سلسلہ ندوۃ المصنفین دہلی

(۶۷)

سلاطینِ دہلی کی مذہبی رجحانات

جس میں سلطان قطب الدین ایبک سے لیکر سلطان ابراہیم لودی تک تمام سلاطینِ دہلی کے مذہبی افکار و عقائد، نظامِ حکومت پر اس کے اثرات اور تاریخِ اسلام میں سلطنتِ دہلی کی حیثیت پر مکمل اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔

تالیف

خلیق احمد صاحب نظامی

ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

رفیق ندوۃ المصنفین

باہتمام

مینیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

طبع اوّل

رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ مطابق اپریل ۱۹۵۸ء

قیمت غیر مجلد [redacted] روپے

قیمت مجلّد [redacted] روپے

مطبوعہ

الجمعیۃ پریس دہلی

فہرست مضامین

جلوہ گاہِ رُخِ او دیدۂ من تنہا نیست
ماہ و خورشید ہمیں آئینہ می گردانند

اپنے مخدوم و محترم

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب قبلہ
گورنر بہار

کی

خدمت میں
اس احساس کے ساتھ ؏
کہ تحفہ کس دُر و گوہر بہ بحر و کاں نبرد

دیباچہ

آج سے تقریباً سولہ سال قبل سلاطینِ دہلی کے مذہبی افکار و رجحانات کے مطالعہ کا خیال پیدا ہوا تھا اور اس سلسلہ میں کچھ مضامین اسلامک کلچر (حیدر آباد) نگار (لکھنؤ)، اور برہان (دہلی) وغیرہ میں شائع بھی کئے گئے تھے۔ علمی حلقوں میں ان مضامین کی پذیرائی توقع سے زیادہ ہوئی، بالخصوص پروفیسر محمد حبیب، ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور پروفیسر شیخ عبدالرشید نے اس موضوع سے جس دل چسپی کا اظہار کیا اور جس طرح ہمت افزائی کی وہ اس کتاب کی تکمیل میں معاون ہوئی، ان بزرگوں سے جو مدد ملی ہے اس کیلئے ممنون ہوں، لیکن اس میں جو نظریات پیش کئے گئے ہیں، اُن کی ذمہ داری خود مجھ پر ہے۔ اگر بعض اور مصروفیتیں پیش نہ آجاتیں تو یہ کتاب کافی عرصہ قبل شائع ہوجاتی۔ اس وقت بھی اس کی اشاعت جناب محترم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کی کوششوں کی رہین منت ہے۔ مفتی صاحب نے مالی مشکلات اور نامساعد حالات کے باوجود اپنے خلوصِ نیت اور ذوقِ عمل سے ندوۃ المصنّفین کو جس طرح زندہ رکھا ہے اس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملے گی۔

اس کتاب کی ترتیب میں ہر ممکن ماخذ سے رجوع کیا گیا ہے۔ مذہبی لٹریچر بالخصوص ملفوظات و مکتوباتِ مشائخ سے پہلی بار تاریخی واقعات کی ترتیب و تہذیب کا کام لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سکوں، کتبات، تذکروں، دواوین وغیرہ سے بھی پوری مدد لی گئی ہے۔

ہندی قرونِ وسطیٰ سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں کتبِ تاریخ کے طرزِ تحریر اور مؤرخین کے

اندازِ فکر کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں، ہر دور کا ایک فکری اور لسانی سانچہ ہوتا ہے اس کو سمجھے بغیر کسی تصنیف کی روح تک نہیں پہنچا جا سکتا، ازمنۂ وسطیٰ میں کوئی گفتگو، خواہ وہ کتنی ہی سیاسی کیوں نہ ہو، مذہب کی آمیزش کے بغیر ممکن ہی نہ تھی، بعض چیزیں تو اس طرح زبان و بیان کا جزو بن گئی تھیں کہ ہندو مورخ بھی اپنے ہم مذہبوں کو نہ صرف "کافر" لکھتے تھے بلکہ ان کی موت پر "بہ جہنم رفت" ہی کہتے تھے۔ قطع نظر اس پہلو کے، اس دور میں جتنی تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں ان میں ایرانی نظریۂ تاریخ کے زیرِ اثر میدانِ جنگ کے حالات اور سیاسی واقعات کی کثرت ہے، پھر بعض تاریخیں سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر لکھی گئی تھیں اور اُن کے ماخذ وہ "فتح نامے" تھے جو زمانۂ حال کی حکومتوں کے communique کی طرح قرونِ وسطیٰ کی حکومتیں تیار کراتی تھیں، اس طرز پر لکھی ہوئی سیاسی تاریخوں سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں اُن کو صرف اس دور کے مذہبی لٹریچر، مشایخ کے ملفوظات، مشاہیر کے مکتوبات وغیرہ سے دور کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ سلاطین کی جو تصویر بنائی جائے اس کے رنگ صرف سیاسی مورخوں ہی سے حاصل نہ کیے جائیں بلکہ سماج کے جس جس طبقہ کی رائے اُن کے متعلق حاصل ہو سکے اس کا پتہ لگایا جائے۔ اس سعی کے باوجود کتاب میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں، جن کا مجھے احساس ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے عزیز دوست سید شفیق احمد صاحب لیکچرار فیضِ عام کالج میرٹھ کا شکریہ ادا نہ کروں جن سے مجھے مختلف قسم کی مدد ملی ہے۔

خلیق احمد نظامی

پیش لفظ

از جناب کرنل سید بشیر حسین صاحب زیدی بی اے (کینٹب)
وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

ہندوستان کی تاریخ پر تحقیق و ترتیب کا کام زیادہ تر یورپین مورخین کا شرمندۂ احسان رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مغرب قطعی غیر جانب دار نہیں رہا۔ اول تو اس کی دسترس اس سارے مواد پر نہیں تھی جو زیادہ تر فارسی میں تھا، دوسرے اس کے ترجمے میں اس سے جابجا غلطیاں ہوئیں، ہندوستان میں بھی کم مؤرخوں کو فارسی پر عبور تھا۔ پھر مغرب ہندوستان کی تاریخ کو ہندو مسلم کش مکش کی عینک سے دیکھتا تھا، اس وجہ سے مغربی مؤرخ ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔

خوشی کی بات ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کی پوری تاریخ کو از سر نو مرتب کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں اور ہندوستان کی زبانوں اور فارسی میں جو مواد بکھرا پڑا ہے اسے سمیٹنے کے لئے اقدام کیا جارہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مواد کی روشنی میں جو تاریخ لکھی جائیگی وہ زیادہ معتبر اور تسلی بخش ہوگی۔

تاریخ کے ان معلموں میں جنھوں نے ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ پر خاص طور سے تحقیق کی ہے خلیق احمد نظامی صاحب ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، انھوں نے ہمارے صوفیائے کرام کی شخصیتوں اور ان کی گرانقدر خدمات کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے۔ اور تاریخ سازی اور سماج سازی میں ان کا جو رول رہا ہے اسکی

تشریح کی ہے، صوفیائے کرام نے ایک طرف مذہب واخلاق کا پرچار کیا، دوسری طرف ایک مشترک تہذیب کیلئے فضا ہموار کی، اُن کا اثر عوام وخواص دونوں پر پڑا اور انھیں کی کوششوں سے وہ گنگا جمنی تہذیب وجود میں آئی جو ہمارا بیش قیمت قومی ورثہ ہے۔

خلیق نظامی صاحب مشائخ چشت کی تاریخ اور بابا فرید گنج شکرؒ کی سوانح لکھ کر اپنی دقتِ نظر اور تلاش وتحقیق کا ثبوت دے چکے ہیں۔ اب انھوں نے سلاطینِ دہلی کے مذہبی رُجحانات پر یہ مبسوط کتاب لکھی ہے۔ تاریخ ہند کے طالب علموں نے اب تک صوفیائے کرام کے ملفوظات پر توجہ نہیں کی تھی۔ نظامی اس کمی کو پورا کر رہے ہیں۔ ان میں عقیدت کی کارفرمائی بھی ہے مگر صحت واصلیت کا بھی التزام رکھا گیا ہے۔ سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات اور اس عہد کے عام مذہبی خیالات وتصورات کے متعلق اُن کی کتاب قابلِ قدر ہے، مجھے یقین ہے کہ اس کتاب سے اس عہد کو اچھی طرح سمجھنے اور اس کی اہمیت کو پرکھنے میں پوری مدد ملے گی۔

خلیق صاحب کا اندازِ بیان شگفتہ اور رواں ہے۔ وہ واضح اور مدلل خیالات کو خوشگوار اسلوب میں پیش کرتے ہیں، انھیں فارسی اور اُردو ادب پر عبور حاصل ہے اور اُن کی نظر واقعات سے بڑھ کر اُن کی رُوح تک پہونچتی ہے، اچھے مورّخ کا یہی نشان ہوتا ہے۔ امید ہے کہ اُن کا یہ کارنامہ اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کرے گا۔

بشیر حسین زیدی

تعارف

ازجناب پروفیسر محمد حبیب صاحب صدر شعبہ سیاسیات
مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

میرے عزیز ساتھی خلیق احمد صاحب نظامی کی تصانیف ہمیشہ تمام ممکن الحصول قلمی اور مطبوعہ ماخذ کے گہرے اور ناقدانہ مطالعہ کا نتیجہ ہوتی ہیں، وہ بڑی تلاش اور محنت سے مواد فراہم کرنے کے بعد ماحول کے پس منظر میں حالات کا جائزہ لیتے اور واقعات کی توجیہ کرتے ہیں پیش نظر تصنیف بھی ان خصوصیات کی حامل ہے۔ تاریخِ ہند سے ہر دلچسپی رکھنے والے کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ خلیق صاحب نے اِس وقت جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اُس کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ یہ وہ موضوع ہے جو معاصرین تک نے غلط پیش کیا ہے اور متاخرین نے تو غلط سمجھا ہی ہے۔ خلیق صاحب کی اس تصنیف سے ہمارے دَور کے تاریخی فکر کو ایک نہایت ہی متوازن نقطۂ نظر مل گیا ہے جس سے معاصرین اور متاخرین دونوں کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ ممکن ہے۔

سلاطینِ دہلی مسلمان ضرور تھے لیکن تحقیق کا مطالعہ پُورا نہیں ہوتا جب تک کہ ہم یہ جان لیں کہ اُن کے عقائد کی نوعیت کیا تھی اور ان کا عمل اور کردار کیا تھا؟ اسلام کی تاریخ بڑی طویل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لیکر آج تک اسلام نے مختلف اور متعدد دَور دیکھے ہیں اور دینی فکر میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ خلیق صاحب نے تاریخِ اسلام میں سلطنتِ دہلی کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور سلاطین کے مذہبی افکار و کردار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

خلیق صاحب کا کہنا ہے کہ جب خلافتِ عباسیہ کا زوال شروع ہوا تو دارالسلطنت سے دور بہت سی ایسی حکومتیں قائم ہوگئیں جو بظاہر تو خلافت کے ماتحت تھیں لیکن عملاً بالکل آزاد اور خودمختار تھیں، غزنویہ، سلجوقیہ اور خوارزمیہ خاندانوں کا مقصد ایرانی تہذیب کا احیاء تھا، ان خاندانوں کے بادشاہوں کی شخصی زندگی پر اسلام کا کتنا ہی اثر ہو لیکن اُن کے سیاسی اداروں میں بقول مولانا شبلی کیقباد و کیخسرو کی رُوح سرایت کرگئی تھی، یہ سب کیسے ہوا' یہ ایک طویل داستان ہے، تاریخ و سیاسیات کے طالب علم کو اس ضمن میں جس مواد کی ضرورت پیش آتی ہے وہ خلیق صاحب نے بڑی خوبی سے اس تصنیف میں مہیا کر دیا ہے۔

قرآن کوئی سیاسی کتاب نہیں ہے، اس کا مقصد انسان کی رُوحانی اصلاح و تربیت ہے' جہاں تک سیاسی اصولوں کا تعلق ہے اس میں دو بُنیادی ہدایتیں ملتی ہیں، اوّل باہمی مشورہ سے جُملہ امُور کا فیصلہ، دوم اولی الامر کی اطاعت بشرطیکہ وہ تم ہی میں سے ہو"۔ سُنّی روایات کے مطابق تو بعد کو پیدا ہونے والے سیاسی مسائل کا حل رسولِ اکرمؐ نے قوم کی اجتماعی رائے پر ہی چھوڑ دیا ہے اور چونکہ ایسی وسیع و عریض ریاستوں کی تنظیم جہاں مختلف نسلی، لسانی اور تمدنی روایات کے حامل بستے ہوں زمانہ کے مطابق ہی ممکن ہے اس لئے رسولِ اکرمؐ نے اس سلسلہ میں قطعی سیاسی احکام نافذ کرکے اُمّت کو پابند نہیں کیا، لیکن اس کے برعکس شیعوں کا دعویٰ ہے کہ اسلام کی قیادت صرف آئمہ کا حق ہے، یہ دعویٰ تحقیق کا محتاج ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ کسی آئینی حکومت کا قیام ممکن نہ تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ کسی ایک خاندان ہی پر اکتفا ممکن تھا خواہ اس میں عملاً حکومت کی صلاحیت باقی رہے یا نہ رہے، چنانچہ خاندانِ عباسیہ اپنے آخری سو ڈیڑھ سو برس میں ایسی صورت میں مُلک پر قابض رہا کہ اُس کے کسی ایک فرد میں بھی نظم و نسق چلانے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی۔

رسولِ اکرمؐ کے زمانہ ہی میں تمام عرب اسلام قبول کر چکا تھا۔ اسلام میں پھیلنے کی صلاحیت تھی۔ اُس کے اخوت اور مساوات کے اصول بحیرہ روم کی اُس دنیا کیلئے بابرکت ثابت ہوئے جہاں غلام اور

آقا کی اٹل تفریق نے انسانی رشتوں کو قطع کر کے مذہبی رہنماؤں کو عوام پر ظلم وستم کے مواقع فراہم کر دئیے تھے

اسلام کی توسیع دراصل حضرت عمرؓ اور ولید بن عبدالملک کے عہد میں ہوئی، حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد ولید بن عبدالملک کے خلافت سنبھالنے تک ایک زبردست طوفان آیا اور نکل گیا۔ یہ مختصر دور تاریخ میں بڑا اہم ہے ضرورت کے تحت شہنشاہیت کے اصولوں کی بنا بھی اس زمانہ میں پڑی حالانکہ مسلمان لفظ "ملک" سے اصولاً اسی قدر نالاں تھے جیسے جمہوری روم کے زمانہ میں اہلِ روم لفظ REGUS سے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد تو گویا ابتلاء و مصائب کا ایک لا متناہی سلسلہ قائم ہو گیا۔ اسلام کی سیاسی حدود کی توسیع کے باعث مدینہ کی گذشتہ حیثیت ختم ہو گئی اور اسلام کا سیاسی مرکز اوّل تو شام کو منتقل ہوا جو روم سے متاثر تھا، پھر عراق کو جہاں ایرانی اثرات کا غلبہ تھا، خلافت کے نزاع نے اسلامی اتحاد کو بھی صدمہ پہنچایا، مسلمان اب آپس کے کشت و خون کے بھی عادی ہو گئے، نئے نئے فرقوں کی کثرت کے باعث بعض اوقات گمان ہونے لگتا تھا کہ شاید اسلام فرقوں کی باہمی جنگ کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ نئے ممالک فتح ضرور ہو چکے تھے لیکن چونکہ اب تک ایمان نہیں لائے تھے اسلئے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اُن کا رُخ کیا ہو گا؟

ان سب مشکلات کا حل صرف ایک ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ ایک ایسی مضبوط "جماعت عاملہ" وجود میں آئے جو حکومتِ مسلم کی پوری طرح پر وفادار ہو اور نظام حکومت کا پورا بوجھ سنبھال سکے، اُس زمانہ کے حالات ایسے تھے کہ ایک ہی حکمراں طبقہ نمودار ہو سکتا تھا اور وہ اُن ممتاز عرب خاندانوں کا جس میں خلفاء بنی اُمیہ پیش پیش تھے ہاشمی خاندان موجود ضرور تھا لیکن اس کے افراد عہدوں پر فائز نہ تھے۔

عرب میں زراعت اور صنعت وحرفت کی کمی کی بنا پر کسی surplus value کی اُمید ہی یکسر بیکار تھی، حد تو یہ ہے کہ حکمراں طبقہ بھی وہاں اُس وقت وجود میں آیا جب ایران کی دولت وہاں کے اعلیٰ خاندانوں میں تقسیم کی گئی، حضرت عمرؓ کے بعد امیر معاویہؓ نے دولت کی یہ تقسیم جاری رکھی، یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ نئے ممالک کی فتح بھی شاید اسی رواج کو باقی رکھنے کے لئے قایم رہی۔

تاریخی شواہد موجود نہ ہونے کی وجہ سے نہیں کہا جا سکتا کہ ایران نے اسلام کب قبول کیا؟ فاتحین نے وہاں سے تحصیلِ زر ضرور کی، لیکن وہاں کے لوگوں کی روایتی پستی اور بدحالی کو ختم کر کے اُن کو خوش حال اور مطمئن

بھی کردیا۔ مجموعی طور پر چونکہ عجم، عراق اور وسط ایشیا کی سرزمین Surplus Value کی حامل تھی اسلئے حکمراں طبقہ کی بھی خوب کفالت کرسکتی تھی، پُرانا حکمراں طبقہ حقِ پیدائش کے سہارے حکومت کرتا تھا لیکن نئے حکام کو اُن کی دیانتداری سے مطمئن ہوکر حکومت کی طرف سے مقرر کیا جاتا تھا۔ بہرکیف یہ تبدیلی ایران کے لیے خوش آیند ضرور ثابت ہوئی۔

تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ بنی اُمیہ کے استحکام کا باعث یہ دو ادارے تھے، ایک وفادار حکام طبقہ، دوسرے خلافت کے معاملہ میں اصولِ وراثت پر عمل، خلفاء راشدین نے تو خلافت کے ضمن میں وراثت کی کوئی روایت چھوڑی نہیں تھی کیونکہ انتشاری حالات کے ہوتے ہوئے بھی چاروں خلیفہ جمہوری نقطۂ نظر سے منتخب کئے گئے تھے لیکن وراثت کا اصول اُس وقت وجود میں آیا جب امیر معاویہ نے اپنے لڑکے یزید کو نامزد کیا، امیر معاویہ کے اس فعل سے حکومت صرف ایک خاندان میں محدود ہوکر رہ گئی اور مدینہ کی شہری ریاست کا جمہوری اصول اس طرح قطعاً نظرانداز کردیا گیا۔

خلیق صاحب کا کہنا درست ہے کہ خلافتِ بنی امیہ کے طریقوں سے صحابہ نے اتفاق تو نہیں کیا لیکن مجبوراً تسلیم ضرور کرلیا۔ بایں ہمہ اس زمانہ میں بھی اُن آزاد منش شہریوں کی ہمیں دو جماعتیں نظر آتی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے سامنے ایک ایسی روحانی اور شخصی آزادی کا تصور پیش کیا جو آگے چل کر اسلام کا جزو بن گیا، پہلی جماعت اُن صحابۂ کرام کی تھی جنھوں نے حکومت کی بدلی ہوئی ہیئت اور بدلی ہوئی نیت کو دیکھتے ہوئے حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کو نظرانداز کرکے خاموش زندگی بسر کرنیکا ارادہ کرلیا تھا اور دوسری جماعت اُن غیر عرب مسلمانوں کی تھی جن کی سیاسی یا سماجی حیثیت تو کچھ بھی نہ تھی لیکن جو مذہبی رہنماؤں اور سلاطینِ وقت سے کنارہ کش ہوکر خواجہ حسن بصریؒ کے گرد جمع ہوگئے تھے اور رسولؐ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرچکے تھے، ان دو جماعتوں کے اثر سے اسلام کے مستقبل کیلئے یہ اصول ترتیب پاگیا کہ مذہبی رہنما اُس وقت تک واجب الاحترام خیال نہ کیا جائیگا جب تک وہ حکومتِ وقت سے متعلق رہے گا، ہندوستان میں بھی اس روایت کے اثرات پہنچے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر علماء ظاہری ختم ہوتے ہی بھلا دئے گئے لیکن اکابر صوفیہ کے مزار جنھوں نے حکومت سے تعلقات رکھ کر اپنے کردار کو ملوث نہیں کیا آج بھی عقیدت مند

ہندو اور مسلمانوں کا مرجع بنے ہوئے ہیں۔

عباسی انقلاب چند اور ہی تبدیلیاں لیکر آیا، اس نے ایک مستقل حکمراں خاندان ہی کو جنم نہیں دیا بلکہ ایک ایسے نئے حکمراں طبقہ کو بھی وجود میں لایا جس پر عربی تہذیب کا رنگ ضرور تھا لیکن جس میں عربی اور ایرانی دونوں شامل تھے، فتح ایران کے بعد وہاں کے بعض اعلیٰ خاندانوں مثلاً آل برمک نے ایرانی نژاد ہوتے ہوئے بھی عرب تہذیب کو قبول کر لیا تھا خلیق صاحب کا کہنا بجا ہے کہ عباسیوں کے بعد دو اہم تبدیلیاں وجود میں آئیں، صوبائی افسروں نے اپنے عہدوں کو موروثی قرار دے لیا اور عباسی خلفاء کو مجبور کیا کہ وہ اس تبدیلی کو قبول کر لیں، دوسرا بڑا تغیر ترکوں کی آمد تھی جو پہلے تو خلیفہ کے محافظ کی حیثیت سے ملازم رکھے گئے تھے لیکن جنھوں نے بعد میں آہستہ آہستہ خلیفہ پر قابو پانا شروع کر دیا۔ غزنی میں الپگین کی حکومت کا قیام اسکی ایک صریح علامت تھی، ایران میں صفوی اور ہندوستان میں سید اور لودی خاندانوں کے علاوہ تمام مسلمان بادشاہوں کے خاندان ترکی النسل تھے، اسی ترک حکمراں طبقہ نے بعد میں ہندوستان کو بھی فتح کر لیا، اس انجام کا آغاز عباسی انقلاب ہی میں پنہاں تھا۔

خلیق صاحب کا خیال درست ہے کہ ہندوستان اور ایران میں شہنشاہوں کا مطمح نظر وہ رسوم و قیود تھے جو مسلمانوں کی آمد سے قبل کبھی ایران میں جاری تھے، عرب فتوحات کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ ایران نے خود اپنے ہاتھوں اپنی روایات ختم کر کے عرب روایات اور تہذیب کو اپنا لیا لیکن امتدادِ وقت نے اُن میں ساسانیوں کی عظمت کا احساس پھر جگا دیا۔ چنانچہ ایران کے چند خاندانوں اور اُن کے درباری شعراء نے ایران میں ایک تمدنی انقلاب برپا کر دیا جو ایران کا نشاۃِ ثانیہ کہلاتا ہے، گذشتہ ایران کی عظمت کو بیان کرنے کیلئے اب مواد کی ضرورت پیش آئی، اور ذرائع ناپید ہونے کی وجہ سے رودکی اور فردوسی کو اُن عربی کتابوں سے رجوع کرنا پڑا جن میں فارسی روایات کا ذکر محض خال خال موجود تھا۔ ایرانی یادداشت روایات کے سلسلہ میں چونکہ اردشیر بابکان تک جا کر رک جاتی ہیں اسلئے فردوسی اور دوسرے مصنفین کے یہاں سکندر سے قبل کے جن اکابرِ ایران کا ذکر ملتا ہے وہ اُن کے تصور کی پیداوار ہے تاریخ ہرگز نہیں۔

ایران کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد سیاسی فضا میں اور تبدیلی واقع ہوئی، نئے حالات کی وجہ سے ایک ایسا

نیا سیاسی ادارہ وجود میں آگیا جو خلافت سے بالکل مختلف تھا۔ رسولِ اکرمؐ نے الوہیت یا نیابت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ خلفاء بنی اُمیہ اور بنی عباس نے بھی "امیر المومنین" اور خلیفۂ رسول اللہ سے زیادہ کسی مرتبہ کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن نئے حکمرانوں نے اپنے لئے "سلطان" کا لفظ اسلئے انتخاب کیا کہ لفظ کی لغوی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر وہ "نیابتِ خداوندی" کا دعویٰ کر سکیں۔

رسولِ اکرمؐ نے وسیع و عریض ریاستوں کی تنظیم کے بارے میں چونکہ کوئی ہدایت نہیں چھوڑی تھی۔ اسلئے بقول خلیق صاحب موضوع احادیث کے ذریعہ اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی گئی پھر ایران کے قدیم قصّوں کو از سرِ نو کھڑا کیا گیا اور اس بار فردوسی اور عرب مؤرخین کو نظر انداز کرکے نثر میں ایک ایسے نئے ادب کی تخلیق شروع کردی گئی جو اب ناپید ہے، اس ادب کے متعلق چند مفید مطلب حوالے فتاوائے جہانداری میں مل جاتے ہیں جن سے کم از کم اُن سیاسی تصورات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اُس دور کی عملی زندگی پر چھا گئے تھے۔ شہنشاہیت کا یہی تصور سالوں بعد عجم سے ہندوستان لایا گیا اور یہاں بھی اُس نے سیاسی فکر اور سیاسی اداروں کو اُسی انداز سے متاثر کیا جس طرح عجم میں کیا تھا۔ کیقباد اور جمشید سے سکندر تک تمام شاہی شخصیتوں کو جدید پیرایہ دے کر نئے سانچے میں ڈھال دیا گیا۔ سکندر اور اُس کے پیش رو تمام بادشاہوں کے سیاسی معتقدات کی اگر اس طرح تجدید و تعبیر نہ کی جاتی تو نئے حالات میں وہ کس طرح قابلِ قبول ہو سکتے تھے، دلچسپ بات یہ ہے کہ گو یہ قدیم حکمراں مسلمان نہ تھے لیکن پھر بھی بدعت اور ایمان کی اصطلاحوں میں گفتگو کرتے ہوئے پیش کئے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں کو نئے انداز سے پیش کرنیکا مقصد شاید یہی تھا کہ اُنکی زبان سے ایسے معاملات پر گفتگو کرا کر اصول منضبط کرائے جائیں جنھیں اسلام نے نظر انداز کردیا تھا اس طرح رسولِ اکرمؐ کے قانون میں اضافہ روا رکھنے کی گنجائش بھی نکل آئی اور جب اضافہ ہوا تو ظاہر ہے کہ اُس میں حسبِ دلخواہ تبدیلیاں بھی کی گئیں، ان من گھڑت کہانیوں نے اپنا مقصد پورا کیا۔ حکمراں خاندان کو تحفظ بہم پہونچانے کی صورت نکل آئی، برسوں تک ان من گھڑت ساسانی روایات نے ساتھ دیا لیکن مغلوں کی آمد کے ساتھ یہ ختم ہو گئیں کیونکہ اب چنگیز اور تیمور کے کارنامے ساسانی کارناموں پر غالب آگئے تھے۔

ہندوستان میں ترکوں کی کامیابی کی بڑی وجہ ہندوستان کی سماجی بدحالی اور ذات پات کی تقسیم تھی جس نے مزدور اور سماج کے نچلے طبقوں کو شہر میں بسنے اور فوج میں بھرتی ہونیکے حق سے محروم کردیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں نے بڑی سہولت سے راجپوتوں کی جگہ حاصل کرلی، اُن کے زمانہ میں شہروں کے حدود وسیع تر ہوگئے۔ چنڈالوں کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی تاکہ وہ کارخانوں کیلئے کارآمد ثابت ہوسکیں، اہم فوجی ملازمتوں کے دروازے بھی عام ہندوؤں کیلئے کھول دیئے گئے جس سے راجپوتوں کی فوجی اجارہ داری کا بھی خاتمہ ہوگیا، ہندو پیشہ وروں کی حالت اسلئے بہتر ہوگئی کہ اُن کیلئے کام کی راہیں کھل گئی تھیں، برہمنو کو سیاسی اور معاشرتی اداروں میں تو دخل نہیں دیا گیا لیکن منوسمرتی کا وہ فیصلہ قائم نہیں رہ سکا جس نے برہمنوں کو موت کی سزا سے بالکل بری کردیا تھا۔

ہندو عبادت گاہوں کے تحفظ کے سلسلہ میں خلیق صاحب نے جو کچھ لکھا ہے مجھے اس میں چند چیزوں کا اضافہ کرنا ہے سلطنت کے زمانہ میں مندر بالکل محفوظ رہے، ایک مندر کا مسجد میں تبدیل کرنا تشکیلی حیثیت سے بھی ناممکن تھا، ہر مسجد کیلئے ایک وسیع کمرے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا رُخ مغرب کی طرف ہو اور اس سے ملحق ایسا وسیع صحن درکار ہوتا ہے جس میں نمازی قطار اندر قطار (قطاروں کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑ کر) کھڑے ہوسکیں، اُس زمانہ کے اکثر و بیشتر مندروں میں کوئی ایسی صورت نہ تھی کہ اُنکو بآسانی مسجد بنایا جاسکے، اور ان میں سے چند اگر مذہبی جنون کی کسی گذراں لہر کی نذر ہو بھی گئے تو سلاطین نے ہندوؤں کی خوشنودی کی خاطر اُن کو دوبارہ تعمیر کرادیا، لنگم کی پرستش سے ابتدا میں سخت نفرت کا اظہار کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ اُس کی بھی اجازت مل گئی، غوری فتوحات کے پہلے دور میں سلاطین نے مندروں کو منہدم کیا لیکن اس میں مذہبی جنون کا شائبہ نہ تھا۔ ترکوں نے مذہبی رواداری سے کام لیا، انھوں نے نہ تو مندر کی دیوداسیوں کی اصلاح کا رُخ کیا اور نہ اس بات کو روا رکھا کہ ہندوؤں کے رسم و رواج میں کسی قسم کی مداخلت کی جائے۔

خلافت بنی امیہ کے زمانہ سے مسلمان ذہن آہستہ آہستہ اس بات سے متفق ہوتا جارہا تھا کہ اسلامی اخلاقیات کے عام اصولوں کا حاکم وقت پر اس طرح اطلاق نہیں ہوتا جس طرح ایک عام انسان پر خصوصیت کے ساتھ وہ قوانین جنکا تعلق شراب، زنا اور قتل سے ہے عجم شہنشاہیت کے بعد سے یہ قوانین حکمراں طبقہ کے حقوق کا حصّہ سمجھ لئے گئے تھے۔

خلافتِ عباسیہ کے تنزل کے بعد سے اکبر اعظم تک یہی طریقہ جاری رہا۔ عوام نے شاہِ وقت سے کم از کم ظواہر کے احترام کی توقع رکھی، شاہِ وقت نے اس توقع کو پورا کیا لیکن یقین کیساتھ یہ کہنا ذرا مشکل ہوگا کہ فرمانروا کا یہ حقیقی یا مصنوعی تقدس اس کے امورِ سلطنت میں کس حد تک معاون ثابت ہوا اور کس حد تک نہیں۔

میں نظامی صاحب سے متفق ہوں کہ التتمش صوم وصلوٰۃ کا بڑا پابند تھا اور اس کے روابط صوفیائے وقت سے بھی نہایت عقیدتمندانہ تھے لیکن اس تقدس نے نہ تو اس کے متقی لڑکے کو کوئی مدد بہم پہونچائی اور نہ بلبن ہی کو اپنے آقا کے خاندان کا خون بہانے سے باز رکھا، بلبن کی مذہبی رسوم کی پابندی بھی (جسکی خلیق صاحب نے تفصیل دی ہے اور جو اُسکی سیاسی حکمت عملی کا ایک حصہ تھی) بلبن کیلئے مفید ثابت نہ ہوئی، اسکے برعکس علاؤالدین خلجی جو سلاطینِ دہلی میں سب سے زیادہ کامیاب حکمراں ثابت ہوا حالانکہ صوم وصلوٰۃ کا پابند نہ تھا لیکن پھر بھی عوام میں اسکی بابت مشہور تھا کہ خدا نے اسے کرامت کی قوت عطا کی ہے۔ محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات بھی اُس مخالفت کو فرو نہ کرسکے جو اس کی حکمت عملی کے نتیجہ کے طور پر وجود میں آئی تھی، فیروز شاہ کی غیر معمولی مذہبیت نے اسکی شہرت کو تو خوب ترقی دی لیکن روز بروز کمزور ہوتی ہوئی حکومت کو اُس سے کوئی سہارا نہ مل سکا۔

ان سرسری حوالوں سے یہ ضرور اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فرماں رواؤں کی نجی زندگی کے مذہبی عناصر ان کے انتظام مملکت میں کبھی معاون ثابت نہیں ہوئے، وجہ یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ اپنی رائے دنیاوی تقاضوں کی بُنیاد پر قائم کرتے رہے، انھوں نے بادشاہ کے افکار و خیالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنی وفاداری کو برقرار رکھا، اسکے علاوہ اس زمانہ کی فضا بھی کچھ اس انداز سے ترتیب پاچکی تھی کہ مذہبی رسوم کی ادائیگی اگر ترکِ دُنیا اور خدمتِ خلق کے اس تصور سے عاری ہوتی تھی جس کی طرف خلیق صاحب نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے سفر بدایوں اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے ارشادات کے سلسلہ میں اشارہ کیا ہے تو ایسی مذہبیت بے اثر ہوتی تھی اور عوام اُس کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔

خلیق صاحب نے التتمش کی اُن مساعی کی تفصیل دی ہے جو اس نے توسیعِ اسلام کیلئے کیں، انھوں نے اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ التتمش کے رجحانات ہی نے دہلی میں وہ فضا پیدا کی جس میں اسلام کے مذہبی اور ثقافتی ادارے پھل پھول سکے مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے، اس لئے کہ اوّل تو اس سلسلہ میں جو اسناد ملتی ہیں وہ بہت بعد کی ہیں، دوسرے تاریخی

واقعات شاہد ہیں کہ التتمش نے بھی ریشہ دوانیوں اور خوں ریزیوں کے بعد اپنی حیثیت کو محفوظ کیا تھا، اُس کی حکومت بھی اس خاص طبقہ کی حکومت تھی، اس کے دَور کے علماء وظیفہ پاکر حکومت سے وفاداری کی تلقین کرتے تھے خدمتِ خلق تو درکنار اُس نے اپنے حریفوں کیساتھ وہی برتاؤ روا رکھا جو اور حکمراں اپنے حریفوں سے کرتے چلے آئے تھے، اسی بنا پر میں اُن بیانات کو مشکوک نظر سے دیکھتا ہوں جو بعض تذکروں میں التتمش اور بلبن کے چشتی بزرگوں سے تعلقات کے سلسلہ میں ملتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کی تعلیم اُن سلاطین کے فکر و عمل سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تھی۔

بلبن کے مذہبی رجحانات کی توجیہ بھی اُن سیاسی حالات کے پس منظر میں کرنی چاہیے جو التتمش کے منظم کیئے ہوئے ترک غلاموں نے پیدا کر دیئے تھے۔ ابتدا میں بلبن کی حیثیت کمزور تھی، نسلی سلسلے کی کمزوری کو چھپانے کیلئے وہ خود کو افراسیاب کی نسل سے بتاتا تھا، ترک افسروں کیخلاف ناکام جدوجہد اسکی دوسری کمزوری تھی جنرل کی حیثیت سے وہ کمتر تھا۔ حق و انصاف کے بار بار ذکر کے باوجود اُس کی طاقت کا راز اس کی ریشہ دوانیوں میں مضمر تھا، مرتے دم تک ساسانی شہنشاہیت کے طمطراق کا میلہ اُس نے قلعہ میں اسلیئے لگائے رکھا تاکہ وہ اپنی نسلی برتری کو ثابت کرکے خود کو اس انجام سے محفوظ کرلے جو اُس کے ہاتھوں اُسکے آقا کا ہوا تھا، سرِ راہ پھانسیاں دیکر اس نے عوام کو سہمایا تو، لیکن اُن کی رہنمائی کبھی نہ کی، اس "گرگ باراں دیدہ" نے مذہب کو آلۂ کار بنایا، علماء کو وظائف دیئے۔ مزاروں پر گڑگڑایا، یہ سب کچھ نمائشی تھا خلیق صاحب نے "زبدۃ التواریخ" کے حوالہ سے برمحل نقل کیا ہے کہ فیروز شاہ تمام سلاطینِ دہلی کے مزاروں پر فاتحہ پڑھتا تھا لیکن اُس نے بلبن کی قبر کا کبھی رُخ تک بھی نہیں کیا۔

مذہبی اور سیاسی نقطہ ہائے نظر سے علاء الدین خلجی ہندوستان کے حکمرانوں میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے اس نے خود کو ہمیشہ جمہور کا ایک فرد سمجھا، اس کی زندگی کا سب سے سیدھا سادھا اصول فلاحِ عام تھا جس پر وہ ایمان رکھتا تھا اور جس کا ذکر اُس نے قاضی حمید ملتانی سے گفتگو کے دوران میں کیا تھا، خدمتِ خلق کا تصور اُس کے یہاں عوام کی مادی بہبودی کا پابند ہے۔ اس نے لشکرِ جرار ترتیب دیکر منگولیوں کے حملے روک دیئے، راجپوتوں کو فتح کرلیا، دکن کے راجاؤں سے اُن کی دولت چھین لی اور اشیاء کی قیمتیں مقرر کرکے عوام کو سہولتیں بہم پہونچائیں، اُس کا عقیدہ تھا کہ تجربہ اور مشاہدہ کے مطابق فلاحِ عام کی کوشش ہی بہترین

نصب العین ہے، اُس نے سلطان محمود یا دیگر فرمانرواؤں کی طرح اسلام کی خدمت کا دعویٰ بھی نہیں کیا، لیکن وہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا بڑا احترام کرتا تھا، اُس نے خود علماء کو سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کیا، نہ اُن کو اس کی اجازت دی کہ وہ سیاست میں دخیل ہوں، مصیبت زدہ لوگوں کی اُس نے مدد کی لیکن مدد کو کبھی تماشہ نہیں بننے دیا۔ مذہبی اکابر کے یہاں نہ خود گیا نہ اُن کو دربار میں آنیکی دعوت دی، اسکی حکمت عملی، بلبن اور التمش کی حکمت عملی سے مختلف رہی، با ایں ہمہ برنی جو اسکے ساتھ معاندانہ رویہ برتنے کا عادی ہے اقرار کرتا ہے کہ اُس کے دورِ حکومت میں رعایا "مذہب کے محافظ" بادشاہوں کے زمانہ سے کہیں زیادہ خوش حال تھی۔ عصامی بھی اُس کے زمانہ کی برکتوں کا شد ومد سے قائل نظر آتا ہے۔

دہلی کے سلاطین کے مذہبی رجحانات کو جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، مورخین نے سمجھنے میں اب تک بڑی غلطی کی ہے، اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانہ کی روایات اور حالات گردوپیش کو عموماً بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ خلیق صاحب کی فاضلانہ تصنیف نے دونوں غلطیوں کا پوری طرح ازالہ کر دیا ہے، تاریخ کے طالب علم کو اس کتاب کے مطالعہ سے اُن کوائف کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی جس نے ہر سلطان کو ایک خاص انداز میں بڑھنے اور عمل کرنے پر مجبور کر دیا تھا، چند غیر اہم فرمانرواؤں کو چھوڑ کر التمش سے لیکر فیروز شاہ تک دلّی کے پانچوں سلاطین کی مصنّف نے بڑی پوری تصویر پیش کی ہے اور ہر سلطان کی حکمت عملی کا اُس کے زمانہ کے حالات اور خود اس کے کردار کی روشنی میں جو مطالعہ کیا ہے وہ بہت عمیق ہے، مصنف نے ہر دور کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے مذہبی نظریات کی تشریح میں بھی دقتِ نظر سے کام لیا ہے، پڑھنے والوں کو ممنون ہونا چاہیئے خلیق صاحب کی اس فاضلانہ تحقیق کا جس نے مضمون سے متعلق اُن تمام ممکن الحصول اسناد کا احاطہ کر لیا ہے جن کے قلمی یا مطبوعہ نسخے حاصل ہو سکتے ہیں اور اُس ناقدانہ نظر کا بھی جس نے ہندوستانی تاریخ کے اتنے اہم مسائل کو نقد و فکر کے بعد اس طرح سلجھا دیا ہے۔

محمد حبیب

مُقَدِّمَه

افتتاحِ سخن[1]

ٹالسٹائی نے اپنی مشہور کتاب "مذہب کیا ہے؟"[2] میں برتھولٹ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں جن چیزوں نے انسانی فکر کو متاثر کیا وہ دو تھیں: قوت اور مذہب۔ قوت کا اثر محدود تھا، مذہب کا لامحدود۔ قوت کے ذریعہ انسان کے جسم پر تسلط حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن اقلیمِ دل کی فتح ممکن نہ تھی۔ مذہب کی حکمرانی انسان کے اُن بُنیادی جذبات پر تھی جہاں اس کی فکر و نظر کے سانچے ڈھلتے تھے اور جہاں اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی تھی غالباً اسی اہمیت کے پیش نظر کارلائل نے کہا تھا کہ اگر کسی شخص یا قوم کی تاریخ کی روح تک پہنچنا ہو تو اس کے معتقداتِ مذہبی کی تحقیق کرنی چاہیے۔[3]

مذہب کی ماہیت و اثرات اور ارتقائی کیفیات کی تحقیق میں عصرِ حاضر کے بعض اہلِ فکر نے بڑی کاوش کی ہے۔ اور کتنے ہی مختلف زاویوں سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے جارج فٹ مور[4] (George Foot Moore) ہربرٹ شینڈر[5] (Herbert Schneider) وغیرہ نے تہذیبِ انسانی کے نشو و نما میں مذہب کے اثرات کا مطالعہ کیا ہے۔ جرمن کے ایک مشہور فاضل لیئو[6] (G. Van Der Leeuw) نے یہ پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ مذہبی جذبات انسان کے کردار اور اس کے بنائے ہوئے اداروں

---

[1] یہ ترکیب صدرالدین حسن نظامی مصنف تاج المآثر سے مستعار لی ہے۔

[2] What is Religion? P. 11

[3] Heroes & Hero-Worship p. 10 نیز ملاحظہ ہو An Historian's approach to Religion, A. Toynbee

[4] History of Religions (New York 1937)

[5] Religion in Various Cultures (New York 1932)

[6] Religion in Essence and Manifestation (London 1938

میں کس طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے جرمن فاضل جوخم واخ[1] (Joachim Wach) نے عمرانیات کی روشنی میں مذہب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ جیمس پریٹ[2] (James Pratt) اور اسکربنر ایمس[3] (E. Sribner Ames) نے مذہبی احساس و شعور کا مطالعہ بڑی دیدہ وری سے کیا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے اور مطالعے مذہب کے اثرات و کیفیات کو سمجھنے میں بڑی مدد کرتے ہیں، لیکن یہاں ہمیں سب سے پہلے یہ طے کرنا ہے کہ کسی شخص کے مذہبی افکار و رجحانات کی تحقیق کن دائروں کے اندر ہونی چاہیے ـــــ اقبال نے مذہبی زندگی کے تین دور قرار دیے ہیں۔ پہلا عقیدہ کا، دوسرا فکر کا، اور تیسرا دور انکشاف کا۔ پہلے دور میں مذہبی زندگی کی حیثیت ایک ایسے ڈسپلن کی ہوتی ہے جو انسان بلا حیل وحجت بالکل ایک حکم کی طرح تسلیم کر لیتا ہے۔ یہ طریقہ سماجی اور سیاسی تاریخ میں کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، لیکن فرد کے باطنی نشو ونما میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کسی ڈسپلن کو صحیح معنی میں تسلیم ہی اُس وقت کر سکتا ہے۔ جب وہ عقلی طور پر اس کی سچائی کا قائل ہو گیا ہو۔ جب فکر متحرک ہوتی ہے تو مذہبی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس کی بُنیاد مابعد الطبعیات (Metaphysics) پر قائم ہوتی ہے۔ اور انسان کے ذہن میں کائنات اور ذاتِ حقیقی کا ایک منظم تصور قائم ہو جاتا ہے۔ تیسرے دور میں نفسیات مابعد الطبعیات کی جگہ لے لیتی ہے۔ اور "ذاتِ حقیقی" سے براہِ راست تعلق کی کوشش کارفرما ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح فرد خود اپنے شعور کی گہرائیوں میں اُن احکام و قوانین کا منبع و مخرج پا لیتا ہے جن کا اتباع پہلے دور میں اُس نے بلا سوچے سمجھے کیا تھا[4] ـــــ سب انسان

۱؎ Sociology of Religion (Chicago 1949)

۲؎ The Religions Consciousness: A Psychological Study (New York 1920)

۳؎ The Psychologyy of Religions Experieuce

۴؎ Reconstructin of Religious Thought in Islam P. 180

ان تینوں منزلوں سے نہیں گزر پاتے۔ کچھ ہیں جو پہلی ہی منزل میں رُک جاتے ہیں۔ ان کے لیے مذہب وراثت کا ایک حصہ ہوتا ہے اور وہ رسموں اور تقریبوں کے سانچے میں ڈھلنے ہی کو اصل مذہب سمجھ لیتے ہیں۔ دوسرا دور اس راہ کی سب سے زیادہ سخت منزل ہے۔ اس کی ابتدا شک سے ہوتی ہے۔ اگر عقل "چراغِ راہ" بننے کے بجائے راہرو کو اپنے ہی میں گم کرلے تو پھر انسان اسی منزل میں رُک جاتا ہے۔ جو اس منزل سے نکل گیا اُس نے مذہب کی حقیقت کو پا لیا۔ یہ آخری اور تیسری منزل وہ ہے جہاں مذہب ذاتی حسنِ عمل (Personal morality) اور سماجی نصب العین اور اجتماعی اخلاق (Social morality) دونوں کا پیام بر بن جاتا ہے۔

دنیا کے ہر مذہب نے اپنے ماننے والوں کو کسی نہ کسی درجہ میں ایک ذاتِ مطلق کا تصور، عبادت کا ایک نظام اور ایک ضابطۂ اخلاق ضرور دیا ہے۔ ذاتِ مطلق کا تصور ہر انسان کی مخصوص ذہنی اور فکری صلاحیتوں اور اس کی تعلیم اور ماحول پر منحصر ہوتا ہے۔ عبادت کا نظام مذہب کو ایک ادارہ کی حیثیت سے زندہ رکھنے اور اس کے پیروؤں میں جماعتی یگانگت اور اجتماعی کردار پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اخلاقی ضابطہ مذہب کی روح ہے۔ تمام عبادتوں کا مقصد اور ذاتِ مطلق میں ایمان کی آخری منزل یہی ہے کہ انسان اس اخلاقی ضابطہ کی رہنمائی میں ایسے آدابِ معیشت سیکھے جن پر نہ صرف اس کی ذاتی فوز و کامرانی بلکہ انسانیت کی بقا کا دارومدار ہے۔ قرآنِ پاک میں پیغمبروں کی بعثت کا مقصد یہی بتایا گیا ہے کہ وہ انسان کی اخلاقی حالت کو سدھارتے اور اس کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرتے ہیں[1]۔ پھر جن لوگوں کو "تمکن فی الارض" سے نوازا گیا اُن کا بھی یہ فرض ہے کہ اللہ کی عبادت دنیا میں قائم کردیں اور بُرائی سے نوعِ انسانی کے دلوں اور ہاتھوں کو روک دیں[1]۔

---

[1] قرآن پاک اعراف ۱۹؛ نساء ۲۳؛ حدید ۳؛ بقرہ و جمعہ ا؛

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ. (۲۲ : ۴۱)

جن کو خدا اگر زمین میں قوت عطا کرے تو عبادتِ الٰہی کریں مستحقین کی مالی اعانت کریں (زکوٰۃ)، لوگوں کو نیکیوں کی تاکید کریں، برائیوں سے روکیں انجام کار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں مذہب "شخصی نجات اور بہبودی" کے تنگ اور محدود دائرہ سے نکل کر سماجی فلاح و ترقی کا ایک محکم لائحہ عمل بن جاتا ہے اور یہی وہ خطرناک منزل بھی ہے جہاں مذہب تنگ نظر انسانوں کے ہاتھوں میں *Inquisition* اور محنہ[1] کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ ایک طرف ان کی شخصی زندگی میں اس کے اثرات واضح ہو جائیں تو دوسری طرف نظامِ حکومت پر بھی اس کے اثرات کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

کسی شخص کے مذہبی افکار و معتقدات کا مطالعہ جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ انسان کے کسی ظاہری عمل کا تجزیہ اس کی روح کی گہرائی تک رہبری نہیں کر سکتا۔ جذبات و احساسات کی دنیا تک پہنچنے میں کتنی ہی پُرپیچ وادیاں ہیں جو قطع کرنی پڑتی ہیں بعض اوقات تو اس جد و جہد میں علمِ نفسیات کو بھی اپنی درماندگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور "پائے مرا رفتار نیست" کہتے ہوئے ہی بن پڑتی ہے۔ متضاد کیفیات، اثرات اور مطالبات کے ہجوم میں انسانی فکر و عمل کے اصل محرکات کی نشاں دہی جوئے شیر لانے سے کم نہیں[2]۔

---

[1] وہ عیسائی قانونی عدالت جو رومن کیتھولک مذہب سے علیحدہ ہو جانے والے لوگوں کو سزائیں دیتی تھی Inquisition کے نام سے مشہور ہے۔ اسپین میں اس کا کام مظالم و بربریت کی ایک طویل داستان ہے۔ محنہ وہ عدالت تھی جو مامون الرشید نے ان لوگوں کو سزا دینے کے لیے قائم کی تھی جو اس کے مذہبی نظریات کو قبول نہیں کرتے تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبل اسی محنہ کے ظلم کے نشانہ بنے تھے۔ ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۱۳۱، نیز تاریخ عرب از ہتی ص ۴۳۰۔ [2] (صفحہ ۷ پر ملاحظہ ہو)

جب بادشاہوں کے مذہبی جذبات کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ دشواریاں اور بڑھ جاتی ہیں، اس لیے کہ ان کے اخلاقی ضابطے عوام سے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ وہ کبھی مذہب کا سہارا لے کر چلتے ہیں کبھی سیاست کو اپنا رہبر بناتے ہیں۔ اور کبھی "تا در بتکدہ در سایۂ ایماں رفتم" پر عمل کر گزرتے ہیں! فطرتِ انسانی کی یہی متضاد کیفیات ہیں جو تحلیل نفسی میں پیچیدگیاں پیدا کر دیتی ہیں

جب مسلمان بادشاہوں کے افکار و اعمال کے جائزے کا سوال اُٹھتا ہے تو دو پیمانے بے اختیار سامنے آجاتے ہیں۔ ایک اسلام کے ان اصولوں کا جن پر رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین نے عمل کیا تھا اور جن پر گو صدیاں بیت چکی تھیں لیکن مسلمانوں کے دینی اور سیاسی شعور میں اُن کی عظمت مسلم تھی[1]۔ اور دوسرا اُس دور کے مروجہ اخلاقی اور سماجی نظریات کا۔ پہلے زاویہ سے جب سلاطین کے افکار و اعمال پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ان کی صدہا خامیاں اُبھر آتی ہیں اور اُن کی زندگی کے بہت سے پہلو قابل ملامت و مذمت نظر آنے لگتے ہیں لیکن جب اُس عہد کے عام سیاسی ماحول میں اُن کے اعمال کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اُن کی اور ہی تصویر بنتی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب ہندوستان

(نوٹ صفحہ ۶) [1] سلطان محمد بن تغلق کی عقلیت پسندی کا ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ ہر چیز کو عقل کے پیمانے سے ناپتا ہے اور محل شاہی کے دروازے پر لوگ متعین ہیں کہ ہر داخل ہونے والے کو عقلیت کی تعلیم دیں دوسری طرف اس کی توہم پرستی کی یہ انتہا ہے کہ قطب الدین مبارک خلجی کے نامکمل مینار کو مکمل کرانا چاہتا ہے لیکن صرف اس لیے ہاتھ نہیں لگاتا کہ اس کو شروع کرانے کے بعد قطب الدین مارا گیا تھا اور یہ اس کے نزدیک ایک فالِ بد تھی! سلطان علاء الدین خلجی ایک طرف تو شریعت اور تقاضائے سیاست میں فرق کرتا ہے اور دوسری طرف اس کا یہ حال ہے کہ اپنے معاشی نظام میں بھی جو سیاسی ضروریات کی پیداوار ہے خدا کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے بوجھ کو شدت سے محسوس کرتا ہے! فیروز شاہ ایک طرف تو ہر معمولی معمولی بات میں شریعت کا خیال رکھتا ہے لیکن دوسری طرف خود وہ شراب نوشی کو ترک کرنے سے قاصر ہے

(نوٹ صفحہ ہذا) [1] خلافت راشدہ کے متعلق شاہ ولی اللہ کا یہ قول پیش نظر رہے:۔

"خلافت ایں بزرگواراں اصلی است از اصول دین تا وقتیکہ ایں اصل را محکم نگیرند ہیچ مسئلہ از مسائل شریعت محکم نشود" (ازالۃ الخفاء ص ۱)

ان بزرگوں کی خلافت اصول دین میں سے ہے جب تک اس جز کو مضبوطی سے نہ پکڑیں گے مسائل شریعہ میں سے کوئی مسئلہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔

سماجی امتیازات اور ذات پات کے جھگڑوں میں مبتلا تھا اور ہر شہر سماجی امتیاز کی ایک نشانی بنا ہوا تھا، اُنھوں نے ملک میں ایک سماجی انقلاب برپا کر دیا۔ جن شہروں میں کبھی پست اقوام کو بلا روک ٹوک چلنے پھرنے کی بھی اجازت نہ تھی اور جہاں غروبِ آفتاب کے بعد وہ قدم نہیں رکھ سکتے تھے، اُن کے جھونپڑے اعلیٰ اعلیٰ افسروں کے محلات کے پہلو بہ پہلو نظر آنے لگے! جہاں تعزیرات کا قانون ملک کے مختلف طبقوں کے لیے مختلف تھا، وہاں انھوں نے ایک قانونی ضابطہ قائم کر کے بڑے اور چھوٹے کے سارے امتیازات ختم کر دیے[۱]۔

یہ دو تصویریں جو دو مختلف پس منظر میں بنانی پڑتی ہیں، ایک مورخ کے لیے بڑی دشواری پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن بہر حال یہ دونوں پیمانے ہمارے لیے ناگزیر ہیں۔ ایک سے ان سلاطین کی جگہ تاریخِ اسلام میں متعین ہوتی ہے اور دوسرے سے تاریخِ عالم میں۔

زمانۂ حال کے بعض مورخین نے سلاطینِ دہلی کے مذہبی معتقدات اور ان کے بنائے ہوئے سیاسی اور معاشی اداروں کو مذہب اور قومیت کے موجودہ تصورات کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کی ہے۔ اور پھر کچھ مصنفین نے ان سلاطین کے تمام سیاسی اعمال و حرکات کو اس طرح پیش کیا ہے گویا اُن کی زندگی سر تا سر ایک مذہبی جذبہ کا نتیجہ تھی اور وہ ملک میں نہ صرف مذہب اسلام کے نمائندے کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ بلکہ ہندوستان میں اسلام کی نشر و اشاعت بھی تمام تر اُن ہی کی کوششوں کی رہینِ منت تھی۔ یہ غلط فہمیاں اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ ہم نے اُن کے فکری نظام کو ان کے ماحول کے آئینے میں نہیں دیکھا اور اُن کے موثرات کے عصری سرچشموں کا سُراغ نہیں لگایا۔—

سلطان محمود غزنوی کو مذہبی دیوانہ قرار دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ایران کی اُس

---

[۱] واضح رہے کہ التتمش اور بلبن نے ترک اور غیر ترک کے درمیان جو امتیازات کیے تھے ان کی نوعیت سیاسی تھی، سماجی نہیں تھی۔ علاوہ ازیں جو نظامِ عدل انھوں نے قائم کیا تھا اس کے سامنے ایک ترک امیر اور ایک معمولی فراش کی حیثیت یکساں تھی۔

نشاۃ ثانیہ کو سمجھ لیں جس نے فردوسی کے قلم[1] اور محمود کی تلوار کو گرمایا تھا! ہندوستان میں اس کی قتل و غارتگری کا مطالعہ کرتے وقت اگر ہماری نظر آگ اور خون کے اس ہنگامہ پر بھی رہے جو اُس نے مسلمانوں کے شہروں میں بپا کیا تھا، تو ہمارے نتائج شاید زیادہ معتبر ہو سکیں پھر اس کی فوجوں کو رضاکاروں کا ہجوم قرار دینے سے پہلے اس بات کو بھی ذہن میں رکھا جائے کہ اس کی فوج میں ہندو سپاہی اور جنرل بھی شامل تھے جو عروس البلاد غزنی میں پوری آزادی کے ساتھ اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے اور سنکھ بجاتے تھے اور اس بات کو نظر کے سامنے رکھا جائے کہ محمود کے ایک معاصر بزرگ قاضی ابو الحسن بولانی نے ہندوستانی مندروں سے حاصل کیا ہوا سونا ان الفاظ کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ

"برمن پوشیدہ است کہ آں غزوہا بر طریق سنت مصطفےٰ است علیہ السلام یا نہ"[2]	مجھ پر یہ بات واضح نہیں کہ آیا سلطان کی وہ جنگیں حضرت مصطفےٰ علیہ السلام کی سنت کے مطابق تھیں (بھی) یا نہیں

تو ہمیں سلطان محمود اور اس کے حملوں کے مقاصد کے تعین میں بڑی مدد ملے اسی طرح سلطان شہاب الدین محمد غوری کے حملوں کے مقاصد کی تلاش کرتے وقت اگر ہماری نظر غور کے سیاسی اور سماجی نظام اور دینی ماحول پر بھی رہے تو ہماری تحقیق میں زیادہ گہرائی پیدا ہو جائیگی۔ ——اس طرز سے مطالعہ کرنے میں ممکن ہے کہ بعض صورتیں ان خد و خال میں نظر نہ آئیں جن میں ہم انہیں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں لیکن تاریخ کا مطالعہ تو بہر حال یہی رہیگا کہ

---

[1] عربوں کی فتح ایران کو فردوسی ان الفاظ میں پیش کرتا ہے ؎

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاج کیاں را کنند آرزو — تفو باد بر چرخ گرداں تفو

نیز ملاحظہ ہو فردوسی کے نظریہ تاریخ پر گرونی بوم کا مضمون Islam : Grunebaum pp. 169-171 (London 1955)

[2] تاریخ آلِ سبکتگین۔ ص ۲۴۳ (مطبوعہ کلکتہ)

برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے رامی پرستند

اس سلسلہ میں ایک اور زبردست غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے بیشتر مورخین نے سلاطینِ دہلی اور حکمراں طبقے کے افکار و اعمال کے آئینہ میں پوری مسلم سوسائٹی کے ذہنی رجحانات اور قلبی کیفیات کو پڑھنے کی کوشش کی ہے، اور جو نقوش سیاسی تاریخوں کے مطالعہ نے ان کے ذہن میں اُبھارے ہیں اُن ہی خطوط کی مدد سے قرونِ وسطیٰ کی مسلمان سماج اور اس کے نظریات و افکار کے خاکے بنائے گئے ہیں۔ تاریخ پر اس سے بڑے ظلم کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ حکمراں طبقہ جن چیزوں کو اپنے لیے باعثِ فخر و مباہات سمجھتا تھا، مسلمانوں کے بعض اہم طبقے اُن کو اپنے لیے ننگ تصور کرتے تھے۔ جس وقت بلبن ایرانی نظریاتِ حکومت کو اپنے سینے سے لگائے ترک و غیر ترک کے امتیازات پر سیاسی نظام کی بُنیادیں استوار کر رہا تھا اور جب بقول خسروؒ "جمالِ سلطانی" کی تمنا حدودِ امکان سے باہر تھی۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے اپنے جماعت خانے کے دروازے ہر کس و ناکس کے لیے کھول دیے تھے اور رنگ و نسل، فقر و امارت کے سارے امتیازات کو اس طرح باطل کر دیا تھا کہ جب بلبن بھی وہاں حاضر ہوا تو بالکل اسی طرح جیسے ادنیٰ سے ادنیٰ اور غریب سے غریب انسان حاضر ہوتا تھا۔ جس وقت سلاطین کی رزم آرائیوں سے ملک میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا، مشائخ کی خانقاہیں محبت و مودت کے نغموں سے گونج رہی تھیں۔ اور ہندو جوگی اور مسلمان صوفی عالم علوی و سفلی پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے، اور تہذیب و تمدن کی ایک دوسری ہی عمارت کی تعمیر کا سامان بہم پہنچایا جا رہا تھا۔ سلاطین کشور کشائی میں مصروف تھے، اور صوفیہ اقلیمِ دل کی تسخیر میں۔ اُن کی خاموش زندگیاں زبانِ حال سے بادشاہوں سے کہہ رہی تھیں ؎

تفاوت ست میانِ شنیدنِ من و تو — تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ اس وقت تک شرمندۂ تفسیر و تعبیر نہیں ہو سکتی

جب تک یہ حقیقت پوری طرح ذہن نشین نہ کرلی جائے کہ سلاطین اور حکمراں طبقے کے رجحانات اور خواہشات پوری مسلم سوسائٹی کے خیالات وجذبات کی آئینہ داری نہیں کرتے۔

سلاطین کے مذہبی افکار وعقائد کا نشوونما

سلاطین دہلی کے مذہبی افکار وعقائد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ذہنی آب وہوا کا جائزہ لیا جائے جس میں ان کے اعتقاد کے پودوں نے پرورش پائی تھی اور ان حالات کو سمجھا جائے جن کے عمل اور ردعمل نے اُن کی زندگی کے مقاصد اور ان کی فکر ونظر کے انداز متعین کیے تھے۔

(۱) اس سلسلہ میں سب سے پہلے غور پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ غور ایک پہاڑی علاقہ تھا۔ منہاج السراج کا کہنا ہے کہ "راہ ہائے جملہ غور از بسیاری برف مسدود"[1] طبری، ابن اثیر، منہاج اور دیگر مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے صدرِ اول میں ہی یہ علاقہ مسلمانوں نے فتح کرلیا تھا، لیکن یہ فتح برائے نام تھی۔[2] یہاں کے جغرافیائی حالات کچھ ایسے حوصلہ شکن اور صبر آزما تھے کہ مسلمانوں کے کسی اہم ثقافتی اور تہذیبی مرکز سے اس کا رشتہ نہ جوڑا جا سکا۔ تمدنی زندگی کو بدلنے میں کامیابی تو کیا ہوتی، یہاں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار بھی پورے طور پر قائم نہ ہو سکا۔ ۴۰۱ھ مطابق ۱۰۱۱ء میں جب سلطان محمود غزنوی نے غور پر حملہ کیا تو بقول ابوالفضل بیہقی "کافرانِ پلید تر و قوی تر"[3] ہی سے اس کا واسطہ پڑا۔ بعد کو جب سلطان مسعود نے اس طرف کا رُخ کیا تو ملاعین[4] ہی سے جنگ ہوئی۔ جہاں

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۱۳؛ نیز ملاحظہ ہو حدود العالم (انگریزی ترجمہ ص ۱۱۰)؛ ابن حوقل اور اصطخری کے بیانات Bibl. Geog. Arab ii, 323, 329.

[2] تاریخ طبری (اردو ترجمہ) حصہ دوم جلد اول ص ۶۵، حصہ سوم جلد دوم ص ۱۲۷
کامل ابن اثیر حصہ دوم جلد پنجم ص ۳۵۳

[3] تاریخ آل سبکتگین ص ۱۲۷-۱۲۹ [4] ایضاً ص ۱۳۲-۱۲۹۔

تک تاریخ ہمارا ساتھ دیتی ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی کے وسط میں اس علاقہ میں اسلامی اثرات پھیلنے شروع ہوئے۔ اور یہ ٹھیک وہ زمانہ ہے جب خود اسلامی مرکزوں میں زوال و انحطاط کے اثرات پورے طور پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ گو ابھی سیل تاتار بغداد کی دیواروں سے آکر نہیں ٹکرایا تھا لیکن اخلاق و کردار کی ساری بُنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں۔ اور جس نظام کا سیاسی ڈھانچہ گرنے کے لیے ہلاکو کی آہنی ضرب کا منتظر تھا، اس کا سماجی اور اخلاقی جنازہ مدتوں پہلے نکل چکا تھا۔ بارہویں صدی میں جب غور یکا یک سیاسی افق پر نمودار ہوتا ہے تو ہم یہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد پاتے ہیں لیکن مسلمانوں کی یہ نئی آبادی فکر و نظر کی ان تمام کوتاہیوں کا شکار تھی جو دورِ انحطاط کا لازمی نتیجہ ہیں۔

اورل اسٹین (A. Stein) گوڈرڈ (Goddard) لی کاگ (Le Coq) اور دیگر ماہرینِ فن کی کوششوں سے غور اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں کی جو تمدنی تصویر ہم تک پہنچی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں مہایانہ بدھ مت کا اثر غالب تھا جب اسلامی اثرات یہاں پہنچے تو وہ بھی ایسے لوگوں کے ذریعہ جو غیر اسلامی تصورات سے پوری طرح سبکدوش نہیں ہو سکے تھے۔ غور کے مسلمانوں کی بیشتر تعداد کرامیہ فرقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس فرقہ کا بانی ابو عبداللہ محمد بن کرام (المتوفی ۲۵۵ھ) [۱] تھا۔ اس کا عقیدہ

---

[۱] کرامیہ فرقہ اور اس کے بانی کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے مندرجہ ذیل کتب سے رجوع کرنا چاہیے:-

ابن الاثیر: تاریخ الکامل (مطبوعہ مصر ۱۲۹۰ھ) ج ۷، ص ۷۷

ابی الفدا: البدایۃ والنہایۃ۔ جلد ۱۱ ص ۲۰

ابو الفرج عبدالحیی: شذرات الذہب فی اخبار من ذہب۔ جلد ۲ ص ۱۳۱

ابن حجر عسقلانی: لسان المیزان (حیدرآباد) ج ۵ ص ۵۶-۳۵۳

ابن تیمیہ: کتاب الایمان (قاہرہ) ص ۵۷

عبدالقاہر بغدادی: الفرق بین الفرق وبیان الفرقۃ الناجیۃ منہم فصل السابع (باقی بر صفحہ ۱۲)

تھا کہ ایمان کا انحصار صرف زبانی اقرار پر ہے۔ اس کے لیے عمل اور یقین کی ضرورت نہیں۔ خدا کا جسم ہے بالکل اسی طرح جیسے انسانوں کا ہوتا ہے اور عرش کے اوپر اس کی ایک مخصوص جگہ ہے۔ تشبیہ و تجسیم کے ان خیالات کو محمد بن کرام نے اپنی ایک کتاب عذاب القبر میں تفصیل سے بیان کیا تھا۔ یہ خیالات اور عقائد اُن علاقوں میں بہت کامیاب ثابت ہوئے جہاں لوگوں کے مذہبی شعور نے مہایانہ بدھ مت کے زیر اثر نشوونما پایا تھا۔ اس لیے کہ فکری اعتبار سے تبدیلی کی نوعیت بہت ہی محدود تھی۔ جس طرح پہلے مہاتما بدھ کنول پر بیٹھا تھا۔ اب اللہ اسی طرح عرش پر بٹھا دیا گیا۔ اصل میں کرامیہ فرقہ، اسلام اور بدھ مت کی ایک درمیانی منزل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ محمد بن کرام نے ہزاروں غیر مسلموں کو اپنے فرقہ میں شامل کر لیا تھا۔ محمد بن کرام کے خیالات کی فلسفیانہ توجیہ کچھ بھی ہو لیکن اس کے غیر اسلامی عناصر بالکل واضح ہیں۔

سلطان شہاب الدین محمد غوری اور اس کا بڑا بھائی سلطان غیاث الدین ابتدا میں اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ منہاج السراج کا بیان ہے:-

دراول حال آں ہر دو برادر نور اللہ مرقدہما بر طریق مذہب کرامیاں بود، بحکم اسلاف و بلاد خود[1]	ابتدا میں وہ دونوں بھائی (نور اللہ مرقدہما) اپنے اسلاف اور اس علاقے کے بسنے والوں کی طرح کرامیہ مذہب میں اعتقاد رکھتے تھے۔

(بقیہ نوٹ ص ۱۲)

امام ابوالحسن اشعری: مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین (استنبول) ج ۱ ص ۱۴۱

امام رازی: اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین (قاہرہ ۱۳۵۶ھ) ص ۶۷

امام رازی: اساس التقدیس (قاہرہ ۱۳۲۸ھ) ص ۹۶-۹۸

عبدالکریم شہرستانی: کتاب الملل والنحل (لندن ۱۸۴۶ء) ص ۸۵-۹۹۔

علاء الدین ابوالمظفر شاہفور اسفرائینی: التبصیر فی الدین وتمیز الفرقۃ الناجیۃ عن الفرق الہالکین (قاہرہ ۱۳۵۹ھ) ص ۶۵-۷۰

تقی الدین مقریزی: خطط المقریزیہ (مصر ۱۳۲۶ھ) ج ۴ ص ۱۷۰

ابن حزم: کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل (قاہرہ ۱۳۲۰ھ) جلد ۳ صفحہ ۱۸۸-۱۹۰

تاج الدین سبکی: طبقات الشافعیۃ الکبریٰ (قاہرہ ۱۳۲۴ھ) ج ۲ صفحہ ۵۲-۵۳۔

احمد تیمور پاشا: ضبط الاعلام (قاہرہ ۱۳۴۶ھ) ص ۱۳۳-۱۳۱

(صفحہ ہذا) [1] طبقات ناصری ص ۷۷۔

بعد کو سلطان شہاب الدین نے حنفی مذہب اور غیاث الدین نے شافعی مذہب اختیار کرلیا۔اس کا سبب منہاج نے یہ بتایا ہے :-

"اما سلطان معزالدین چوں تخت غزنیں نشست و اہل آں شہر و مملکت بر مذہب امام اعظم ابوحنیفہ کوفی رحمۃ اللہ بودند، بموافقت ایشاں مذہب ابی حنیفہ رحمۃ اللہ اختیار کرد" [۱]	لیکن جب سلطان معزالدین، غزنیں کے تخت پر بیٹھا اور دیکھا کہ باشندگان غزنیں اور مملکت کے دوسرے حصوں میں بسنے والے امام ابوحنیفہ کے مذہب پر ہیں تو اس نے بھی ان کی موافقت میں مذہب ابوحنیفہ رح اختیار کرلیا۔

گویا مذہبی اعتقادات بھی ضروریاتِ ملک و سیاست کے تابع تھے۔غیاث الدین کے شافعی مذہب اختیار کرنے کا واقعہ زیادہ دلچسپ تھا۔اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اور قاضی سعید وحیدالدین محمد مروزی امام شافعی کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔اگلے دن اس نے قاضی صاحب کو تذکیر کے لیے بلایا تو انہوں نے بھی وہی خواب بیان کیا۔سلطان بہت متاثر ہوا اور اس نے شافعی مذہب اختیار کرلیا۔علماء کرامیہ کو یہ بات بے حد ناگوار ہوئی، اور ان کے ایک امام صدرالدین علی ہیصم نیشاپوری نے ایک قطعہ لکھ کر غیاث الدین کو بھیجا۔اس کے مندرجہ ذیل اشعار قابل غور ہیں ؎

در خراساں خواجہ گونہ شافعی بسیار بود ۔۔۔ بر در ہر خسروے اے خسرو صاحب نشاں
لیکن اندر ہفت کشور بادشاہِ شافعی ۔۔۔ بہتر کہ معلوم کن تا ہیچکس دارد نشاں
در کسے گوید خلیفہ شافعی مذہب بود ۔۔۔ حاش للہ ہیچ زیرک را نباشد ایں گماں
پس تو باری چوں پدر را خواستی کردن خلاف ۔۔۔ چوں نرفتی بر شعار و راہِ دیگر خسرواں
شافعی و بوحنیفہ واللہ ایں خواہند گفت ۔۔۔ خوب نبوشے بے سبب ما را دریں دین بے زیاں [۲]

ان واقعات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں ہندوستان میں مسلمانوں کا

---

[۱] طبقات ناصری، ص ،، [۲] ایضاً ص ۸۰۷-۹، (باقی بر صفحہ ۱۵)

سیاسی اقتدار قائم ہوا وہ کس ذہنی موسم کی پیداوار تھے۔

(۲) دہلی کے بیشتر سلاطین ترکی النسل تھے یا افغان، ایبک، التمش اور بلبن کے اجداد کے مذہبی حالات کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں ہے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ بہت سے اور ترکوں کی طرح جو غلامی کی حالت میں خرید کر لائے گئے تھے، یہ تینوں بھی ایسے قبائل سے متعلق تھے جنھوں نے یا تو اسلام قبول ہی نہیں کیا تھا اور اگر قبول کر بھی لیا تھا تو اس پر کچھ زیادہ عرصہ نہ بیتا تھا۔ جن علاقوں سے یہ ترک غلام مسلمانوں کے شہروں میں لا کر فروخت کیے جاتے تھے اُن کے ماحول کا اندازہ فخر مدبر کی تاریخ کے اُن چند صفحات سے لگایا جا سکتا ہے جس میں اُس نے ترک قبائل کے رسم و رواج، عام سماجی حالات اور مذہبی معتقدات سے بحث کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کے بیشتر قبائل ابھی تمدن و حضارت سے آشنا نہ ہوئے تھے اور اُن میں جہالت کی بہت سی رسمیں اب تک جاری تھیں[۱]۔ یہی حال افغانوں کا تھا اُن کے بڑے بڑے شہروں میں گو اسلام تھا لیکن بہت سے افغان قبیلے ابھی اسلام سے ناآشنا تھے اور کافر سمجھے جاتے تھے[۲]۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:-

"اس حقیقت سے ہم کو واقف ہونا چاہیے تھا کہ ترک فاتح جو ہندوستان آئے خاص خاص افسروں یا عہدہ داروں کو چھوڑ کر قوم کی مجموعی حیثیت سے وہ اسلام کے نمائندے نہ تھے اور نہ اُن کے اصولِ سلطنت کو اسلام کی طرزِ حکومت اور اصولِ فرمانروائی سے کوئی مناسبت تھی۔ اُن کے ترک افسر زیادہ تر نومسلم غلام تھے جن کو اسلام کی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴) کامل ابن اثیر نے ۵۹۵ھ کے حوادث میں لکھا ہے:- "اسی سال غیاث الدین صاحب غزنہ اور بعض باشندگانِ خراسان مذہب کرامیہ کی تقلید ترک کر کے شافعی المذہب ہو گئے اور اس کا سبب یہ تھا کہ غیاث الدین کی مصاحبت میں ایک شخص فخر مبارک شاہ نامی تھا.... اس نے شیخ وجیہ الدین ابوالفتح محمد بن محمود المروزی الفقیہ الشافعی کو غیاث الدین کی خدمت میں پیش کیا جنھوں نے اس کے سامنے مذہب شافعی کے محاسن بیان کر کے مذہب کرامیہ کے نقائص ظاہر کیے جس سے متاثر ہو کر اس نے مذہب شافعی کو قبول کر لیا۔ پھر شوافع کے لیے مدارس قائم کیے"[۳]۔

(نوٹ صفحہ ہذا) [۱] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۳۹-۴۲ [۲] ... [۳] ابن اثیر جلد ۹ ص ۲۱۸۔

صلح و جنگ کے قوانین سے شاید واقفیت بھی نہ تھی ..... ترک قبائل کا یہ حال تھا کہ بیشتر مسلمان نہ تھے وہ غلاموں کی حیثیت سے ہزارہا کی تعداد میں فروخت ہوتے تھے اور سلاطین اور امراء ان کو خرید کر اور مسلمان بنا کر فوج میں بھرتی کرتے تھے یا وہ خود لوٹ مار کے شوق میں وسط ایشیا سے نکل کر اسلامی ممالک میں آتے تھے اور مسلمان ہو کر مختلف بادشاہوں اور امیروں کی فوج میں بھرتی ہوتے تھے اور آگے چل کر بڑے بڑے افسر ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ بادشاہ بن جاتے تھے۔ الپتگین اور سبکتگین جو اس غزنوی سلطنت کے بانی تھے، اسی قسم کے ترک غلام تھے سلطان غوری کے جانشین التمش وغیرہ بھی ایسے ہی تھے ..... ان کے علاوہ غوری قبائل چوتھی صدی کے وسط تک یعنی غزنویوں کی پیدائش کے بعد تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ پھر سلطان محمود سے پہلے اس وقت تک ان اطراف میں نہ اسلامی درسگاہیں تھیں، نہ اسلامی تعلیمات کا رواج ہوا تھا اور نہ مسلمان علماء پھیلے تھے[1]

(۳) سلاطینِ دہلی کے فکر و عمل میں ایرانی عنصر بہت غالب تھا۔ ان کی حکمرانی کے نظریے[2] نظامِ مملکت کے اصول، دربار کے آداب و رسوم[3]، لباس و لوازم شاہی، محلات کا ماحول خواجہ سراؤں، غلاموں، حاجبوں کی تربیت، سب[4] ساسانی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ایک طرف اگر ان کے عیش و نشاط کی محفلیں[5] بہرام، پرویز اور جمشید کی محفلوں کی یاد تازہ

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۹۰-۱۸۷۔

[2] ملاحظہ ہو برنی کی تاریخ فیروز شاہی - ص ۳۳ - ۳۵، اور فتاوائے جہانداری؛ قران السعدین ص ۲۳

[3] تاریخ فیروز شاہی - برنی ص ۲۵؛ ۱۴۲؛ عجائب الاسفار ج ۲ ص ۲۳؛ مثلاً پابوس کی رسم۔ ملاحظہ ہو برنی ص ۳۸، ۱۴۲، ۲۹۵ - عفیف ص ۴۳۔

[4] برنی ص ۳۰، ۳۱۔

[5] مثلاً نوروز کا جشن، برنی ص ۱۱۳ - امیر خسرو نے متعدد قصائد میں اس کا ذکر کیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو عفیف ص ۳۶۰۔

کرتی تھیں تو دوسری طرف اُن کی رزمی زندگی اور اُن کے آئین جنگ اور ترتیب فوج میں ساسانی نقشہ نظر آتا تھا۔[1] ایرانی نشاۃ ثانیہ نے اُن کے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ اُن کا یہ عقیدہ ہوگیا تھا کہ حکمرانی بغیر ایرانی ماحول پیدا کیے ممکن ہی نہیں۔ بلبن جس نے تخت نشینی سے پہلے اپنے بیٹوں کے نام محمد اور محمود رکھے تھے، تخت نشینی کے بعد اپنے پوتوں کے نام کیقباد کیخسرو، کیکاؤس، کیمرث رکھنے پر مجبور ہوگیا۔ مشہور ہے کہ سلمان فارسیؓ سے جب اُن کے نسب کے متعلق پوچھا گیا تو اُنھوں نے جواب دیا: "سلمان بن اسلام"[2] لیکن اگر کوئی سلاطین دہلی سے وہی سوال کر لیتا تو وہ اپنے مسلمان ہونے پر نہیں بلکہ "آل افراسیاب" ہونے پر اپنے فخر کا اظہار کرتے[3]۔ حاکم و محکوم کا وہ فرق جس پر بلبن ہمیشہ زور دیتا رہا۔ اسلام سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا، بلکہ یہ ایران کے طبقاتی نظام کی صدائے بازگشت تھی جو ہندوستان کے ماحول میں اس قدر گونج اٹھی تھی۔ التیمش اپنی ذاتی زندگی میں بے حد مذہبی تھا، لیکن وہ بھی شریف و رذیل، ترک و غیر ترک کے غیر اسلامی امتیازات کو ہمیشہ ضروری سمجھتا رہا۔ سید نورالدین مبارک غزنویؒ نے اس کے دربار میں علانیہ کہا تھا:

"ہرچہ بادشاہاں از لوازم امور پادشاہی	بادشاہ جو کچھ بادشاہی کے لوازم سمجھ کر کرتے
می کنند و طریقہ کہ طعام و شراب می خورند	ہیں، جس طریقہ سے وہ کھاتے پیتے ہیں، جو
و جامہ می پوشند و شکلے کہ می نشینند و می	کپڑے پہنتے ہیں، جس انداز سے وہ بیٹھتے،
خیزند و سوار می شوند و در حالت نشستن	اُٹھتے اور سواری کرتے ہیں اور تخت پر بیٹھ کر
تخت خلق را پیش خود می نشانند و سجدہ	جس طرح لوگوں کو اپنے سامنے بٹھاتے اور سجدہ
می کنانند و رسم اکاسرۂ باغی و طاغی خدا	کراتے ہیں اور جس طرح خدا کے باغیوں کے مراسم

[1] آئین جنگ پر اس عہد کی سب سے اہم کتاب فخر مدبر کی آداب الحرب والشجاعت ہے۔ یہ کتاب سلطان التتمش کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ ہمارے عزیز دوست عبدالوحید صاحب قریشی اس کتاب کو مختلف نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس میں ساسانی آئین جنگ کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ [2] تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد ص ۲۵ [3] تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۳۷

...با دل و جاں مراعات می نمایند و با بندگان خدا در جمیع معاملات خود تفرد می ورزند بر خلاف مصطفیٰ است و اشراک است"۔[1]

کی دل و جان سے رعایت کرتے ہیں اور جس طرح بندگان خدا سے اپنے آپ کو سب معاملات میں برتر سمجھتے ہیں۔ یہ سب باتیں سنت مصطفیٰ کے خلاف ہیں اور شرک ہیں۔

سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاںؒ نے بادشاہوں کی اس رسم کو کہ

"نان سوئے یکے پرتاب می کنند و مرداں از طعام بر می خیزند و سلام می کنند"

روٹی لوگوں کی طرف زور سے پھینکتے ہیں اور لوگ کھانا کھاتے ہیں کھڑے ہوتے اور آداب بجالاتے ہیں۔

بدعت و نامشروع بتایا۔ اور ان کے کپڑے پہننے کے وقت کی قربانی کو حرام قرار دیا۔[2]

(۴) ہندوستان میں سلاطین کا مذہبی احساس و شعور مختلف سماجی قوتوں کے عمل اور ردعمل سے بھی متاثر ہوا تھا۔ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کے معاشرہ کی خشتِ اول تو وہ مسلمان تھے جو غوریوں کے سیاسی تسلط سے قبل مختلف شہروں میں آباد ہو گئے تھے بعد کو منگولوں کے حملوں کے باعث صدہا مسلمان پناہ گزینوں کی حیثیت سے ہندوستان آئے۔ یہ مسلمان جن علاقوں سے آئے تھے اُن میں گو زوال و انحطاط کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں لیکن یہ سب لوگ آگ اور خون کے ایک ایسے سنگم سے گزرے تھے جس نے اُن کو زندگی کے حقائق پر غور کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان میں بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی صلاحیتیں حکومت وقت کے حوالہ کر دیں تاکہ دہلی اس موجِ خون سے بچ جائے جس نے مسلمانوں کے صدہا شہروں کو ویرانہ کر دیا تھا۔ کچھ ایسے تھے جن کی نظر میں اب سیاسی اقتدار کی دلفریبی سراب سے زیادہ نہ رہی تھی[3] وہ اپنا وقت عبادت الٰہی اور خلق خدا کی بہبود میں گزارنا چاہتے تھے۔ بہت سے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۴۰۔

[2] ملفوظات حضرت مخدوم جہانیاں (قلمی نسخہ) ص ۱۹-الف، ۲۰ ب ۲۱-الف

[3] مولانا ضیاء الدین نخشبیؒ نے اسی کیفیت کے زیر اثر لکھا تھا۔

(باقی بر ص ۱۹)

ایسے بھی تھے جن کو سیل تاتار نے اتنا بدحواس کر دیا تھا کہ وہ اب کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہے تھے۔ اور اپنی پُرغم زندگی کا بوجھ صرف اس لیے اُٹھائے ہوئے تھے کہ اس کو پھینک دینا ممکن نہ تھا — ایک طرف مسلمانوں کے یہ طبقے تھے، دوسری طرف ترک فاتح تھے جو جہانگیری وجہانبانی کے پورے عزم اور جوش کے ساتھ اپنی حکومت کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے بےچین تھے۔ ظاہر ہے کہ اس مسلم سماج کے مختلف طبقوں کے مطالبات بھی مختلف تھے۔ پھر دوسری طرف ہندوؤں کے مختلف طبقات تھے — ایک طبقہ جس کے ہاتھ سے زمامِ حکومت چھنی تھی یہ سوچ رہا تھا کہ اس نئی عمارت کی کونسی ٹیڑھی اینٹ کو نکالا جائے کہ پوری عمارت منہدم ہو جائے۔ پھر کچھ پست اقوام تھیں جو عرصہ تک چھوت چھات اور طبقاتی امتیازات کا شکار رہی تھیں لیکن جن کی حیثیت نئے سماجی نظام میں بدل گئی تھی اور جن کے لیے یہ بات بڑے فخر کا باعث تھی کہ نئی حکومت نے ان کی ساری سماجی پابندیوں کو ختم کر کے اُن کو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے برابر تسلیم کر لیا ہے — ان سب طبقات کی ذہنی کیفیت اور مطالبات کی نوعیت مختلف تھی اور سلاطین شعوری اور غیر شعوری طور پر ان مختلف محرکات کے عمل و ردعمل سے متاثر ہوتے تھے۔

(۵) سب سے پہلے حکمراں طبقہ کو لیجیے۔ یہ طبقہ سلطان سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ حکومت کے سب اعلیٰ مناصب ان ہی کے لیے مخصوص کر دے۔ ابتدائی دور میں یہ طبقہ ترکوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ ترک امراء وحکام کسی غیر ترک کو خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو حکومت کے اعلیٰ مناصب پر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر ترک امیر اپنی طاقت کے استحکام کے لیے یہ کوشش کرتا تھا کہ مسلمانوں کے با اثر طبقات کی زیادہ سے زیادہ ہمدردیاں حاصل کرے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸)

آنکہ ویرانی جہاں زیداست — خشت بر خشت ہیچ گر نہ نہد

جن حالات میں نخشبی ہندوستان آئے تھے اُن کی جو ذہنی کیفیت تھی اس کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون مطبوعہ برہان۔ نومبر ۱۹۵۱ء ص ۲۶-۱۷۔

تاکہ سلطان سے اپنی حیثیت کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر منوا سکے۔ یہ ترک امیر مسجدیں بنواتے تھے، امام مقرر کرتے تھے[1] قرآن خواں ملازم رکھتے تھے[2] اور مقصد یہی ہوتا تھا کہ اس طرح وہ عوام کا اعتماد و تعاون حاصل کرلیں۔ سلاطین کو اپنا تاج و تخت برقرار رکھنے کے لیے جس طبقہ کا سب سے زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا وہ یہی تھا۔ علاء الدین خلجی نے اس طبقہ کی طاقت کو کم کر دیا تھا لیکن بعد کو پھر یہ امراء تمام کشمکشوں اور باہمی آویزشوں کے ساتھ ابھر آئے۔ عہدِ تغلق میں ملکی اور غیر ملکی امراء میں کشاکش شروع ہوئی اور ان کے اختلافات نے عام فضا کو مکدر کر دیا۔ بہرحال اس طبقہ کا رویہ یہ تھا کہ اگر بادشاہ اُن کے اختیارات و حقوق کو تسلیم کرتا رہے تو وہ ہر شرعی اور غیر شرعی کام میں اس کے ممد و معاون تھے۔ وہ اقتدار و اختیار کی تمنا رکھتے تھے اور بادشاہ کو جس رنگ میں دیکھتے تھے، اسی میں خود بھی رنگ جاتے تھے۔ یہی وہ طبقہ تھا جس کے متعلق "الناس علیٰ دین ملوکھم" کہا جا سکتا تھا۔ علاء الدین خلجی جس تقویت پر نئے مذہب کی داغ بیل ڈالنے پر آمادہ ہو گیا تھا وہ اس کے چار امیر الغ خاں، ظفر خاں، نصرت خاں اور الپ خاں ہی تھے۔ چنانچہ کہا کرتا تھا:

"اگر من بخواہم از قوت ایں چہار یار دینے | اگر میں چاہوں تو ان چار یاروں کی مدد سے
و مذہبے دیگر پیدا کنم"[3] | ایک نیا مذہب قائم کر سکتا ہوں۔

(۶) پھر علماء کے دو طبقے تھے۔ علماء دیندار اور علماء دنیوی۔ پہلا طبقہ اپنی حریت فکر و ضمیر کو قائم رکھنے کے لیے حکومت وقت سے بے تعلق رہتا تھا[4] لیکن جب وقت کا مطالبہ ہوتا تو

---

[1] فوائد الفواد ص ۷۸-۷۹ [2] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۱۱۷-۱۱۸۔ [3] ایضاً ص ۲۶۳

[4] مولانا علاء الدین اصولی، مولانا دولت یار، مولانا برہان الدین نسفی، مولانا شادی مقری وغیرہ کا شمار اس طبقہ میں کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ ان بزرگوں کا حال کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مجلسوں میں کہیں کہیں ان کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۱۵۸-۱۶۵ وغیرہ۔

پوری بے باکی اور جرأت کے ساتھ اظہارِ رائے کرتا تھا۔ دوسرا طبقہ اُن علماء کا تھا جو سلاطینِ وقت سے منسلک ہوجاتے تھے اور حُبِّ جاہ و زر میں اُن کے ہر عمل پر مُہرِ توثیق ثبت کرتے رہتے تھے[1]۔ بلبن کہا کرتا تھا:

"علماء بر دو نوع اند۔ علماء آخرت کہ خدائے ایشاں را از دنیا و محبت دنیا و حرص دنیا نگاہ می دارد، و علماء دنیا اند کہ ایشاں از حرص و دوستی دنیا و طمع دنیا ہمچو سگ تاختہ و پاسوختہ در سراہا می روند، قصا و بلاو حیلہ و تاویلہا زیاں کار، پیشہ و حرفت ایشاں باشد۔ بادشاہ بینا و دین دار اورا تواں گفت کہ بگفت علماء دنیا کارے نکند..... احکام شرع مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بعلماء حوالہ کند کہ رو از دنیا گردانیدہ باشد و تنکہ و جیتل ایشاں را ہمچو مار و کژدم نماید"[2]

علماء دو طرح کے ہیں۔ ایک علماء آخرت جنہیں اللہ تعالیٰ دنیا اور اس کی حرص اور محبت سے محفوظ رکھتا ہے۔ دوسرے علماء دنیا، جو دنیا کی حرص اور دوستی سے مغلوب ہوکر بیر جلے کتے کی طرح محلات میں بھاگے پھرتے ہیں۔ حیلے بہانے اور نقصان دہ تاویلات ان کی حرفت اور پیشہ بن جاتی ہیں۔ سمجھ دار اور دیندار بادشاہ وہ ہے جو علماء دنیا کے کہنے پر عمل نہ کرے..... (بلکہ) شریعت مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام (کا نفاذ) ان علماء کے حوالے کرے جنہوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا ہو اور جن کی نظر میں روپیہ پیسہ سانپ اور بچھو کی حیثیت رکھتا ہو۔

---

[1] امام غزالیؒ، مجدد الف ثانیؒ اور دیگر اکابرین نے ان علماء کی شدید مذمت کی ہے۔ امام صاحبؒ کا خیال تھا کہ "سلاطین کی حالت اس وجہ سے بگڑی کہ علماء کی حالت بگڑ گئی۔ اور علماء کی خرابی اس وجہ سے ہے کہ جاہ و مال کی محبت نے اُن کے دلوں کو چھا لیا ہے" ملاحظہ ہو۔ الغزالی ص ۲۲۱۔
عام طور پر علماء کا درباریوں کی طرح سلاطین سے ربط ضبط بڑھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ فخر مدبر لکھتا ہے:
"بہترین امیران و پادشاہاں آں کسانے اند کہ بر در علماء روند و بدترین عالماں کسانے اند کہ بر در امیران و پادشاہاں روند" تاریخ فخر الدین مبارک شاہ۔ ص ۱۵۔

[2] برنی: تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۱۵۴۔ ۱۵۵۔

مولانا منہاج السراج، شیخ الاسلام نجم الدین صغری، حسام درویش وغیرہ وہ علماء تھے جنہوں نے درباداری کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا اور حُبِّ جاہ میں گرفتار ہو کر اپنے فرائض کو بالکل بھول گئے تھے۔ مولانا نور ترک نے اسی قبیل کے علماء کو ناجی اور مرجی ہونے کے طعنے دیئے تھے[۱]۔ ایسے ہی علماء نے کیقباد کو نماز اور روزہ چھوڑنے کی شرعی رخصت دیدی تھی! امیر خسرو ان علماء دنیادار کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

حیلہ گرانے کہ مظالم کنند — شرع نبی سخرۂ ظالم کنند
ہرزۂ شہ را دم نعماں دہند — کفر ملک را لقب ایماں دہند
وانچہ کہ شہ کار پریشاں کند — آنہمہ از رخصتِ ایشاں کند
او فگند مال کساں در مغاک — شاں ہمہ گویند حلال ست و پاک[۲]

پھر فرماتے ہیں ؎

علم نہ علم ست برارباب جاہ — جادوے ہست از پے تسخیر شاہ

ایک طرف یہ علماء سو تھے جن کے اثرات سلاطین کو گمراہی کی طرف لے جا رہے تھے۔ دوسری طرف علماء آخرت کا وہ گروہ تھا جو حق گوئی کو دینی خدمت سمجھتا تھا اور سلاطین کے غیر شرعی اعمال و طرز زندگی پر تنقید کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا تھا۔ قاضی وجیہ الدین کاشانی، سید نور الدین مبارک غزنوی، قاضی مغیث، مولانا عبداللہ وغیرہم ایسی ہی حریت فکر و ضمیر کے مالک تھے اور جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کے اظہار میں تامل نہیں کرتے تھے۔ ان علماء کی تنقیدیں آئندہ صفحات میں نظر سے گزرینگی۔

افکار و نظریات کے اعتبار سے علماء کے مختلف گروہ تھے اور جس چیز کو وہ زیادہ اہم سمجھتے تھے اسی کی طرف سلطان کو بھی توجہ دلاتے تھے۔ اُن کے بعض مطالبات دوسرے طبقوں کی خواہشات سے ٹکراتے تھے اور ایسی صورت میں سلطان کے دماغ میں کشمکش پیدا ہو جانا

---

[۱] طبقات ناصری۔ ص ۱۸۹۔ [۲] مطلع الانوار۔ ص ۶۹۔

لازمی امر تھا۔ مثلاً علماء کے ایک طبقہ کا فیصلہ یہ تھا کہ درباری زندگی کی ہر تفصیل شرک ہے اور اس کو ختم کر دینا چاہیے۔ دوسری طرف ترک خانوں کی خواہش تھی کہ ان کو عام لوگوں سے اونچا مرتبہ ملے[1] اور تمام وہ ایرانی رسوم جاری رہیں جن میں طبقاتی برتری کے جذبات کارفرما ہیں۔ کچھ علماء حکومت وقت سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ہندوؤں کو ذمیوں کے حقوق نہ دیے جائیں لیکن مسلمانوں کا ایک اور طبقہ اس خیال کی تائید میں نہیں تھا اور ہندوؤں سے سماجی ربط ضبط بڑھا رہا تھا۔ پھر کچھ فقہاء سلاطین سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ صوفیہ کو سماع سے روکا جائے، لیکن دوسری طرف صوفیہ کے ہم خیال عوام و خواص اس مداخلت کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ پھر ضیاء الدین برنی اور اس کے ہم خیال علماء یہ چاہتے تھے کہ سلاطین فلاسفہ کی صحبت سے نہ صرف پرہیز کریں بلکہ اُن کو شہر سے نکال باہر کریں ـــ ان متصادم نظریات و افکار کے ہجوم میں سلاطین کو اپنے مذہبی رجحان کا تعین کرنا پڑتا تھا۔

(۷) سلاطین کے مذہبی افکار پر مشائخ کے اثرات بھی فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ ان بزرگوں نے اپنی خاموش زندگی اور بے لوث خدمتِ خلق سے عوام و خواص سب ہی کو متاثر کیا تھا۔ ان کے اثرات مختلف نوع کے تھے۔ بعض صورتوں میں یہ اثرات براہِ راست تعلقات سے پیدا ہوئے۔ مثلاً التتمش اور بلبن نے اپنے عہد کے مشائخ سے عقیدتمندانہ تعلقات رکھے اور ان کے کچھ اثرات بھی قبول کیے۔ بعض سلاطین بلا واسطہ ان بزرگوں سے متاثر ہوئے۔ مثلاً علاء الدین خلجی، کہ گو وہ خود کبھی شیخ نظام الدین اولیاء سے نہیں ملا لیکن درباریوں کے ذریعہ اُن کی تعلیم اور ان کے اثرات اس تک پہنچتے رہے۔ پھر اگر کبھی بادشاہوں

---

[1] بلبن کو جب غلام کی حیثیت سے خرید کر التتمش نے شاہی اصطبل میں نوکری دی تو ترکوں نے اظہار ناراضگی کیا اور کہا:-

"کہ شاہا چو دولت بہ ترکاں رسید | سر رایتِ شاں بہ کیواں رسید
کنوں حیف باشد دریں تخت گاہ | کہ ترکے کند خدمتِ پائگاہ"

فتوح السلاطین (مدراس ایڈیشن) ص ۱۲۳

کی حالت "نوار اتیع ترجی ن" کا مطالبہ کرتی تو کچھ مشایخ اس خطرناک خدمت کو انجام دینے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح، شیخ فخر الدین زرادی رح، شیخ قطب الدین منور رح وغیرہم نے ایسا ہی رویہ اختیار کیا تھا۔

جس دور کے سلاطین کے مذہبی رجحانات کا ہم مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اس میں دو روحانی سلسلے ہندوستان میں قائم ہوئے تھے: سہروردیہ اور چشتیہ۔ بعد کو فردوسی سلسلہ بہار میں قائم ہو گیا تھا لیکن اس زمانہ میں شمالی ہندوستان پر اس کے اثرات بہت محدود رہے۔ سلاطین سے ربط ضبط کے معاملہ میں چشتی اور سہروردی مشایخ کے مسلک میں بڑا اختلاف تھا۔ سہروردی مشایخ سلاطین سے کافی میل جول رکھتے تھے اور شاہی مناصب اور جاگیروں کو بھی قبول کر لیتے تھے۔ چشتی بزرگوں کا خیال یہ تھا کہ دربار سے تعلق روحانی زندگی کی سعادتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ اور اس بنا پر وہ سلاطین اور حکومتِ وقت سے اپنا دامن بچاتے تھے[1]۔ بہر حال مسلک کے اس اختلاف نے ان دونوں سلسلوں کے مشایخ کی زندگیوں اور خانقہی نظام میں بڑا زبردست فرق پیدا کر دیا تھا، اور سلاطین بھی اس فرق کو کچھ تکلیف کے ساتھ محسوس کرنے لگے تھے۔ شیخ رکن الدین سہروردی رح سلطان سے ملنے کے لیے ملتان سے دہلی تشریف لاتے تھے[2]۔ اور شیخ نظام الدین اولیاء رح دہلی میں ہوتے ہوئے بھی کبھی دربار میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ممکن ہو کہ اس بات کو دہلی کے اور بادشاہوں نے بھی محسوس کیا ہو، لیکن مبارک خلجی اس پر اپنے غصہ کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا[3]۔ پھر ایک طرف شیخ رکن الدین رح کا یہ اصول تھا کہ کسی شخص کو اس وقت تک اپنی خانقاہ میں نہ ٹھہراتے تھے جب تک والیِ ملتان سے اجازت حاصل نہ کر لیں[4]۔ دوسری طرف اُن کے ہم عصر چشتی

---

[1] ان دونوں سلسلوں کے حکومت وقت سے تعلقات پر، ملاحظہ ہو خاکسار کے مضامین مطبوعہ اسلامک کلچر (حیدر آباد) ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۰ء

[2] سیر العارفین ص ۷۵۔

[3] سیر العارفین ص ۱۴۲، ۱۴۳، ۷۵۔

[4] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۱۴۴۔

بزرگ شیخ علاء الدین اجودھنیؒ کا یہ حال تھا کہ اگر دربار سے آنے والے کسی شیخ سے مجبوراً معانقہ کرنا پڑ جاتا تو کپڑے بدلتے تھے[1] اور ان کے رعب کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی مجرم بھی ان کی خانقاہ میں پناہ لے لیتا تو بادشاہ کو بھی یہ ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کو زبردستی وہاں سے نکال سکے۔ سلاطین سے اپنے اپنے طرز عمل کا نتیجہ دونوں سلسلوں کو بھگتنا پڑا۔ ایک طرف اگر سہروردیوں کے دربار سے تعلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی خانقہی آزادی ختم ہوگئی اور سلطان سجادہ نشینی تک میں دخیل ہوگیا[2] تو دوسری طرف چشتیوں کی سلطان سے بے تعلقی اور درباری زندگی سے نفرت کا رد عمل یہ ہوا کہ محمد بن تغلق نے جبراً ان کو خانقاہوں سے نکال کر سرکاری عہدوں پر متعین کر دیا۔ ان مشائخ کے اثرات کا ذکر مناسب جگہوں پر نظر سے گزریگا۔

(۸) علاوہ ازیں یہ ممکن نہ تھا کہ سلاطین بعض ایسی تحریکوں سے متاثر نہ ہوں جن کے ہمہ گیر اثرات سے مسلم سوسائٹی کا ہر طبقہ کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوا تھا۔ التتمش جس زمانہ میں بغداد میں تھا چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کے مشاہیر بزرگ وہاں موجود تھے۔ اور ساری فضائیں تصوف کے خیالات سے معمور تھیں۔ اس ماحول میں سانس لینے کے بعد یہ ممکن نہ تھا کہ التتمش اس سے متاثر نہ ہوتا۔ چنانچہ اس کے دل و دماغ پر تصوف کی تحریک کا جو اثر ہوا اس کا اندازہ آئندہ صفحات سے ہوگا۔ پھر چودھویں صدی میں امام ابن تیمیہؒ کی تحریک اسلامی ممالک میں ایک آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ اور ان کی تصنیفات جگہ جگہ اہل علم کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ ہندوستان میں ان کے اثرات امام عبدالعزیز اردبیلی کے ذریعہ پہنچے اور محمد بن تغلق کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اگر کسی درباری مورخ کو مشائخ کے طرز پر سلاطین کے بھی ملفوظات لکھنے کا خیال آجاتا تو ہمیں اس بات کا اندازہ لگانے میں آسانی ہوتی کہ محمد بن تغلق کے ذہنی و فکری نشو و نما میں کس حد تک

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۹۵-۱۹۶ [2] عجائب الاسفار۔ ج ۲ ص ۱۴۴

امام ابن تیمیہؒ کی تحریک کا ہاتھ تھا! پھر چودھویں صدی کے عام مذہبی رجحانات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو فقہ سے خصوصی طور پر دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور اس فن پر مستقل کتابیں مدوّن کی گئی تھیں اور کثیر تعداد میں حاشیے اور شرحیں تیار کی گئی تھیں۔ جس طرح کا فقہی ذہن ان تصانیف میں نظر آتا ہے اسی کی ایک جھلک فیروز شاہ تغلق کے افکار و اعمال میں بھی ملتی ہے۔

(۹) ہندوستان میں بس جانے کے بعد سلاطین کا ہندوؤں کے سماجی اور فکری حالات سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ نظام حکومت چلانے کے لیے انہیں ہندوؤں کی مدد اور ان کے تعاون کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ہندو معماروں نے ان کی عمارتیں بنائیں[1] ہندو سناروں نے اُن کے سکّے گھڑے[2] اور ہندو افسروں نے اُن کے مالی نظام کو سنبھالا۔ برہمنوں نے ہندوؤں کے مقدمات طے کرنے میں مدد دی۔ اثرات کا یہ دائرہ نظام حکومت تک محدود نہیں رہا۔ پہلے ان اثرات کی سماجی نوعیت واضح ہوئی اور پھر فکری۔ ہندو شہزادیوں سے ازدواجی تعلقات کی ابتداء شہاب الدین غوری سے ہوگئی تھی[3] بعد کو علاء الدین خلجی، تغلق شاہ، رجب وغیرہ نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں[4]۔ اور اس طرح شاہی حرم میں ہندو اثرات ظاہر ہونے لگے۔ محمد بن تغلق کی بہن کی شادی کی جن رسوم کی تفصیل ابن بطوطہ نے

---

[1] سلطنت دہلی کے ابتدائی دور میں تو ہندو معماروں کی مدد بالکل ناگزیر تھی لیکن یہ صورت صدیوں تک قائم رہی۔ ۱۳۶۹ء میں قطب مینار کو بجلی سے صدمہ پہنچا تو فیروز شاہ نے اس کی مرمت کا کام تین ہندو معماروں نانا، لولا، لشمند کے سپرد کیا۔ Arch. Sur. Memoirs No.22 p42.

[2] اس دور کے سکّوں پر ہند واثرات کا اندازہ لگانا ہو تو E. J. Rapson کا مضمون Some Hindu elements in Muslim Coinage (I.H. Congress 1936 P. 672-87) دیکھنا چاہیئے۔ نیز ملاحظہ ہو N. Wright کی کتاب The Coinage & Metrology of the Sultans of Delhi, (Delhi 1936)

[3] ملاحظہ ہو ڈاکٹر مہدی حسین کی کتاب Rise & Fall of Mohd bin Tughluq, p.18 نیز Cambridge History of India III p.38.

دی ہے، اُن میں صاف ہندوانہ اثرات نظر آتے ہیں[۱]۔ پھر ہندو نجومیوں، شاعروں اور جوگیوں[۲] سے سلاطین کے تعلقات پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سلطان محمد بن تغلق دکن میں تھا تو روزانہ گنگا کا پانی منگا کر پیتا تھا[۳]۔ اودھ میں جب اس نے ایک شہر آباد کیا تو اس کا نام "سرگ دواری" رکھا جس کے معنی ہیں "بہشت کا دروازہ"[۴]۔ اس نام کی اہمیت کو سمجھنے میں ابن بطوطہ کا یہ بیان بہت مدد دیتا ہے: "گنگا کی طرف ہندو حج کے لیے جاتے ہیں.... اُن کا گمان ہے کہ اس دریا کا منبع بہشت میں ہے[۵]"۔

(۱۰) سلاطین دہلی کے مذہبی افکار کے مطالعہ میں مسلم سوسائٹی کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سلاطین کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی ایسا قدم اُٹھائیں جس سے عام مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔ علاء الدین خلجی نے جب ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنی چاہی تو جس تنبیہ نے اس پر سب سے زیادہ اثر کیا وہ یہ تھی کہ اس حرکت سے مسلمانوں میں ایسی بیچینی پیدا ہو جائیگی کہ سَو بزرجمہر بھی اس کو فرو نہ کر سکینگے[۶]۔ جب محمد بن تغلق کی پالیسی نے ملک میں ایک عام اضطراب کی صورت پیدا کر دی تو اس نے مسلم سوسائٹی کے رجحانات کو سمجھتے ہوئے خلافت سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا[۷]۔ اور اس طرح اپنے کھوئے ہوئے اثر و اقتدار کو مذہب کی راہ سے واپس لانے کی کوشش کی!

مسلم سوسائٹی کے بعض اہم عناصر اپنے مخصوص انداز میں بادشاہوں کو ہدایت کرتے رہتے تھے۔ کوئی رمز و کنایہ میں بات کہتا، کوئی کہانیوں کے ذریعہ اور کوئی شاعرانہ

---

[۱] عجائب الاسفار۔ ج ۲ ص ۱۲۵۔ [۲] مسالک الابصار (انگریزی) ص ۳۲، عجائب الاسفار ج ۲ ص ۲۵۸-۲۵۹۔ [۳] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۳

[۴] ملاحظہ ہو: تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۵۔ عصامی اس کے متعلق لکھتا ہے ؎

بہشتے بنا کرد شداد وار — کہ "سرکابری" خواندش روزگار

(فتوح السلاطین۔ مدراس ص ۴۷۲)

[۵] عجائب الاسفار ص ۳۵

[۶] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۶ [۷] ایضاً ص ۴۹۱-۴۹۲-۴۹۳۔

انداز ہیں۔ امیر خسروؒ حالانکہ ہمیشہ دربار سے متعلق رہے لیکن بادشاہوں کو نصیحتیں کرنے اور ان کو کمزوریوں سے آگاہ کرنے میں انہوں نے کوئی کسر اُٹھا کر نہ رکھی۔ بادشاہوں کو جب ہنگامۂ نادنوش میں مبتلا پاتے ہیں تو پکارتے ہیں ؎

چوں تو خوری بادۂ کافور بو ۔۔۔ پس غمِ گیتی کہ خورد؟ خود بگو

؎ کار چناں کن کہ بہنگامِ کار ۔۔۔ از در یزداں نشوی شرمسار

اور ہدایتیں ملاحظہ ہوں:

یاد کن زاں گدائے بے توشہ ۔۔۔ کہ شب افتد گرسنہ در گوشہ

کہ چو فردا شمار کار کند ۔۔۔ اول از مفلساں شمار کند

ضیاء الدین برنی کا یہ جملہ بھی قابل غور ہے:-

بادشاہ از راہ انصاف وحق گزاری	انصاف اور سچائی کا تقاضہ یہ ہے کہ بادشاہ
اوراتواں گفت واوراتواں دانست	اُسے کہا جائے اور اُسے سمجھا جائے جس کی
کہ یک آدمی در بادشاہی او گرسنہ	بادشاہی میں ایک آدمی بھی بھوکا اور ننگا نہ
وبرہنہ نخسپد" [1]	سوئے۔

مولانا ضیاء الدین نخشبیؒ کی تصانیف میں بے شمار حکایتیں ہیں جن میں روئے سخن بادشاہوں کی جانب معلوم ہوتا ہے۔ شیخ حمید الدین ناگوریؒ نے ایسے ملوک کی مذمت کی ہے جو "لہو ولعب" میں اپنا وقت گزارتے تھے [2]

ان تمام قوتوں اور حالاتِ گردو پیش کے عمل اور ردِ عمل نے سلاطین دہلی کے مذہبی معتقدات پر اثر ڈالا تھا۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۴۷

[2] سرور الصدور (قلمی) ص ۳۸

تاریخ اسلام میں سلطنت دہلی کا مقام

ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اداروں کی صحیح نوعیت اور اُن کے چلانے والوں کے ذہنی محرکات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تاریخ اسلام کے چوکٹے میں سلطنت دہلی کا مقام تلاش کریں اور یہ پتہ لگائیں کہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے سلطنت کی حیثیت کیا تھی۔

(۱) قرآن پاک نے اس سے بحث نہیں کی کہ مسلمانوں کو کس طرز کی حکومت قائم کرنی چاہیے۔ اور یہ بات اُن مقاصد و مطالب سے بالکل مطابق ہے جو قرآن نے انسانی زندگی کو سنوارنے کے لیے اختیار کیے ہیں۔ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ انسان میں وہ وجدان و شعور بیدار کیا جائے جو اسے نظام ربوبیت کے سمجھنے اور عرفانِ حقیقت کا سُراغ لگانے میں معاون ہو اسی مقصد کے پیش نظر قرآن نے انسانی کردار کی اصلاح اور "خاندان" کی صحیح اصولوں پر تربیت پر زور دیا ہے کہ اگر انسانی سماج کی یہ "اکائی" درست ہو جائے تو پھر جو بھی سیاسی نظام صورت پذیر ہوگا وہ اسلامی ہوگا۔ بس تین اصولوں پر اکتفا کیا گیا ہے کہ ان کی روشنی میں دنیوی بصیرت، زمانے کے تقاضے اور سماج کی ضروریات جس طرف رہنمائی کریں وہ نظام مرتب کر لیا جائے۔

(۱) اقتدار اعلیٰ اللہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

— ان الحکم الا للہ

— لا یشرك فی حکمہ احداً

— فالحکم للہ العلی الکبیر

اس کے معنی واضح طور پر یہ ہیں کہ کوئی انسان کسی انسان پر برتری نہیں رکھتا۔ سب قانون کے تابع ہیں۔ کوئی بھی انسان یا انسانی ادارہ جس کو "تمکن فی الارض" کی خدمت سپرد کی جائے

قانون سے بالاتر ہونے کے غرور و پندار میں مبتلا نہ ہو۔

(ب) معاملات شوریٰ سے طے کیے جائیں۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

—— امرھم شوریٰ بینھم

—— وشاورھم فی الامر

جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ایک شخص کی بصیرت پورے انسانی سماج کی رہنمائی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ پوری ملت کی اجتماعی صلاحتیں اس ذمہ داری کو سنبھالیں۔

(ج) جس اولی الامر کی قیادت پر اجماع ہو جائے اس کی اطاعت کی جائے۔ ارشاد ہوتا ہے :

أطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم[1]

اللہ، رسول، اولی الامر کو ایک جگہ بیان کر کے یہ بات بھی صاف کر دی گئی ہے کہ یہ احکام اللہ اور رسول کے احکام کی بنیادوں پر ہونگے اُن سے تناقض نہیں ہونگے۔

ان تین اصولوں نے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے بنائے ہوئے نظام پر اثر ڈالا، اس سے اسلامی نظام حکومت کے بنیادی تصورات متعین ہوتے ہیں۔

(۲) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سیاسی نظام مرتب کیا تھا اس کی بنیاد شوریٰ، اخوت، مساوات اور عدل پر تھی۔ بیت المال سب کا مشترک سرمایہ تھا۔ رنگ و نسل کے سارے امتیازات مٹا کر ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کر دی گئی تھی جس میں توحید کا نظریہ عملاً بروئے کار تھا۔ نہ کوئی حکمراں طبقہ تھا اور نہ کوئی محکوم۔ قانون کی نظر میں ایک ادنیٰ

---

[1] علامہ ابن حزم نے کتاب الملل والنحل میں لکھا ہے :۔
"فقد ورد بایجاب الامام من ذلك قول اللہ تعالیٰ" یعنی نصب امام کا وجوب اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہے۔

غلام اور رسول کی لخت جگر فاطمہؓ کی ایک حیثیت تھی[1]۔ وحی الٰہی کے علاوہ سارے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے تھے۔ خود رسول اکرم صلعم نے فرمایا تھا

انما انا بشرٌ اذا امرتکم بشیءٍ	میں آدمی ہوں اس لیے جب میں دین کی
من دینکم فخذ وابہ واذا امرتکم	بابت حکم دوں تو اس کو لو اور جب اپنی رائے
بشیءٍ من رائی فانما بشرٌ	سے کچھ کہوں تو تم میں ایک آدمی ہوں۔

ان کے جسم پر نہ خلعت شاہانہ ہوتا، نہ دروازہ پر حاجبوں کا ہجوم، جب کسی علاقہ میں عامل متعین کرتے تو فرماتے:

من کان لنا عاملاً فلیکتسب زوجۃ	جو شخص ہمارا عامل ہو اس کو ایک بی بی کا
فان لم یکن لہ خادم فلیکتسب خادماً	خرچ لینا چاہیے اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو
وان لم یکن لہ مسکن فلیکتسب	تو نوکر کا، اگر مکان نہ ہو تو گھر کا، لیکن اگر
مسکناً ومن اتخذ غیر ذلک فھو غال	اس سے زیادہ لیگا تو خائن ہوگا

(ابوداؤد)

حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں اسلامی سیاست اور سماج کے بنیادی اصولوں کی طرف اس طرح اشارہ کر دیا تھا:

"ہاں، جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔۔ لوگو ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے، اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے۔۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔۔ تمہارے غلام! تمہارے غلام! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔۔۔۔ جاہلیت کے تمام انتقامی خون باطل کر دیے گئے۔۔۔ تمہارا عورتوں پر اور

[1] صحیح بخاری۔ کتاب الحدود۔

عورتوں کا تم پر حق ہے۔۔۔ جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیے گئے۔۔ تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اس شہر میں حرام ہے۔۔۔۔ خدا نے ہر حق دار کو از روئے وراثت اس کا حق دیدیا، اب کسی کو وراثت کے حق میں وصیت جائز نہیں۔۔۔ ہاں! مجرم اپنے جرم کا ذمہ دار ہے۔ ہاں! باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔۔۔۔ اگر کوئی حبشی بینی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔۔۔ ہاں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو" [۱]

(۳) رسول اکرم صلعم کے بعد خلفاء راشدین نے "منہاج سنت" پر ہی اپنے سیاسی نظام کی عمارت تعمیر کی۔ جس طرح وجود نبوۃ میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع تھا، اسی طرح اُن کی شخصیت بھی جامع اور حاوی تھی۔ دینی دعوت اور شرعی اجتہاد و امر حکومت و فرمانروائی اور قوام و نظام شرع، نظام شریعت اور نظام سیاست، یہ سب ان کی ذات میں اکٹھے تھے۔ اُن کی حکومت سچے اور حقیقی نظام پر تھی یعنی حکومت شوری جس کو آج کل کی زبان میں ایک ناقص تشبیہ کے ساتھ "ری پبلک" کہہ سکتے ہیں [۲]۔ حضرت عمرؓ نے اپنی حیثیت کے متعلق کہا تھا:۔

انما انا و مالکم کولی	مجھ کو تمہارے مال (یعنی بیت المال) میں اس قدر حق ہے
الیتیم [۳]	جتنا یتیم کے مربی کو یتیم کے مال میں۔

[۱] ملاحظہ ہو سیرت النبی مولانا شبلی حصہ اول جلد ۲ ص ۱۴۵-۱۴۸
[۲] مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب، مولانا ابو الکلام آزاد، ص ۹-۱۰
[۳] کتاب الخراج۔ ص ۶۷۔ نیز احیاء العلوم ج ۲ ص ۲۸۳-۲۸۴-

انہوں نے اپنے عاملوں کو تنبیہ کی تھی کہ

ولا تستاثروا علیھم فتظلموھم۔ ؎۱ — اُن سے (عام لوگوں سے) کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو کہ یہ اُن پر ظلم کرنا ہے۔

ایک مرتبہ عمرو بن العاص کے بیٹے نے ایک قبطی کو بے وجہ مارا تو آپ نے خود اسی قبطی کے ہاتھ سے مجمع عام میں سزا دلوائی اور عمرو بن العاص اور اُن کے بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

مذ تم تعبد تم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارا۔ ؎۲ — تم لوگوں نے آدمیوں کو غلام کب سے بنا لیا؟ ان کی ماؤں نے تو اُن کو آزاد جنا تھا۔

قرون وسطیٰ میں جب بھی کسی شہری ریاست نے اپنے سیاسی اقتدار کا دائرہ بڑھایا ہے، ایک حکمراں طبقہ ضرور نمودار ہو گیا ہے۔ جب مسلمانوں کی فتوحات کا حلقہ بڑھا تو حضرت عمرؓ کو یہی خطرہ پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے ایسی تدابیر اختیار کیں جس سے کچھ عرصہ کے لیے اسلام کا سیاسی نظام حکمراں طبقہ کی لعنت سے بچ گیا۔ عرب میں حکمراں طبقہ کے پیدا ہونے کے خطرات تین طرف سے تھے: قریش سے، جن کے پیچھے سیاسی قیادت کی روایات تھیں۔ یا اُن فوجی افسروں سے، جو عسکری قوتوں کی تنظیم میں مصروف تھے یا پھر صوبائی گورنروں میں سے جو مختلف علاقوں میں انتظامی کام انجام دے رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ کوئی عرب کسی مفتوحہ ملک کی زمین پر قبضہ نہ کرے۔ ہاشمیوں کو حکومت کے عہدے نہ دیے جائیں، اس لیے کہ اُن کے پاس پہلے ہی سے کافی دولت تھی۔ خمس ملنے سے وہ اور زیادہ مالدار ہو جاتے اور دولت کی خرابیاں ان میں پیدا ہو جاتیں۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے۔

ابت الدراھم الا ان یخرج اعناقھا ؎۳ — روپے، سر اونچا کیے بغیر نہیں رہتے۔

پھر صوبائی گورنروں کے ساتھ بھی سختی کا برتاؤ کیا گیا۔ جلد جلد اُن کا تبادلہ ایک مقام سے دوسرے مقام کو کیا گیا اور حج کے موقع پر عام لوگوں کی رائے اُن کے متعلق دریافت کی گئی۔ عرب

؎۱ ملاحظہ ہو الفاروق ج ۲ ص ۳۰-۳۱ ؎۲ کنز العمال ج ۶ ص ۳۵۵ ؎۳ الفاروق ج ۲ ص ۲۷۵

میں غلامی کو بالکل ختم کر دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ ــــ "لا یسترق عربی"[1]۔ ان تمام تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب میں کوئی حکمراں طبقہ پیدا نہیں ہوا اور اسلامی اقتدار کے حدود بھی بڑھتے رہے۔ لیکن یہ صورت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی اور خلافت کا یہ خالص اسلامی نظام حضرت علیؓ پر ختم ہو گیا، اور جس حکمراں طبقہ کی پیدائش کو حضرت عمرؓ نے روکنے کی کوشش کی تھی وہ بنی اُمیہ کی شکل میں نمودار ہوا۔ بنی اُمیہ کے اقتدار کے ساتھ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ رسول اکرم صلعم نے اس تبدیلی کے متعلق متعدد پیشین گوئیاں فرمائی تھیں۔ ان پیشین گوئیوں کو شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ازالۃ الخفاء عن الخلفاء میں تفصیل سے بیان کیا ہے[2]۔

(۴) بنی اُمیہ کے زمانہ میں سیاست کی بنیادیں بدل گئیں۔ وراثت کا اصول اسلامی سیاست میں داخل ہو گیا۔ شوریٰ کا وہ نظام جس کے بغیر بقول حضرت عمرؓ خلافت کا تصور ہی ناممکن تھا، درہم برہم ہو گیا۔ خلیفہ متولی قوم کے بجائے شہنشاہ قوم بن گیا۔ ایک طرف قصر خضری[3] کی فلک بوس عمارتیں نمودار ہوئیں تو دوسری طرف مسجدوں میں مقصورے دروازوں پر حاجب اور درباروں میں تخت نظر آنے لگے۔ بیت المال ملت کی ملکیت سے نکل کر حکمراں کے ذاتی قبضہ میں پہنچ گیا۔ اس تبدیلی نے اجتماع اسلامی کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔

بنی اُمیہ کے ابتدائی دور میں گو صحابہ کرام کی جماعت ہر ناحیہ ملک میں موجود تھی اور ان کا اس بات پر اجماع بھی ہو گیا تھا کہ بنی اُمیہ راہ سنت سے ہٹ گئے اور ان میں خلافت کی اہلیت نہیں، لیکن بایں ہمہ ان کے خلاف بغاوت کو انتشار ملت کے مترادف سمجھا گیا اور اس وقت سے یہ اصول قرار پا گیا کہ اگر کوئی غیر مستحق شخص بھی خلافت پر مسلط ہو جائے تو اس پر خروج نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے کفر صریح سرزد نہ ہو[4]۔ یہ اصول

[1] کنز العمال جلد دوم ص ۳۱۲ [2] ازالۃ الخفاء جلد اول ص ۱۲۱-۱۳۶
[3] ملاحظہ ہو Short History of the Saracens, Amir Ali
[4] ازالۃ الخفاء جلد اول ص ۱۳۶، ۱۳۷۔

سیاسی استحکام کے لیے اپنی جگہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن جو غلط تبدیلی اسلام کے سیاسی نظام میں پیدا ہو گئی تھی وہ اس کے باعث درست نہ ہو سکی۔ اس اصول نے فتنہ و فساد کی راہیں تو بند کر دیں لیکن حکمراں طبقہ کے ظلم و تعدی کا دروازہ بند نہ کر سکا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ اسلام میں مذہب اور سیاست کے راستے بدل گئے۔ مذہبی طبقوں نے حکومت وقت سے دامن بچا لیا اور سلاطین نے دینی زندگی کے تقاضوں سے چشم پوشی کر لی۔ عام مسلمانوں نے اس قسم کی احادیث کے سہارے جو امام ماوردی نے احکام السلطانیہ میں نقل کی ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد تم پر حاکم متعین ہونگے۔ نیک اپنی نیکی کے ساتھ اور بد اپنی بدی کے ساتھ۔ مگر تم لوگ اُن کے ہر اُس حکم کی جو حق کے موافق ہو تعمیل کرو۔ اگر وہ حکومت میں بھلائی کرینگے تو اس کا فائدہ تمہیں اور انہیں دونوں کو ہوگا۔ اگر بُرائی کرینگے تو فائدہ تمہیں ہوگا اور اس کا وبال اُن کے ذمہ ہوگا۔" [۱]

بادشاہوں کی بے راہ روی کو برداشت کیا لیکن پھر بھی سیاسی بے چینی مذہبی تحریکوں کی صورت میں ظاہر ہوتی رہی ـــــ اس میں شک نہیں کہ دائرہ اقتدار بڑھ جانے کے بعد سیاسی نظام میں بعض تبدیلیاں تو بالکل ناگزیر تھیں لیکن سب سے زیادہ بنیادی اور قابل مذمت فکر و نظر کی وہ تبدیلی تھی جس نے ملوکیت کو مسلمانوں کی سیاست کا مرکز و محور بنا دیا!

(۵) بنی اُمیہ نے گو استبداد اور شخصی حکومت کی بنیاد ڈال دی تھی، لیکن پھر بھی عرب کے اس ماحول میں جہاں قدم قدم پر علماءِ حق کی سر بکف جماعتیں ان پر تنقید کے لیے تیار رہتی تھیں۔ انہیں زیادہ دور جانے کی ہمت نہیں ہوئی [۲] خود بنی اُمیہ میں عمر بن عبد العزیزؒ

---

[۱] احکام السلطانیہ (اردو ترجمہ)

[۲] بنی اُمیہ گو راہ سنت سے ہٹ گئے تھے لیکن دنیاوی اعتبار سے اُن کی حکومت بہت سی خوبیوں کی حامل تھی۔ اسی بنا پر امام ابن تیمیہؒ نے امیر معاویہ کو اسلام کا بہترین بادشاہ کہا ہے۔

کا وجود اس بات کا ثبوت ہو کہ خلفاء راشدین کے قائم کیے ہوئے اصول ابھی ذہنوں میں روشن تھے۔ بعد کو جب سیاسی اقتدار بنی عباس میں منتقل ہوا تو خلافت کا ایک نیا باب شروع ہوگیا۔ "چونکہ کامل پانچ صدیوں تک حکمرانی ایک ہی گھرانے میں رہی، اس لیے وہ تمام ذہنی وجسمانی اور اجتماعی ومدنی فسادات کمال درجہ تک پیدا ہوگئے جو ہمیشہ امتدادِ سلطنت وعروج تمدن کے لازمی نتائج رہے ہیں[1]"۔ بنی اُمیہ نے سیاست کو مذہب سے علیحدہ کیا تھا، بنی عباس نے ایک قدم بڑھ کر تہذیب وتمدن وآداب کو بھی دین کی ہمہ گیری سے الگ کر لیا۔

(۶) جب بغداد کی خلافتِ عباسیہ کمزور ہونی شروع ہوگئی تو مرکز سے دور صوبوں میں ایسی حکومتیں وجود میں آئیں جو رسمی طور سے تو خلیفہ کے ماتحت تھیں لیکن اپنے تمام معاملات میں خودمختارانہ حیثیت رکھتی تھیں۔ اس طرح طاہریہ (سنہ ۸۲۰ء تا سنہ ۸۷۲ء) صفاریہ (سنہ ۸۶۳ء تا سنہ ۹۰۳ء) سامانی (سنہ ۸۷۴ء تا سنہ ۹۹۹ء) دیلمی (سنہ ۹۴۵ء تا سنہ ۱۰۵۵ء) سلطنتیں قائم ہوئیں۔ اس کے بعد ترکوں کی سلطنتیں غزنویہ (سنہ ۹۹۹ء تا سنہ ۱۰۴۰ء) سلجوقیہ (سنہ ۱۰۳ء تا سنہ ۱۱۵۹ء) اور خوارزمیہ (سنہ ۱۱۵۷ء تا سنہ ۱۲۳۱ء) وجود میں آئیں۔ ان نئی حکومتوں کا مقصد ایرانی تہذیب کو زندہ کرنا تھا۔ ان کے ذہنوں پر ایرانی حکمرانوں کے نقش تھے اور وہ اسلام میں اپنی ذاتی حیثیت میں کہیں تک بھی یقین رکھتے ہوں لیکن ان کی سیاسی زندگی کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر قائم نہیں تھیں۔ ان کی سیاست اور خراج وباج کے آئین قیصر وکسریٰ کے دستور وقواعد پر مبنی تھے۔ زبان پر نام کبھی کبھی قرآن کا بھی آجاتا تھا، لیکن اصل میں ان کی رہبری آئین نوشیروانی اور تورہ چنگیزی سے ہوتی تھی۔ ان سلاطین کو دیکھ کر بقول مولانا شبلی ایسا گمان ہوتا تھا کہ کیقباد وکیخسرو نے طغرل وسنجر کا قالب بدل لیا ہے[2]۔

(۷) ان مسلمان فرمانرواؤں کے طرزِ زندگی اور ان کی سیاست پر اسلامی نقطۂ نظر

[1] مسئلہ خلافت اور جزیرۂ عرب ص ۷۰
[2] الغزالی ص ۲۳۰

سے سب سے زیادہ سخت تنقید حضرت امام غزالی رحؒ نے کی ہے[1]۔ انہوں نے پورے نظام پر شرعی حیثیت سے نظر ڈالنے کے بعد مذہبی طبقہ کو مشورہ دیا ہے کہ حکومت وقت سے مکمل علیحدگی اختیار کرلے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ سلاطین شریعت کے آثار و علامات کے مٹانے پر آمادہ ہیں[2]۔ اُن کے اموال اکثر حرام ہیں[3]۔ جاگیروں کے متعلق لکھا ہے کہ اس زمانہ کی اکثر جاگیریں حرام محض ہیں، اور اُن کا قبول کرنا جائز نہیں، سوائے عراق کی زمینوں کے جو امام شافعیؒ کے خیال میں مسلمانوں کی بہتری کے لیے وقف ہیں[4]۔ وظائف وغیرہ دینے سے سلاطین کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علماء ان کے اغراض و مطالب میں اعانت کریں اور اُن کے عیوب کی پردہ پوشی کریں[5]۔ شاید قرون وسطیٰ کے پورے لٹریچر میں سلاطین، اُن کے طرز زندگی اور اُن کے حاصل کیے ہوئے ٹیکسوں کی اتنی شدید مذمت کسی دوسری جگہ نہیں ملتی جتنی کہ احیاء العلوم میں۔ انہوں نے بادشاہوں سے مکمل عدم تعاون کی ترغیب دی ہے۔ آخر میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو بازار سلاطین نے اپنے حرام مال سے بنائے ہیں اُن میں تجارت حرام ہے اور اُن میں سکونت کرنا جائز نہیں[6]۔ قاضیوں

[1] ایک کتاب نصیحۃ الملوک امام غزالیؒ سے منسوب کی جاتی ہے (آغا جلال ہمائی نے اس کو مجلس طہران سے شائع کیا ہے ۱۳۱۷ھ) ہمیں اس کتاب کو حضرت امام کی تصنیف تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ اگر احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت ان کے افکار و رجحانات کی صحیح عکاسی کرتی ہیں تو نصیحۃ الملوک کبھی ان کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ جن غیر اسلامی رسوم اور سیاسی روایات کی انہوں نے اپنی دو مشہور کتابوں میں مذمت کی ہے، اس کتاب میں اُن کو سراہا گیا ہے۔ اس کے بغور مطالعہ سے ایسا خیال ہوتا ہے کہ کیمیائے سعادت کو سامنے رکھ کر اس میں پیوند لگائے گئے ہیں، اور یہ الحاقی ٹکڑے اس قدر نمایاں ہیں کہ ایک نظر میں ان کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ بہر حال یہ پیوند اس عہد کے فکری رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ امام صاحب کی کتابوں مثلاً کتاب النفخ والتسویہ، سر العالمین، منخول وغیرہ کے ساتھ یہ صورت پیش آئی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو احیاء العلوم الجزء الثانی، الباب الخامس فی ادرارات السلاطین ص ۱۱۹-۱۲۲۔ ترجمہ جلد ۲ ص ۳۱۳ [3] جلد ۲ ص ۲۸۶ [4] جلد ۲ ص ۲۷۹ [5] جلد ۲ ص ۲۸۷

[6] جلد ۲ ص ۳۱۱۔

عاملوں، اور خادموں سے معاملہ رکھنا جائز ہے[1]۔ اُن کے بنائے ہوئے پل، سرائوں، مسجدوں اور باؤلیوں کا استعمال بھی درست نہیں[2]۔ احیاء العلوم میں ایسے مقامات بھی آئے ہیں جہاں یہ گفتگو کرتے کرتے وہ سلاطین کے خلاف باغیانہ جذبات مشتعل کرنے لگے ہیں[3] لیکن جو خیالات ایسے اقدام سے عناں گیر ہوتے تھے ان کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

"..... جن سلطانوں نے خلیفہ سے عہد کرلیا ہے، اطراف بلاد میں ان کی حکومت نافذ ہے اور اس باب میں جو مصلحت ہے وہ ہم نے اپنی کتاب مستظہری میں بیان کی ہے اور مختصر یہ ہے کہ ہم سلاطین میں صفات و شروط کا لحاظ اس لیے کرتے ہیں۔ کہ اس میں توقع زیادتی مصلحت کی ہے اور اگر ہم حکومتوں کو باطل کہہ دیں تو سرے سے مصالح باطل ہو جاتے ہیں تو نفع کی طلب میں ہم راس المال کو کیسے کھو بیٹھیں۔ بلکہ اب تو حکومت شوکت کی تابع ہے، شوکت والے جس سے بیعت کرلیں وہی خلیفہ ہے[4]"

احیاء العلوم میں سلاطین اور امراء کے مقابلہ میں امر بالمعروف کا ایک خاص باب باندھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ سلاطین کی روک ٹوک میں اگر فساد ملکی کا اندیشہ ہو تو نا جائز ہے لیکن اگر

---

[1] احیاء العلوم۔ ترجمہ جلد ۲ ص ۳۱۱۔ [2] جلد ۲ ص ۳۱۲

[3] امام صاحب نے یہ دو حدیثیں نقل کی ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سلاطین کے غیر اسلامی طرز زندگی سے کس درجہ بیزار تھے:

(۱) فمن نابذهم نجا ومن اعتزلهم سلم او کاد ان یسلم ومن وقع معهم فی دنیاهم فهو منهم۔ — جو ان سے مقابلہ کریگا وہ نجات پائیگا اور جو ان سے کنارہ پکڑیگا وہ سلامت رہیگا یا قریب ہے کہ بچ جائیگا۔ اور جو شخص ان کے ساتھ ان کی دنیا میں پڑیگا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا۔ (جلد دوم ص ۲۹۳)

(۲) من دعا لظالم بالبقاء فقد احب ان یعصی اللّٰہ فی ارضہ (جلد دوم ص ۲۹۰) — جو شخص ظالم کے لیے بقا کی دعا کرے تو وہ یہ چاہتا ہے، کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی اس کی زمین میں کی جائے۔

[4] احیاء العلوم (اردو ترجمہ) جلد ۲ ص ۲۹۰

صرف اپنی جان اور مال کا خطرہ ہو تو نہ صرف جائز بلکہ نہایت مستحسن ہے۔ ایک مرتبہ انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ ایک شخص کے پاس وسائل موجود ہیں اور اس میں بلا قتل و خونریزی اصلاح کا کام انجام دینے کی صلاحیت ہے، تو انہوں نے اس کو مدد دی اور یہ مدد سلطنت موحدین کے قیام میں ممد و معاون ہوئی۔

(۸) "سلطنت" کے وجود میں آنے کے بعد بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ علمائے اسلام نے ان مسائل پر اجتہادی انداز میں غور و فکر کرنے کے بجائے، قانون کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا کہ پیدا شدہ حالات کے لیے جواز نکل آئے۔ اسلامی نظام میں سلطنت کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے موضوع احادیث کا سہارا لیا گیا[۱] اور ابتدا میں یہ کوشش کی گئی کہ لفظ سلطان کا اطلاق اس شخص پر کیا جائے جو خلیفہ کے دنیوی اختیارات کا بلا شرکت غیرے مالک ہو۔ نظام الملک نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اعلان کیا کہ سلطان کے دنیوی اختیارات خلیفہ کا عطیہ نہیں ہیں بلکہ وہ خود مامور من اللہ ہے۔

قانون کو حالات کے مطابق کرنے کی کوشش ماوردی نے بھی اسی انداز میں کی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ خلیفہ کی طاقت کم ہو گئی ہے اور با اقتدار امیر وجود میں آ رہے ہیں، لہذا امارت کی تین قسمیں — امارت خاصہ، امارت عامہ، امارت استیلا — قرار دے کر بغاوت کو تسلیم کر لیا اور اس طرح قائم ہو جانے والی حکومتوں کو قانونی شکل دے دی۔ اس طرح قانون کی ظاہری

---

[۱] سلطان کے متعلق بہت سی حدیثیں کتابوں میں ملتی ہیں۔ ان کی صحت مشتبہ ہے۔ رسول اکرمؐ کے زمانہ میں لفظ 'سلطان' کسی صاحب اقتدار شخصیت کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ قرآن میں یہ لفظ برہان اور حجت کے معنی میں آیا ہے۔ آزاد خود مختار فرمانروا کے لیے یہ لفظ سب سے پہلے گیارہویں صدی عیسوی میں استعمال ہوا۔ ابن اثیر کا کہنا ہے کہ خلیفہ القادر نے محمود کو یہ خطاب دیا تھا (جلد ۹ ص ۹۲) ابن خلدون نے لکھا ہے کہ جعفر برمکی 'سلطان' کہلاتا تھا۔ اس بنا پر کہ وہ صاحب اقتدار تھا۔ جس فرمانروا کے سکوں پر سب سے پہلے 'سلطان' کھدا ہوا ملتا ہے وہ ابراہیم غزنوی (م ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء) ہے۔ لفظ سلطان سے متعلق لغوی مباحث کے لیے ملاحظہ ہو: تاج العروس ج ۵ ص ۱۵۹۔ نیز Ency. of Islam vol IV p. 543-44 ؛ نیز آرنلڈ کی کتاب Caliphate p 202-203

شکل تو برقرار رہی لیکن اجتہادی بصیرت سرد پڑ گئی اور بالآخر قانون اور حالات میں ایک خلیج پیدا ہوگئی۔ گو علماء کا ایک طبقہ سلاطین سے دینداری اور دین پناہی کا مطالبہ کرتا رہا لیکن ایسے موقعے بھی آئے جب مسلمان مصنفین کی توقعات سلاطین اور سیاسی نظام دونوں سے بدل گئیں۔ اس بدلے ہوئے رجحان کی آئینہ دار قرون وسطیٰ کی تین کتابیں ہیں[1] — قابوس نامہ، الفخری اور فتاوائے جہانداری۔

قابوس نامہ[2] اُن نصائح کا مجموعہ ہے جو امیر عنصر المعانی کیکاؤس نے ۴۷۵ھ / ۱۰۸۲ء میں اپنے بیٹے گیلان شاہ کے لیے مرتب کیے تھے۔ مصنف نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی ہے کہ اگر وہ اوسط درجہ کا آدمی بنے تو کیا طرزِ عمل رکھے، سپہ سالار بنے تو فوج کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اگر بادشاہ بن جائے تو کیا فرائض انجام دے۔ جو نصیحتیں آخری ضمن میں کی گئی ہیں ان میں عزم وجرأت، سچائی اور راست بازی کی تلقین ضرور ہے لیکن مذہب سے متعلق کوئی فریضہ بیان نہیں کیا گیا۔ جو مثالیں آدابِ حکمرانی اور فرمانبرداری کے سلسلہ میں دی گئی ہیں وہ عجمی تاریخ سے ماخوذ ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کیکاؤس کے ذہن میں بادشاہ کی جو تصویر ہے وہ ساسانی رنگ و بُو لیے ہوئے ہے۔

صفی الدین محمد المعروف بہ ابن طقطقیٰ (م ۷۰۳ھ / ۱۳۰۳ء) نے اپنی کتاب الفخری[3] اس وقت مدون کی تھی جب منگولوں نے وسط ایشیا کی بیشتر مسلمان حکومتوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔ ابن طقطقیٰ کی ہمدردیاں منگولوں کے ساتھ تھیں۔ الفخری میں جہانگیری و جہانبانی کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ بادشاہوں میں عقل و فراست، انصاف و دادرسی وغیرہ خصوصیات کو لازمی بتایا گیا ہے لیکن کسی جگہ مذہب سے متعلق ان کے فرائض بیان نہیں

---

[1] ان تین کتابوں کا انتخاب ایک خاص نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔ ورنہ اسلام کے سیاسی نظریات اور مسائل پر علماء اسلام نے کافی لکھا ہے۔ احمد بن محمد بن ابی الربیع المعروف بہ شہاب الدین کی سلوک المالک فی تدبیر الممالک، ابو نصر فارابی کی سیاست المدنیہ، امام تیمیہ کی منہاج السنہ، اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی ازالۃ الخفا اس سلسلہ میں خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہیں۔ [2] مطبوعہ تہران (۱۳۱۲ شمسی)؛ نیز منتخب قابوس نامہ باہتمام سعید نفیسی) ۱۳۲۰ شمسی۔ [3] الفخری مطبوعہ مصر ۱۵۲۱ء

کیے گئے بلکہ اس کے برخلاف ایک اور اصول بیان کر دیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ ۶۵۶ھ میں جب ہلاکو نے بغداد کو فتح کر لیا تو علماء اسلام سے اس مسئلہ پر فتویٰ طلب کیا گیا کہ ایک عادل کافر فرمانروا بہتر ہے یا ایک ظالم مسلمان بادشاہ! مولانا رضی الدین علی بن طاؤس نے جو طبقۂ علماء میں خاص مقام رکھتے تھے، اس پر جواب لکھ دیا کہ کافر عادل بادشاہ مسلم ظالم بادشاہ سے بہتر ہے۔ اور اس پر سب علماء نے دستخط کر دیے ــــ ابن طقطقی نے مذہب کو سیاست سے علیحدہ کر دیا ہے اور اس بڑے فرق کو جو خلافت راشدہ اور بعد کے سیاسی نظاموں میں محسوس ہوتا ہے یہ کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا تعلق تو نبوت سے تھا لکھتا ہے:

"خلافت راشدہ بہ نسبت دنیوی سلطنت ہونے کے دینی حکومت تھی خلیفہ کرپاس وغیرہ کے موٹے کپڑے اور چھال کے جوتے پہنتے اور چھال ہی کا پرلا استعمال کرتے بازار میں معمولی رعیت کی طرح چلتے پھرتے۔ جب وہ کسی ادنیٰ شخص سے گفتگو کرتے تو وہ اُن کو سخت باتیں سُناتا، اس طرح کی زندگی کو وہ دین محمدی سمجھتے .... یہ طریقہ ملوکانہ حکومت کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق نبوت سے ہے"

(۹) تاریخ اسلام کے اس دور میں قائم ہونے والی سلطنت دہلی کی حیثیت بھی بالکل وہی ہے جس پر امام غزالیؒ نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اگر اس پورے نقشہ کو سامنے رکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ "سلطنت" بالکل غیر اسلامی سیاست کی پیداوار تھی! اور سلاطین دہلی گو مسلمان تھے لیکن اسلام کے نمائندے نہ تھے۔ اُن کی انفرادی زندگی میں مذہب کو کوئی بھی درجہ حاصل رہا ہو لیکن انہوں نے سیاسی معاملات میں مذہب سے روشنی حاصل نہیں کی۔

سلطنت دہلی کو مذہبی حیثیت سے سمجھنے کی ایک کوشش ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب فتاوائے جہانداری میں کی ہے۔ برنی کی یہ تصنیف اپنے زمانہ کی اہم ترین کتابوں میں ہے اس میں وہ تمام ذہنی کشمکش بے نقاب ہوگئی ہے جو علماء اسلام کے ذہن میں نظم مملکت کے

سلسلہ میں پیدا ہوگئی تھی اور اس میں کم وبیش وہ سب مسائل آگئے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے سلاطین دہلی اور اُن کے طرز حکومت کے سلسلہ میں معرض بحث میں رہے ہیں۔ برنی کو پوری طرح احساس تھا کہ حکومت دہلی کا پورا ڈھانچہ اور سلاطین کا طرز عمل شریعت کی روشنی میں قابل معافی نہیں لیکن برنی محض ایک سیاسی مفکر یا مذہبی عالم ہی نہ تھا، اس کو نظام حکومت کے عملی مسائل اور مشکلات سے بھی آگاہی تھی۔ وہ مذہب کے مطالبات اور سیاست کے مقتضیات کو اپنی فہم وبصیرت کے مطابق خوب سمجھتا تھا۔ وہ اجتہادی فکر کی بلندیوں تک نہیں پہنچتا لیکن بایں ہمہ وہ ہندوستان کا پہلا مسلمان مورخ ہے جس نے مذہب اور سیاست کے تضاد کو محسوس کیا اور اپنی سمجھ کے مطابق اس کو حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بات اتنی بنیادی اور مسائل اتنے پیچیدہ تھے کہ اس کی فکر اُلجھ کر رہ گئی اور وہ جہاں سے چلا تھا وہاں یہ کہتے ہوئے واپس آگیا کہ حکومت جو دنیاداری کی آخری منزل ہے، دین داری کے ساتھ نہیں چل سکتی۔

برنی نے کہا ہے کہ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ خود راہِ شریعت پر چلے اور رعایا کو اس پر چلائے[1]۔ "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" میں ہمیشہ سرگرم رہے بلکہ اس سلسلہ میں اُسے چاہیے کہ ہر ہر قصبہ اور شہر میں "محتسبانِ درشت خو" اور "امیر دادان صلب نسب" کا تقرر کرے اور ان کو اتنے اختیارات دے کہ وہ حدود کو جاری کر سکیں۔ قمار بازوں، شراب خواروں اور فاسقوں پر جب سزا کا اثر نہ ہو تو اُن کو شہر سے نکال دیا جائے "خماری وفحاشیت" کو سختی سے روکا جائے اور ایسے لوگوں کو اس پر مجبور کیا جائے کہ وہ مکاسب مشروع اختیار کریں۔ شہروں میں "طرب آباد"[2] کو بیخ وبن سے اکھاڑ

---

[1] فتاوائے جہانداری (روٹوگراف نسخہ انڈیا آفس لائبریری) ص ۲ ب

[2] ابن بطوطہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں مختلف مقامات پر "طرب آباد" قائم تھے۔ دولت آباد کے متعلق لکھتا ہے: "(یہاں) اہل طرب کا ایک بازار ہے جس کو طرب آباد کہتے ہیں .... دکان میں بہت مکلف فرش ہوتا ہے اور اس کے وسط میں ایک گہوارہ ہوتا ہے جس میں گانے والی عورت بیٹھ جاتی ہے ...." (عجائب الاسفار ص ۲۶۸-۲۶۹)

پھینکا جائے (۹-الف) اگر کچھ لوگ پوشیدہ طور پر مناہی کا ارتکاب کریں تو اُن کے حالات کی دریافت میں غیر ضروری تجسس سے کام نہ لیا جائے۔ محتسب ہر ہر محلہ اور ہر ہر کوچہ میں پہنچیں اور مسلمانوں کو کلمۂ شہادت پڑھائیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی تلقین کریں۔ جو لوگ تارک الصلوٰۃ ہوں اُن پر سختی کی جائے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی ترغیب دی جائے (۹ ب)

برنی نے شوریٰ کی اہمیت کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نظامِ حکومت میں اس کی اہمیت کو محسوس کرتا تھا[۱]۔ کہتا ہے کہ بادشاہ کو چاہیے کہ اپنے کاموں کو مخلص مشیروں کی مدد سے انجام دے (۱۷ اب) ان مشیروں کو اتنی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ بے خوف ہو کر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں (۲۳ ب)۔ یہ سب اصحاب ایک مرتبہ کے ہونے چاہئیں۔ اگر کوئی کم مرتبہ ہوگا اور کوئی اعلیٰ مرتبہ تو شتر و گربہ والا معاملہ پیش آئیگا (۲۴ الف)۔ ضروری ہے کہ یہ سب لوگ "محرم اسرار ملکی" ہوں۔ اگر کچھ مشیر حالات سے ناواقف ہوئے تو پھر وہ مشورہ کیا خاک دے سکینگے۔ یہ مشیر آزادی رائے اور جرأتِ فکر و نظر کے مالک ہونے چاہئیں اور اُن کو مکمل "امان جانی" حاصل ہونی چاہیے تاکہ

"در مجلس رائے بہ ہیچ وجہ تدبیر را در میان نیارند" (۲۴ الف)

بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذاتی رائے مجلس سے پوشیدہ رکھے تاکہ لوگ اس سے متاثر ہوئے بغیر حالات کی نوعیت اور معاملہ کی اہمیت کو اپنے فہم و ادراک کے مطابق سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر بادشاہ نے ابتدا ہی میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا تو

حاضراں را ضرورت شود اما طوعاً و کرہاً	حاضرین کے لیے ضروری ہو جائیگا کہ طوعاً
کہ رائے بادشاہ را استحسان کنند	و کرہاً بادشاہ کی رائے کی تعریف کرنے لگیں

[۱] شوریٰ کی اہمیت کا اندازہ اس عہد کے اور مورخین کو بھی تھا۔ فخر مدبر نے آداب الحرب والشجاعت (ص ۶۸) اور صدر الدین حسن نظامی نے تاج المآثر (ص ۱۹-۲۰) میں اس پر بحث کی ہے اور اس کی ضرورت کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔

وترک اندیشہ ہائے خود گیرند۔ وکسے را زہرہ نباشد کہ در رائے بادشاہ مخالف و بدلیل جرح کند، وایں معنیٰ بہ تجارب بتحقیق پیوستہ است" (۲۴ ب)	اور خود ذہن پر زور دینا (اور معاملہ کو سمجھنا) چھوڑ دیں۔ اور کسی کو ہمت نہ ہوگی کہ بادشاہ کی رائے کے خلاف اظہار خیال کرے اور دلائل سے جرح کرے اور یہ بات تجربہ سے پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے

مجلس رائے سے مشورہ کے بعد جب کوئی فیصلہ ہو تو بادشاہ کو عزم اور جرأت کے ساتھ اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ "عزم" اور "استبداد" میں فرق ہے، اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ استبدادیت کو کسی طرح بھی "عزم" بنا کر صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ (۳۳ ب ۴۴ الف)

عدل لازمۂ دین ہے (۴۴ الف)۔ اگر عدل وانصاف نہ رہے تو پھر دنیا میں اباحت کے سوا رہ ہی کیا جائیگا۔ (۴۴ الف) باغیوں اور سرکشوں کو سزا دینے میں شرع کا لحاظ ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں برنی نے اپنی تمام گفتگو کی بنیاد قرآن کے اس اعلان کہ جس کسی نے کسی انسان کو قتل کر ڈالا تو وہ صرف ایک جان ہی کا قاتل نہیں بلکہ تمام انسانوں کا قاتل ہے۔ (۳۵:۵) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر کہ "ادرء الحدود بالشبہات" (ص ۱۸۸ ب) قائم کی ہے۔ سلاطین اپنی طاقت کے استحکام کے لیے جو سزائیں دیتے ہیں ان کی مذمت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ ناجائز محض ہیں۔ وہ اپنی چند روزہ طاقت کو قائم رکھنے کے لیے خلق خدا کا خون بہاتے ہیں۔ اور گمراہی نفس کا اس حد تک شکار ہو جاتے ہیں کہ

"درسلامتی یک ذات خود وصلاح یک ذات خود ورونق امور بادشاہی خود وعزت وعظمت امور خود صلاح وسلامتی عالمیاں دانند" (۱۴۶ ب)	تنہا اپنی ذات کی صلاح وسلامتی، اور امور شاہی کی رونق اور اپنے امور کی عزت و عظمت میں سارے عالم کی صلاح اور سلامتی تصور کرتے ہیں۔

برنی کے اس ایک جملہ نے ان عمارتوں کو مسمار کر دیا ہے جو بادشاہوں کے پرفریب تخیل نے قتل و غارت گری کے جواز میں تعمیر کی تھیں!

نظامِ حکومت کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے برنی نے بادشاہوں کو ہدایت کی ہے کہ 'ضوابط'
بناتے وقت یہ خیال رکھیں کہ نہ تو اُن کا کوئی عمل احکامِ شرع کے منافی ہو اور نہ اُن کے کسی
ضابطہ سے جابر اور ظالم بادشاہوں کی روش کا احیا ہونا ہو۔ بادشاہ کو ایسے قوانین بنانے
چاہئیں جن سے خواص و عوام سب کو نیکی کی طرف رغبت پیدا ہو۔

برنی نے مسلمان بادشاہوں کو "فلاسفۂ بدمذہب" کی صحبت سے پرہیز کرنے کی تلقین
کی ہے اور کہا ہے کہ دار الملک میں ایسے لوگوں کا قیام ہرگز مناسب نہیں جو "علم یونانیاں" کو
معقول اور علم شریعت کو منقول سے تعبیر کرتے ہیں اور جن کا نہ فرشتوں پر ایمان ہے اور نہ روزِ آخرت
پر۔ ایسے لوگوں کو اپنے افکار و عقائد کی ترویج کا موقع دینا، اسلام کے حق میں مضر ہے (ص ۱۲۱ الف)
یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ برنی کی فکر بالکل اسلامی فکر ہے۔ ایک طرف تو اس کے خیالات کے
بعض گوشے ساسانی رنگ میں ڈھلے ہوئے ہیں، اور دوسری طرف اس کے بعض افکار میں تنگ
نظری اور تعصب کی بُو آتی ہے۔ شریف اور رذیل کے فرق کو اس نے جس طرح فتاوائے جہانداری
میں پیش کیا ہے، اس سے حکمراں طبقہ کے نظریات کی ترجمانی معلوم نہیں پوری طرح ہو بھی
سکی ہے یا نہیں، لیکن اسلام کے نظریۂ مساوات کو صدمہ ضرور پہنچ گیا ہے۔ نسب کے امتیازات
پر اس کا اصرار اور کچھ لوگوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کا مشورہ، اس کے ذہن پر غیر اسلامی
اثرات کو نمایاں کرتا ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ اس نے جس سلوک کی سفارش کی ہے وہ اس
کی تنگ نظری سے زیادہ سیاسی بصیرت کی کمی اور حقائق سے چشم پوشی کو ظاہر کرتا ہے۔

(ص ۱۱۸-۱۲۲)

سلطنت دہلی میں مذہب کی حیثیت

(۱) ہر چند کہ خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں کا سیاسی نظام، مذہب کی ہمہ گیری سے نکل گیا تھا اور اسلام نے جن اصولوں پر سیاسی زندگی کو ترتیب دینے کی ہدایت کی تھی وہ فراموش کر دیے گئے تھے، لیکن پھر بھی سلاطین کسی نہ کسی حد تک مذہب سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے رہے اور علماء کا ایک بڑا طبقہ اُن سے دین داری اور دین پناہی کی توقعات کو وابستہ کرتا رہا[1]۔ یہ 'تعلق' اور یہ 'توقعات' ایک دوسرے کی اہمیت کے احساس پر قائم تھیں اور حالات اور مصلحتِ وقت کے مطابق ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ امیر خسروؒ مبارک شاہ خلجی سے تعظیمِ شرع کا مطالبہ اس لیے کرتے تھے کہ ؎

مملکت از دیں شود آراستہ
کارِ جہاں زیں شود آراستہ[2]

لیکن تاج المآثر کے مصنف کا خیال یہ تھا کہ

بداں اے خرد مند با آفریں — برادر بود پادشاہی و دیں
نہ بے تخت شاہی بود دیں بپائے — نہ بے دیں بود پادشاہی بجائے
نہ از بادشاہ بے نیاز است دیں — نہ بے دیں بود شاہ را آفریں[3]

ایک کی نظر میں مذہب مملکت کو آراستہ کرنے کے لیے ضروری تھا، دوسرے کے نزدیک بغیر دین کے بادشاہی ہی ممکن نہ تھی ـــــ حقیقت میں یہ باتیں دل خوش کن توقعات سے زیادہ نہ تھیں

---

[1] امام ماوردی کے نزدیک خلیفہ کا سب سے پہلا اور اہم فرض یہ ہے کہ "وہ دین کی حفاظت اس کے اصول مستقرہ اور سلف کے اجماع کے مطابق کرے" (احکام السلطانیہ، اردو ترجمہ ص ۲۸)

خوند امیر نے لکھا ہے ؎

شریعت شعاری و دیں پروری — بود بہترین مایہ سروری (قانون ہمایونی ص۱)

[2] نہ سپہر ص ۲۲۷-۲۲۸ [3] تاج المآثر (قلمی نسخہ ص ۲)

علماء کا ایک طبقہ اگر ایک طرف برابر یہ کہتا رہتا تھا کہ ـــــ

"و چند چیز از احکام شرع بذات و فرمان بادشاہان متعلق است، چوں خطبۂ جمعہ و عیدین و اقامت حدود و جبات خراج و صدقات و غزوہ کردن و حکم کردن میان خصمان، و دعویٰ شنیدن ..... و برانداختن منکرات و مناہی بدعت ہا۔[1]	احکام شرع کی بعض چیزیں، بادشاہوں کی ذات اور اُن کے فرمان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً خطبۂ جمعہ اور عیدین۔ حدود کا قائم کرنا، خراج اور صدقات کی وصولی، دشمنوں سے جنگ کرنا اور جھگڑوں کا طے کرنا اور دعوی سننا .. منکرات ومناہی اور بدعات کا ختم کرنا۔

تو دوسری طرف کچھ علماء ایسے بھی تھے جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو صدمہ پہنچ جانے کے ڈر سے ردوانکار کا کوئی قدم اُٹھانا تو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن سلاطین کی دسترس سے دینی زندگی کو بالکل علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مولانا کمال الدین زاہدؒ سے جب بلبن نے شاہی امامت کا عہدہ قبول کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے نہایت جرأت اور بے باکی سے جواب دیا:

"در ما جز نماز چیزے دیگر نمانده است اکنوں بادشاہ چہ می خواہد کہ ایں ہم از ما برود"[2]	ہمارے پاس نماز کے سوا اور رہ ہی کیا گیا ہے۔ کیا بادشاہ یہ چاہتا ہے کہ وہ بھی ہم سے چلی جائے۔

---

[1] تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۱۳-۱۴، نیز آداب الحرب ص ۱۹ الف، نیز ۲۹ الف۔ قرون وسطیٰ کی کتابوں میں جگہ جگہ یہ مشہور مقولہ "الناس علیٰ دین ملوکھم" دہرایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ چونکہ عوام کی زندگی بادشاہوں کی زندگی کا پرتو ہوتی ہے اور گمراہی کے سوت جب دربار سے پھوٹتے ہیں تو جھونپڑوں کو بھی بہالے جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ بادشاہ دینی زندگی کے مطالبات پورے کرے۔ مجدد صاحبؒ کا کہنا ہے: سلطان کالروح است وسائر الانسان کالجسد۔ اگر روح صالح است، بدن صالح است، اگر روح فاسد است، بدن فاسد" (مکتوبات مجدد الف ثانیؒ ج ۲ م ۶۷)

نیز ملاحظہ ہو اخلاق جلالی ص ۲۷۳؛ اخلاق محسنی ص ۶-۷؛ برنی: تاریخ فیروز شاہی ص ۱۳۰؛ اخلاق ناصری ص ۳۴۳؛ مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہی ص ۹۔

[2] سیر الاولیاء ص ۱۰۶۔

(۲) ان متضاد توقعات اور زاویہ ہائے نگاہ کی موجودگی میں سلاطین کے لیے دو ہی راہِ عمل تھیں — یا تو مذہب سے اپنے تعلق کو بالکل ختم کر دیں یا پھر یہ کوشش کریں کہ دین سے اُن کا یہ تعلق محض رسمی نہ ہو بلکہ حقیقت اور رسم کی اُس خلیج کو بھر دیا جائے جو اُن کی مذہبی قیادت میں حارج اور مانع تھی۔ پہلی صورت پر عمل اس لیے ممکن نہ تھا کہ بہرحال لوگوں پر مذہب کا اثر تھا اور اُس سے بالکل بے تعلق ہو جانا اپنے اختیار و اقتدار کو ضرب لگانے کے مترادف تھا۔ دوسری صورت پر علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق نے عمل کرنے کی کوشش کی۔ علاء الدین خلجی کی طبیعت جو ایک نئے مذہب کی داغ بیل کی طرف راغب ہوئی تھی اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ اس کے اقتدار کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔ اُس نے اس مقصد کے حصول کے لیے یقیناً غلط راہ تلاش کی تھی لیکن محرک یہی جذبہ تھا جب وہ اس کوشش میں ناکام ہوا تو پہلی صورت کی طرف رجوع ہو گیا اور یہ کوشش کی کہ مذہب کو بلا وجہ سیاست میں دخیل ہی نہ بنایا جائے۔ پھر جب محمد بن تغلق نے "الملک و الدین توامان"[1] کی آواز بلند کی تو اس نے مذہب کی اہمیت کو محسوس کر کے، اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ اپنے اقتدار کو سیاست کے محدود دائرے سے نکال کر مذہب کی لامحدود وسعت میں لا سکے۔ غالباً اس کا احساسِ برتری اور جذبۂ اقتدار اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ کوئی مذہبی طبقہ یہ کہنے کی جرأت کرے کہ سلطان کو اس کی مذہبی زندگی میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔ بہرحال علاء الدین اور محمد بن تغلق دو ایسے آزاد فکر سلاطین تھے جنھوں نے مسئلہ کے بنیادی پہلو پر غور کیا، ورنہ عام طور پر سلاطین مذہب سے اپنے رسمی تعلق کے اظہار پر ہی اکتفا کرتے رہے۔

(۳) سب سے پہلے القاب پر غور کیجیے۔ دین سے تعلق، خلافت سے عقیدت اور نیابتِ خداوندی — یہ تین چیزیں ہیں جن پر پیہم زور دیا گیا ہے۔ التتمش کے نام کے ساتھ فخر مدبر نے جو

---

[1] سیر الاولیا، ص ۱۹۶؛ ضیاء الدین برنی نے اس طرزِ فکر کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ سلطان چاہتا تھا کہ: "بادشاہی را بہ پیغمبری جمع کند" ص ۴۵۹۔

القاب لکھے ہیں وہ قابلِ غور ہیں:

"بادشاہِ اسلام، عادلِ اعظم، شاہنشاہ معظم شمس الدنیا والدین، اعدل الملوک والراس السلاطین، قاہر العداۃ والمشرکین، قامع الکفرۃ والملحدین، قاتل الفجرۃ والمعاندین، کہف الثقلین، ظل اللہ فی الخافقین، محرر ممالک الدنیا، مظہر کلمۃ اللہ العلیا، شہاب سماء الخلافۃ، نصاب العدل والرافۃ، باسط العدل فی الارضین، ناشر الاحسان فی العالمین حامی البلاد، راعی العباد، ناصر الاسلام، کاسر الاصنام، سلطان الحق، برہان الخلق، شہریار غازی ذوالامان لاہل الایمان، وارث ملک سلیمان، الخاتم فی ملک العالم اسکندر الثانی، فلک المعالی، عضد الخلافۃ، ملک ملوک الشرق ابوالمظفر ایلتتمش السلطان، ناصر امیر المومنین" [1]

اسی طرح کے القاب اس کے کتبوں پر بھی ملتے ہیں۔ علاء الدین خلجی کے کتبات میں "راعی شرائط شریعت محمدی، حامل مراسم ملت احمدی، موکد معابر معالم و مساجد، .. ممہد بنیان رسوم مسلمانی و مؤسس مبانی مذہب نعمانی" وغیرہ الفاظ ملتے ہیں۔ اسی طرح اور سلاطین کی عمارتوں، کتبات اور سکوں میں ایسے القاب درج ہیں جن میں مذہب سے گہرے تعلق کا اظہار کیا گیا ہے۔[2] ان القاب کی رسمی حیثیت اس وقت واضح ہو جاتی ہے جب یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ خسرو خاں جس کے معتقدات مذہبی پر برنی نے شدت سے اعتراض کیے ہیں، جب تخت پر بیٹھا تو اس نے ناصر الدین لقب اختیار کرنا ضروری سمجھا۔

پھر خلافت سے عقیدت کا اظہار بھی بار بار کیا گیا ہے۔ "شہاب سماء الخلافہ" "ناصر امیر المومنین" "یمین الخلافہ" "نائب امیر المومنین" اور "عضد الخلافہ" وغیرہ القاب میں خلیفہ کے اقتدار اعلیٰ

---

[1] آداب الحرب والشجاعت ص ۹ ب، ۱۰ الف

[2] تاج المآثر (ص ۳)، میں معز الدین محمد بن سام، قطب مینار، اڑھائی دن کے جھونپڑے پر ایلتتمش، اور علائی دروازہ پر علاء الدین خلجی کے القاب خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہیں۔ محمد بن تغلق کے سکے بھی اس سلسلہ میں دلچسپی سے خالی نہیں۔

کا اظہار ہے۔ اور اس طرح سلطان کی مذہبی حیثیت کا ایک اہم رُخ بھی نمایاں کیا گیا ہے۔

پھر ایک پہلو "نیابت خداوندی"[1] کا تھا۔ اس تصور کے سوتے ساسانی نظریۂ حکومت سے پھوٹے تھے۔ ساسانی بادشاہ صرف سیاسی اقتدار ہی کا حامل نہ تھا، بلکہ اس کو مذہبی فوقیت بھی حاصل تھی۔ وہ جسد انسانی میں الوہیت کا پیکر سمجھا جاتا تھا۔ یہ نظریہ اسلام کے بنیادی عقائد سے ٹکراتا تھا اس لیے مسلمانوں کی سیاسی فکر کا جزو بننے کے لیے اس کو کافی رنگ بدلنا پڑا۔ اور یہ نیابت خداوندی اسی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اور "ظل اللہ فی الارض"[2] کا تصور اسی جذبے کا بظاہر معصومانہ اظہار ہے لیکن اس ماحول میں پرورش پائے ہوئے ذہن نے جب بھی حدود سے باہر قدم نکالا ہے تو بے اختیار بادشاہ کو "خدا" کہہ دیا ہے۔[3]

صدرالدین حسن نظامی[4]، فخر مدبر[5]، منہاج السراج[6]، امیر خسرو[7]، حسن سجزی[8] وغیرہ نے اپنے عہد کے سلاطین کو "ظل اللہ فی العالمین" "ظل یزدانی" "سایہ یزدان پاک" کے القاب سے پکارا ہے۔ فیروز شاہ ایک فرمان میں خود اپنے متعلق لکھتا ہے:

"و تیغ کشورستانی که مؤید بتائید آسمانی ست به قبضهٔ اقتدار ما داده ما را از جمیع
اور کشورستانی کی تلوار جس کو تائید آسمانی حاصل ہے ہمارے قبضۂ اقتدار میں دی گئی ہے اور ہم کو

---

[1] قدیم زمانہ میں لوگ جن جذبات کے ماتحت بادشاہوں کو الوہیت کے قریب لے جاتے تھے اُن کا تجزیہ C. Van Der Leeuw نے اپنی کتاب Religion in Essence & Manifestation میں اور Frazer نے The Magical Origin of Kings میں کیا ہے۔

[2] نصیحت الملوک میں لکھا ہے: "ایشاں را چنانکہ باخبار می شنوی کہ (السلطان) ظل اللہ فی الارض یعنی کہ بزرگ و برگماشتۂ خدائیہ بر خلق، پس بباید دانستن کہ او را آں پادشاہی و فرایزدی داد، ازیں روی طاعت ایشاں باید داشت و ایشاں را دوست باید داشت و متابع باید بود" ص ۳۹-۴۰ نیز ملاحظہ ہو اخلاق جلالی (نول کشور ۱۸۹۱ء)، ص ۲۶۹؛ تاریخ یمینی ج ۱ ص ۲۱۔

[3] فتاوائے جہانداری ص ۱۹۹ ب، ۲۰۰ الف، نیز تاریخ فیروز شاہی ص ۵۷۸ [4] تاج المآثر ص ۹،

[5] تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۱۳؛ آداب الحرب والشجاعت ص ۱۱۳ الف

[6] طبقات ناصری ص ۱۲۴؛ ۲۰۵ [7] قرآن السعدین ص ۲۰۵ [8] کلیات حسن ص ۵۷۳

مکونات و جمہور موجودات برگزید، و رقسم "السلطان ظل اللہ یأوی الیہ کل ملہوف" بر روزگار، کشید"[1] | ساری مکونات اور ساری موجودات میں سے منتخب کیا۔ اور "سلطان ظل اللہ ہے جس کی پناہ میں ہر پریشان حال آتا ہے" کا امتیازی نشان ہمارے وجود پر ثبت کیا۔

اس مسئلہ پر عوام کے تاثرات و احساسات کا اندازہ لگانے کے لیے ہمارے پاس کوئی مواد نہیں ہے لیکن پھر بھی معدن المعانی کا ایک جملہ اس سلسلہ میں کافی اہم ہے۔ ایک شخص نے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری سے سوال کیا۔

"السلطان ظل اللہ۔ ایں راچہ تاویل است یعنی حق تعالیٰ از سایہ منزہ است" | سلطان کو ظل اللہ کہنے کا کیا سبب ہے ذاتِ الٰہی تو سایہ سے منزہ ہے۔

پوچھنے والے نے گو اپنے سوال کو فلسفیانہ اور مذہبی رنگ دے دیا، لیکن اس جملہ میں تنقید کا ایک دفتر پڑھا جا سکتا ہے۔ شیخ نے مختصراً یہ جواب دے کر اپنی گفتگو کا رُخ دوسری طرف کر دیا۔

"ازیں سایہ رحمت تاویل کردہ اند، یعنی رحمت خدائے او ست، ازیں جا اثر رحمت خدائے خواہند نہ عین رحمت"[2] | اس سایہ سے "رحمت" مراد لی گئی ہے یعنی (سلطان) خدا کی رحمت ہے۔ عین رحمت نہیں بلکہ رحمتِ خدا کا اثر۔

ممکن ہے کہ سلطان کی شرعی حیثیت کے متعلق بھی کچھ لوگوں کے ذہن میں شکوک اور شبہات پیدا ہوئے ہوں، لیکن ضعیف اور موضوع احادیث[3] کا سہارا لے کر اس تنقیدی فکر کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا۔

(۴) مذہب سے اپنے تعلق کے اظہار کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے سلاطین نے عوام سے مطالبہ

---

[1] منشآت ماہرو ص ۲، ۸ [2] معدن المعانی جلد اول ص ۲۵

[3] فخر مدبر نے یہ حدیث نقل کی ہے: لولا السلطان لاکل الناس بعضهم بعضاً (اگر سلطان نہ ہو تو لوگ ایک دوسرے کو نگل جائیں) آداب الحرب ص ۱۱۳ الف۔ یہی حدیث محمد بن تغلق کے سکوں پر بھی درج ہے۔ ملاحظہ ہو Wright p. 143

کیا کہ اُن کی اطاعت اور فرمانبرداری کو مذہبی فریضہ سمجھیں۔ چنانچہ جگہ جگہ "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم"[1] پر زور دیا گیا ہے۔ محمد بن تغلق نے جب ملک میں اپنے خلاف جذبات کو مشتعل پایا تو لوگوں کے مذہبی احساسات سے اس طرح اپیل کی کہ سکوں پر "من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمٰن" "لا یولا السلطان کل الناس بعضھم بعضاً"[2] کھدوا دیا۔ ان اعلانات اور اس طرز فکر کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بغاوت کو عصیان اور معصیت بنا کر پیش کیا جانے لگا۔ چنانچہ فخر مدبر اور منہاج السراج باغیوں کے متعلق "عاصی شدند" کا جملہ استعمال کرتے ہیں[3]۔ سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاںؒ فرمایا کرتے تھے۔

بادشاہان روئے زمین برگزیدگاں خداوند عزوجل اند، ہیچ سبیلے اہانت و ترک فرمان ایشاں در مشروعات درست و جائز نیست لہذا چندیں عبادات وطاعات را حق سبحانہٗ تعالیٰ مفوض درامر ایشاں گردانیدہ است، و چوں نماز جمعہ و نماز عید، ستدن مال بیت المال بعلم ایشاں حلال است پس مخالفت درامر ایشاں، سرّاً و علانیۃً جائز نیست۔۔ داگر معونت او نکنی۔۔۔۔ فردا قیامت ازیں جہت ترا عذاب سخت بکنند[4]۔	دنیا کے بادشاہ اللہ تعالیٰ کے منتخب ترین لوگ ہیں۔ کسی طرح بھی ان کی توہین کرنا یا اُن کے فرمان کو ترک کرنا، اُن معاملات میں جو مشروع ہوں، درست اور جائز نہیں ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے کتنی ہی عبادتیں ان کے حکم سے متعلق رکھی ہیں۔ مثلاً نماز جمعہ، نماز عید ان کے علم سے بیت المال کا مال لینا حلال ہے، اُن کے حکم کی مخالفت خواہ وہ پوشیدہ طور پر ہو یا کھلی ہوئی، جائز نہیں ہے۔۔۔۔ اگر تم اُن کی مدد نہیں کروگے تو کل کو قیامت کے دن اس سبب سے تم پر سخت عذاب کیا جائیگا۔

---

[1] منشآت ماہرو ص ۲

[2] Chronicles of the Pathan Kings of Delhi، نیز Wright p. 143 p. 250

[3] آداب الحرب ص ۱۰۰ ب، ۱۰۲ الف؛ طبقات ناصری ص ۱۱۶

[4] ملفوظات قطب عالم (قلمی نسخہ اٹاوہ اسلامیہ کالج لائبریری) ص ۱۶ الف

مذہب کو جس طرح ذاتی اقتدار بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس کی ایک دلچسپ مثال فیروز شاہ تغلق کے فرامین میں ملتی ہے۔ لکھا ہے:

"در قول امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آمدہ است 'مایزع السلطان اکثر ممایزع القرآن' یعنی منع سلطان بیشتر از منع قرآن است"[۱]	امیر المومنین حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ سلطان کا منع کرنا قرآن کے منع کرنے سے بڑھ کر ہے۔

اور یہ اُس سلطان کا قول ہے جس کو ہندوستان میں مذہبی اعتبار سے بڑا درجہ دیا گیا ہے!

(۵) جہاں تک عام مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا تعلق تھا، سلاطین اس میں گہری دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ وہ مساجد تعمیر کرتے تھے، امام، مؤذن اور مذکر مقرر کرتے تھے اور اُن کو وظائف دیتے تھے۔ اور شیخ الاسلام اور صدر الصدور کے ذریعہ مذہبی طبقہ سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مذہبی کاموں کے لیے اوقاف قائم کیے جاتے تھے[۲]۔ مذہبی تہواروں بالخصوص عیدین اور شب برات کے موقعوں پر خاص اہتمام کیے جاتے تھے اور کئی کئی دن تک عام داد و دہش جاری رہتی تھی[۳]۔ شب برات میں آتشبازی چھوڑنے پر بعض علماء و مشائخ سخت اعتراض کرتے تھے[۴] لیکن عوام کے جذبات کا ساتھ دیتے ہوئے سلاطین اس کو جاری رکھتے تھے۔ فیروز شاہ کی طرف سے چراغاں اور آتشبازی کا جو اہتمام ہوتا تھا اُسے دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ

---

۱ منشات ماہرو۔ ص ۲

۲ شہاب الدین محمد غوری، غیاث الدین تغلق وغیرہ کے بعض اوقاف کا ذکر منشات ماہرو (ص ۳۳۔۳۴۔۳۴) میں ملاحظہ کیجیے۔

۳ ملاحظہ ہو عجائب الاسفار۔ ص ۱۰۲؛ تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۳۶۴ - ۳۶۵

۴ سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں ؒ نے ایک بار فرمایا تھا:

ایں فقیر چوں بزیارت خانۂ کعبہ می رفت در ملک غزنین و در ولایت خراسان و در زمین عرب دیدم ہیچ بدعتے ازیں بدعتہا کسے نمی کند۔ پس ثابت شد کہ باتفاق مسلمانان خاص نیست بلکہ عوام خلق ہندوستان کہ خبر از دین ندارند، دریں شب بدیں نامشروعات مشغول می گردند، نامۂ خود را سیاہ می کنند (ملفوظات قطب عالم قلمی ص ۲، ۷ نسخہ)	یہ فقیر جب خانۂ کعبہ کی زیارت کو گیا تھا تو ملک غزنین، خراسان اور عرب میں دیکھا کہ اس قسم کی کوئی بدعت وہاں رائج نہیں پس ثابت ہوا کہ اس کا کوئی خاص تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے عوام جو دین سے بے بہرہ ہیں اس شب میں غیر شرعی چیزوں میں مشغول ہو کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرتے ہیں

آتے تھے اور ہندو بھی اس میں شریک ہوتے تھے[1] رمضان کے مہینے میں بعض سلاطین روزانہ محفلیں منعقد کرتے تھے[2] بعض سلاطین وعظ سننے کے لیے خود علمار کے مکانوں پر جاتے تھے[3]

(۶) اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجاتا جس میں علمار یا مشائخ کے درمیان اختلاف ہوتا اور معاملہ کی نوعیت مذہبی ہوتی تو محضر طلب کیے جاتے تھے۔ اور یہ اکثر ایسی صورت میں کیا جاتا تھا جب سلطان کسی فیصلہ کی ذمہ داری اپنے اوپر لینا خلافِ مصلحت سمجھتا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ التتمش صوفیہ سے گہری عقیدت رکھتا تھا لیکن جب قاضی سعد اور قاضی عماد نے صوفیہ دہلی بالخصوص قاضی حمید الدین ناگوری کے سماع سننے کے متعلق شکایت کی تو اس کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ معاملہ کو خود ختم کردے بلکہ اس کے لیے محضر طلب کیا۔ اسی کے زمانہ میں ایک اور محضر اس وقت بلایا گیا تھا جب دہلی کے شیخ الاسلام نجم الدین صغری نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ پر ایک بے بنیاد الزام لگایا تھا[4] تیسری بار محضر سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں سیدی مولاؔ کے سلسلہ میں بلایا گیا تھا[5] چوتھی بار محضر سلطان غیاث الدین تغلق نے طلب کیا تھا تاکہ شیخ نظام الدین اولیار کے سماع سننے پر علمار کے اعتراض اور شیخ کے جوابات پر شرعی نقطۂ نظر سے غور کرنے کا موقع ملے[6] ان مجلسوں کی تفصیل مناسب مقامات پر نظر سے گزریگی۔

دینی معاملات میں سلاطین کی مداخلت کے دو سبب تھے۔ اول تو حکومت کا دائرۂ اختیار اس قدر وسیع تھا کہ جب کبھی دینی معاملات میں بھی اختلافات رونما ہوتے تھے تو حکومت کسی نہ کسی طرح اُن میں دخیل ہو ہی جاتی تھی، دوسرے علمار کا وہ طبقہ جو حکومت وقت سے متعلق تھا ہمیشہ کوشاں رہتا تھا کہ سلاطین کے اقتدار کا دائرہ دینی زندگی کے اُن گوشوں تک پہنچادے

---

[1] عفیف کا بیان ہے: خلائق از اطراف واکناف دار الملک دہلی و خلق دہلی مخصوص کردہ دریں شبہا در فیروز آباد از عوام و خواص، مسلم و ہنود، صغیر و کبیر حاضر شدہ تماشائی دیدند" تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۶

[2] طبقات ناصری ص ۱۷۵ [3] تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۳۴۶

[4] سیر العارفین (قلمی)، ص ۱۰۸-۱۱۰؛ اخبار الاخیار ص ۴۳؛ گلزار ابرار (قلمی)

[5] تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۲۱۰ [6] سیر الاولیار ص ۵۲۸

جہاں بصورت دیگر سیاسی اثرات کا گزر ممکن نہیں تھا۔

عالم آباد میں ایک مرتبہ نماز کے سلسلہ میں کچھ جھگڑا ہوا تو عین الملک ماہرو نے لکھا:۔

"فی الجملہ ایں مصالح اگرچہ امور دینی است	حاصل سخن یہ ہے کہ یہ معاملہ اگرچہ امور دینی میں سے
اما اذن اولی الامر امام یا نائب اومی باید[1]	ہے لیکن اولی الامر یا اس کے نائب کی اجازت اس
	میں ضروری ہے۔

سلطان قطب الدین مبارک خلجی ایک بار دہلی سے باہر گیا اور دارالسلطنت کا انتظام باربلدا کے سپرد کر گیا۔ "دانشمندان دہلی" نے باربلدا سے اس بات کی اجازت لے لی کہ نماز جمعہ میں امام جب "سمع اللہ لمن حمدہ" کہے تو مقتدی بجائے "ربنا لک الحمد" کے "اللّٰھم ربنا لک الحمد" کہیں۔ مولانا ضیاء الدین سنامی کو اس کا علم ہوا تو اُنھوں نے سلطان کو خط لکھا[2]۔ محمد بن تغلق کو جب یہ خیال پیدا ہو گیا کہ خلیفہ کی اجازت کے بغیر حکومت جائز نہیں تو اس نے تمام مملکت میں نماز جمعہ اور عیدین بند کرا دیں[3]۔

(۷) جہاں تک "پرسنل لا" کا تعلق تھا، سلاطین دہلی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مکمل آزادی دی تھی۔ اور وہ اُن قوانین میں مداخلت کو نہ خود مناسب سمجھتے تھے اور نہ کبھی اس کی ضرورت پیش آئی تھی۔

ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی بیشتر تعداد فقہ حنفی میں اعتقاد رکھتی تھی[4]۔ امیر خسروؒ کا بیان ہے ؎

مسلماناں نعمانی روش خاص ۔۔۔ ز دل ہر چار آئیں را باخلاص

نہ کیں با شافعی نے مہر با زید ۔۔۔ جماعت را و سنت را بجاں صید[5]

[1،2] منشأت ماہرو۔ ص ۳۹ ۔۔۔ [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۹۱-۴۹۲

[4] مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ بہت سے امراء اور حکام فقہ کے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے وہ مختلف مذاہب کے پیرو تھے لیکن عموماً ہندی مسلمان فقہ حنفی کو مانتے تھے (انگریزی ترجمہ ص ۲۷)

[5] دول رانی خضر خاں ص ۴۶-۴۷۔

معلوم ہوتا ہے کہ قاضیوں، شیخ الاسلام وغیرہ کے تقرر میں یہ تخصیص نہیں کی جاتی تھی کہ وہ حنفی المذہب ہی ہوں۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں اودھ کے شیخ الاسلام ایک شافعی عالم، مولانا فریدالدین تھے[۱] ابن بطوطہ جس کو محمد بن تغلق نے دہلی کا قاضی بنایا تھا، مذہباً مالکی تھا۔ اس زمانہ کے مسلمان عوام اس اختلافِ عقائد کو برداشت کر لیتے تھے لیکن کسی غیر متدین شخص کو ان ذمہ دار عہدوں پر دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ علاء الدین خلجی نے حمید ملتانی کو قضا کا کام سپرد کیا تو لوگوں نے اس کی 'دنیا داری' اور 'نااہلیت' کے پیشِ نظر اس پر اعتراض کیا[۲]

(۸) سیاسی معاملات میں سلاطین کا طرزِ عمل بالکل سیاسی مصالح متعین کرتے تھے۔ ایسی صورت میں مذہبی اصولوں سے چشم پوشی اختیار کر لی جاتی تھی اور کسی غیر شرعی طریقہ کار سے گریز نہ کیا جاتا تھا۔ مثلاً وراثت کے اصول پر عمل کرتے ہوئے سلاطین اپنی طاقت کے استحکام کے لیے ہر جائز اور ناجائز طریقہ استعمال کرتے تھے[۳] عورتوں اور نابالغوں کو تخت پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ التتمش نے جب اپنے بیٹوں کو تخت کا اہل نہ پایا تو بیٹی کو جانشین مقرر کر دیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے کہ "ما افلح قوم ولوا امرھم امراۃ"[۴] آنکھیں بند کر لیں۔ حالانکہ اس کے معاصر مورخ اور علماء عورتوں کی نسبت اپنی رائے کا اس طرح اظہار کر رہے تھے:۔

"در زناں مشورت نباید کرد و اگر مشورہ کردہ شد بارائے وگفت ایشاں کار نباید کرد، چنانکہ پیغامبر علیہ السلام می فرماید: شاوِروا النساء وخالفوھن، بازناں	عورتوں سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے اور اگر ان سے مشورہ کیا جائے تو ان کے کہنے پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ عورتوں سے مشورہ کرو لیکن جو کچھ وہ

---

[۱] سیر الاولیاء ص ۲۷۵ [۲] تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۲۹۸

[۳] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۴۷، ۴۸ ؛ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۷۶

[۴] ازالۃ الخفاء عن الخلفاء ص ۸ ، حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۵۶

مشورہ کنید وآنچہ بگویند کار مکنید"[1] کہیں اس پر عمل نہ کرو۔

صحیح ہے کہ تخت نشینی کے وقت امراء واکابر کی رائے اور اعانت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن اس میں "شوریٰ" کے مذہبی تصور سے زیادہ سیاسی مصالح پیش نظر ہوتے تھے۔ اور یہ صرف ایک نمائشی عمل تھا ورنہ تخت نشینی کا مسئلہ تو جنگ کے ذریعہ طے ہوتا تھا۔ بیعت عام، جس کا ذکر معزالدین بہرام[2]، علاء الدین مسعود[3]، ناصر الدین محمود[4] وغیرہ کے سلسلہ میں ملتا ہے محض ایک رسم تھی اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ التتمش کے بعد امراء نے رضیہ کے بجائے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھا دیا، تو رضیہ نے ایک دن مجمع عام میں لوگوں کو مخاطب کیا اور کہا کہ وہ امتحان کے لیے اس کو تخت پر بٹھا دیں، اگر وہ اہل نہ ثابت ہو تو اس کو معزول کر کے تخت کسی دوسرے کو دے دیا جائے[5]

پیے امتحاں تاج بر سر نہید | مگر از غم مملکت وارہید
زمرداں اگر بہتر آیم مرا | بدارید بر جائے فرمانروا
سپارید آں راکہ دارید رائے | بگردید پیش اطاعت گرائے

رضیہ نے جو بات کہی تھی اگر اس کے پیچھے مذہبی جذبات کار فرما ہوتے تو عہد سلطنت میں شوریٰ کا نظام قائم ہونے کے امکانات بڑھ جاتے!

(۹) دور سلطنت میں حکومت کی پالیسی اور اس کا طریقۂ کار بادشاہ متعین کرتا تھا یا اس کے سیاسی مشیر جو نظام الملک، مؤید الملک، صدر الملک، عین الملک ہوتے تھے، نہ کہ علماء یا شیخ الاسلام۔ دیوان قضا جہاں بیشتر علماء کا عمل دخل ہوتا تھا، حکومت کے کاروبار میں براہ راست کوئی دخل نہیں رکھتا تھا۔ علماء نے اگر کبھی سیاست میں حصہ لیا تو مذہبی حیثیت سے نہیں بلکہ اور دوسرے سیاسی کارکنوں کی طرح۔ ایسا ضرور ہوتا تھا کہ بعض اوقات

---

[1] آداب الحرب والشجاعت ص ۶۸ الف [2] طبقات ناصری ص ۱۹۱ [3] ایضاً ص ۱۹۸
[4] ایضاً ص ۲۰۸ [5] فتوح السلاطین (مدراس ایڈیشن)، ص ۱۳۶

کہیں باغیانہ جذبات مشتعل ہوتے تو علماء کو بھیجا جاتا تاکہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے حالات کو قابو میں لے آئیں[1] یا کسی علاقہ میں محاصل کے وصول کرنے میں دقت ہوتی تو علماء کے ذریعہ اس مشکل حل کیا جاتا تھا[2] لیکن جہاں تک حکومت کی پالیسی کا تعلق تھا اس میں علماء کو کوئی دخل نہ تھا اور باگ ڈور کلیتہً سیاسی طاقتوں کے ہاتھ میں تھی۔

(۱۰) نظام حکومت کے جس حصہ میں سلاطین نے سب سے زیادہ مذہبی اثرات قبول کیے وہ عدل و انصاف کا تھا۔ عموماً اس کام کو دینی فریضہ کی حیثیت دی جاتی تھی۔ امیر خسرو نے انصاف و داد کو شرائط جہانداری قرار دیتے ہوئے، بادشاہ کو ہدایت کی ہے ؎

آں عمل آرند کہ در دیہ و شہر منعم و مفلس شود آسودہ بہر[3]

دیگر مصنفین نے عدل کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ مظلوم خواہ کافر ہو، اس کی دعا میں تاثیر ہوتی ہے[4] اور ملک "کفر" کے ساتھ باقی رہ سکتا ہے لیکن "ظلم" کے ساتھ نہیں "الملك يبقى مع الكفر ولا يبقى مع الظلم"[5]

ایبک کے متعلق لکھا کہ اس کے انصاف کے باعث بھیڑ اور بھیڑیا ایک ہی تالاب پر پانی پی سکتے تھے[6] التمش کے محل کے دروازہ پر زنجیریں لٹکی رہتی تھیں، جو مظلوم بجاتا تھا، سلطان اس کی فریاد سنتا تھا[7] بلبن کے متعلق برنی کا بیان ہے:

"در داد دہی و انصاف ستانی روئے	انصاف کے معاملہ میں وہ بھائی، بیٹے، عزیز،
برادران و پسران و مقربان و خواصان	قریب کسی کے ساتھ رو رعایت نہ کرتا تھا۔
خود نگاہ نداشتے و اگر کسے از نزدیکان	اس سے قربت رکھنے والے لوگوں میں سے
او مظلمت کردے قضیہ داد دہی فرو گذاشت	اگر کوئی ظلم کا مرتکب ہوتا تو انصاف کرنے میں

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۹۶؛ [2] خشانت ماہرو۔ ص ۴۷
[3] مثنوی نہ سپہر ص ۲۴۲ [4] آداب الحرب ص ۳۶ الف [5] سیاست نامہ نظام الملک طوسی ص [6] تاج المآثر۔ ص ۳۳۸ - ۳۳۹ [7] عجائب الاسفار ص ۵۳

نہ کردے، تا انصاف مظلوم از مقرب خود	بالکل تامل نہ کرتا تھا جب تک مظلوم کی دادرسی
نہ ستدے دل او بیارامیدی و در حالت	اپنے مقرب کے مقابلہ میں نہ کرلیتا تھا اس کے
دادہی وانصاف ستانی نظر او دریں	دل کو سکون نہیں آتا تھا جب انصاف کرتا
نافتادے کہ ظلم از انصار و اعوان من	تھا تو اس کا خیال کبھی اس طرف نہیں جاتا تھا
است مصلحت ملکی نباشد کہ بدو کوفت	کہ ظلم میرے انصار و اعوان نے کیا ہے اور یہ خلاف
رسد و درباب مظلومان و عاجزان پدری	مصلحت ہے کہ اس کو رنج پہنچے مظلوموں اور
و مادری کردے"[1]	عاجزوں کے ساتھ تو ماں باپ کا برتاؤ کرتا تھا۔

محمد بن تغلق کے متعلق تو ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہندو کے استغاثہ پر قاضی کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوا تھا۔[2]

لیکن ایک معاملہ سزاؤں کا تھا۔ بالخصوص ان سزاؤں کا جو حکومت کے خلاف جرم کرنے والوں کو دی جاتی تھیں۔ ایک دو مثال ایسی ضرور ملتی ہے جب علمار نے کسی سزا کی غیر شرعی نوعیت پر اعتراض کیا اور سلاطین نے اس کو تسلیم کرلیا[3]، لیکن عموماً ان معاملات میں سلاطین شرعی نقطۂ نظر کو بہت کم اہمیت دیتے تھے۔ علماء کو اول تو ان معاملات میں دخل نہیں ہوتا تھا اگر ہوتا بھی تو سوائے مہر توثیق ثبت کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ محمد بن تغلق نے اپنے نفس کو دھوکا دینے کے لیے ایک شرعی حیلہ نکال لیا تھا اور وہ یہ کہ کسی کو وہ اس وقت تک سزا نہیں دیتا تھا جب تک کہ علمار اس کی رائے سے متفق نہ ہو جائیں۔ وہ اپنے فلسفیانہ دلائل اور منطقی بحث سے ان کو عاجز کر دیتا تھا۔[4] پھر کچھ مفتی ایسے بھی تھے کہ اُن کو سلطان کی رائے کے خلاف کہنے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ برنی نے لکھا ہے:

"و دیوان سیاست وضع کردہ بودند و	اور اس نے ایک دیوان سیاست قائم کیا تھا

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۰ [2] عجائب الاسفار ص ۱۳۰ [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۱۱
[4] تاریخ مبارک شاہی یحییٰ سرہندی ص ۱۱۵-۱۱۶

"چندیں بے دین، بدبخت را مفتی دیوان سیاست گردانیده، وچند مرتد صفتاں کافر خو، را آمر و متصرف و متفحص دیوان سیاست ساختہ، کار سیاست بجائے رسیدہ کہ آسمان و زمین و فلک و ملک بیزار شدند و تنفر کردند" [1]

اور چند بے دین، بدبخت لوگوں کو مفتی دیوان سیاست بنایا تھا۔ اور چند مرتد صفت، کافر خصلت لوگوں کو دیوان سیاست کا آمر، متصرف اور متفحص مقرر کر دیا تھا۔ قتل و خونریزی کا کام یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ آسمان اور زمین اور فرشتے تک بیزار اور متنفر ہو گئے۔

اسی طرح بلبن کے متعلق برنی نے لکھا ہے کہ:

"از شدت دوستی ملک چند روزہ در خاطر او نگذشتے بہر وجہ کہ مسلمانان را بکشند خواہ بہ تیغ و خواہ بزہر و خواہ بخفیہ و خواہ بلت و چوب و خواہ بہ عذر و خواہ بہ بے نانی و بے آبی و خواہ از بلندی فرو انداختن و خواہ در آب غرق کردن و با آتش سوختن کہ جواب خون او فردائے قیامت خواہند طلبید" [2]

ملک چند روزہ کی محبت میں اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اس کے دل میں یہ بات نہ آئی تھی کہ خواہ کسی طرح سے وہ مسلمانوں کو مارے گا، چاہے تلوار سے، یا زہر دے کر، یا پوشیدہ طریقہ سے یا لت و چوب سے، یا بھوکا پیاسا رکھ کر، یا بلندی سے پھینک کر، پانی میں غرق کر کے، یا آگ میں جلا کر —— اس سے قیامت کے دن اس خونریزی کا مواخذہ کیا جائیگا۔

علاء الدین خلجی کے عہد میں ایک نہایت ہی غیر شرعی طریقہ یہ جاری ہو گیا تھا کہ باغی کے پورے خاندان کو سزا دی جاتی تھی [3]۔ اس غیر شرعی نظام تعزیر کو ختم کرنے کی ایک کوشش فیروز شاہ

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۹۷ [2] ایضاً ص ۴۸

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۵۳ رسول اکرم صلعم نے عہد جاہلیت کے اس طریقہ کو بالکل ختم کر دیا تھا اور فرمایا تھا: "الا لا یجنی جان الا علی نفسہ الا یجنی جان علی ولدہ ولا مولود علی والدہ" (ابن ماجہ و ترمذی) مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں، بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔

نے کی تھی۔ خود لکھتا ہے:

"در عہود ماضیہ بسے خونِ مسلمانان ریختہ شدی وانواع تعذیب از بریدن دست و پا و گوش و بینی وکشیدن چشم وریختن ارزیر گداختہ در حلق خلق وشکستن استخوانہائے دست و پا بہ میخکوب و سوختن اندام بآتش وزدن میخہا بردست و پا وسینہ وکشیدن پوست وزدن دُرہ ہا بامیخہائے آہنی، وبُریدن پے، و دونیم کردن آدمی بہ آرہ، وبسیار انواع مثلہ کردن واقع می شد" ۱؎

گزشتہ زمانہ میں مسلمانوں کا خون ناحق بری طرح بہایا جاتا تھا اوران کو مختلف قسم کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں ناک کان کاٹنا، آنکھیں نکال لینا، لوگوں کے گلے میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنا، ہاتھ پاؤں کی ہڈیوں کو ہتوڑے سے توڑنا، بدن کو آگ سے جلانا، ہاتھ پاؤں اور سینہ میں لوہے کی کیلیں ٹھونکنا۔ کھال کھینچ لینا، لوہے کی میخوں والے دُرّے لگانا، لنگڑا کر دینا آرے سے انسان کو چیر کر دو کر دینا۔ غرض اس طرح اعضا تراشی کے بہت سے طریقے رائج تھے۔

وہ اپنے گورنروں کو بھی ہدایت کرتا تھا کہ سزاؤں کے معاملہ میں انتہائی احتیاط سے کام لیں اور نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر "جان آدمی" کے احترام کو فراموش نہ کر دیں۔ ۲؎

(۱۱) احتساب کو مسلمان بادشاہ ایک مذہبی فرض سمجھتے تھے۳؎ ان سلاطین کو چھوڑ کر جو خود ہنگامہ ہائے نا ؤ نوش میں گرفتار رہتے تھے، باقی سب نے اس ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا۔ ابتدائی دور میں جہاں جہاں مسلمانوں کی نو آبادیاں وجود میں آئیں، وہاں قاضیوں اور محتسبوں کا تقرر بھی عمل میں آیا۴؎ علاء الدین خلجی نے درستگی اخلاق اور انسداد شراب نوشی کے سلسلہ میں نہایت سختی سے احتسابی کارروائی کی۵؎ شراب نوشی

۱؎ فتوحات فیروز شاہی ص ۲ ۲؎ ملاحظہ ہو فیروز شاہ کا فرمان، خان اعظم ہمایوں فتح خاں کے نام، منشآت ماہرو ص ۵ ۳؎ اخلاق کی کتابوں میں جگہ جگہ بادشاہ کو اس فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو احکام السلطانیہ (اُردو ترجمہ) ص ۲۸، ۳۷۶ وغیرہ۔

۴؎ طبقات ناصری ص ۱۷۵ ۵؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۴؛ خزائن الفتوح ص ۱۸-۲۰

کے انسداد کی وجہ سے خزانہ کو بے اندازہ محاصل کا نقصان برداشت کرنا پڑا[۱]۔ محمد بن تغلق کے متعلق لکھا ہے کہ وہ نماز نہ پڑھنے پر لوگوں کو سزائیں دیتا تھا[۲]۔ شاہی خاندان کی ایک عورت زنا کی مرتکب ہوئی تو سلطان نے بلا پس و پیش اس کو سنگسار کرادیا[۳]۔ فیروز شاہ نے اباحتی طرز زندگی کو سختی سے روکا۔ ملتان کا ایک واقعہ لکھا ہے:

"بعض رساتیق ملتان راکہ منکوحہ یکے پیش از طلاق دیگرے بزنے می گیرند ایں عادت مردود و بدعت نامحمود کہ در جمیع ادیان حرام است میان ایناں شائع و مستفیض، سزا و زجرے باستقصا و واجب بینید[۴]"	ملتان کے بعض گنواروں میں یہ رسم جاری ہو گئی ہے کہ دوسرے کی منکوحہ کو طلاق سے پہلے اپنی بیوی بنا لیتے ہیں۔ یہ عادت مردود ہے اور نہایت ہی منحوس بدعت ہے۔ کیونکہ تمام مذہبوں میں یہ بات حرام ہے۔ پوری کوشش کے ساتھ ایسے معاملوں میں تعزیری کارروائی کریں۔

فیروز شاہ کی ہدایت تھی کہ

"طائفہ کہ پائے از دائرہ شریعت بیروں می نہند و در چیزے کہ خلاف مذہب است اقدام می نمایند، بصلابت تمام و حسن اہتمام مانع و زاجر باشند[۵]"	ایسے لوگ جو دائرہ شریعت سے باہر قدم رکھیں اور ایسی چیز کو شروع کریں جو خلاف مذہب ہو تو پوری سختی اور حسن اہتمام سے تنبیہ کرنی چاہیے اور روکنا چاہیے۔

(۱۲) اقتصادی نظام: مواد کی کمی کے باعث سلطنت دہلی کے اقتصادی نظام کے بہت سے پہلو اب تک تشنۂ تفسیر و تعبیر ہیں، اور ہمیں بعض بنیادی مسائل کے متعلق بھی پوری معلومات نہیں ہے۔

شریعت نے حکومت کے مندرجہ ذیل ذرائع آمدنی قرار دیے ہیں:

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۴ [۲] عجائب الاسفار۔ ج ۲ ص ۱۳۰۔ ۱۳۱

[۳] عجائب الاسفار۔ ج ۲ ص ۱۳۷ [۴-۵] منشآت ماہرو۔ ص ۱۶

(۱) خراج (۲) عُشر (۳) جزیہ (۴) زکوٰۃ (۵) فے

اسلامی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان ٹیکسوں کی نوعیت، وصولیابی کے طریقوں اور مقدار کے تعین میں ہر علاقہ کے مخصوص سیاسی اور معاشی حالات کے پیش نظر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ جس وقت سلطنت دہلی کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی، اور اس کے سیاسی اور اقتصادی ادارے وجود میں آرہے تھے، فخر مدبر نے لکھا تھا:

"و دیگر عمال و گماشتگان بر سر ولایت و عمل روند بر ایشاں تاکید کنند تا انچہ از غلّہ و خراج و مراعی ستانند بر حکم فرمان شریعت محمود و قانون ستانند و بیروں قانون بظلم و محدث نستانند و رعایا را بدیں سبب درویش و مستاصل نگردانند"۔ ؎۲

اور عمال اور گماشتے جو عمل داری کے لیے جائیں انہیں تاکید کی جائے کہ جو کچھ غلّہ خراج یا مراعی وصول کریں شریعت اور قانون کے مطابق کریں۔ اور قانون سے زیادہ یا ظلم وستم سے نئی چیزیں وصول نہ کریں اور رعایا کو اس طرح برباد نہ کریں اور فقیری تک نہ پہنچائیں۔

چنانچہ قطب الدین ایبک نے لاہور میں اعلان کیا تھا کہ ——

"املاک مسلمانان را بر مالکان مقرر دارند و خراجے کہ از املاک بیرون شرع و فرمان خدای می ستدند و آں خمس بود برانداخت و چنانکہ شریعت فرمودہ است جائے عشر و جائے نصف عشر معین فرمود و مثال داد تا توقیع نوشتند... و محدثے بزرگ در

مسلمانوں کی زمینیں اُن ہی کے پاس رہنے دیں اور وہ خراج جو خلاف شرع لیا جاتا تھا اور جو کل پیداوار کا پانچواں حصّہ تھا لینا بند کر دیا گیا اور جس طرح شریعت کا حکم ہے کہیں سے عشر اور کہیں سے نصف عشر مقرر کر دیا اور حکم دیا کہ توقیع لکھیں۔ اور جو ٹیکس شرعاً ناجائز تھے

؎۱ ابتدائی دور میں محاصل کی نوعیت کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو۔
Frede Lokkegaard: Islamic Taxation in the Classic Period.

؎۲ آداب الحرب ص ۱۴- الف

شرع جائز نبود برانداخت"[1] وہ ختم کردیے۔

غالباً عشری اور غیر عشری کا یہ فرق صرف اُن علاقوں تک محدود رہا جو غزنویوں نے فتح کیے تھے، ورنہ اور علاقوں کے متعلق تو عمل اسی اصول پر رہا کہ بغیر کسی مذہبی تخصیص کے سب سے خراج وصول کیا جائے۔ فخر مدبر التتمش ہی کے عہد میں اس مسئلہ کو صاف کر دیتا ہے۔ لکھتا ہے:

وہر کہ از اہل خراج مسلمان شود، ہماں	اہل خراج میں سے جو بھی مسلمان ہو جائے اس سے
خراج ستانند کہ پیش ازاں بودہ است و	وہی خراج لیا جائے جو اس سے پہلے لیا جاتا تھا
روا باشد کہ مسلماناں زمین خراج بخرند	اگر مسلمان خراجی زمین خریدلیں تو ان سے وہی
از ذمی ہماں خراج واجب آید کہ از	خراج لیا جائے جو ذمی سے لیا جاتا تھا۔ خراجی
ذمی ستدندے وعُشر در زمین خراج واجب	زمین سے عُشر نہیں لیا جاتا۔
نیاید"[2]	

چنانچہ بلبن کے عہد میں ایک شخص سراج الدین نامی سے خراج وصول کرنے کا واقعہ ملتا ہے۔ لکھا ہے:

"در دیہ مولانا سراج الدین ساوی کہ	مولانا سراج الدین ساوی کے گاؤں سے جو
از شعرائے معروف سامانہ بود، خراج	سامانہ کے مشہور شاعر تھے، خراج لیا جاتا تھا
پذیرفتند"[3]	

عہد فیروز شاہ کے دو مصنف، صاحب فقہ فیروز شاہی[4] اور صاحب علم الحساب[5] نے امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک بیان کیا ہے کہ خراجی زمین مسلمان کے خرید لینے پر بھی خراجی ہی رہتی ہے۔

دوسرا مسئلہ زکوٰۃ کا ہے۔ عہد سلطنت کے پورے لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ نہیں ملتا جس سے

---

[1] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۳۳-۳۴ [2] آداب الحرب ص ۱۵۸۔ الف

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۴۔

[4] فقہ فیروز شاہی (قلمی نسخہ) نیز ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب: دہلی سلطنت کا نظام حکومت ص ۹۶۔ [5] علم الحساب (انگریزی ترجمہ) ص ۸۔

زکوٰۃ کے حاصل کرنے کی صحیح نوعیت کا پتہ لگایا جا سکے۔ البتہ مال تجارت پر زکوٰۃ وصول کرنے کے حوالے ضرور ملتے ہیں، لیکن وہ ایک طرح کی چنگی تھی۔[۱] فقہ فیروز شاہی میں زکوٰۃ کے لیے ایک علیحدہ بیت المال کا بھی ذکر ہے[۲] لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ فیروز شاہ کے عہد میں ایسا کوئی انتظام تھا، دشوار ہے۔ برنی نے محتسب کے فرائض میں سے ایک اہم فرض یہ بتایا ہے کہ "از اغنیاء فقراء را بزور زکوٰۃ بدہانند"[۳] کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ حکومت براہ راست زکوٰۃ وصول ہی نہیں کرتی تھی!

مال غنیمت کی تقسیم کے شرعی اصول پر آداب الحرب میں تفصیلی بحث موجود ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب مال غنیمت آئے تو بادشاہ کو یہ حق ہے کہ کوئی ایک چیز جو اس کو پسند ہو اپنے لیے نکال لے،[۴] اس کے بعد

"بادشاہ باید کہ غنیمت قسمت کند خمس بستاند، و چہار خمس دیگر بر غنیمت کنندگان قسمت کند"[۵]	بادشاہ کو چاہیے کہ غنیمت کو تقسیم کردے پانچواں حصہ لے لے، اور باقی چار حصے سپاہیوں میں بانٹ دے۔

لیکن تاریخی شواہد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اصول پر ہمیشہ عمل نہیں ہوا۔ ۱۲۳۳ء میں ملک تابسی نے بلاد کالنجر پر حملہ کیا اور مال غنیمت لایا تو اس کی تقسیم شرعی طریقہ پر کی گئی۔[۶]

---

[۱] منشات ماہرو میں "زکوٰۃ و دانگانہ" ساتھ استعمال ہوا ہے (ص ۵۰) جس سے ٹیکس کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ (ص ۵۱) لکھا ہے "زکوٰۃ کہ آں را بتہ می گویند"۔
جو مال تجارت باہر سے آتا تھا اس پر بتہ ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اس کا تعین سرائے عدل میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد مال دریبہ میں آتا تھا، وہاں ایک اور ٹیکس لیا جاتا تھا جو ایک تنکہ پر ایک دانگ ہوتا تھا۔
(عفیف: تاریخ فیروز شاہی ص ۳۷۵)

[۲] فقہ فیروز شاہی ص ۱۰۴ الف بحوالہ سلطنت دہلی کا نظام حکومت، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ص ۹۶

[۳] فتاوائے جہانداری ص ۹ ب [۴] ایسی چیز کو صفیہ کہتے تھے۔ ملاحظہ ہو آداب الحرب ص ۱۵۵

[۵] آداب الحرب ص ۱۵۵ ب [۶] طبقات ناصری ص ۲۴۰۔ "غنائم بسیار بدست آورد۔ چنانچہ مدت پنجاہ روز بیست و پنج لکھ خمس سلطانی در قلم آمد"

لیکن ۶۵۷ھ ۱۲۵۹ء میں جب الغ خاں میوات کی مہم سے تینتیس ہزار تنکے کے چھٹے کا حصہ لایا تو یہ پوری رقم خزانہ میں پہنچادی گئی[1] غالباً سلاطین دہلی کا عام دستور یہی تھا کہ ⅘ شر کا رجنگ کو دیدیتے تھے اور بقیہ سب خزانہ میں داخل ہو جاتا تھا۔ فیروز شاہ نے اس صورت حال کو بدلا[2]۔ منشات ماہرو میں عمال حکومت کو صاف ہدایت ہے :

"چوں غنائم بہ بلاد اسلام برسد، بحکم خدا بر شریعت مصطفیٰ قسمت شود... واین قسمتے است کہ در جہاں تا امروز کسے نکردہ است"[3]

جب مال غنیمت بلاد اسلام میں پہنچے تو شریعت کے مطابق تقسیم کر دیا جائے اور یہ تقسیم کا وہ تناسب ہے جس پر دنیا میں اب تک کسی نے عمل نہیں کیا ہے۔

فیروز شاہ نے بہت سے ٹیکس جن کی تفصیل آگے آئیگی اس نظر سے معاف کردیے کہ وہ غیر شرعی تھے۔

---

[1] طبقات ناصری ص ۳۱۵-۳۱۶

[2] فتوحات فیروز شاہی ص

[3] منشات ماہرو۔ ص ۲۹

سلطنت دہلی میں غیر مسلم

(۱) فقہاء اسلام نے غیر مسلموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اہل کتاب، مشابہ اہل کتاب، اور مشرکین۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں نے قدم رکھا تو سب سے پہلا مسئلہ اُن کے سامنے یہ آیا کہ ہنود کا شمار کس طبقہ میں کیا جائے۔ عربوں نے فیصلہ کیا کہ ہندوؤں کو اہل ذمہ کے جملہ حقوق دے دیے جائیں اور اُن کا شمار "مشابہ اہل کتاب" میں کیا جائے[۱]۔ سلاطین دہلی نے بھی ہندوؤں کی یہی حیثیت برقرار رکھی۔ برنی کے بیانات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کچھ علماء (غالباً شافعی مذہب[۲]) ہندوؤں کو مشابہ اہل کتاب کا درجہ دینے کے حق میں نہ تھے[۳]۔ فتاوائے جہانداری میں اس نے اپنی رائے بھی یہی لکھی ہے کہ

"جزیہ ستدن از ہندو جائز نیست کہ ایشاں را کتابے و پیغمبرے نبودہ است"[۴] ہندوؤں سے جزیہ لینا جائز نہیں، اس لیے کہ نہ اُن پر کوئی کتاب اتری ہے نہ اُن میں کوئی پیغمبر آیا ہے۔

لیکن برنی کا یہ خیال نہ حکومت نے تسلیم کیا، اور نہ کبھی عام علماء نے اس زاویۂ نگاہ کی تائید کی اور ہندوؤں کو ہمیشہ اہل ذمہ ہی شمار کیا جاتا رہا۔

۱؎ چچ نامہ ص ۲۱۰ ۲؎ علماء شافعی نے جزیہ کے جو اصول مقرر کئے ہیں وہ نسبتاً سخت ہیں اُن کے نزدیک جزیہ صرف عیسائیوں، یہودیوں اور آتش پرستوں سے لیا جاسکتا ہے، بت پرستوں سے جزیہ لینا جائز نہیں۔ ۳؎ ثنائے محمدی (قلمی نسخہ) ۴؎ فتاوائے جہانداری ص ۱۲۰ الف

برنی کے اس خیال کی سب سے زیادہ مدلل تردید مرزا مظہر جانجاناںؒ کے اس مکتوب سے ہوتی ہے جس میں اُنھوں نے ہندو مذہب اور نوعیت پر بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں: "…. رحمتِ الٰہیہ در وقتِ آغاز پیدائش نوع انسانی برائے اصلاحِ معاش و معاد شاں کتابے مسمٰی بہ بید…. بتوسط ملکے برہما نام …. فرستاد" (کلمات طیبات ص ۳۷) آگے چل کر فرماتے ہیں: "در ملک ہند نیز بعثت انبیاء و رسل واقع شدہ است و احوال آنہا در کتب ایشاں مضبوط است"۔

(ایضاً۔ ص ۳۸)

(۲) مسلمانوں کی حکومت میں اہل ذمہ کی حیثیت اور جزیہ کی نوعیت سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بڑی سے بڑی ذلت تھی جو غیر مسلموں کی کی جا سکتی تھی۔ حالانکہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "نادانی اور بے خبری سے ہندوؤں نے سمجھا کہ یہ اُن کی تذلیل و تحقیر ہے۔ حالانکہ اگر اس وقت علمائے محققین ہوتے اور وہ جزیہ کی غرض و غایت اور اہل الذمہ کے حقوق معتبر فی الشرع کو کھول کھول کر بیان کر دیتے تو ہندوؤں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ اُن کی تذلیل نہیں ہے بلکہ وہ بہتر سے بہتر سلوک ہے جو دنیا میں کوئی حاکم قوم محکوموں کے ساتھ کر سکتی ہے[1]" نامناسب نہ ہوگا اگر اس مسئلہ پر ذرا تفصیل سے غور کر لیا جائے۔

فارسی میں ایک لفظ "گزیت" خراج کے معنی میں مستعمل تھا۔ جزیہ اُسی لفظ کا معرب ہے۔ تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ اسلام سے پہلے جزیہ کا لفظ رائج ہو چکا تھا[2]۔ اور نوشیروان عادل نے اس کے قواعد بھی مرتب کیے تھے۔ ایران اور روم میں اس طرح کے ٹیکس لیے جاتے تھے۔ عرب کے جو علاقے اُن کے زیرنگیں تھے وہ اس طرح کے ٹیکسوں سے واقف تھے۔ ہندوستان کے شہری بھی اس قسم کے ٹیکسوں سے ناواقف نہ تھے۔ قنوج کا گہروار خاندان ایک ٹیکس ترشکی ڈانڈا وصول کرتا تھا[3]۔ ٹاڈ نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں بھی بعض راجپوت

---

[1] جامع الشواہد۔ ص ۳۶

[2] جزیہ اور اس کے متعلق مسائل پر مولانا شبلی کے رسائل "الجزیہ" اور "حقوق الذمیین" کا مطالعہ ضروری ہے۔ مولانا آزاد کا خیال ہے کہ "اس بارے میں مولانا شبلی نعمانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ زمانہ حال کی نہایت قیمتی اسلامی تحقیقات میں سے ہے" (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۲۲)

[3] اس ٹیکس کے متعلق مورخین کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ ٹیکس ہندوؤں سے لیا جاتا تھا تاکہ مسلمان حملہ آوروں کو خراج کے طور پر دیا جا سکے (ملاحظہ ہو ویدیہ کی کتاب *Medieval Hindu India* III p. 211. اور اسمتھ کی *Early History of India* p. 400 کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ان مسلمانوں سے لیا جاتا تھا جو ہندو حکومت میں رہتے تھے (ملاحظہ ہو ڈاکٹر بھنڈارکر اور پروفیسر کونی کی تصانیف)

ریاستیں ایک روپیہ فی کس وصول کرتی تھیں[1]۔ ڈاکٹر تریپاٹھی کا خیال ہے کہ کم و بیش اسی نوعیت کے ٹیکس فرانس میں Host Tax، جرمنی میں Common Penny اور انگلستان میں Scutage کے نام سے وصول کیے جاتے تھے[2]۔

قرآن پاک میں جزیہ کا حکم اس طرح آیا ہے: "حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون" یہاں تک کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کرلیں اور حالت ایسی ہو جائے کہ ان کی سرکشی ٹوٹ جائے[3]۔

تاریخ اسلام میں جزیہ لینے کا سب سے پہلا واقعہ نجران کے عیسائیوں کا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اُن کا ایک وفد آیا اور اُس نے خود یہ بات پیش کی کہ ہم مسلمان تو نہیں ہوتے لیکن اطاعت قبول کیے لیتے ہیں، آپ ہم پر جزیہ مقرر کردیں۔

اس جزیہ کی غرض و غایت یہ تھی: اسلام نے مسلمانوں پر فوجی خدمت فرض کردی تھی، جو غیر مسلم اسلامی حکومت میں شہری زندگی بسر کرتے تھے اُن پر یہ خدمت فرض نہیں کی گئی۔ وہ چاہتے تو شریک ہو سکتے تھے۔ بصورت دیگر اُن کو ایک سالانہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ طبری اور بلاذری نے وہ فرامین نقل کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ میں شرکت کی صورت میں جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ اسلام نے مسلمانوں پر کئی اور ٹیکس (مثلاً زکوٰۃ، صدقات مصارف جنگ وغیرہ) عائد کیے تھے۔ اس کے برخلاف اسلام نے غیر مسلموں کو حقوق تو مسلمانوں کے برابر ہی دیے لیکن مالی بوجھ مسلمانوں کا سا اُن پر نہیں ڈالا۔ اگر ایک غیر مسلم فوجی خدمت

---

[1] راجستھان ص ۱۱۱۶ [2] Some Aspects of Muslim Administration p. 339

[3] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۸۲۔ "وھم صاغرون" کا مفہوم سمجھنے میں بہت لوگوں نے غلطی کی ہے۔ اور اس کو وہ معنی پہنا دیے ہیں جو صدر اول کے مسلمانوں کے ذہن میں نہیں تھے۔ امام شافعیؒ لکھتے ہیں:
"سمعت عددا من اھل العلم یقولون الصغار ان یجری علیھم حکم الاسلام" (کتاب الام)
(یعنی میں نے متعدد اہل علم سے سنا ہے کہ "وھم صاغرون" کا مطلب یہ ہے: اُن پر اسلامی حکومت کے قانون جاری ہو جائیں یعنی وہ اسلامی حکومت کے قوانین کے آگے جھک جائیں)

سے انکار نہ کرے (جو خود اسی کے وطن کی حفاظت کے لیے ہوگی) تو وہ اسلامی حکومت میں آزادی وحقوق کی ٹھیک ویسی ہی زندگی بسر کریگا جیسی کہ ایک مسلمان بسر کرسکتا ہے لیکن مسلمانوں کی طرح اُسے کوئی ٹیکس ادا کرنا نہیں پڑیگا"[1]

(۳) سلطنت دہلی میں جزیہ کی وصولیابی کے طریقوں کی تحقیق بہت دشوار ہے۔ مورخین نے اس تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور فقہار نے ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ اس سلسلہ میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں: ہندوستان جیسے ملک میں لاکھوں کروڑوں بسنے والوں ہندوؤں سے فرداً فرداً یہ ٹیکس کس طرح وصول کیا جاتا تھا؟ کیا یہ ٹیکس اجتماعی حیثیت سے شہروں اور دیہاتوں سے وصول کرلیا جاتا تھا؟ کیا خراج کے ساتھ ہی اس کی وصولیابی کا کوئی طریقہ رائج تھا؟ یا جس طرح حضرت عثمان رضؓ نے تفلس والوں سے فی کس کے بجائے فی گھر جزیہ مقرر کیا تھا[2] اور جس طرح مامون وغیرہ کے عہد میں بعض علاقوں سے جزیہ کی وصولی کا انتظام کیا گیا تھا، اسی طرح ہندوستان میں بھی وصول کیا جاتا تھا؟ ہندی قرون وسطیٰ کا جو تاریخی سرمایہ اس وقت پیش نظر ہے، اس سے ان مسائل پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

جزیہ کا ذکر سب سے پہلے فخر مدبر نے آداب الحرب میں کیا ہے اور اسلام کا پورا رویہ اس طرح بیان کردیا ہے:-

اگر مسلمانان با دار الحرب روند و شہرے	اگر مسلمان دار الحرب میں جائیں اور کسی شہر
یا قلعہ را محصر کنند، باید کہ نخست ایشاں	یا قلعہ کا محاصرہ کریں تو چاہیے کہ پہلے انہیں
را اسلام خوانند۔ اگر اجابت کردند دست	اسلام کی دعوت دیں۔ اگر قبول کرلیں تو
از جنگ باز دارند و اگر قبول نہ کنند	جنگ سے ہاتھ روک لیں، اگر قبول نہ کریں تو
جزیہ طلب کنند۔ اگر جزیہ پذیر فتند	ان سے جزیہ مانگا جائے۔ اگر جزیہ دینا قبول

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۲۳۔ [2] فتوح البلدان ص ۳۰۱۔ بحوالہ المامون ص ۱۱۰۔

جنگ بگزارند کہ خون و مال ایشاں ہمچو خون و مال دیگر مسلمان باشد"۔[۱]

کرلیں تو لڑائی بند کردی جائے اس لیے کہ (جزیہ لینے کے بعد) ذمیوں کا خون اور مال مسلمانوں کے خون اور مال کی طرح ہو جاتا ہے۔

لیکن ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اس دور کے بیشتر لٹریچر میں جزیہ کا لفظ خراج کے ہم معنی استعمال ہوا ہے۔ امیر خسروؒ لکھتے ہیں ؎

گرم شد آوازہ بگردِ جہاں   جزیہ بدرگاہ رسید از شہاں[۲]

پھر فوائد الفواد کی ایک عبارت بھی غور طلب ہے۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ کی مجلس کا واقعہ ہے:

"حکایت طائفہ افتاد کہ بر خلق زیادتی کنند در ستدن خراج و جزیہ و کشتہا۔ دریں میاں فرمود کہ پیش ازیں در حدود لہاور دیہی بود، دراں دیہ درویشے ساکن بودہ است وکشت می کرد و بداں روزگار می گزرانید ہیچ کس از و چیزے نمی ستد، تا وقتے شحنہ نصب شد۔ او ازیں درویش حصہ طلبیدن گرفت۔ گفت کہ چندیں سال است کہ تو کشت میکنی و ہیچ حصہ نمی دہی وغلہ می بری، جزیہ سالہائے گذشتہ بدہ یا کرامتے بنما"۔[۳]

ان لوگوں کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی جو خراج جزیہ اور فصل کی وصولی میں خلقت پر زیادتی کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں فرمایا کہ پہلے لہاور کے علاقہ میں ایک گاؤں میں کوئی درویش رہتا تھا اور کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اور اس سے اپنا گزارہ کرتا تھا، کوئی شخص اس سے کوئی چیز نہیں لیتا تھا۔ ایک مرتبہ وہاں ایک شحنہ متعین ہوا۔ اس نے درویش سے حصہ مانگا، اور کہا کہ اتنے سالوں سے کھیتی کر رہا ہے اور کوئی حصہ نہیں دیتا اور سب غلہ خود ہی لے لیتا ہے یا تو گزشتہ سالوں کا جزیہ دے یا کوئی کرامت دکھا۔

اس عبارت میں لفظ جزیہ واضح طور پر خراج زمین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ برنی نے بھی اپنی

۱ آداب الحرب والشجاعت ص ۱۵۶ الف   ۲ قران السعدین ص ۳۵
۳ فوائد الفواد۔ ص ۱۳۵-۱۳۶۔

کتاب میں بعض جگہ "خراج وجزیہ" اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس کی نوعیت پوری طرح ظاہر نہیں ہوتی[۱]۔ عبدالحمید محرر غزنوی نے جزیہ کو خراج مقاسمہ میں شمار کیا ہے[۲]۔ فیروز شاہ تغلق لکھتا ہے :-

"باعلام گفتیم ہر کہ از کفار کلمۂ توحید گوید و دین اسلام پذیرد ... جزیہ از و دور کنند"[۳]	میں نے اس بات کا اعلان کرادیا کہ جو کافر کلمۂ توحید پڑھ لے اور دین اسلام قبول کرلے اس سے جزیہ نہ لیا جائے۔

کیا اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی لوگوں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا؟ اگر ایسی صورت نہ تھی تو پھر فیروز شاہ نے اس کو اپنا کارنامہ بنا کر کیوں پیش کیا؟ ــــ پورے حالات اور منتشر معلومات کو یکجا کرنے پر یہ خیال ہوتا ہے کہ دیہات میں جزیہ، خراج کے ساتھ وصول کرلیا جاتا تھا۔ شہروں میں غالباً فرداً فرداً وصول کیا جاتا ہوگا۔ فیروز شاہ کے عہد میں جزیہ برہمنوں سے بھی وصول کیا گیا جس پر دہلی میں کافی اضطراب پیدا ہوا[۴]۔ برہمنوں کے اس احتجاج کے علاوہ، دہلی سلطنت کی پوری تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جب جزیہ پر کوئی اظہار ناراضگی کیا گیا ہو۔

(۴) اس دور کے لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہ دارالسلطنت میں بلا خوف وخطر بتوں کی پوجا کرتے تھے، دریا میں نہاتے تھے اور ناقوس بجاتے تھے۔ یہ سب کام مسلمان بزرگوں کی خانقاہوں اور بادشاہوں کے محلات کے قریب ہوتے تھے اور کبھی کسی طرح کی مزاحمت نہیں کی جاتی تھی۔ جلال الدین خلجی اپنے زمانہ کا حال بتاتا ہے :

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۷۴۔

[۲] علم الحساب (انگریزی ترجمہ) Medieval India Quarterly, vol I No. 3.

[۳] فتوحات فیروز شاہی۔ ص ۲۱ (لاہور ایڈیشن)

[۴] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۳۸۲۔۳۸۳

"ہر روز ہندواں ... مندل زناں و بوق زناں در زیر کوشک من میگذرند و در جون می آیند و بت پرستی می کنند و احکام شرک و کفر را در نظر ما ... رواج می دہند"[1]

ہر روز ہندو دکھاول اور کرنا بجاتے ہوئے میرے محل کے نیچے سے گزرتے ہیں اور دریائے جمنا پر آکر بت پرستی کرتے ہیں اور احکام شرک کو ہماری نظروں کے سامنے رواج دیتے ہیں۔

دہلی میں اس مذہبی آزادی کی تائید ہندو کتبات سے بھی ہوتی ہے[2]

حکومت سے قطع نظر مسلمانوں کے بیشتر مذہبی طبقے ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں دخل اندازی کو روا نہیں رکھتے تھے۔ اس طرز فکر کا آئینہ دار شیخ نظام الدین اولیاؒ کا وہ واقعہ ہے جو تذکروں اور تاریخوں میں ملتا ہے۔ ایک دن صبح کے وقت وہ اپنے جماعت خانہ کی چھت پر امیر خسروؒ کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ نیچے نظر پڑی تو دیکھا کہ دریا کے کنارے کچھ ہندو بتوں کی پوجا میں مصروف ہیں۔ فرمایا ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس مصرعہ میں مذہبی رواداری کا ایک بے پایاں جذبہ سمٹ آیا ہے۔ ایک ایسے دور میں جب مسلمانوں کا سیاسی اقتدار اپنے نصف النہار پر پہنچ گیا تھا، ایک مذہبی پیشوا کا یہ بے ساختہ ارشاد صرف مذہبی رواداری ہی کا نہیں بلکہ ایک ایسی فکر کا بھی آئینہ دار ہے جس نے ہندوستان کی تہذیب کے "جلوۂ صد رنگ" کو سمجھ لیا ہو اور جو یہاں کے تہذیبی نقشے میں "ہر دین" اور "ہر قبلہ گاہ" کو دیکھنے کے لیے تیار ہو!

مثنوی نہ سپہر حضرت امیر خسروؒ نے سلطان مبارک خلجی کے لیے لکھی تھی۔ ہندو مذہب اور رسوم کے متعلق جو اظہارِ رائے اس مثنوی میں کیا گیا ہے وہ تنہا اُن ہی کے خیالات کا ترجمان نہیں ہے بلکہ سلاطینِ دہلی کے رویہ سے بھی ہم آہنگ ہے۔ ہندوستان اور اس کے مناظر

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۱۶-۲۱۷۔

[2] ملاحظہ ہو Catalogue of the Delhi Museum of Archaeology pp. 29-33.

کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

برلبِ جو زآبِ خنک برہمناں　　غسل کنند آخرِ شب غوطہ زناں[1]

ہندوؤں کے علوم کے متعلق لکھتے ہیں ؎

برہمنے ہست کہ در علم و خرد　　دفترِ قانونِ ارسطو بدرد

وانچہ طبیعی و ریاضیت ہمہ　　ہیأتِ مستقبل و ماضیت ہمہ

رومی ازاں گونہ کہ افگندہ بروں　　برہمنا نراست ازاں مایہ فزوں[2]

اس تمام گفتگو کے بعد فرماتے ہیں ؎

نیست ہنود ارچہ کہ دیندار چو ما　　ہست بسے جائے باقرار چو ما[3]

فکر و نظر کا یہ انداز بالخصوص اس دور میں جب مسلمانوں کا سیاسی عروج پورے شباب پر تھا، اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہندوؤں کو نہ صرف پوری مذہبی آزادی حاصل تھی بلکہ اُن کے رسوم وعقائد، فلسفۂ وافکار کو نہایت ہی ہمدردانہ سمجھنے کی کوشش بھی کی جاتی تھی۔ بت پرستی پر طعنہ زنی کے بجائے، امیر خسرو اس جذبہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس عمل کے پیچھے کارفرما نظر آتا ہے ؎

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری　　ہم ازوے آموز پرستش گری

عہد سلطنت میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کی تبلیغ واشاعت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ خود بعض مسلمان اکابر ہندو مذہب کی گہرائیوں کو سمجھنے کی جستجو کرتے تھے۔ چودہویں صدی کے آخر سے بھگتی کی جو تحریک ملک میں پھیلی اور جس طرح ہندو مبلغین ہر ناحیۂ ملک میں اپنے خیالات کی ترویج واشاعت میں مشغول ہوگئے وہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ حکومت وقت نے مذہبی خیالات کی نشرواشاعت میں مانع ہونا پسند نہیں کیا۔ کبیر، نانک، دھنا، سندر داس، دادو وغیرہ کی زندگیاں اور اُن کے کارنامے مسلمان بادشاہوں کی مذہبی رواداری

---

[1] نہ سپہر ص ۱۵۹　[2،3] ایضاً ص ۱۶۳

کے پس منظر ہی میں سمجھے جا سکتے ہیں۔ سکندر لودی کے عہد میں، ایک ہندو برہمن نام مسلمانوں کو درس دیتا تھا۔ بدایونی نے لکھا ہے :۔

"باوجود کفر کتب علم رسمی را درس می گفت" لہ

عہد سلطنت کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے اس بات پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا تھا کہ حکومت کس طرح ان باتوں کو روا رکھتی ہے۔ لکھتا ہے :۔

اگر پادشاہان اسلام با چندیں قوت و شوکت مسلمانی کہ در جہاں پیدا آمدہ است ... روا دارند کہ در دار الملک ایشاں و شہرہائے مسلماناں شعار کفر و کافری ظاہر گردانند و بتاں را آشکارا پرستند و شرائط کفر و کافری را ... مراعات نمایند و احکام دین باطل خود را در میاں بے خوف و ہراس جاری دارند و بت خانہا بدارند و بتاں را ... و عیلات خویش طبل زناں و ہول زناں و سماع گویاں و پاکوباں شادیہا کنند و بدادن چند تنکہ از وجہ جزیہ تمامی شرائط کفر و کافری را معمول دارند و ہمہ ایشاں کتب دین باطل را سبق گویند و احکام آں را منتشر گردانند، دین حق

اگر پادشاہان اسلام اتنی قوت اور شوکت ہوتے ہوئے جو دنیا میں مسلمانوں کو حاصل ہے اس بات کو روا رکھیں کہ ان کے دار السلطنت میں اور مسلمانوں کے شہروں میں کفر کی رسمیں پھیلیں اور کھلم کھلا بت پرستی کی جائے، اور وہ (سلاطین اسلام) شرائط کفر کے ساتھ یہ مراعات دکھائیں اور اس طرح اُن کے باطل دین کے احکام بے خوف و ہراس جاری ہو جائیں اور وہ بت خانے اور بت رکھیں اور ان کے گروہ طبل بجاتے ہوئے شور مچاتے ہوئے، گاتے ہوئے اور پیر مارتے اور خوشی کرتے ہوئے نکلیں۔ اور چند تنکہ جزیہ دے کر کفر کی تمام رسوم کو رواج دیں اور دین باطل کی کتابوں کا سبق دیں اور اُن کے احکام کو پھیلائیں —— تو پھر دین حق

لہ منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۳

برادیان دیگر چگونہ غلبہ کند"[۱] دوسرے مذہبوں پر کس طرح غالب آئیگا۔

لیکن معاملہ کی نوعیت اس وقت بدل جاتی تھی جب ہندوؤں کا کوئی طبقہ مذہبی خیالات کی معصومانہ ترویج کو چھوڑ کر، مسلمانوں میں فتنۂ ارتداد پیدا کرنے کی جد و جہد میں لگ جاتا تھا۔ ایسی صورت میں مسلم سماج کو خطرات پیدا ہو جاتے تھے اور حکومت کے لیے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ ایسی کارروائیوں کو بلا روک ٹوک جاری رہنے دے۔ فیروز شاہ نے کچھ برہمنوں کو ایک مسلمان عورت کے ہندو کر لینے پر سزا دی[۲]۔ شیر شاہ سُور مذہبی معاملات میں حد درجہ وسیع النظر تھا، لیکن جب اُسے ایک شخص ملا ضمیر سندھی کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ ہندوؤں کے اعتقاد مسلمانوں میں پھیلا رہا ہے تو ایک فرمان کے ذریعہ تنبیہ کی اور اس قسم کی کوششوں کا سختی سے سد باب کیا[۳]۔

مذہبی مقامات پر ہندو جس آسانی کے ساتھ آ جا سکتے تھے اس کا اندازہ آثار قدیمہ کے بعض کتبات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کننگھم نے بریلی اور متھرا کی سڑک پر ایک مندر میں سنہ ۱۲۴۱ء سے سنہ ۱۲۹۰ء تک پندرہ بار ہندو یاتریوں کے بڑی تعداد میں جمع ہونے کا پتہ لگایا ہے[۴]۔ دہلی کے پرانے قلعہ میں فارسی اور سنسکرت کا ایک کتبہ ملا تھا جس میں بارہ بیگہ زمین پر سری کرشنا کے مندر کی تعمیر کا ذکر ہے[۵]۔ ایٹہ میں کچھ مورتیاں ملی ہیں جن کے متعلق خیال ہے کہ سنہ ۱۳۳۵ وکرم یعنی سنہ ۱۲۷۸ء میں نصب کی گئی تھیں[۶]۔ فیروز شاہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد تغلق تک مندر بنانے کا سلسلہ جاری تھا۔ اور دہلی کے گرد و نواح میں ہندوؤں نے منادر تعمیر کیے تھے[۷]۔ فیروز شاہ کو اس پر اعتراض نہیں تھا کہ یہ مندر کیوں تعمیر کیے گئے بلکہ اس بات پر

---

[۱] فتاوائے جہانداری ص ۱۲۰ الف

[۲] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۳۷۹-۳۸۲۔

[۳] تاریخ دولت شیر شاہی احسن علی خاں Medieval India Quarterly Vol I no 1

[۴] Reports I p 206

[۵] Reports of the Archaeological Survey 1909-10 p 131

[۶] Reports of A.S. 1923-24 p 92.

[۷] فتوحات فیروز شاہی۔ ص ۱۱-۱۰

غصہ تھا کہ حکومت کی بغیر اجازت ایسا کیوں کیا گیا! سکندر لودی نے ایک قدیم مندر کو مسمار کرانا چاہا تو ایک عالم دین مولانا عبداللہ نے اعتراض کیا اور کہا کہ کسی قدیم مندر کو منہدم کرانا جائز نہیں[1]

علاء الدین خلجی کے عہد میں ٹھاکر پھیرو نے ایک کتاب "واستوسارا"[2] لکھی تھی۔ اس کو پنڈت بھگوان داس جین نے جے پور سے شائع کیا ہے۔ اس میں مندروں کے طرز تعمیر سے بحث کی گئی ہے اور پچیس طرز کے مندروں کی تعمیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے کسی طرح بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ اس عہد میں مندروں کی تعمیر میں کوئی دشواری پیش آتی تھی۔

(۵) عہد سلطنت میں ہندوؤں کی اقتصادی حالت کا اندازہ فتاوائے جہانداری سے ہوتا ہے۔ لکھا ہے کہ ہندو "معظم ومجل ومکرم ومعزز" ہیں اور معاشی خوشحالی اور بے فکری کا یہ عالم ہے کہ ـــ

"طبل وعلم ومرصعات وقبا، زربفت و	طبل، علم، جڑاؤ چیزیں، قبا، زربفت اور اسپان
اسپاں تنگ بست و . . . ولایتہا و	تنگ بست اُن کے پاس ہیں . . . علاقے،
شغلہا وعملہا ارزانی دارند و در دار	ملازمتیں اور عمل داری کی ان کے لیے ارزانی
الملک روا دارند و بہ پسندند کہ کافر و	ہے۔ اور (مسلمان بادشاہ) اس کو روا رکھتے
مشرک وبت پرست . . . خانہائے	ہیں کہ دار الملک میں کافر، مشرک اور بت پرست
قصر مانند بر آرند، و جامہائے زربفت	اپنے مکان محلوں کی طرح بنائیں اور زربفت
پوشند و اسپان تازی با ساخت زرو	کے کپڑے پہنیں اور اُن اسپان تازی پر جو چاندی

[1] تاریخ داؤدی ص ۱۵ (قلمی نسخہ)   [2] نیز ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ اگروال کا مضمون

A Note on Medieval Temple Architecture: Journal of the United Provinces Historical Society, July 1943 pp. 112-117)

ٹھاکر پھیرو نے اس کے علاوہ ایک اور کتاب "پراسادہ منڈنہ" بھی لکھی تھی۔

نقرہ سوار گردند و بصد ہزار مکنت آراستہ.	سونے کے سازسے لدے ہوتے ہیں، سوار ہوں
. . راحتہا گیرند و عیش ہا رانند و مسلماناں	اور نہایت تمکنت کے ساتھ آراستہ ہوں . . .
راچاکر گیرند و پیش اسپاں خود بدوانند	ان کو راحتیں اور آسائشیں میسر ہوں، مسلمانوں
و فقراء اہل اسلام از ایشاں و بر درہائے	کو نوکر رکھیں اور اپنے گھوڑوں کے آگے دوڑائیں
ایشاں گدائی ہا کنند و ایشاں را در	اور بیچارے مسلمان اُن کے دروازوں پر بھیک
درون دار السلطنت رائے و رانہ و ٹھکر	مانگیں اور ان کو دار السلطنت میں رائے، رانا،
و ساہ و مہتہ و پندت خوانند"[1]	ٹھاکر، ساہ، مہتہ، پنڈت کہہ کر پکاریں۔

محمد بن قاسم ہی کے زمانہ سے ہندوؤں کو حکومت کے کاموں میں شریک کرنے کا اصول تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اور حقیقت میں اُن کی مدد اور عملی تعاون کے بغیر نظم مملکت چل بھی نہیں سکتا تھا۔ عہد سلطنت میں ہندوؤں کو سرکاری ملازمتیں اور سرکاری اقتدار دونوں چیزیں حاصل تھیں۔ خاص طور پر خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ میں ہندو اعلیٰ سرکاری عہدوں پر نظر آتے تھے۔ کوتوال برنج تن (جو غالباً دہلی کا کوتوال تھا) اور رہتیا پائک کے نام اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں[2]۔ جلال الدین خلجی نے قبیلہ منڈاہر کے ایک شخص کو ایک لاکھ جیتل تنخواہ پر وکیلدر مقرر کیا تھا[3]۔ لاڈنو (جودھپور) کے ایک کتبہ (مورخہ ۱۳۱۶ء) میں لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی نے ایک ہندو سادھارنہ کو دھن ادھکارن (خزانچی) مقرر کیا تھا[4]۔ محمد بن تغلق نے ایک ہندو رتن کو سندھ کا گورنر بنایا تھا اور اس کو علم اور نوبت رکھنے کی اجازت دی تھی اور یہ وہ اعزاز تھا جو صرف بڑے امیروں کو دیا جاتا تھا[5]۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ ایک شخص بھیرن رائے جو قلعہ گلبرگہ کا کمانڈر بنایا گیا تھا سلطان کا بڑا معتمد تھا[6]۔ ہندو افسروں کے یہ نام تو وہ ہیں

---

[1] فوائد جہانداری ص ۱۲۰-۱۲۱۔ [2] تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۲۱۰۔

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۵۔

[4] Journal of Indian History, (August 1936) نیز E.I. XII, 23 p. 183.

[5] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۹ [6] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۵۲۲ (بمبئی ایڈیشن)

جن کا ذکر مورخین کو اُن کی شہرت اور اقتدار کے باعث کرنا پڑا، ورنہ دوسرے عہدوں پر بھی کثیر تعداد میں ہندوؤں کا ملازم ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ پھر ان ہندو عمال حکومت کو سلاطین کا پورا اعتماد حاصل تھا۔[۱]

بابر جب ہندوستان آیا تو اس کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ہندوستان میں تمام کاریگر، مزدوری پیشہ لوگ اور افسر ہندو ہیں[۲] — اس زمانہ میں ہندو مسلمانوں کی فوجوں میں کام کرتے تھے اور مسلمان ہندوؤں کی فوج میں۔ اور یہ تعلقات مذہب، رنگ، اور نسل کے امتیازات پر قائم نہیں ہوتے تھے۔ اس کی اساس ایک ایسے اصول پر تھی جو قرون وسطیٰ کا سب سے اہم اصول تھا، یعنی "نمک حلالی"[۳] — جو شخص نمک حرامی کرتا تھا وہ سماج کی نظروں میں ذلیل ہو جاتا تھا۔ اسی اصول کا نتیجہ تھا کہ جو مسلمان ہندو راجہ کے زیر نگیں ہوتے تھے وہ اس کے ساتھ اور جو ہندو مسلمان بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے وہ اپنے بادشاہ کے ساتھ لڑتے تھے۔ صرف ایک واقعہ ابن بطوطہ کی زبانی سُنیے:

"اجودھن سے چل کر ایک شہر میں پہنچا جس کے اکثر باشندے ہندو تھے اور جس کا نام ابرہی تھا۔ اس کا حاکم سامرہ قوم کا مسلمان تھا اس کے نواح میں نافرمان ہندو رہتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے رہزنی کی تو امیر ہندو مسلمانوں کو ساتھ لے کر اُن سے لڑنے گیا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی، سات ہندو مارے گئے"۔[۴]

سنہ ۱۲۸۵ء کا ایک کتبہ وسط ہند میں ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بٹیا گڑھ میں ایک مسلمان جنرل کی نگرانی میں ہندو سپاہیوں پر مشتمل فوجیں لڑی تھیں۔[۵]

---

۱ ملاحظہ ہو منشآت ماہرو ص ۲۰ — ۲ بابرنامہ (انگریزی ترجمہ، بیوریج) ص ۵۱۸

۳ برنی نے "حلال خوارگی" (ص ۵۸۳، ۵۸۴) "حرام خوارگی" (ص ۱۸۴) "حلال نمکی" (۵۴۴-۵۴۵) "حق نمک" (ص ۵۴۵) کا ایک مستحکم اصول کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو: عفیف کی تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۱۳، ۱۹۱، ۶۶ وغیرہ۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۸۶، ۹۰۔ تاریخ داودی (ایلیٹ جلد چہارم) ص ۴۴۳۔

۴ عجائب الاسفار، ص ۳۷۔ — ۵ Epigraphia Indica XII p. 44-45

خلافت اور سلاطینِ دہلی

ہر چند کہ خلافتِ بغداد اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہی تھی لیکن سلاطین دہلی اس بین الاقوامی اسلامی مرکز سے اپنا دامن وابستہ رکھنا ایک اہم قانونی ذمہ داری تصور کرتے تھے۔ خلیل بن شاہین کا قول ارنلڈ نے نقل کیا ہے کہ مشرق و مغرب کا کوئی فرمانروا بغیر خلیفہ کی منظوری اور منشور کے سلطان کا لقب اختیار نہیں کر سکتا تھا[۱]۔ عوام کے دل میں خلافت کی بے حد عظمت تھی۔ اور جب سلطان اس اسلامی مرکز کے نائب کی حیثیت سے ان کے سامنے آتا تھا تو عقیدت کی نگاہیں جھکے بغیر نہ رہتی تھیں۔

عام مسلمان خلافت کو اسلامی اقتدار اعلیٰ کا مرکز و منبع سمجھتے تھے۔ تاج الدین ریزہ کو ایک شخص نے زدوکوب کیا تو اُس نے ایک منظوم فریاد سلطان کی خدمت میں پیش کی۔ اس میں لکھا تھا ؎

اگر دادِ من نیابم ازیں ستم را — روم زیں خاک خوں آشام برباد
ز آبِ چشم امیر المومنین را — نمائم دجلۂ دیگر بہ بغداد!

مطلب یہ تھا کہ اگر سلطان نے انصاف نہ کیا تو وہ عدالت عالیہ یعنی خلیفہ بغداد کی خدمت میں پہنچے گا اور اپنے آنسوؤں سے ایک دوسرا دجلہ جاری کر دیگا۔

خلافت بغداد سے سب سے پہلا رابطہ التمش نے قائم کیا۔ اس کے عہد کے معمولی تانبہ کے سکوں پر خلیفہ کا نام ہندی میں ملتا ہے۔ اس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ ملک کا ہر بسنے والا خلیفہ کی حیثیت کو اچھی طرح سمجھ لے[۲]۔ التمش کے بعد بھی سکوں پر خلیفہ بغداد کا نام کندہ ہوتا

---

[۱] Arnold: the caliphate p. 101-102

[۲] ہندوستان میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو خلافتِ بغداد کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ یعنی قرامطہ۔ (باقی بر ص ۸۱)

رہا ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں گوہلاکو نے خلافتِ بغداد کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن جلال الدین خلجی کے عہد تک خلیفہ کا نام سکوں پر نقش ہوتا رہا۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ دہلی کو سقوطِ بغداد کا علم نہ ہوا تھا۔ سعدی کے جاں سوز مرثیے دہلی میں بھی پڑھے گئے تھے۔ علاوہ ازیں بلبن کے عہد میں خاندان عباسیہ کے بہت سے شہزادے دہلی میں پناہ گزین تھے[1] پھر طبقات ناصری میں مستعصم باللہ کی شہادت اور "حادثہ بغداد" کا پورا حال درج ہے[2] جس کے مطالعہ کے بعد تو اس شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ بقول ڈاکٹر ترپاٹھی اس عمل کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ "خلیفہ مر گیا، خلیفہ ہمیشہ زندہ رہے"[3]

جلال الدین خلجی کے بعد رکن الدین ابراہیم نے مستعصم کا نام سکوں سے نکلوا دیا۔ اور صرف "ناصر امیر المومنین" پر اکتفا کیا[4]۔ علاء الدین خلجی نے اپنے نام کے ساتھ "یمین الدولہ" کا اضافہ کیا۔ حسن سجزیؒ اور امیر خسروؒ نے بعض جگہ اس کو خلیفہ لکھا ہے اور اس کے بعض سکوں پر بھی ٹکسال کا نام "دار السلام" ملتا ہے[5]۔ لیکن اس بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اپنی خلافت کا باضابطہ اعلان کر دیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ چیز اس لئے کی گئی ہو تاکہ کوئی شخص سیدی مولا[6] کی طرح خلافت کا دعویٰ دار ہو کر سامنے نہ آجائے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا خیال ہے کہ غالباً دربار میں کوئی طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہوگا جو سلطان کے خلافت اختیار کرنے کی حمایت کرتا ہو۔ اور بظاہر اس عمل کے لیے کافی دلائل بھی تھے[7]۔ بہر حال جو چیز علاء الدین خلجی

(بقیہ صفحہ ۸۰) ملتان کو گو محمد غوری نے ۵۷۱ھ/۱۱۷۵ء میں فتح کر لیا تھا (طبقات ناصری ص ۱۱۶) لیکن یہ فرقہ عرصہ تک قائم رہا اور محمد غوری اُن ہی کے ہاتھوں شہید ہوا (طبقات ص ۱۲۴) پھر رضیہ کے عہد میں انھوں نے دہلی کی جامع مسجد پر حملہ کیا (طبقات ص ۱۸۹-۱۹۰)۔ فیروز شاہ کے عہد تک اس فرقہ کا ذکر ملتا ہے (فتوحات فیروز شاہی ص ۷) (نوٹ صفحہ ہذا) [1] تاریخ فرشتہ (نول کشور) ج ۱ ص ۷۵

[2] طبقات ناصری۔ ص ۴۳۰-۴۳۶-۴۳۴۔ [3] Some Aspects of Muslim Administration.

[4] Thomas p.155; Wright p.37.

[5] Thomas p 171 [6] تاریخ فیروز شاہی - برنی ص ۲۱۰

[7] سلطنت دہلی کا نظم حکومت ص ۳۰۔

کے یہاں مبہم صورت میں ملتی ہے وہ اس کے لڑکے مبارک خلجی کے یہاں صاف نظر آجاتی ہے اس نے سکوں پر اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کیا۔[۱] اس کے بعد سب سلاطین نے "ولی امیرالمومنین" اور "ناصر امیرالمومنین" القاب پر اکتفا کیا۔

ایک ایسے شخص سے عقیدت کا اظہار جس کا کوئی وجود نہیں رہا تھا اور ایک ایسے نظام سے ارادت جس کو ختم ہوئے ایک مدت ہوئی تھی تصور خلافت سے مسلمانوں کے قلبی لگاؤ کا اظہار تو ضرور کرتا ہے لیکن اس میں حقیقت سے چشم پوشی کا جو پہلو مضمر ہے وہ فکری جمود اور تعطل کی بہت ہی خراب مثال ہے۔ غالباً محمد بن تغلق نے اپنے ابتدائی دور میں خلافت سے اس افسانوی تعلق کو بے معنی سمجھ کر اپنے سکوں پر صرف خلفاء راشدین کے نام کندہ کرا دیے تھے۔ بڑی کوشش کے بعد اس کو یہ پتہ چلا کہ مسلمانوں نے مصر میں خلافت کا مرکز قائم کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے خلافتِ مصر سے منشور حاصل کیا۔ فیروز شاہ نے اس تعلق کو قائم رکھا۔ سید خاندان کے فرمانروا "نائب امیرالمومنین" لکھتے رہے۔ یہی روش لودیوں کی بھی رہی۔[۲] جس سال ابراہیم لودی تخت نشین ہوا اسی سال مرکز خلافت بدلا اور اقتدار خاندان عثمانیہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ عثمانیوں سے شاہانِ مغلیہ کے تعلقات کی تفصیل اس سلسلہ کی دوسری جلد میں نظر سے گزرے گی۔ ان صفحات میں سلاطین کے مذہبی افکار و عقائد کا جو پس منظر پیش کیا گیا ہے اس کو ذہن میں رکھ کر ان کے انفرادی جذبات و رجحانات کا مطالعہ کیجیے۔

۱۔ Thomas p. 179-182; Wright p. 96-102.

۲۔ Thomas p. 358-377 Wright p. 243-256.

معزی و شمسی سلاطین

باب اوّل

سُلطان قطب الدین ایبک

فتح دہلی کے بعد پہلا سلطان جو اورنگِ سلطنت پر بیٹھا قطب الدین ایبک[1] تھا۔ سلطنت کی داغ بیل اُسی کے ہاتھوں پڑی تھی اور اس کے انتظامی ڈھانچے کا نقش اوّل بھی اُسی کے ذہن رسا نے تیار کیا تھا۔ گو اس کا دورِ حکومت مختصر تھا، اور یہ مختصر دور بھی زندگی کے ہوش رُبا تقاضوں کی نذر ہو گیا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے کردار کی خوبیوں[2] کا اتنا گہرا نقش ذہنوں پر چھوڑا کہ صدیوں بعد جب دکن کا ایک مورخ ہندوستان کی تاریخ لکھنے بیٹھا تو اُسے اعتراف کرنا پڑا کہ

"تا امروز اہل ہند کسے را کہ در جود و — آج تک ہندوستان کے لوگ جس شخص کی جود و

---

[1] ایبک ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں 'چاند کا سردار'۔ ای بمعنی چاند، بک بمعنی سردار۔ ایبک ترکوں کا ایک قبیلہ تھا، طبقات ناصری میں اس قبیلہ سے تعلق رکھنے والے کئی امراء کے نام ملتے ہیں (ملاحظہ ہو ریورٹی کا ترجمہ ص ۶، ۷۴، ۷۷۴، ۷۷۹، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۹) مرزا غالب بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں :-

ایبکیم از جماعۂ اتراک — درتمامی زماہ دہ چندیم

منہاج نے لکھا ہے کہ سلطان کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی اس لیے اس کو ایبک شل کہتے تھے (طبقات ناصری ص ۱۳۸۔ تاریخ حقی ص ۵ الف)، یہاں صرف لفظ شل سے ایک جسمانی نقص اور ایک عضو کا معطل ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ بعض مورخین (مثلاً طبقات اکبری جلد اول ص ۴۱؛ مآثر رحیمی ج ا ص ۲۸۹؛ خلاصۃ التواریخ ص ۱۸۸) نے اس سے یہ سمجھا کہ ایبک شل ہی کا مفہوم ٹوٹی ہوئی انگلی ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ کتبوں میں یہ نام ای بک لکھا ہوا ملتا ہے جس سے اس کی ترکیب اور مفہوم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

[2] فخر مدبر کا بیان ہے: "بجملۂ مناقب و مآثر و خصال حمیدہ و آداب پسندیدہ پادشاہاں آراستہ است و دوست و دشمن را مسخر مراد وی گردانیدہ است" (تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۶۰)

سخاوت ستایش کنند "گل قطب الدین" گویند . . . گل زمانہ را گویند، یعنی قطب الدین زمانہ" [1]	سخاوت کی تعریف کرتے ہیں تو اسے 'گل قطب الدین' کہتے ہیں، گل کے معنی ہیں زمانہ، یعنی وہ اپنے زمانہ کا قطب الدین ہے۔

مورخین نے سلطان کے تین اوصاف کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ عدل، شجاعت اور سخاوت اور اس سلسلہ میں جب اُس کی خوبیوں کو گنایا ہے تو اُن کا ذہن بے اختیار خلفاے راشدین کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔[2] جن کو اسلامی سوسائٹی نے ان اقدار عالیہ کا بہترین نمونہ مانا ہے۔ اُس کی عدل گستری کی تعریف کرتے ہوئے صاحب تاج المآثر نے لکھا ہے:

گرگ از نہیب عدل تو اندر دیار تو
از بیم میش بدرقہ گیرد و سگ از شبان[3]

منہاج کا بیان ہے کہ شجاعت اور کرم میں اُس کا یہ حال تھا کہ

"در شرق و غرب عالم در عصر او بادشاہی را نبود" [4]	اُس کے زمانہ میں مشرق و مغرب میں کوئی بادشاہ اُس کا مثل نہیں تھا۔

جود و سخاوت کی بنا پر وہ "لکھ بخش" مشہور ہو گیا تھا۔[5] مولانا بہاء الدین اوشی نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا۔

اے بخشش تو لک بجہاں آوردہ
کان را کفِ تو کار بجاں آوردہ
از رشک کف تو خوں گرفتہ دل کان
وز لعل بہانہ درمیاں آوردہ[6]

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۶۳، نیز طبقات اکبری جلد ا ص ۴۲۔

[2] تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۵۴-۶۰۔ [3] تاج المآثر ص ۳۳۸ [4] طبقات ناصری ص ۱۳۷

[5] تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۵۱، طبقات ناصری ص ۱۳۸، منتخب التواریخ ج ا ص ۵۵، تاریخ محمدی (روٹوگراف) ص ۳۳۳ الف۔ تاریخ حقی (قلمی) ص ۶ الف، طبقات اکبری ج ا ص ۴۲، زبدۃ التواریخ (روٹوگراف) ص ۱۰ الف، خلاصۃ التواریخ ص ۱۸۹۔ فخر مدبر نے لکھا ہے: "و رسم پیل بخشی و آئین لکبخشی و سنت پیل وار زر دادن در جہاں او نہاد است" (ص ۵۱) بدایونی کا بھی یہی خیال ہے۔ (ج ا ص ۵۵) لیکن ریورٹی نے لکھا ہے کہ ایبک کا معاصر ہندو راجہ رتے لکھمنیہ بھی لک بخش مشہور تھا (ص ۵۵۵-۵۵۶)

[6] تاریخ محمدی (روٹوگراف) ص ۳۳۳ الف، منتخب التواریخ ج ا ص ۵۵، طبقات اکبری ج ا ص ۴۲، مآثر رحیمی ج ا ص ۲۸۹۔

کردار کی ان خوبیوں نے قطب الدین کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک امتیازی شان کا مالک بنا دیا ہے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

قطب الدین ابھی بچہ ہی تھا کہ بردہ فروشی کا شکار ہوا اور نیشاپور کے بازار میں بیچنے کے لیے لایا گیا۔ وہاں شہر کے قاضی فخر الدین عبد العزیز کوفی نے اس کو خرید لیا[1]۔ قاضی فخر الدین، امام ابو حنیفہؒ کی اولاد میں تھے اور اپنے علمی تبحر، اتقا اور دیانت داری کی بنا پر بڑی اچھی شہرت رکھتے تھے[2] اور لوگ اُن کو بڑی عقیدت سے ابو حنیفہ ثانی کہتے تھے[3]۔ قطب الدین نے جو کچھ مذہبی علم حاصل کیا وہ ان ہی کے فیضانِ تربیت کا نتیجہ تھا۔ قاضی فخر الدین نے ایبک کو تعلیم کی وہ تمام سہولتیں بہم پہنچائیں جو اُنھوں نے خود اپنی اولاد کے لیے فراہم کی تھیں[4]۔ ایبک نے اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور

در اندک مدت کامل حال گشت[5] — تھوڑی مدت میں کمال حاصل کر لیا۔

قرآن مجید وہ بہت اچھی آواز سے پڑھتا تھا اور اس بنا پر لوگ اس کو "قرآن خواں" کے نام سے پکارتے تھے[6]۔

سلطان شہاب الدین غوری کے غلاموں میں

قطب الدین جب نیشاپور کے اس قاضی گھرانے سے نکلا تو قسمت نے سلطان شہاب الدین محمد غوری کے غلاموں کے حلقہ میں پہنچا دیا۔ یہاں اُس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ سلطان نے جس طرح اس کو تربیت دی اُس کی تفصیل تو نہیں معلوم لیکن غلاموں کی تربیت کا جو عام طریقہ اس دور میں رائج تھا[7]

---

[1] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۲۱، طبقات ناصری ص ۱۳۸، مآثر رحیمی (ج ۱ ص ۲۸۹) میں ان کا نام قاضی قمر الدین لکھا ہے، جو غلط ہے۔ [2] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۲۱ [3] ایضاً ص ۲۱
[4] طبقات ناصری ص ۱۳۸ [5] تاریخ مبارک شاہی (یحییٰ سرہندی) ص ۱۳
[6] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۲۱، مولانا ذکاء اللہ نے لکھا: "وہ قرآن کا حافظ ہو گیا اور عربی فارسی پڑھ گیا" (تاریخ ہندوستان جلد اول ص ۳۶۴) اس بیان کا پہلا حصہ اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب قرآن خواں کے معنی حافظ قرآن کے لیے جائیں۔ [7] ملاحظہ ہو سیاست نامہ، نظام الملک طوسی فصل ۲۸: "اندر تربیت غلامان سرائے" ص ۱۲۹-۱۴۶۔ (تہران ایڈیشن بہ تصحیح آقای عباس اقبال)

اُس کے پیشِ نظر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ قطب الدین کو مذہبی علم میں اضافہ کا کوئی خاص موقع ملا ہوگا۔ بہرحال قطب الدین نے اپنی وفاشعاری اور خدمت گزاری سے بہت جلد اپنے آقا کا دل موہ لیا[1]۔ جس زمانہ میں سلطان خوارزم شاہ کی غوریوں سے جنگ ہو رہی تھی، قطب الدین امیر آخور کے عہدہ پر مامور تھا۔ ایک دن چارہ کی تلاش میں نکلا تو دشمنوں نے پکڑ لیا اور لوہے کے پنجرے میں بند کر دیا۔ بعد کو جب خوارزمیوں کو شکست ہوئی اور قطب الدین اسی حال میں اپنے آقا کے سامنے لایا گیا تو اس کے دل پر بے حد اثر ہوا اور اُس کے جذبۂ جاں نثاری کی قدر کی[2]۔ جب سلطان شہاب الدین ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے اپنے ہندوستانی مقبوضات کی نگرانی اور توسیع کا کام قطب الدین کے سپرد کر دیا۔ سنہ ۱۱۹۲ء سے سنہ ۱۲۰۶ء تک وہ پوری تندہی اور وفاداری کے ساتھ محمد غوری کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس کے متعلق امیر خسرو کا ایک شعر تاریخ محمدی میں نقل کیا گیا ہے ؎

زہے بندہ کہ از یک حکمِ مخدوم ہمایوں کرد ز اسلام این کہن بوم[3]

حسن نظامی نے اسی زمانہ کے متعلق لکھا ہے:

"بہ علو ہمت و عقیدت پاک سزاوار ملک و شایاں سریر سلطنت شد"[4] اپنی اعلیٰ حوصلگی اور پاک عقیدت کی بنا پر وہ اس کا مستحق ہوگیا کہ ملک پر حکومت کرے اور سریر سلطنت پر بیٹھے۔

سنہ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین تخت پر بیٹھا اور سنہ ۱۲۱۰ء تک آزاد حکمراں کی حیثیت سے حکومت کی۔

تخت نشینی | سلطان شہاب الدین ۳۔ شعبان سنہ ۶۰۲ھ مطابق ۱۵۔ مارچ سنہ ۱۲۰۶ء کو شہید ہوا تھا[5]۔ تین ماہ سے زیادہ گزرنے کے بعد، ۱۷ ذی قعدہ سنہ ۶۰۲ھ مطابق ۲۵۔ جون سنہ ۱۲۰۶ء

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۳۸۔۱۳۹ [2] ایضاً ص ۱۳۹۔ [3] تاریخ محمدی (روٹوگراف) ص ۳۳۲ب
[4] تاج المآثر (قلمی) ص ۱۱۶ [5] طبقات ناصری ص ۱۲۴

کو قطب الدین تخت نشین ہوا۔ اس موقع پر سلطان شہاب الدین کے برادر زادہ سلطان غیاث الدین محمود نے چتر بھیجا اور سلطان کے لقب سے نوازا[۱]۔ لیکن ایسا خیال ہوتا ہے کہ خط آزادی کے دینے میں دیر کی گئی۔ منہاج کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط آزادی ۶۰۵ھ مطابق ۱۲۰۸ء سے قبل حاصل نہ ہو سکا[۲]۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کتبات میں اس کے نام کے ساتھ ملک، اور سپہ سالار سے زیادہ اونچا کوئی لقب استعمال نہیں کیا گیا[۳]۔ آزاد ہونے سے پہلے قطب الدین کی تخت نشینی بہر حال ایک عجیب واقعہ ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ شمس الدین التتمش کی تخت نشینی کے موقع پر علماء نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آیا اس کو خط آزادی مل بھی گیا ہے[۴]۔ یا وہ بھی قطب الدین کی طرح غلامی کی حالت میں تخت پر بیٹھ رہا ہے۔

ہندوستان کی جنگیں، ان کے مقاصد اور اثرات

۱۱۹۲ء میں سلطان شہاب الدین نے کہرام اور سامانہ کی حکومت قطب الدین کے سپرد کی تھی۔ اُس وقت سے لے کر ۱۲۱۰ء تک قطب الدین کا بیشتر وقت معرکہ آرائیوں میں بسر ہوا۔ ان فوجی مہمات کی تفصیل تاج المآثر اور طبقات ناصری کے صفحات میں پڑھی جا سکتی ہے۔ حسن نظامی نے اپنی کتاب کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

"بفتوائے شرع و رخصت عقل، محاربت	دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ حکم شرع اور رخصت
با اعدائے دین لازم و متعین گشتہ است	عقل کی بنا پر لازم اور متعین ہو چکی ہے۔ اور
و فضیلت جہاد بہ نصوص ہم ظاہر و	جہاد کی فضیلت آیات قرآنی سے ظاہر اور
روشن شدہ"[۵]	روشن ہے۔

---

[۱] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۳۱-۳۲۔ طبقات ناصری ص ۱۴۰۔ [۲] طبقات ناصری ص ۱۴۰۔

[۳] Epigraphia Indo Moslemica 1911-1912 p.2.

[۴] عجائب الاسفار (ابن بطوطہ) ج ۱ ص ۵۲ [۵] تاج المآثر (قلمی) ص ۱۔ فخر مدبر نے اپنی کتاب آداب الحرب والشجاعت (روٹو گراف قلمی نسخہ برٹش میوزیم ص ۱۳۱ ب ۱۳۲ الف) میں پانچ قسم کی

(باقی بر صفحہ ۸۹)

کتاب کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان ساری جنگوں میں 'جہاد' کا جذبہ کارفرما تھا اور وہ خالصتاً مذہبی مقاصد کے تحت لڑی گئی تھیں۔ جگہ جگہ مندروں کا انہدام اور مسجدوں کی تعمیر کا ذکر اس انداز میں پڑھ کر کہ

"اساس و قواعد بتکدہ ہا نقص و خرابی	بت کدے برباد ہوگئے اور ان کی جگہ
پذیرفت و معابد اصنام و اوثان بمساجد	مساجد و مدارس وجود میں آگئے اور
و مدارس بدل افتاد و احکام اسلام و	اسلام کے احکام اور شریعت کے رسوم
رسوم شریعت شائع و مستمر شد"[2]	پھیل گئیں اور انہوں نے استواری حاصل کرلی

اس خیال کو مزید تقویت ہونے لگتی ہے۔ لیکن جب پوری تفصیلات کو سامنے رکھ کر غور کیا جاتا ہے تو معاملہ کی دوسری ہی صورت سامنے آتی ہے، اور غوریوں کے حملوں کے اور ہی مقاصد قرار دینے پڑتے ہیں۔

ہندوستان میں غوریوں نے جس حکمراں کو سب سے پہلے ختم کیا وہ ہندو نہیں بلکہ مسلمان تھا۔ بعض تذکروں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ خسرو ملک کے خلاف سلطان شہاب الدین نے کشمیر کے ہندو راجہ سے بھی مدد لی تھی[3]۔ یہ بیان صحیح ہو یا غلط، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ غوریوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں جس سیاسی طاقت کو صدمہ پہنچایا وہ غزنویوں کی تھی۔ جب ہندو راجاؤں سے نبرد آزمائی شروع ہوئی تو سیاسی مصلحتیں جو راہ دکھاتی رہیں اُن پر عمل ہوتا رہا۔ اجمیر کی فتح کے بعد اس علاقہ کو ایک مدت تک پرتھوی راج کے بیٹے کی نگرانی میں رہنے دیا گیا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ٨٨) جنگیں قرار دی ہیں۔ اور اُن پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کی ہے۔ گو اس نے حسن نظامی کے انداز میں لکھنے سے گریز کیا ہے، لیکن وہ بھی جس رنگ میں ان جنگوں کو دیکھتا ہے وہ مذہبی ہی ہے۔

[2] تاج المآثر ص ١٠٧؛ اسی مفہوم کی تکرار ص ١٧٧، ٣١٨، ٣٢٧، ٣٥٧ پر ملاحظہ کیجیے

[3] راجہ ترنگنی ص ٥٤ ب بحوالہ ڈاکٹر حبیب اللہ کی کتاب

Foundation of Muslim Rule in India p 296.

حسن نظامی نے لکھا ہے:

"و پسر رائے پتورا کہ شمائل و عادات او دلائل مردانگی و مخائل فرزانگی پیدا بود بایالت اجمیر نصب کردہ شد" [1]

اور رائے پتھورا کے بیٹے کو جس کی شکل اور عادات سے دلائل مردانگی اور علامات فرزانگی ہویدا تھیں، اجمیر کی حکومت سپرد کر دی گئی۔

پھر ایک جگہ لکھا ہے:-

"پسر رائے پتورا بہ تشریف و کرامت مخصوص و مشرف شد" [2]

رائے پتھورا کے بیٹے کو خلعت اور کرامت خاص سے نوازا گیا۔

اسی طرح کچھ دنوں تک دہلی کھاندی رائے کے جانشین کی نگرانی میں رہی اور جب تک تومروں کے متعلق یہ یقین نہیں ہو گیا کہ وہ باغیانہ سازشوں کا جال بچھا رہے ہیں، اس کا انتظام ہندو راجہ ہی کے سپرد رہا۔ یہی عمل گوالیار کے راجہ کے ساتھ کیا گیا۔ جب اُس نے شہاب الدین کا اقتدار تسلیم کر لیا تو اس کو برقرار رکھا گیا۔ سکّوں سے بھی یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ بعض ہندو راجاؤں نے جب غوریوں کا اقتدار اعلیٰ مان لیا تو اُن کو بلا کسی مزاحمت کے اپنے علاقوں پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔[3] اگر ان جنگوں کا مقصد مذہبی ہوتا تو فتوحات کا رنگ نہ صرف مختلف ہوتا بلکہ مفتوحہ علاقہ میں نیا مذہب پھیلانے کے لیے پرزور جدوجہد بھی کی جاتی۔

صحیح ہے کہ کالنجر، بنارس، کالپی، دہلی، اجین، اجمیر اور بدایوں کی مہمات کے دوران میں مندر منہدم کئے گئے تھے۔ لیکن اس سلسلہ میں چند باتیں پوری طرح ذہن میں رہنی چاہییں

(۱) معاصر مورخوں، بالخصوص صدر الدین حسن نظامی نے جس انداز میں یہ واقعات بیان کیے ہیں وہ حد درجہ مبالغہ آمیز ہے۔ اگر ان بیانات کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ

---

[1] تاج المآثر۔ ص ۱۱۰ [2] ایضاً ص ۱۸۴۔

[3] ملاحظہ ہو: E. Thomas: Chronicles p. 18: پرتھوی راج کے سکوں پر ایک طرف "سری محمد سام" श्री मुहम्मद साम کندہ ہے۔

ترکوں کے حملوں کے باعث شمالی ہندوستان میں ایک مندر بھی باقی نہ رہا تھا اور ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں وجود میں آگئی تھیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا۔ اگر اس دور کی تعمیر شدہ مسجدوں کی تعداد کا پتہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی تعداد ایک درجن تک بھی نہیں پہنچتی۔ اس کے برخلاف آثار قدیمہ کی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ شمالی ہندوستان میں اب تک بہت سے اُس زمانہ کے مندر موجود ہیں[۱]۔ (۲) جو مندر اس زمانہ میں ڈھائے گئے تھے اُن کا انہدام کسی مذہبی پروگرام کے ماتحت نہیں ہوا۔ بلکہ یہ تباہی مہمات جنگ ہی کا ایک حصہ تھی۔ (۳) ایک ایسے دور میں جب دلوں پر مذہب کا گہرا تسلط تھا، عبادت گاہوں کی حفاظت میں لوگ اپنی پوری طاقت صرف کر دیتے تھے۔ ان عبادت گاہوں پر قابض ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ حملہ آور نے مدافعت اور مخالفت کی سب سے محکم دیواروں کو منہدم کر دیا۔ اور اب کوئی ایسی طاقت باقی نہیں رہی جو اس کی عظمت اور قوت کے آگے نہ جھک گئی ہو۔ جب منگولوں نے اسلامی دنیا پر حملے کیے تھے تو مسجدوں، خانقاہوں مدرسوں کی تباہی اور بربادی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ (۴) یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس دور میں مندر دولت کے مرکز تھے۔ مذہبی عقیدت نے زر و جواہر کی جو فراوانی ان مندروں میں پیدا کر دی تھی اُس سے کوئی حملہ آور بے خبر نہیں تھا۔ (۵) معاصر تاریخوں میں ان فتوحات کو مذہبی رنگ میں مصلحتاً پیش کیا گیا ہے۔ صورت حال یہ تھی کہ اس طرح وسط ایشیا اور دیگر اسلامی ممالک میں غوریوں کی عزت اور شہرت میں اضافہ ہوتا تھا اور انہیں سپاہیوں کے حاصل کرنے میں مدد ملتی تھی۔ ہندوستان کی ایک ایک فتح کا حال لکھ کر باہر بھیجا جاتا تھا، اور ان فتح ناموں کی ترتیب و تہذیب میں پورا زور قلم صرف کر دیا جاتا تھا۔ بقول برنی تعریف میں مبالغہ اور "سخن آرائی"[۲] ان فتح ناموں کی جان ہوتی تھی — ایسی

[۱] Cunningham : Reports XXI pp. 25, 58-59; 71-79.

[۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۱ ۔ تاج المآثر میں ایک فتح کے تذکرہ کے بعد لکھا ہے: "فتحنامہا مشتمل بر کیفیت نصر اولیائے دولت و قہر اعدائے مملکت تحریر افتاد" (ص ۱۶۹)

صورت میں محض مورخین کے انداز بیان سے متاثر ہو کر ان جنگوں کو مذہبی جنگیں قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا

بالعموم مفتوحہ قومیں کسی حملہ آور کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا کرتیں۔ اُن کے کانوں میں ہمیشہ شمشیر و سناں کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں اور اُن کے دل انتقامی جذبات سے بھڑکتے رہتے ہیں۔ لیکن قطب الدین ایبک کے ساتھ یہ معاملہ پیش نہیں آیا۔ اُس کے جذبۂ حق پرستی وسیع القلبی اور دادگری نے نہ صرف دلوں میں اپنا اعتماد پیدا کرا دیا بلکہ اس کے قائم کیے ہوئے نظام کی سماجی خوبیوں سے متأثر ہو کر تمام لوگ قتل و خون ریزی کے ہنگامہ کو بھی بالکل بھول گئے[۱]۔ اس سلسلہ میں دو چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

(۱) ایبک کی ذاتی خوبیاں کچھ ایسی دل آویز تھیں کہ مفتوحہ قوم کے دل کو متاثر کیے بغیر نہ رہیں۔ بقول فخر مدبر

"بکرم و سخا و بذل صد ہزار آزاد را بندہ کرد"[۲] — اُس نے اپنی سخاوت، کرم و بخشش سے ہزاروں آزاد انسانوں کو اپنا غلام بنا لیا۔

اور جو کام تیغ و تفنگ سے انجام نہیں پا سکتا تھا وہ اس نے جود و سخا سے کر دکھایا۔ حسن نظامی نے لکھا ہے:

"اعدار ملک و دولت بداں علو مناقب وسمو مراتب اقرار و اعتراف کردند"[۳] — ملک و دولت کے دشمنوں نے بھی اس کے اوصاف حمیدہ اور مراتب کی بلندی کا اقرار اور اعتراف کیا۔

اس کے "سایہ بسیط امن و امان"[۴] میں ہر شخص نے آرام پایا۔ اور جنگی حالات کے باوجود اُس نے عوام کی آسائش کا خیال رکھا اور بقول فخر مدبر

---

[۱] ابو الفضل جس نے سلطان محمود غزنوی کے متعلق "خون بے گناہاں" بہانے کی شکایت کی ہے، ایبک کے متعلق لکھتا ہے: "شگرف کارہا از و پدید آمد" (آئین اکبری ج ۲ ص ۱۹۸)

[۲] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۲۱۔ [۳] تاج المآثر ص ۱۱۸

[۴] تاج المآثر۔ ص ۳۳۸۔

عدل را براں جملہ بنا نہاد کہ باچنداں لشکر	اُس نے عدل کی بنیاد اس طرز سے رکھی تھی کہ
کہ در ضمن رایات عالیہ بودند از ترک و	باوجودیکہ اس کا اتنا بڑا لشکر تھا جس میں ترک
غوری و خراسانی و خلجی و حشم ہندوستان	غوری، خراسانی، خلجی اور ہندوستانی سب ہی
ہیچ آفریدہ را زہرہ آں نبود کہ برگ کاہ و	(قسم کے) لوگ تھے، لیکن کسی کی یہ ہمت نہیں ہو سکتی
تای نان و گوسفندے از صحرا و مرغ	تھی کہ گھاس کا تنکہ، روٹی کا ٹکڑا یا بکری کسی
از آبادانی کسے بستدے یا خانۂ رعیتے	جنگل سے اُٹھالے یا کوئی پرند کسی کی آبادی سے
سپنج کردے[1]	پکڑلے یا کسی رعیت کے مکان پر (زبردستی) قیام کرلے۔

اس "رعایت حقوق رعیت و لشکری"[2] نے ہر دل میں اعتماد پیدا کر دیا، اور ملک میں ایسا ماحول قائم ہو گیا کہ "ذکر دزد و دزدی کہ بر السنہ سائر بود در خاک افتاد"[3]

(۲) ترکوں کے حملوں کے وقت ہندوستان طبقاتی امتیازات اور چھوت چھات کے مہلک تصورات کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ اعلیٰ طبقے شہروں میں رہتے تھے اور پورا سماجی نظام اُن کے لیے زندگی کی ساری نعمتیں مہیا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ چھوٹے طبقے کے لوگ شہر سے باہر رہتے تھے۔ اُن کی زندگیاں، نکبت و خواری کی دردناک داستانیں تھیں۔ مذہبی کتابیں پڑھنا تو درکنار، سننا بھی جُرم تھا۔ مندروں کی شکل انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شہر کی چہار دیواری میں طلوعِ آفتاب کے بعد وہ کام کرنے کے لیے داخل ہوتے تھے اور غروب سے پہلے باہر نکل جانا پڑتا تھا۔ ایک ہی جرم کے لیے مختلف سزائیں تھیں۔ اعلیٰ طبقات کے لیے اور، اور نچلے طبقہ کے لیے اور[4]۔ ایسے سماجی نظام کو ختم کرنے والے کے ساتھ محبت کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ ایک نے جس سماجی نظام سے ملک کو روشناس کیا اس کے دو زبردست انقلابی اثرات ہندوستان کے ہر بسنے والے نے محسوس کیے ہونگے۔ ایک یہ کہ نئی

---

[1] تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۳۳ [2] تاج المآثر ص ۱۲۰ [3] ایضاً۔ ص ۳۳۹
[4] اس اجمال کی تفصیل درکار ہو تو البیرونی کی کتاب الہند کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

سیاسی نظام کی نظر میں اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقے کے ہندو ایک ہی حیثیت رکھتے تھے، اور صدیوں کی وہ طبقاتی تقسیم جس کو حکومت برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہتی تھی یکدم بے معنیٰ ہوگئی تھی۔ نئے قانون کی نظر میں سزا کے لیے بڑے چھوٹے کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ اور دوسرے یہ کہ شہر کی چہار دیواری اب طبقاتی تقسیم کی نشانی نہیں رہی تھی، بلکہ محض محافظت کی ایک فصیل ہو کر رہ گئی تھی۔ نئے شہروں میں رئیسوں کے محل اور فقیروں کے جھونپڑے دوش بدوش نظر آتے تھے۔

علماء سے تعلقات قطب الدین ایبک نے مذہبی طبقوں بالخصوص علماء سے بہت اچھے تعلقات رکھے۔ معاصر مورخ کا بیان ہے:

ادرارات و مشاہرات کہ مستحقان از اہل علم و فقہ و قرأت و زہد و مصلحان داشتند آں ہم برحال داشتن فرمود و مبلغے خطیر از زر و غلہ از خاص خویش بفرمود بنام مستحقان تا ادرار کنند و مبلغے دیگر از زر بمستحقان و درویشان و بیوگان و یتیمان صدقہ فرمود" [۱]	روزینہ و مشاہرہ کے طور پر مستحقین یعنی علماء و فقہاء قاریوں، زاہدوں، مصلحوں کو جو کچھ دیا جاتا تھا اس کے جاری رکھنے کا حکم دیا اور بہت بڑی رقم سونا اور غلہ خود اپنے پاس سے دیا تاکہ مستحقوں میں تقسیم کیا جائے اور کچھ اور روپیہ سونے کی قسم سے مستحقوں، درویشوں، بیواؤں اور یتیموں میں صدقہ کے طور پر بانٹا۔

حسن نظامی نے لکھا ہے کہ

"و ائمہ و علماء دین کہ نگین خاتم شریعت اند ... بہ لطف اعزاز نواخت" [۲]	اور ائمہ اور علماء دین کو کہ شریعت کی انگوٹھی کے نگینے ہیں، اپنی مہربانی سے نوازا۔

اس کی علم دوستی اور عالم پروری نے لاہور کو "مرکز اہل تقویٰ، منشاء اصحاب فضل و فتویٰ و مامن زہاد و عباد و مسکن اقطاب و اوتاد" [۳] بنا دیا۔ اور علوم دینی کا چرچہ اس حد تک پہنچ گیا کہ

---

[۱] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۳۵ [۲،۳] تاج المآثر (قلمی نسخہ) ص ۲۶۶ وغیرہ

از بہر صدتن نوذ در و عالم | از بہر دہ نہ مفسر قرآں[1]

اس عہد کے اُن علماء میں جو کسی نہ کسی حد تک قطب الدین کے دامن سے وابستہ رہے قاضی حمید الدین افتخار علی بن عمر المحمودی، فخر مدبر، صدر الدین حسن نظامی، اور مولانا بہاد الدین اوشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قاضی حمید الدین افتخار کو عوفی نے "قدوۂ افاضل عصر" لکھا ہے[2] اور بتایا ہے کہ اُن کے "رسالات ومنشات"

"دریں بلاد مشہور است وبر زبانہائے فضلاء مذکور"[3]	ان بلاد میں مشہور ہیں اور عالموں کی زبان پر اُن کا ذکر ہے۔

ایبک کے دست سخاوت نے اُنہیں فکر معاش سے آزاد کر دیا تھا[4]۔ فخر مدبر غزنین کے مشہور عالم مولانا ابو الحسن منصور کے فرزند تھے۔ لاہور اور غزنین کے بیشتر علماء اُن کے باپ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔

"استاد ائمہ ہر دو حضرت لاہور و غزنی و دیگر قصبات و مراحل کہ درمیان دو حضرت بودند و جملہ ائمہ و قضات و خطباء کہ دریں مواضع بودند در پیش خدمت او بتعلیم زانو زدہ اند"[5]	لاہور اور غزنی کے ائمہ اور ان قصبات و مراحل کے ائمہ، قضات اور خطباء نے جو ان دو شہروں کے درمیان واقع ہیں اُن ہی کے سامنے زانوئے تعلیم تہ کیا ہے۔

خود فخر مدبر کی علمی کاوشوں کا یہ عالم تھا کہ جب تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تو صرف نسب پر ایک ہزار کتابیں مطالعہ کیں[6]۔ صدر الدین حسن نظامی کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ نظامی عروضی سمرقندی صاحب چہار مقالہ کے صاحبزادے تھے۔ اُن کی تصنیف تاج المآثر ادب و انشاء کے اعتبار سے خاص مقام رکھتی ہے، لیکن تاریخی معلومات بہم پہنچانے میں بہت

---

[1] تاج المآثر (قلمی نسخہ) ص ۲۶۶ وغیرہ [2-3-4] لباب الالباب جلد اول ص ۲۰۳

[5-6] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۶۶-۷۰

زیادہ مفید نہیں۔ معلوم نہیں کہ کیا سبب تھا کہ اُن کو زمانہ سے بڑی شکایت تھی۔ اور شکایت صرف ان ناگفتہ بہ حالات ہی سے نہیں تھی جن کی بناء پر وہ ہندوستان آئے تھے بلکہ یہاں کے عام حالات سے بھی ایک گونہ بددل تھے۔ "ذکر شکایت اخوان خوان زمان و منافقان" میں انہوں نے ایک جملہ ایسا لکھا ہے جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ انہیں یہ احساس تھا کہ اُن کی پذیرائی اُن کی قابلیت و صلاحیت کے مطابق نہیں ہوئی۔ لکھتے ہیں:

"ازینجا معلوم می شود کہ وفور فضل و کمال ہنر درین زمانہ وسیلتے ضعیف و دست آویزی باطل است" [۱]	اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں وفور فضل اور کمال ہنر (حصول مقصد یا ترقی کے لیے) کمزور وسیلہ اور جھوٹی دستاویز ہے۔

امام الاجل مولانا بہار الدین اپنی فصاحت، بدیہی گوئی، اور شگفتگی طبع کی بنا پر بہار اوش (اوش کی رونق) مشہور ہو گئے تھے۔[۲] ایبک کی مدح میں اُنھوں نے قصیدے لکھے تھے اور اُس کی داد و دہش سے مستفیض ہوئے تھے۔

احترام شرع حسن نظامی اور فخر مدبر دونوں نے قطب الدین کے مذہبی جذبات اور احترام شرع کی تعریف کی ہے۔ اول الذکر نے لکھا ہے۔

"ہمت بلندش بر احیاء معالم شریعت و اعلائے اعلام سنت مقصور و موقوف داشت" [۳]	اس کی بلند ہمت، شریعت کے نشانات کو زندہ کرنے اور سنت کے جھنڈوں کو بلند کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اس طرح کے جملے کتاب میں متعدد جگہ ملتے ہیں[۴] لیکن یہ اتنے مبہم ہیں کہ اس کی کوششوں کی صحیح نوعیت واضح نہیں ہوتی۔ ایک جگہ "اعلام احکام حنفی" کا بھی ذکر ہے لیکن تفصیل درج نہیں۔ یہی حال فخر مدبر کا ہے، لیکن اس کی کتاب سے اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ سلطان

---

[۱] تاج المآثر۔ ص ۶۰-۶۱؛ "مذمت عہد" کے لیے دیکھیے ص ۶۷۔

[۲] لباب الالباب جلد اول ص ۱۸۸ - ۱۸۹ [۳] تاج المآثر ص ۳ [۴] ایضاً ص ۲۶۳، ۵۳۳ وغیرہ

قطب الدین نے لاہور میں بہت سے ایسے ٹیکس جو غیر شرعی تھے (محدثات بزرگ) موقوف کر دیے تھے اور حکم دیا تھا کہ مسلمانوں سے غیر شرعی خراج کے بجائے شرعی ٹیکس عُشر وصول کیا جائے[۱]

القاب معاصر مورخوں نے سلطان قطب الدین کو جن القاب سے یاد کیا ہے اُن میں مندرجہ ذیل القاب مذہبی اعتبار سے قابل غور ہیں :

۱۔ کہف الاسلام والمسلمین　　۲۔ قامع الکفرۃ والتمردین (والمشرکین)

۳۔ قاتل الفجرۃ والمشرکین　　۴۔ ناصر الاسلام، کاسر الاصنام

۵۔ نصرۃ امیر المؤمنین　　۶۔ رکن الاسلام والمسلمین

۷۔ المؤید من السماء　　۸۔ ظہیر الملت، مجیر الامۃ

۹۔ عضد الخلافۃ[۲]

سکے معاصر مورخوں نے صاف لکھا ہے کہ ایبک نے اپنے نام کا سکّہ جاری کیا تھا۔ لیکن ہمیں تانبہ کے چند سکّوں کے علاوہ سلطان کا کوئی سکّہ نہیں ملا۔ تانبہ کے اس سکّہ پر ہندو اثرات نمایاں ہیں۔ اس کے ایک جانب بیل کی تصویر کندہ ہے[۳]

تعمیر مساجد حسن نظامی نے قطب الدین کے متعلق لکھا ہے :

از تیغ او بجائے صلیب و کلیسا　　در دار کفر مسجد و محراب و منبر است

آں جا کہ بود نعرہ و فریاد مشرکاں　　اکنوں خروش و نعرۂ اللہ اکبر است[۴]

لیکن ہمیں صرف دو مسجدوں کا حال ملتا ہے۔ مسجد ادینہ دہلی اور اڑھائی دن کا جھونپڑا اجمیر۔ دونوں کی بنیاد ایبک نے ڈالی تھی لیکن مکمل التمش نے کیا۔

دہلی کی ادینہ مسجد سلطان کے بلند عزائم اور اعلیٰ حوصلگی کی آئینہ دار تھی۔ اس کی دیواریں

۱؎ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۳۴

۲؎ تاج المآثر (قلمی نسخہ)؛ نیز تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۳۲

۳؎ N. Wright p. 14

۴؎ تاج المآثر (قلمی) ص ۲۶۳ وغیرہ

بقول حسن نظامی ثریا تک پہنچتی تھیں۔ اس کے منبر و محراب آسمان کو چومتے تھے۔ نقش آرائی کے متعلق لکھا ہے:

"ومنبر و محراب بہ لطائف کتابت و دقائق صنعت آراستہ شد و باشکالِ غریب ونقوشِ بدیع ساختہ و پرداختہ گشت"[1]

اس مسجد کے زریں قبے اور زریں طاق[2] مرغ نظر کا شکار کرتے تھے۔ سرسید کا خیال ہے کہ ایسی بڑی مسجد روئے زمین پر نہ ہوگی اور چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھی ہوگی۔[3] اڑھائی دن کے جھونپڑے کے متعلق آثار قدیمہ کے ایک ماہر فرگسن کا خیال ہے کہ اس میں کوفی اور طغرا خطوط جس انداز سے ملا کر کتبات تیار کیے گئے ہیں وہ عدیم النظیر ہے۔ بصر و ایران شام و اسپین میں بھی کسی جگہ اس شان کی چیز نہیں ملتی۔[4]

سلطان کی وفات عصامی نے ایبک کی اچانک موت کا سبب ایک "صاحب دل" کی بددعا کو قرار دیا ہے۔ لکھا ہے کہ ایک دن بعد از سحر ایبک ایسے محلہ سے گزرا جہاں چمڑے کو پکانے اور صاف کرنے والے رہتے تھے۔ بدبو کی وجہ سے سلطان کا بُرا حال ہوگیا اور اس نے حکم دیا کہ دباغت گردں کو وہاں سے ہٹا کر کسی دوسری جگہ آباد کر دیا جائے۔ ان چمڑے والوں میں ایک صاحب دل بھی تھا جو اپنا حال چھپانے کے لیے یہ پیشہ کرتا تھا۔ اس کو جب سلطان کے حکم کا علم ہوا تو بولا۔

بگفتا کہ "چوں شہ بہ میداں رسد ... ببینی کہ حکمش بہ پایاں رسد

---

[1] تاج المآثر (قلمی)، ص ۲۶۴ [2] فوائد الفواد میں ایک جگہ لکھا ہے "بر بالائے کنگرہائے ملمع مسجد آدینہ" (ص ۱۲) حسن نظامی نے "قبہ ہائے زریں" کا ذکر کیا ہے (ص ۲۶۴)

[3] آثار الصنادید۔ ص ۵۲-۵۴؛ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو Carr Stephen p 39-49; نیز Cambridge History of India III p 571, نیز Fergusson, Vol III p. 50

ابن بطوطہ لکھتا ہے: "اس کی دیواریں اور چھتیں اور فرش ہر ایک چیز تراشی ہوئی سفید پتھر کی بنی ہوئی ہے جس کو سیسہ لگا کر جوڑ لگایا ہے ... اس مسجد میں تیرہ گنبد ہیں ... عجائب الاسفار ص ۴۲؛ نیز قران السعدین ص ۳۰،

[4] Fergusson, III p. 513

اسی دن چوگان کھیلتے ہوئے، سلطان گھوڑے سے گرا اور اس سے قبل کہ دباغنت گروں کو اس محلہ سے ہٹایا جائے، خود راہی ملک عدم ہوگیا[۱] ــــ اس قسم کی داستانوں کو کوئی تاریخی اہمیت نہیں دی جاسکتی، اس لیے کہ شاید ہی کوئی ایسا بادشاہ ہو جو اچانک مرا ہو اور اس کے متعلق اس قسم کے افسانے مشہور نہ ہوگئے ہوں، لیکن اس سے قرون وسطیٰ کے عوام کے اعتقادات ورجحانات پر ضرور روشنی پڑتی ہے۔

---

[۱] فتوح السلاطین ص ۱۰۵-۱۰۶ (مدراس ایڈیشن)

باب دوم

سلطان شمس الدین التمش

سلطان شمس الدین التمش[1] (۶۰۷-۶۳۳ھ مطابق ۱۲۱۰-۱۲۳۵ء) اسلامی ہند کا پہلا[2] خود مختار فرمانروا تھا جو تخت دہلی پر بیٹھا۔ تقریباً پچیس سال تک اس نے نہایت شان وشوکت کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی۔ اس کے دربار کی رونق محمود اور سنجر کے درباروں کی یاد تازہ کرتی تھی۔[3] شجاعت اور تہور کا یہ عالم تھا کہ سارا شمالی ہندوستان اس کی جہانکشایانہ ہمت کا بازیچہ بن گیا تھا اور بقول امیر خسرو[4]

زحد مالوہ تا عرصۂ سند   نمودار غزائی اوست درہند[4]

معاصرین نے اس کے عزم وجلال میں سکندر کی تصویر دیکھی تھی۔[5] اس کے سلیقہ جہانداری اور صلاحیتِ جہانبانی کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے منتشر اور ضعیف البنیاد اسلامی مقبوضات کو یکجا کرکے ایک مستقل اور مستحکم سلطنت کے قالب میں ڈھال دیا اور پایۂ تخت دہلی کو وہ عظمت و

---

[1] یہ لفظ التمش نہیں، ایلتتمش ہے، جیسا کہ منہاج کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

آں شہنشاہے کہ حاتم بذل و رستم کوشش است   ناصر الدنیا و دین محمود بن ایلتتمش است

(طبقات ناصری ص ۲۰۲)

ترکی زبان میں ایلتتمش کے معنی ہیں "حکومت قائم کرنے والا" یا "عالمگیر"۔ ملاحظہ ہو تاریخ جہاں کشا جلد دوم ص ۶۱، نیز Z.D.M.G. 1907 p. 192 — یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایلتتمش اس کا خاندانی نام تھا یا تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے اختیار کیا۔ ترکی زبان سے اس کے لگاؤ کا اظہار ہندوستان میں بھی ہوتا رہا۔ اس نے آم کو "انب" سے "نغزک" کر دیا تھا۔ اس بنا پر کہ ترکی زبان میں اس لفظ کے معنی اچھے نہیں تھے (فوائد الفواد ص ۲۱۲)

[2] گو ایبک پہلا سلطان تھا لیکن دہلی کے تخت پر سب سے پہلے ایلتتمش ہی بیٹھا ابن بطوطہ نے صحیح لکھا ہے: "وہو اول من ولی الملک بمدینۃ دہلی مستقلاً" (رحلہ ج ۲ ص ۲۱) نیز ملاحظہ ہو ڈاکٹر ترپاٹھی کی کتاب Some Aspects of Muslim Administration p. 24.

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۷ [4] مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۴۸۔ [5] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۷

شوکت بخشی کہ بقول عصامی ؎

دراں شہر یک رونقے شد پدید — بلے لذتے باشد اندر جدید
بسے سیدانِ صحیح النسب — رسیدند در روے زملکِ عرب
بسے کاسبانِ خراساں زمیں — بسے نقشبندانِ اقلیم چیں
بسے عالماں بخارا نژاد — بسے زاہد و عابد از ہر بلاد
ز ہر ملک و ہر جنس صنعت گراں — ز ہر شہر و ہر اصل سیمیں براں
بسے ناقدانِ جواہر شناس — جواہر فروشاں بروں از قیاس
حکیمانِ یوناں، طبیبانِ روم — بسے اہل دانش ز ہر مرز و بوم
دراں شہر فرخندہ جمع آمدند — چو پروانہ بر نورِ شمع آمدند
یکے کعبۂ ہفت اقلیم شد — دیارش ہمہ دارِ اسلیم شد[1]

التمش کی زندگی کا یہ صرف ایک رُخ ہے۔ سیاسی اعتبار سے جہاں اُس کا عہد تاریخ ہند میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے، وہاں مذہبی اور علمی حیثیت سے بھی اُس کا عہد نہایت تابناک ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ثقافتی اور تہذیبی اداروں کی داغ بیل اور نشو و نما اُسی کی کوششوں کی رہینِ منت ہے۔ اس نے مختلف النوع، متضاد، اور (بعض صورتوں میں) مضمحل صلاحیتوں کو ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر میں لگا دیا جس کے بغیر ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی بنیادیں کبھی استوار نہیں ہو سکتی تھیں۔ حوض شمسی اور قطب مینار محض تعمیری کارنامے نہیں تھے، وہ زبردست تہذیبی نشانیاں تھیں جو تمدن کے ایک نئے دور کے آغاز کا اعلان کرتی تھیں اور جن کے پیچھے عزمِ جہانبانی کے ساتھ ساتھ فرائض دینی اور خدمت خلق کے بے پناہ جذبات کارفرما تھے۔ افسوس کی بات ہے کہ سلطان کے تہذیبی کارناموں اور مذہبی دلچسپیوں کی تفصیل تاریخوں میں نہیں ملتی۔ معاصر مورخ منہاج السراج

---

[1] فتوح السلاطین (مدراس ایڈیشن) ص ۱۱۳-۱۱۵

نے اپنی تصنیف طبقات ناصری میں مذہبی اور علمی حالات سے کلیتہً اجتناب کیا ہے[1]۔ اور بعد کے مورخین اُسی کے نقش قدم پر چلے ہیں۔ لیکن مشایخ کے ملفوظات اور مذہبی تذکروں سے سلطان کی زندگی کے اس پہلو کے متعلق ہمیں دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہاں اُن ہی مآخذ کی مدد سے سلطان کے مذہبی افکار و جذبات کی تصویر بنائی گئی ہے۔

التتمش کے مذہبی احساس وشعور کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہندوستان سے ہٹ کر اُسے بغداد و بخارا کے مذہبی مرکزوں میں دیکھیں۔

بخارا میں التتمش نو یا دس برس کا ہوگا کہ اُس کے حاسد بھائیوں[2] نے اُس کو بخارا کے بازار میں لے جا کر فروخت کر دیا۔ یہاں صدر جہاں کے ایک عزیز نے اُسے خرید لیا۔ یہ خاندان اپنی بزرگی اور طہارت کی وجہ سے مشہور تھا۔ یہاں التتمش کی تعلیم و تربیت بالکل اپنی اولاد کی طرح کی گئی۔ التتمش اسی خاندان میں تھا کہ ایک معمولی سا واقعہ پیش آیا، لیکن اس واقعہ نے اُس کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ ایک دن صاحبِ خانہ نے بازار سے انگور خریدنے کے لیے بھیجا۔ التتمش بچہ تو تھا ہی، کہیں راستہ میں پیسے کھو دیے اور بازار میں کھڑا ہو کر رونے لگا۔ ایک فقیر اس طرف سے گزرا، التتمش کو روتا دیکھ کر وجہ پوچھی اور حال معلوم ہونے پر اپنے پاس سے انگور خرید کر دیے۔ چلتے وقت کہا: "دیکھو جب تم صاحبِ دولت ہو جاؤ تو فقیروں اور درویشوں کا احترام کرنا اور اُن کے حقوق کی پاسبانی اپنا فرض جاننا"۔ التتمش نے وعدہ کیا اور اپنے گھر آ گیا۔ ـــ کہنے کو تو یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن التتمش کو مدت العمر فقراء و مشائخ سے جو بے پناہ عقیدت رہی اُس کی بنیاد دراصل اُسی دن رکھی گئی تھی۔ تخت نشین ہونے کے بعد اُس نے یہ واقعہ اکثر اپنے دربار میں بیان کیا اور کہا کہ ــ

---

[1] محمد غوثی شطاری نے اپنی کتاب گلزارِ ابرار میں منہاج السراج کے اس طرز پر اظہار ناپسندیدگی کیا ہے۔ [2] اُس کے ظاہری جمال اور باطنی خوبیوں کی بنا پر بھائی اُس سے حسد کرنے لگے تھے (طبقات ناصری، ص ۱۶۷) اُس کی ایک غیر معمولی صلاحیت کا ذکر شیخ نظام الدین اولیاؒ نے اس طرح فرمایا تھا: "طبع حافظہ قوی داشت" (فوائد الفواد ص ۲۱۳)

"ہر دولت و سلطنت کہ یافتم از نظرِ آں درویش یافتم" [1] — جو کچھ دولت اور سلطنت مجھے ملی ہے اُسی درویش کی نظر کا فیض ہے۔

بغداد میں بخارا میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد التتمش بغداد پہنچا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغداد میں جس خاندان سے وہ متعلق رہا، اُس کے افراد مذہبی معاملات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ التتمش کا آقا کبھی کبھی اپنا مکان درویشوں کو محفل سماع منعقد کرنے کے لیے دے دیا کرتا تھا۔ ایک شب کو اس مکان میں محفل آراستہ تھی۔ بڑے بڑے درویش اور مشائخ موجود تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ اس مجلس کے عمائدین میں سے تھے۔ التتمش تمام رات ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر رہا اور شمع کا سر گل گیر سے کاٹتا رہا۔[2]

جس زمانہ میں التتمش بغداد میں تھا، مشاہیر بزرگ وہاں موجود تھے۔ ہندوستان آنے والا روحانی قافلہ ابھی بغداد ہی میں قیام کر رہا تھا۔ بغداد اس وقت ایک زبردست روحانی مرکز بنا ہوا تھا۔ جگہ جگہ خانقاہیں قائم تھیں جن سے فیضانِ الٰہی کے چشمے ابل رہے تھے۔ مسجد کنکری، مسجد ابو اللیث سمرقندی، مسجد جنید بغدادی میں صوفیہ و مشائخ کے جھمگٹے لگے رہتے تھے۔ کسی خانقاہ میں سعدیؒ کا مرشد شہابؒ "تزکیۂ نفس اور تجلیۂ باطن کے درس دے رہا تھا، تو کسی مسجد میں ہندوستان کا روحانی سلطان (خواجہ معین الدین چشتیؒ) معرفت و حقیقت کے دریا بہا رہا تھا۔ مولانا عماد الدینؒ، شیخ اوحد الدین کرمانیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور دیگر اکابر صوفیہ کے فیضانِ صحبت سے ہزاروں تشنگانِ معرفت سیراب ہو رہے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ التتمش اس ماحول میں رہتے ہوئے اس سے متاثر نہ ہوتا۔ ایک دن کچھ پیسے لے کر شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا، مؤدب بیٹھ گیا اور بٹوے میں سے پیسے نکال کر شیخ الشیوخ کی خدمت میں پیش کیے۔ حضرت نے فاتحہ پڑھی اور پھر فرمایا:-

من در چہرۂ ایں شخص انوارِ سلطنت لامع — مجھے اس شخص کے چہرہ پر انوارِ سلطنت درخشاں

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۶۷ [2] فتوح السلاطین ص ۱۱۹، طبقات اکبری ج ا ص ۶۲، فرشتہ ج ا ص ۶۰-۶۲

می بینم" — نظر آتے ہیں۔

شیخ اوحدالدین کرمانیؒ بھی اُس وقت موجود تھے۔ التمش کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے :

از برکت شما در سلطنت دنیوی دینیش ہم سلامت باشد" [۱]

شیخ نظام الدین اولیاؒ کا یہ قول فوائد الفواد میں نقل کیا گیا ہے کہ التمش کے متعلق فرماتے تھے:

"او خدمت شیخ شہاب الدین سہروردی را و شیخ اوحدالدین کرمانی را رحمۃ اللہ علیہم دریافتہ بود و یکے از ایشاں گفتہ بود کہ تو بادشاہ خواہی شد" [۲]

وہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور شیخ اوحدالدین کرمانیؒ سے ملا تھا اور ان میں سے ایک بزرگ نے یہ فرمایا تھا کہ تو بادشاہ ہوگا۔

موضوع ملفوظات میں التمش کے متعلق بہت سی روایتیں ملتی ہیں۔ لکھا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ اور دیگر صوفیہ کرام بغداد میں ایک جگہ تشریف فرما تھے۔ التمش ایک کمان ہاتھ میں لیے ہوئے اُس طرف سے گزرا۔ ان بزرگوں کی نظر اُس پر پڑی۔ فوراً خواجہ صاحبؒ نے فرمایا ــــ

"ایں کودک بادشاہ دہلی خواہد شد" [۳] — یہ لڑکا دہلی کا بادشاہ ہوگا۔

ابتدائی زندگی کے یہ نقوش التمش کے افکار و احساسات کی اساس بن گئے۔ چشتیہ اور سہروردیہ بزرگوں کی صحبت سے قلب کی حرارت اور نگاہ کی پاکی لے کر وہ ہندوستان میں داخل ہوا۔[۴]

بدایوں میں قطب الدین ایبک نے سنہ ۱۲۰۳ء میں التمش کو بدایوں کا والی بنا کر بھیجا۔ بدایوں ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے قدیم ترین مرکزوں میں تھا۔ محمد غوری کی فتوحات سے قبل یہاں مسلمانوں کی نو آبادی قائم ہوگئی تھی۔ یہاں بے شمار شہداء کے مزارات تھے بغداد، بخارا، یمن، نخشب، ہمرہ، غزنین اور غور کے سیکڑوں برگشتہ قسمت انسانوں نے یہاں

۱؎ سیر العارفین (قلمی نسخہ) ص ۲۷؛ ۲؎ فوائد الفواد ص ۲۱۲؛ ۳؎ فوائد السالکین (قلمی نسخہ)

۴؎ صدر جہاں کے خاندان سے نکلنے کے بعد التمش، حاجی بخاری کے یہاں رہا، پھر جمال الدین چست قبا نے خریدا۔ پھر دہلی میں ایبک نے خریدا۔ یہ پوری داستان طبقات ناصری کے صفحات میں پڑھی جا سکتی ہے۔ ص ۱۶۷-۱۶۸۔

کے خاموش علمی اور مذہبی ماحول میں پناہ لی تھی۔ بہت سے مشائخ یہاں ارشاد و تلقین میں مصروف تھے۔ التتمش کس حد تک اس ماحول سے متاثر ہوا، اِس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی مجلس میں ایک بار بیان فرمایا تھا۔ ایک دن التتمش چوگان کھیلنے کیلئے اپنے مکان سے نکلا۔ راستہ میں ایک بوڑھے آدمی نے جس کی کمر عمر کے بوجھ سے جھک گئی تھی، بھیک مانگی۔ التتمش نے اُسے کچھ نہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ایک توانا اور تندرست جوان ملا۔ التتمش نے بغیر مانگے سونے کے چند تنکے اُس کو دیدیے۔ اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا: "کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں نے اس بڈھے فقیر کو کیوں کچھ نہیں دیا اور اِس جوان کو بغیر مانگے ہوئے کیوں دے دیا؟" التتمش کے دوست جو خود اس بات پر متعجب تھے اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ پھر التتمش نے خود ہی وجہ بتائی کہ

"اگر خواست من بودے، پیر را دادمے۔ پس ہر کرا می دہد خدا می دہد، من چہ کنم"[1]

اگر (انحصار) میری مرضی پر ہوتا، تو میں بڈھے (ہی) کو دیتا۔ لیکن جس کو بھی دیتا ہے خدا دیتا ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔

شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے التتمش کے اس جملہ کو نہایت پسندیدگی کے ساتھ اپنی مجلس میں بیان فرمایا تھا۔

بخارا، بغداد، بدایوں اور دہلی میں پرورش پائے ہوئے دینی شعور پر تصوف کا رنگ چڑھ جانا بالکل ناگزیر تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

تخت نشینی اور علماء کا ایک وفد

سنہ ۱۲۱۱ء میں التتمش دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ قاضیوں اور مفتیوں نے اُس سے بیعت کرنے میں تامل کیا۔ غالباً انہیں یہ شبہ تھا کہ وہ خطِ آزادی حاصل کیے بغیر تخت پر بیٹھ گیا ہے[2]۔ چنانچہ علماء کا ایک وفد قاضی وجیہ الدین کاشانی کی سرکردگی میں اُس سے ملنے کے لیے آیا۔ اس سے پہلے کہ وفد کا کوئی رکن استفسار حال کرے، التتمش نے اپنے فرش کا

۱؎ فوائد الفواد ص ۲۱۲ ۲؎ عجائب الاسفار ج ۲ ص ۵۲

کو نہ اُٹھایا اور قطب الدین کا لکھا ہوا خطِ آزادی نکال کر علمار کے سامنے رکھ دیا۔ سب علمار نے اسی وقت بیعت کرلی[1]۔ اس واقعہ نے جو آغازِ عہد میں پیش آیا تھا، التمش میں نہ صرف علمار کی طاقت کا احساس پیدا کیا بلکہ مذہبی طبقوں سے اُس کے تعلقات کی نوعیت بھی متعین کردی

مذہب میں دلچسپی

مذہب کی جو عظمت اور محبت ابتدائی زمانہ میں التمش کے دل میں قائم ہوگئی تھی وہ تخت نشینی کے بعد بھی اُس کے قلب و جگر کو گرماتی رہی اور سیاسی زندگی کی مصروفیتیں اس کے روحانی مشاغل میں حارج نہیں ہوئیں۔ اس نے اپنی دینی دلچسپیوں کا اتنا گہرا نقش دلوں پر بٹھا دیا تھا کہ تذکرہ نویس اولیار و مشائخ میں اُس کا شمار کرنے لگے اور تقدس کا ہالہ اس کے نام کے گرد رقص کرنے لگا۔ مولانا غلام سرور نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ :

"اگرچہ بظاہر تعلق بہ بادشاہی داشت — اگرچہ ظاہر میں اس کا تعلق بادشاہی سے تھا لیکن
لیکن از دل فقیر و فقیر دوست بود"[2] — جہاں تک دل کا تعلق ہے وہ فقیر اور فقیر دوست تھا۔

نظام الدین احمد بخشی نے اس کا شمار تو بادشاہوں ہی میں کیا، لیکن اس کی سیاسی طاقت کو یہ کہہ کر مذہبی رنگ دے دیا کہ

"چراغِ دولت او از نورِ تائیدِ الٰہی روشنی — اس کے چراغ دولت نے تائید الٰہی کے نور
پذیرفتہ بود"[3] — سے روشنی پائی تھی۔

حقیقت میں التمش کی زندگی اور اس کے کردار کا اصلی حسن اس توازن میں تلاش کرنا چاہیے جو اس نے مذہبی اور سیاسی زندگی کے تقاضوں میں قائم کیا تھا۔ اقبال کی زبان میں اُس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ؎

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

ایک طرف عزم جہانگیری کا یہ عالم کہ آہنی قلعوں سے ٹکرا جانے کے لیے بے قرار، دوسری طرف عجز و انکسار کا یہ حال کہ پھٹے کپڑوں میں مساکین اور درویشوں کی خدمت میں حاضری کے لیے بیچین

[1] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۵۱ [2] خزینۃ الاصفیار ج ۱ ص ۲۷۶ [3] طبقات اکبری ج ۱ ص ۶۳

جلال اور جمال کے یہ جلوے اس کی زندگی میں ایک خاص کشش پیدا کر دیتے ہیں۔ آئندہ صفحات میں جب اس کی تصویر کے مذہبی پہلو نظر کے سامنے آئیں تو اس کی سیاسی مصروفیات کا نقشہ بھی ذہن میں روشن ہونا چاہیے!

نماز کی پابندی التتمش نہایت پابندی سے نماز پنجگانہ ادا کرتا تھا۔ مہمات کے زمانہ میں نماز کے لیے خاص انتظام کیے جاتے تھے۔ واعظ اور امام ہر مہم پر اُس کے ہمراہ ہوتے تھے لکھا ہے:

"سلطان شمس الدین بر طاعت و عبادت مولع بود و روز ہائے جمعہ بمسجد رفتے و بہ ادائے فرائض و نوافل قیام نمودے"[1]	سلطان شمس الدین طاعت و عبادت کی بڑی لگن رکھتا تھا۔ جمعہ کے دن مسجد جاتا تھا اور فرائض و نوافل کی ادائیگی کے لیے وہاں قیام کرتا تھا۔

شب بیداری تزکیۂ باطن کی خواہش نے التتمش کو عبادت و ریاضت کی طرف متوجہ کر دیا۔ عشق حقیقی کی وہ چنگاری جو بغداد کی دینی مجلسوں میں اُس کے سینے میں روشن ہوئی تھی تخت نشینی کے بعد ایک شعلہ بن گئی۔ تمام تمام رات وہ بارگاہِ الٰہی میں سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا بیان ہے:

"شبہا بیدار بودے و ہیچ کس را بیدار نہ کردے"[2]	راتوں کو جاگتا تھا اور کسی کو بیدار نہیں کرتا تھا۔

موضوع ملفوظات میں اس اجمال کی تفسیر ملتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ الفاظ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نہ ہوں، لیکن اس زمانہ میں سلطان کی عبادتوں کے متعلق عام رائے یہ تھی:-

"از حد صاحب اعتقاد بود کہ شبہا بیدار بودے کہ وقتے اور اکسے در خواب ندیدے مگر در عالم تحیر ایستادہ واگر قدرے خواب کردے ہماں زماں بیدار شدے و خود بر خاستے	(وہ) حد سے زیادہ صاحب اعتقاد تھا۔ تمام تمام رات جاگتا تھا۔ (اس کا یہ حال تھا کہ) کسی نے اس کو کبھی سوتے ہوئے نہیں دیکھا (جب بھی دیکھا عالم تحیر میں کھڑا ہوا) اور عبادت میں مصروف

[1] طبقات اکبری ج ۱ ص ۶۳ [2] فوائد الفواد - ص ۲۱۳

وآب گرفتے، وضو ساختے، وبر مصلی قرار	اگر کبھی آنکھ لگ جاتی تو اُسی وقت (گھبرا کر) بیدار
گرفتے و ہیچ یکے از خدمت گاراں وغیرہ	ہو جاتا۔ اُٹھ کر خود پانی بھرتا، وضو کرتا اور مصلے پر بیٹھ
بیدار نہ کردے وگفتے کہ آسودگاں را	جاتا اور کبھی کسی خدمتگار کو نہیں جگاتا تھا، بلکہ کہتا
چرا در رنج آرم"۔ [۱]	تھا کہ جو لوگ آرام میں ہیں اُن کو کیوں زحمت دوں۔

یہ پیہم شب بیداری اُس کے روحانی سفر میں چراغِ راہ بن گئی اور اس کی مدد سے وہ تصوف کی دشوار گزار راہیں طے کر گیا۔

مذہبی مجلسیں التتمش کے دربار میں تین طرح کی مذہبی مجلسوں کا ذکر ملتا ہے۔ (۱) وعظ (۲) علمی مباحثے (۳) مجلسِ ذکر۔ وہ معمولاً ہفتہ میں تین بار وعظ سُنا کرتا تھا۔ جب رمضان کا مہینہ آتا تو وعظ کی مجلسیں روزانہ منعقد ہونے لگتی تھیں[۲]۔ مہمات کے دوران میں بھی وعظ ہوتے تھے۔ مولانا منہاج السراج نے اوچہ کے محاصرہ کے دوران میں خیمہ شاہی میں وعظ کہے تھے[۳]۔ سید نورالدین مبارک غزنویؒ اور دیگر مشاہیر عہد نے اس کے دربار میں وعظ کہے تھے۔ سماع وغیرہ کے سلسلہ میں مذہبی بحثیں بھی ہوئی تھیں۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ نے اپنے ملفوظات میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان مجلسوں میں اکابر کے درمیان جھگڑے کا ماحول بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ شیخ نظام الدین ابوالمویدؒ[۴] اور سید نورالدین مبارکؒ کے متعلق لکھا ہے:۔

"در پیشِ سلطان شمس الدین برائے زیر دست	سلطان شمس الدین کے روبرو، اوپر نیچے بیٹھنے پر
وزبردست نشستن نزاعے رفتہ بود"[۵]	اُن کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا۔

جمعہ کی نماز کے بعد ایک مجلس منعقد ہوتی تھی جس میں اکابر و مشائخ شریک ہوتے تھے اور زُہّاد سلطان

---

[۱] فوائد السالکین (قلمی نسخہ) [۲] و [۳] طبقات ناصری ص ۱۷۵۔
[۴] شیخ نظام الدین المویدؒ اس دور کے مشاہیر بزرگوں میں تھے۔ علی گڈھ کے مشہور بزرگ شیخ جمالؒ ان ہی کی اولاد میں ہیں۔ مختصر حال کے لیے ملاحظہ ہو: اخبار الاخیار۔ ص ۴۵۔
[۵] فوائد الفواد۔ ص ۱۹۳۔

حلقہ کردہ نشستند"[۱] التمش کے دربار میں علماء و مشائخ کے اجتماع کے متعلق برنی نے بلبن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس طہارت اور بزرگی کے لوگ نہ اُس نے کبھی دیکھے، نہ سُنے[۲]

سید نورالدین مبارک غزنوی کے وعظ | سید نورالدین مبارک غزنوی، شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے۔ دہلی میں لوگ اُن کی بڑی عزت کرتے تھے اور احتراماً میر دہلی کہہ کر پکارتے تھے۔ التمش نے ان کو دہلی کا شیخ الاسلام مقرر کر دیا تھا۔[۳] دربار میں انھوں نے متعدد بار وعظ کیے اور انتہائی جرأت اور بے باکی کے ساتھ دربار کے رسوم پر تنقید کی، لیکن بعض اور معاملات میں فکری اور نظری اعتبار سے وہ کسی ایسی بصیرت کا ثبوت نہ دے سکے جو ہندوستان کے مخصوص حالات میں قابلِ عمل ہوتی۔ ان کے مواعظ کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) بادشاہوں نے جن چیزوں کو "لوازم امور بادشاہی" قرار دے لیا ہے (مثلاً کھانے پینے کے طریقے، دربار کے آداب، وغیرہ) وہ سب سنت اور شریعت کے خلاف ہیں۔

(۲) "دین پناہی" کے لیے مندرجہ ذیل چار چیزیں ضروری ہیں۔ بادشاہوں کو ان پر عمل کرنا چاہیے۔

(الف) کلمۂ حق کی بلندی اور شعائرِ اسلام کی ترویج کے لیے کوشش۔ شرک اور بت پرستی کا خاتمہ۔ غیر مسلموں کے ساتھ سختی کا برتاؤ۔

ب۔ فسق و فجور کا خاتمہ، بدکردار لوگوں پر سختی۔ لیکن طوائفوں کو ختم نہ کیا جائے اس لیے کہ

"اگر ایں قوم نباشند بسیار بدبختاں از سر غلبۂ شہوت در محارم افتند"	اگر یہ قوم نہ ہو گی تو بہت سے بدبخت شہوت سے مغلوب ہو کر محارم میں کودنے لگینگے۔

---

[۱] سیر العارفین (قلمی نسخہ) ص ۱۱۲؛ مطبوعہ نسخہ میں یہ عبارت نہیں ہے۔

[۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۷۰، [۳] مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو: فوائد الفواد۔ ص ۱۹۳ اخبار الاخیار۔ ص ۲۸-۲۹؛ گلزار ابرار (قلمی)

[۴] اخبار الاخیار۔ ص ۲۸۔

ج۔ دین محمدی کے احکام کا اجراء۔ اور اس کے لیے اتقیا، زُہّاد اور خدا ترس لوگوں کا تقرر۔ فلسفیوں کا ملک سے اخراج۔ بدمذہب اور بددین لوگوں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تقرر کی ممانعت

د۔ داد دہی اور انصاف ستانی کے لیے پوری جدوجہد۔ ظلم و تعدی سے مملکت کو بالکل پاک کر دینے کا عزم۔

سید نورالدین مبارکؒ کا خیال یہ تھا کہ خواہ سلطان خود ہوا و ہوس اور نفس کی آلودگیوں میں مبتلا رہے لیکن ان چار باتوں پر اگر وہ عمل کرتا رہیگا تو اولیاء اور انبیاء میں مقبول ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر وہ خود کتنا ہی دیندار، دن میں ہزار رکعت پڑھنے والا اور صائم الدہر ہوگا، لیکن ان چار باتوں پر عامل نہ ہوگا تو اس کا ٹھکانہ دوزخ کے سوا کوئی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔[1]

برنی نے یہ مواعظ بالتفصیل اپنی تاریخ میں نقل کیے ہیں۔ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ یہ ساری گفتگو میرِ دہلی ہی کی ہے یا برنی نے خود اپنے افکار و خیالات اُن کی زبان سے ادا کرا دیے ہیں۔ فلسفہ کی تعلیم کے خلاف جو کچھ سید نورالدین مبارکؒ کی زبان سے کہلوایا گیا ہے وہ برنی کا اپنا خیال معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فلسفیوں کا عروج اور فلسفہ کی ترویج کا مسئلہ عہد تغلق کا مسئلہ تھا، اور التتمش کے عہد میں کسی نوعیت اور شکل میں بھی موجود نہ تھا۔ اسی طرح کے خیالات برنی نے فتاوائے جہانداری میں بھی ظاہر کیے ہیں۔ سید نورالدین مبارکؒ کے متعلق تفصیلی معلومات موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ برنی نے کہاں تک ان کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ غیر مسلموں کے متعلق جن خیالات کا اظہار انھوں نے کیا ہے وہ قابلِ غور ہیں۔ برنی کی ایک اور تصنیف صحیفۂ نعت محمدی کے ساتھ اُن کو پڑھا جائے تو اس مسئلہ کے کئی پہلو واضح ہو جاتے ہیں۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۱-۴۴۔

علماء کا ایک وفد سلطان کی خدمت میں

برنی نے لکھا ہے کہ ایک دن کچھ اکابر علماء التتمش کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہندوؤں کے ساتھ "اما القتل واما الاسلام" کا معاملہ کرنا چاہیے، اور یہ کہ اہل ذمہ کے حقوق اُن کو نہیں دینے چاہییں۔ اس بنا پر کہ وہ اہلِ کتاب نہیں ہیں۔ التتمش نے اپنے وزیر نظام الملک جنیدی کو طلب کیا اور علماء کو جواب دینے کا حکم دیا۔ وزیر نے کہا:

"فاما دریں وقت کہ ہندوستان نوگیر است	لیکن اس وقت کہ ہندوستان ابھی فتح ہوا ہے
وہندو چندان است کہ مسلمان درمیاں	اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب وہی ہے
ایشاں بہ طریق نمک اندک در آید، بسیار	جیسے آٹے میں نمک، اگر ہم اس حکم یا مشورہ
برنیاید، کہ اگر ما حکم مذکور با ایشاں کار	پر عمل کریں تو وہ متحد ہو جائینگے اور ایسا انتشار
خواہم فرمود نباید کہ یک دیگر شوند	پیدا ہو جائیگا اور ہم طاقت کی کمی کے باعث
شیعہ عالم شود و ما ازاند کی طاقت	اس فتنہ کو فرو نہ کر سکینگے۔ لیکن چند سال گزرنے
نیارم و از ہر طرف فتنہ زاید۔ فاما چوں	پر جب دار الملک، قصبات و خطط میں مسلمان
چند سال بگزرد و در دار الملک و خطط	جم جائینگے اور لشکر بڑھ جائینگے اس وقت
وقصبات مسلمان (برایند) ولشکرہا	ہندوؤں کے ساتھ "اما القتل" یا "اما
بسیار گرد آید ما البتہ با ہنود "اما القتل" و	الاسلام" کا معاملہ کیا جا سکیگا!
"اما الاسلام" پیش آمدنی ام" [۱]	

برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں سید مبارک غزنوی ؒ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ بھی اس وفد کے ارکان میں شامل ہونگے۔ عجیب بات ہے کہ جو سوال ہندوستان میں محمد بن قاسم ہی کے زمانہ میں طے ہو گیا تھا اُس کو التتمش کے عہد میں پھر اُٹھایا گیا۔ ظاہر ہے کہ التتمش اس مشورہ پر عامل نہیں ہو سکتا تھا۔ سیاسی بصیرت، حالات کے تقاضے، مذہب کی حقیقی تعلیم۔ سب کسی دوسرے اندازِ فکر و عمل کی طرف اشارہ کر رہے

---

[۱] صحیفۂ نعت محمدی (قلمی نسخہ) اس کتاب کا نادر نسخہ رام پور کے قلمی کتب خانہ میں ہے۔

تھے۔ التتمش کے فکر کی بنیاد سید نورالدین مبارکؒ کے اصول نہیں بن سکتے تھے۔ وہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے "صلح کل" کے اُن اصولوں سے زیادہ متاثر تھا جن کی تقویت پر وہ اجمیر میں پرتھوی راج کے دورِ حکومت میں ہندو آبادی کے درمیان جا کر بسا گئے تھے اور تیغ و تفنگ کے بجائے محبت کی بے پناہ قوت سے اقلیم دل کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی۔ التتمش نے ہندوستان کی تاریخ کے اس خاموش اشارہ کو سمجھ لیا تھا کہ یہاں ایک وسیع، ہمدردانہ اور مصلحانہ طرزِ فکر ہی کی مدد سے ایک مضبوط سیاسی اور سماجی نظام کی بنیادیں استوار کی جا سکتی ہیں۔

ایصال ثواب کا اہتمام التتمش، روح کو ثواب پہنچانے کے لیے قرآن خوانی اور تقسیم طعام کا قائل تھا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وفات پر اُس نے قاضی حمید الدین ناگوریؒ کی خانقاہ میں کھانا بھیجا۔[۱] جب اُس کے بڑے بیٹے ناصر الدین محمود کا انتقال ہوا تو بقول تاریخ محمدی

"مختمات قرآن و صدقات فراواں استمداد نمود"[۲] (ایصال ثواب کے لیے ختم قرآن کیے گئے اور بہت صدقات تقسیم کیے گئے۔)

مشائخ سے عقیدت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے التتمش کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ

"در تعظیمِ مشائخ و علماء و زہاد از بادشاہانِ وقت نظیر نداشت"[۳] (مشائخ، علماء اور زہاد کی تعظیم میں وہ بادشاہانِ وقت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔)

منہاج السراجؒ نے اس بات کو ذرا مبالغہ کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:۔

"غالب ظن آن است کہ ہرگز بادشاہی بحسن اعتقاد و آب دیدہ و تعظیم علماء و مشائخ مثل او از مادر خلقت در قماط" (ظن غالب یہ ہے کہ کوئی بادشاہ جو علماء اور مشائخ کی اس درجہ تعظیم کرتا ہو اور ان میں اتنا اعتقاد رکھتا ہو پیدا

---

[۱] رسالۂ حال خانوادۂ چشت (قلمی) [۲] تاریخ محمدی (روٹوگراف) ص ۳۴۸ الف

[۳] تاریخ حقی (قلمی نسخہ) ص ۷ الف، نیز ملاحظہ ہو زبدۃ التواریخ (روٹوگراف) ص ۱۰ الف

سلطنت نیا مدہ۔[۱] ہی نہیں ہوا۔

جس وقت التمش دہلی کے تخت پر بیٹھا تھا، اس زمانہ میں صدہا علماء و مشائخ وسط ایشیا کے حالات سے بدل ہو کر ہندوستان آ رہے تھے۔[۲] سلطان نے ان بزرگوں کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور شاہی مہمان رکھا۔ اُس کی مہماں نوازی نے مقناطیس کا کام کیا اور بہت سے مشاہیر فن اور بزرگ یہاں آکر بس گئے۔[۳] بعض اوقات تو ایسا ہوتا تھا کہ جب کسی بزرگ کی آمد کی اطلاع ملتی تھی تو میلوں تک استقبال کے لیے نکل جاتا تھا۔ جب شیخ جلال الدین تبریزیؒ بغداد سے دہلی تشریف لائے تو سلطان اُن کے استقبال کے لیے دور تک گیا اور

"چوں شیخ را دید از اسپ فرود آمدہ بجانب ایشاں دوید"[۴]	جوں ہی شیخ کو دیکھا، گھوڑے سے اُتر کر اُن کی طرف دوڑا۔

منہاج کا بیان ہے کہ سلطان "دستار بندوں" اور "کلاہ داروں" پر کافی خرچ کرتا تھا۔

"از اول عہدِ دولت و طلوع صبح مملکت در استجماع علمائے با نام و سادات کرام و ملوک و امراء و صدور و کبراء زیادت از ہزار لک ہر سال بذل فرمود"[۵]	اپنے عہد دولت کی ابتدا اور طلوع صبح مملکت سے (اس کا یہ دستور بن گیا تھا کہ) وہ علماء، سادات کرام، ملوک و امراء، صدور و کبراء پر ایک کروڑ سے زیادہ بخشش ہر سال کرتا تھا

سید محمد گیسو درازؒ کی روایت ہے کہ

"در ہر شب جمعہ خود در خانۂ عوراتِ زال و فقراء گشتے و ہر یکے را تنکہ و چندگاں سیر شیریں پیش آں داشتے و ... یگاں کرہ سیم چہار گاں پنجگاں	ہر جمعہ کی رات کو بوڑھی عورتوں کے گھروں اور فقیروں کے پاس جاتا تھا، ایک کرہ سیم، چار پانچ تنکے، چند سیر مٹھائی ان کے سامنے رکھتا تھا اور

[۱] طبقات ناصری ص ۱۶۷ [۲] ایضاً ص ۱۶۶ [۳] زبدۃ التواریخ ص ۱۱ - الف
[۴] سیر العارفین ص ۱۶۵ [۵] طبقات ناصری ص ۱۶۵

پائے ایشاں افتادے و گفتے کہ من بندۂ شمام و غلام شمام۔ شما بیبیاں ماآید[1]"

اُن کے پیروں پر گرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں تمہارا غلام ہوں تم میری (بیبیاں) مائیں ہو۔

ایک مرتبہ دہلی میں شدید قحط پڑا۔ امساک باراں کے باعث غلّہ کی قیمت بڑھ گئی اور لوگ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ ایلتتمش پر اس کا بے حد اثر ہوا۔ ایک درباری کو حکم دیا۔

"برو درویشانِ اہل اللہ را کہ دریں شہر اند از ما سلامے و نیازے برساں و عرض دار کہ دفع ظالم و فتنہ کارِ بادشاہان است، ما دراں تقصیر نداریم و توجہ باطن بحق تبارک و تعالیٰ و دعائے خیر خلائق خاص و عام حق شما است، توجہ بحق نمائید و دعائے استسقار فرمائید تا از برکت اخلاص دعا و توجہ شما حق تعالیٰ کرم فرماید و باران رحمت عطا فرماید[2]"

جا اس شہر میں جو درویشان اہل اللہ ہیں ان کو میرا سلام اور (ہدیہ) نیاز پہنچا۔ اور عرض کر کہ ظالم کا اور فتنہ کا دفع کرنا بادشاہوں کا کام ہے، میں اس (کام) میں کوتاہی نہیں کرتا۔ حق تعالیٰ کی طرف توجہ باطن اور خلق کی بہتری کے لیے دعاء کرنا آپ کا حق ہے۔ اللہ کی طرف توجہ کیجیے اور دعائے استسقاء فرمائیے تاکہ آپ کی دعاؤں کی برکت اور توجہ سے حق تعالیٰ کرم فرمائے اور بارانِ رحمت نازل فرمائیے۔

مشایخ سے ان تعلقات کا اثر یہ ہوا کہ وہ مذہبی حلقوں میں خاص عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں نے جو سلاطین سے زیادہ ربط ضبط بڑھانے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اپنی مجلسوں میں اُس کے عقائد کی تعریف پر اکتفا کیا، لیکن سہروردیہ سلسلہ کے مشائخ نے، جن کے نزدیک سلاطین و امراء سے تعلقات رکھنا کسی روحانی سعادت کے خلاف نہیں تھا، اس کو حدودِ سلطنت وسیع کرنے میں مدد دی۔

ایلتتمش اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ

شیخ بہاء الدین زکریاؒ ہندوستان میں سہروردیہ سلسلہ

---

[1] جامع الکلم ص ۲۶۹، نیز ملاحظہ ہو: فوائد السالکین (قلمی نسخہ) ص ۱۰ الف

[2] سیر العارفین (قلمی نسخہ) ص ۹۰، (مطبوعہ نسخہ) ص ۱۵۴-۱۵۵، نیز ملاحظہ ہو خیر المجالس ص ۴۵۔

کے سب سے زیادہ مشہور بزرگ تھے۔ سلسلہ کی داغ بیل اور اس ملک میں اُس کا نشو ونما ان ہی کی جد وجہد کا نتیجہ تھا۔ چشتی بزرگوں کے مسلک کے خلاف وہ سلاطین سے گہرے تعلقات رکھتے تھے اور جب حالات کا تقاضہ ہوتا تو سیاست میں بھی حصہ لے لیتے تھے۔ ملتان میں گو قباچہ کی حکومت تھی، لیکن شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس کے مخالف یعنی التمش سے ہمدردی رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ملتان کے قاضی، مولانا شرف الدین کی شرکت میں التمش کو ایک خط لکھا۔ یہ خط قباچہ کے ہاتھ لگ گیا۔ اُس نے قاضی شہر اور شیخ دونوں کو بلایا اور اس معاندانہ کارروائی پر جواب طلب کیا۔ شیخ نے صرف اتنا کہا کہ انہوں نے خدا کے حکم سے ایسا کیا تھا۔ قباچہ نے شیخ کو کوئی سزا نہیں دی، لیکن قاضی کو قتل کرا دیا[۱]۔ شیخ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنے کا بڑا سبب ملتان میں ان کی غیر معمولی مقبولیت تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں شیخ کی سزا کے حکم کے ساتھ التمش کی فوجیں اسی بہانہ سے ملتان میں داخل نہ ہو جائیں۔

شیخ نظام الدین اولیاءؒ اس واقعہ کے سب سے قدیم راوی ہیں لیکن اُنہوں نے شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور قباچہ کے تعلقات کی خرابی کے اسباب بیان نہیں کیے[۲]۔ مولانا جمالیؒ کا بیان ہے کہ قباچہ، التمش کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ یہ بات شیخ ملتانیؒ کو پسند نہ تھی انہوں نے اس کی اطلاع التمش کو کر دی[۳]۔ اسباب کچھ ہوں، بہر حال یہ حقیقت ہے کہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ جیسے معاونین کے ہوتے ہوئے التمش ملتان پر اپنا تسلط قائم کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ملتان التمش کے قبضہ میں آگیا۔ شیخ ملتانیؒ نے سلطان سے نہ صرف ذاتی تعلقات قائم کیے بلکہ شیخ الاسلام کا عہدہ بھی قبول کر لیا[۴]۔

۱؎ فوائد الفواد ص ۱۱۹-۱۲۰، سیر العارفین ص ۱۶۹ ۲؎ فوائد الفواد ص ۱۱۹

۳؎ سیر العارفین ص ۱۱۲-۱۱۳، فرشتہ کا یہ بیان کہ قباچہ کی شریعت سے بے اعتنائی اس اقدام کا سبب تھی (جلد ۲ ص ۴۰۶) قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کسی معاصر مورخ کے بیان سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

۴؎ سیر العارفین ص ۱۶۹۔

ملا سیف ہروی نے لکھا ہے کہ ایک بار ملتان پر ملک شمس الدین وسالی نوین نے حملہ کیا۔ ان دنوں ملتان کا حاکم التمش کا ایک غلام جنگر خاں تھا۔ جنگر خاں نے شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو حملہ آور کے پاس بھیجا تاکہ اُسے سمجھا کر اور کچھ مال دے کر حملہ کرنے سے باز رکھیں۔ شیخ نے نہایت خوش اسلوبی سے اس کام کو انجام دیا[1]۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور التمش

التمش کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بڑی عقیدت تھی بعض تذکرہ نویسوں[2] نے اس عقیدت کے پیش نظر سلطان کو خواجہ صاحبؒ کے مریدوں میں شمار کیا ہے لیکن کسی قدیم تذکرہ یا تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ جب قطب صاحبؒ دہلی تشریف لائے تو سلطان نے بڑی گرم جوشی سے اُن کا استقبال کیا۔ اور اُن سے گزارش کی کہ محل شاہی کے قریب ہی قیام فرمائیں۔ قطب صاحبؒ نے یہ درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا تو سلطان نے دو ہفتہ میں دو بار ان کی قیام گاہ پر حاضر ہونا اپنا معمول بنا لیا[3]۔ قطب صاحبؒ نے سلطان کو ہدایت کی تھی کہ:

اے والی دہلی! تجھے چاہیے کہ غریبوں فقیروں مسکینوں کے ساتھ نیکی سے پیش آئے اور خلق (خدا) کے ساتھ نیکی کرے، رعیت پرور رہو۔ جو بھی رعیت کے ساتھ رعایت کرتا ہے اور خلقت کے ساتھ نیکی کا برتاؤ، اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے دشمن (بھی) اس کو دوست سمجھنے لگتے ہیں۔	اے والی دہلی! باید کہ با غریبان و فقیران و درویشاں و مسکیناں نیکو باشی و با خلق نیکوئی کنی و رعیت پرور باشی۔ ہر کہ با رعیت رعایت کند و با خلق نیکوئی کند خدائے تعالیٰ او را نگاہ دارد و جملہ اعداء او (را) دوست دارند"[4]

---

[1] تاریخ نامۂ ہرات، سیف بن محمد بن یعقوب ہروی ص ۱۵۷-۱۵۸۔
[2] ملاحظہ ہو مراۃ الاسرار (قلمی نسخہ) اور سبع سنابل ص ۲۳۴۔
[3] سیر العارفین ص ۲۱، جواہر فریدی (قلمی نسخہ)، فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۰، روضہ اقطاب ص ۶- مونس الارواح (قلمی نسخہ) ص ۷۔ [4] رسالہ حال خانوادۂ چشت (قلمی نسخہ)، سبع سنابل ص ۲۲۳۔

مولانا جمال الدین محمد بسطامی کے انتقال پر التتمش نے شیخ الاسلام کا عہدہ قطب صاحبؒ کو پیش کیا۔ قطب صاحبؒ نے معذوری ظاہر کی تو یہ خدمت مولانا نجم الدین صغری کے سپرد کی گئی۔ صغری کی طبیعت میں غرور اور حسد کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ قطب صاحبؒ کی مقبولیت اُن کے لیے ذہنی اذیت اور قلبی بےچینی کا سبب بن گئی۔ اور اُن کو ایذا پہنچانے کی فکر میں رہنے لگے۔ ایک بار خواجہ معین الدین چشتیؒ دہلی تشریف لائے۔ انہیں جب شیخ الاسلام کی معاندانہ حرکات کا علم ہوا تو رنجیدہ خاطر ہوئے اور قطب صاحبؒ کو اپنے ہمراہ اجمیر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ التتمش کو جب اس کی اطلاع ملی تو ہزاروں اور عقیدتمندوں کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کے پیچھے پیچھے میلوں تک گیا۔ میر خورد کا بیان ہے:

"پس شیخ قطب الدین ہمراہ شیخ روانہ اجمیر گردید۔ ازیں مقدمہ در تمام شہر دہلی شور افتاد، ہمہ اہل شہر مع سلطان شمس الدین دنبال برآمدند و ہر جا شیخ قطب الدینؒ قدم میگذاشت خلائق خاکِ آں زمین بہ تبرک برمیداشت"۔ ۱

پس شیخ قطب الدین (اپنے) شیخ کے ہمراہ اجمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ اس بات سے تمام شہر دہلی میں ایک شور برپا ہوگیا۔ تمام اہالیان شہر مع سلطان شمس الدین ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ جہاں شیخ قطب الدین قدم رکھتے تھے لوگ اس زمین کی خاک تبرک کے طور پر اٹھا کر رکھ لیتے تھے۔

خواجہ اجمیریؒ نے جب عوام اور سلطان کو یکساں رنجیدہ پایا تو قطب صاحبؒ کو دہلی میں قیام کرنے کی اجازت دیدی۔ التتمش نے فرطِ مسرت میں خواجہ صاحبؒ کے قدم چوم لیے اور قطب صاحبؒ کو دہلی واپس لے آیا۔ ۲

فوائد السالکین میں لکھا ہے کہ قطب صاحبؒ نے فرمایا کہ سلطان ایک مرتبہ رات کے وقت اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ قطب صاحبؒ نے گھبرا کر پوچھا: تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے؟ جو حاجت ہو بتاؤ۔ سلطان نے جواب دیا، اُس خدا کے فضل و کرم

۱ سیر الاولیاء ص ۵۴-۵۵ ۲ ایضاً ص ۵۵

سے جس نے مجھے یہ مملکت عطا فرمائی ہے، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ـــ

"چوں فردا قیامت شود مارا بکدام	کل کو جب (ہنگامۂ) قیامت برپا ہوگا مجھے
طائفہ بگرداند" [1]	کس گروہ میں شمار کرینگے!

مشائخ سے اس عقیدت کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ امیر خسروؒ نے کیا خوب کہا ہے ـ

در حجرۂ فقر بادشاہے	در عالمِ دل جہاں پناہے
شاہنشہے بے سریر و بے تاج	شاہانش بخاکپائے محتاج

ہر چند کہ التمش اس عقیدت سے پیش آتا تھا، لیکن قطب صاحبؒ اس کے دربار میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ، اجمیر سے دہلی تشریف لائے۔ صورت یہ تھی کہ اُن کے بیٹوں نے ایک افتادہ زمین میں کاشت شروع کردی تھی۔ مقطعِ اجمیر نے فرمان طلب کیا، لڑکوں نے بوڑھے باپ کو مجبور کیا کہ دہلی جاکر فرمان شاہی حاصل کریں۔ قطب صاحبؒ نے شیخ سے گزارش کی کہ آپ غریب خانہ پر قیام فرمائیں، میں خود جاکر فرمان لے آؤنگا۔ قطب صاحبؒ کو دربار میں دیکھ کر التمش کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس نے بارہا تشریف لانے کی درخواست کی تھی لیکن کبھی قبول نہیں ہوئی تھی۔[2] سید محمد گیسو دراز کا بیان ہے،

بمجرد آنکہ سلطان شنید کہ شیخ می آید از	جوں ہی سلطان نے شیخ کی تشریف آوری کی بات
تخت فرود آمد، پائے پیادہ دوید۔ در صحن	سُنا، تخت سے نیچے اُتر آیا اور ننگے پیر دوڑا۔ دوسرے
دوم ملاقات کرد۔ شیخ را بالا نبرد، ہمانجا	صحن میں ملاقات ہوئی۔ شیخ کو اوپر جانے کی زحمت
زلیچہ فراز کرد۔ چند بار خود سلطان بر در	نہیں دی۔ اسی جگہ زلیچہ (؟ زلیہ) بچھا دیا۔ چند بار

---

[1] فوائد السالکین (قلمی نسخہ) ص ۱۹۔

[2] سیر الاولیاء ص ۵۳، جوامع الکلم (ص ۲۰۷) میں یہ واقعہ کچھ فرق سے لکھا ہے۔ سیر الاولیاء سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کے فرزندوں نے کاشت شروع کردی تھی لیکن جوامع الکلم میں یہ ہے: "من (خواجہؒ) مزرعہ کردہ بودم، آں مزرعہ استقامت گرفت" (ص ۲۰۷)

شیخ رفتہ، شیخ در نکشودہ و بر خود نخواندہ،	سلطان خود شیخ کے در پر حاضر ہوا تھا لیکن شیخ نے نہ
امروز خود آمدہ است، پرسید بچہ سبب	دروازہ کھولا تھا نہ اس کو اپنے پاس بلایا تھا۔ آج
شیخ بندہ خویش را نواختہ اند" ۱؎	وہ خود تشریف لائے تھے۔ (سلطان نے) پوچھا: کس
	سبب سے شیخ نے بندہ کو نوازا ہے؟۔

بہر حال ایلتتمش نے فوراً فرمان تیار کرا کر شیخ کے حوالے کر دیا۔

قطب صاحبؒ نے ۱۴-ربیع الاول ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۳۵ء کو وصال فرمایا۔ جب جنازہ نماز کے لیے لایا گیا تو خواجہ ابو سعید نے اعلان کیا:

"حضرت خواجہ وصیت کردہ بود کہ امام	حضرت خواجہ نے وصیت کی تھی کہ جاسے جنازہ
جنازہ ما آں کس باشد کہ گاہے ازار بہ دسس	کا امام ایسا شخص ہو جو عفیف رہا ہو، عصر کی
حرام نکشادہ باشد و سنتہائے عصر و تکبیر	سُنتیں اور فرائض نماز کی ادائیگی میں تکبیر
اولیٰ فرائض نماز گاہے از و ترک نشدہ	اولیٰ کبھی اس سے ترک نہ ہوئی ہو۔
باشد" ۲؎	

ایلتمش بھی اُس وقت موجود تھا۔ کچھ دیر دم رو کے اس انتظار میں کھڑا رہا کہ کوئی دوسرا شخص اس مجمع سے باہر آ کر نماز جنازہ پڑھا دے۔ جب کوئی اُن خصوصیات کا حامل نہ نکلا تو خود آگے بڑھا اور کہا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنی نمازوں کی اس طرح نمائش کروں، لیکن بہر حال قطب صاحبؒ کے حکم کی تعمیل لازم ہے۔ یہ کہہ کر ایلتتمش نے نماز پڑھائی اور اپنے کاندھوں پر جنازہ قبرستان تک لے کر گیا۔ ۳؎

قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور سلطان

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے دوست، قاضی حمید الدین ناگوریؒ اپنے زمانہ کے مشہور صوفی اور عالم تھے۔ ۴؎ اُن کی

۱؎ جوامع الکلم ص ۲۰۷ ۲، ۳؎ خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۲۷۵۔
۴؎ مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو: فوائد الفواد ص ۲۴۱، سیر العارفین ص ۱۴۷، اخبار الاخیار ص ۳۶-۴۳۔ گلزار ابرار (قلمی نسخہ)، معارج الولایت (قلمی نسخہ)

تصانیف مشایخ کے حلقہ میں خاص عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ اپنے شاگردوں سے قاضی ناگوریؒ کی تصانیف کے متعلق کہا کرتے تھے:

"شما انچہ می خوانید ہم دریں کاغذہا ہست	تم جو کچھ پڑھتے ہو، اس میں ہے جو کچھ تم نے نہیں
وانچہ نخوانده اید ہم دریں میاں ہست	پڑھا ہے وہ بھی ان کتابوں میں ہے جو کچھ
وانچہ من خوانده ام ہم دریں میاں ہست	میں نے پڑھا ہے وہ بھی ان میں ہے، جو میں
وانچہ نخوانده ام ہم ہست" [۱]	نے نہیں پڑھا وہ بھی ان میں ہو۔

قاضی حمید الدینؒ کو سماع میں بے حد دلچسپی تھی۔ دہلی میں سماع کو ان ہی نے رواج دیا تھا[۲]
ایلتتمش کو اُن سے بڑی عقیدت تھی۔ جب دربار میں تشریف لاتے تھے تو سلطان کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کرتا تھا۔ عصامی نے لکھا ہے[۲]

بہ تعظیم او شاہ برخاستے	نظر از جمالش بیاراستے [۳]

دہلی کے علماء بالخصوص قاضی سعد اور قاضی عماد سماع کے مخالف تھے۔ ایک بار انھوں نے سلطان سے قاضی حمید الدین ناگوریؒ کی شکایت کی[۴] ایلتتمش نے مسئلہ کے شرعی پہلو کی وضاحت کے لیے علماء کو طلب کیا، اور قاضی ناگوری کو بھی بلایا۔ جب قاضی صاحبؒ تشریف لائے تو ایلتتمش کھڑا ہو گیا اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ سماع کے متعلق قاضی صاحبؒ نے فرمایا کہ اہلِ حال کے لیے جائز ہے لیکن اہلِ قال کے لیے ممنوع۔ اس کے بعد اُنھوں نے سلطان کو وہ وقت یاد دلایا جب بغداد میں محفل سماع منعقد تھی اور اس نے تمام رات مشایخ کی خدمت گزاری میں بسر کر دی تھی۔ اور اسی رات اُنھوں نے خوش ہو کر:

دراں شب ترا ملک ہندوستاں	بدادند زاں چاکریِ عارفاں

---

[۱] فوائد الفواد۔ ص ۲۴۱ [۲] ایضاً ص ۲۳۹ [۳] فتوح السلاطین ص ۱۱۷۔
[۴] مختصراً اس واقعہ کی طرف شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے بھی اشارہ کیا ہے۔ فوائد الفواد ص ۲۳۹۔

التمش کو وہ واقعہ یاد آگیا اور وہ قاضی حمید الدینؒ کے قدموں میں گر گیا۔ قاضی صاحبؒ نے اپنے قوال محمود سے کچھ اشعار سنوائے۔ پھر التمش قاضی صاحبؒ کے ہمراہ ان کی خانقاہ میں گیا وہاں محفل سماع منعقد ہوئی اور دعوت کا بھی انتظام کیا گیا[۱]۔ التمش کے ایما سے اس کا خواہرزادہ سعد الدین تنبولی قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے حلقہ مریدین میں شامل ہوا[۲]۔

شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور التمش

شیخ جلال الدین تبریزیؒ، شیخ ابو سعید تبریزیؒ کے خلیفہ تھے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی صحبت سے بھی فیض پایا تھا[۳]۔ جب ہندوستان تشریف لائے تو التمش نے اُن کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور محل شاہی میں اُن کو مہمان رکھا۔ دہلی کے شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو اُن سے حسد پیدا ہو گیا اور اُن کے متعلق سلطان کی رائے کو خراب کرنے کے لیے مختلف قسم کے الزام تراشے[۴]۔ جب کسی طرح کامیابی نہ ہوئی تو دہلی کی ایک رقاصہ گوہر کو پانچ سو دینار سرخ کا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ شیخ جلال الدین تبریزی پر ایک نہایت ہی رکیک اور ناشائستہ الزام لگائے۔ نجم الدین صغری نے ڈھائی سو دینار پیشگی ادا کر دیے اور بقیہ نصف کے متعلق بعد کو ادائگی کا وعدہ کیا۔ گوہر نے جب التمش سے شیخ کے متعلق کہا تو اُس نے محضر طلب کیا تاکہ علمار کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا جائے ہندوستان کے تمام مشاہیر مشایخ کو شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔ جمالی نے لکھا ہے:-

مسموع است کہ دویست وچند اولیا	سُنا ہے کہ دو سو سے زیادہ اولیار شیخ المشائخ
مثل حضرت شیخ المشایخ شیخ بہار الدین	شیخ بہار الدین زکریاؒ کی مثل جامع مسجد میں
زکریا در مسجد جامع حاضر شدند[۵]	حاضر ہوئے تھے۔

جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد میں سب علمار و مشایخ جمع ہوئے۔ التمش بھی حاضر ہوا۔ حضرت

---

[۱] فتوح السلاطین ص ۱۱۹ [۲] رسالہ حال خانوادۂ چشت (قلمی)، سبع سنابل (ص ۲۳۲-۲۳۳) میں تفصیل درج ہے [۳] مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو: سیر العارفین ص ۱۶۴-۱۷۱، اخبار الاخیار ص ۴۳-۴۵، گلزار ابرار (قلمی) [۴] جمالی نے تفصیل سے بیان کیا ہے، سیر العارفین ص ۱۶۵-۱۶۶۔ [۵] سیر العارفین ص ۱۶۸۔

شیخ بہاء الدین زکریا ؒ کو حَکَم بنایا گیا۔ نجم الدین صغری کا یہ خیال تھا کہ شیخ تبریزیؒ اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے تعلقات کشیدہ ہیں، اس لیے ان کا حَکَم ہونا مفید مطلب ثابت ہوگا لیکن شیخ ملتانیؒ نے مجلس کا رنگ ہی بدل دیا۔ شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے جب مسجد میں قدم رکھا اور جوتیاں اُتار کر اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا تو شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے دوڑ کر اُن کی جوتیوں کو ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ التمش نے فوراً کہا:۔

محضر بر خیزد کسے را کہ حَکَم ساختہ بودند او   محضر برخاست ہوتا ہے جس کو حَکَم بنایا گیا ہے

این تعظیم کرد، پس حاجت گفتگو نماند"   جب وہ اتنی تعظیم کرتا ہے تو پھر گفتگو کی کیا ضرورت ہے،

شیخ ملتانیؒ نے جواب میں کہا کہ میرے لیے واجب ہے کہ ان جوتیوں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بناؤں اس لیے کہ شیخ تبریزیؒ سات سال تک سفر و حضر میں میرے پیر و مرشد کے ساتھ رہے ہیں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ نجم الدین صغری یہ سمجھے کہ میں نے اس تعظیم سے ان کی عیب پوشی کی ہے۔ حالانکہ تمام اہل اللہ پر یہ بات روشن ہے کہ ایسی پاک ذات سے اس طرح کی حرکت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد گوہر کو بلایا گیا اور شیخ ملتانیؒ نے اس سے حق بات کہنے کا مطالبہ کیا۔ مطربہ نے باآواز بلند کہا — "یہ سب محض دروغ اور افترا ہے۔ حضرت شیخ جلال الدین آبحیات سے زیادہ پاک ہیں"۔ اس کے بعد نجم الدین صغری کی سازش کا انکشاف کیا۔ التمش نے صغری کو شیخ الاسلامی سے معزول کر دیا[۱]۔ شیخ تبریزیؒ کو اس پورے معاملہ کا بے حد صدمہ ہوا اور وہ یہ کہتے ہوئے دہلی سے رخصت ہو گئے:

من دریں شہر آمدم زرِ صرف بودہ ام،   میں جب اس شہر (دہلی) میں آیا تھا تو خالص

ایں زماں نقرہ ام یا بیشتر چہ خواہد شد[۲]"   سونا تھا۔ اس وقت چاندی میں تبدیل ہو چکا ہوں (نہ معلوم) آگے کیا ہو!

شیخ تبریزیؒ ایک ستارہ کی مانند افق دہلی پر نمودار ہوئے، اور آناً فاناً میں بنگال جا کر نظروں

[۱] سیر العارفین ص ۱۶۹   [۲] فوائد الفواد ص ۱۱۳

سے اوجھل ہو گئے۔ بنگال میں اُن کے کام کی نوعیت اور اثرات کا اندازہ سنسکرت کی ایک کتاب شیکا شوبھودیہ[1] سے لگایا جا سکتا ہے۔

شیخ نجیب الدین نخشبیؒ اور التتمش سرور الصدور میں لکھا ہے کہ شیخ نجیب الدین نخشبیؒ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دوستوں میں تھے۔ التتمش کے عہد میں خواجہ صاحبؒ چالیس یاروں کے ساتھ دہلی پہنچے۔ لکھا ہے:

"سلطان شمس الدین میگویند کہ ہر یکے را جائزہ گراں بداد، شیخ نجیب الدین نصیب خود ہمہ ایثار کرد و دعوت ساخت وہم در دہلی بماند۔ سلطان شمس الدین او را پدر خواند و شیخ الاسلام دہلی خطاب داد[2]"	کہتے ہیں کہ سلطان شمس الدین نے ہر ایک کو گراں بہا انعام دیے۔ شیخ نجیب الدین نے اپنا سب حصہ بانٹ دیا، دعوت کی، اور دہلی ہی میں رہ گئے۔ سلطان شمس الدین نے ان کو "باپ" بنالیا اور "شیخ الاسلام دہلی" ان کو خطاب دیا۔

قاضی قطب الدین کاشانیؒ اور التتمش قاضی قطب الدین کاشانیؒ اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے اُن کے "علم و دیانت" کا ذکر اپنی مجلسوں میں کیا ہے[3]۔ ملتان میں ان کا مدرسہ تھا۔ شیخ بہاء الدین زکریاؒ صبح کی نماز اُسی مدرسہ میں جا کر ادا کیا کرتے تھے[4]۔ قاضی صاحب دہلی تشریف لائے تو التتمش سے بھی ملنے گئے۔ اُس وقت سلطان کے پاس سید نور الدین مبارکؒ اور قاضی فخر الائمہ بیٹھے تھے۔ سلطان نے کھڑے ہو کر قاضی قطب الدین کا استقبال کیا اور ہاتھ پکڑ کر خرمگاہ کے اندر لے گیا اور وہاں "نزدیک خود بنشاند"[5]۔

مشائخ بلگرام اور التتمش خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے دو مرید خواجہ عماد الدینؒ اور سید محمد صغریؒ سرزمین بلگرام میں آسودہ ہیں۔ التتمش کو ان دونوں سے عقیدت تھی۔ خواجہ عماد الدین

---

[1] مرتبہ سکمار سین مطبوعہ کلکتہ [2] سرور الصدور (قلمی نسخہ)

[3] [4] فوائد الفواد ص ۲۳۵ [5] ایضاً ص ۲۳۶ -

بلگرام کے شاہ ولایت ہیں۔ سید محمد صغری رح کے متعلق آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

"در اعلائے کلمۂ دین و احیاء سنت اماتت بدعت قدمے راسخ داشت و با سلطان شمس الدین التمش بسر می برد" [۱]

کلمۂ دین کی اشاعت، سنت کے احیاء اور بدعت کے مٹانے میں راسخ قدم تھے۔ اور سلطان شمس الدین کے ساتھ رہتے تھے۔

بلگرام کی مہم میں وہ سپاہی کی حیثیت سے لڑے تھے اور التمش نے اُن کو فرمانِ عشر دیا تھا۔[۲]

گنج الاسرار پر ایک نظر قرون وسطیٰ میں مشایخ کے ملفوظات، اوراد، اور دواوین بڑی کثرت سے وضع کیے گئے ہیں۔ اسی طرح کی ایک تصنیف گنج الاسرار ہے[۳]۔ اس کتاب کو خواجہ اجمیری سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مقدمہ میں سبب اور مقصدِ تالیف اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ مرحندام درویشاں اضعف العباد معین الدین حسن سجزی را فرمود کہ برائے استقامت تربیت طالب صادق سلطان شمس الدین ... از آیات و حدیثات و قول مشایخ رحمۃ اللہ علیہم در تعریفات معانی ابیات نظمات منقولات اولیا راز سخنہائے کبار ملفوظات تصنیف کن کہ در سفر ملازمت کند تا دل سلطان از تفرقہ خطرات غیر اللہ تعالیٰ کلی باز آید"

خواجہ عثمان ہرونی رح نے اس درویشوں کے خادم اضعف العباد معین الدین حسن سجزی کو حکم دیا کہ طالب صادق سلطان شمس الدین کی استقامت اور تربیت کے لیے آیات، احادیث، اقوال مشائخ وغیرہ کی بنیاد پر ایک کتاب لکھو تاکہ ہمیشہ سفر (روحانی) میں ساتھ رہے اور سلطان کا دل غیر اللہ کے تمام خطرات و تفرقات سے کلیتًا بچا رہے۔

۱، ۲ مآثر کرام ص ۱۰-۱۳

۳ اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ خاکسار کے پاس ہے۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں جب میں نے اس کتاب کو شائع کرنے کا ارادہ کیا تو مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی اس نسخہ کے متعلق معلومات کی۔ اُنھوں نے جواب میں لکھا تھا: کتاب گنج الاسرار چھپ گئی ہے ..... مگر اگر آپ بھی صحت اور عمدگی کے ساتھ اس کو شائع فرما دیں تو بہتر ہے لیکن تلاش کے باوجود اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

پھر لکھا ہے کہ خواجہ عثمان ہرونیؒ دہلی تشریف لائے تھے۔ التمش اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے خلوص کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ راہِ حقیقت کا طالب ہے اور خواجہ صاحبؒ سے ارادت کی دلی تمنا رکھتا ہے۔ خواجہ ہرونیؒ نے جب اُس کو "انسان کامل" پایا تو کلاہ ارادت سے سرفراز کیا اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اُس کی تربیت پر مامور کیا۔

گنج الاسرار کے مباحث خاصے دلچسپ ہیں اور انداز بیان بھی کافی صاف اور واضح ہے۔ اس تصنیف کے پیچھے ایک بیدار مغز اور حساس قلب کام کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تربیت و اصلاحِ نفس کو چھوڑ کر دیگر عنوانات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے مذہبی ماحول اور سلاطین سے مذہبی طبقوں کی توقعات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ بادشاہ کے فرائض سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

۱۔ "وامر کردن در قصبان (؟ قصبات) ولایت بر حاکمان و خطیبان و محتسبان و گماشتگان در اطاعت شریعت بعمل صلاحیت دایم صلوٰۃ با دیانت دین در امانت نگاہ دارد"

۲۔ "بداں کہ سلاطین ولایت را بصارت باید یعنی مردمانے کہ عمل صلاحیت دین دار لایق کارباشند تعین فرمودن واجب آید"

۳۔ "بدانکہ خلفاء ولایت را شاید کہ در کارہائے آخرت غفلت نہ نمایند"

۴۔ "حاکمان قضات ولایت را نیز شرائط اصلی آنست یعنی حاکمان و عالمان باشند و مفتیان رشوت ستان نباشند"

۵۔ "منقول است سلطان ابراہیم ادہمؒ میفرماید خلفا، سلاطین خدائے مجازی اند یعنی سلاطین صادق را شاید کہ امر معروف کردن بر خلائق دیار و قصبات و لایت۔۔"

۶۔ "حق سبحانہ تعالیٰ فرمان امر خوش بدست امیران صادق دادہ است پس اطاعت سلاطین بر ہمہ واجب است"

التمش کے متعلق لکھا ہے کہ پیہم عبادت اور ریاضت کے باعث اُس میں کشف کی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک رات کو جب تیز بارش ہو رہی تھی اور ہر طرف بجلی کڑک رہی تھی سلطان نے

دو خواصوں کو بلا کر سو تنکہ دیے اور مسجد علی تجار کے قریب ایک سرائے میں بھیجا، جہاں ایک عورت تنہا اندھیرے میں لیٹی تھی اور دردزہ میں مبتلا تھی۔ سلطان کو اپنی روحانی طاقت کے باعث اُس کی حالت کا علم ہو گیا تھا۔

گنج الاسرار خواجہ اجمیری رح کی تصنیف نہیں تسلیم کی جا سکتی۔ اندرونی اور بیرونی شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔ اول تو شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح کا واضح ارشاد ہے کہ

"از مشایخ شجرۂ ما ہیچ شیخے تصنیف نہ کردہ است" ^(۱)

ہمارے شجرہ کے مشایخ میں سے کسی شیخ نے کوئی تصنیف نہیں کی ہے۔

ایسی صورت میں کسی کتاب کو مشایخ چشت کی تصنیف تسلیم کرنے میں بڑا تامل ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی معاصر بیان سے خواجہ عثمان ہرونی رح کے ہندوستان تشریف لانے کی تصدیق نہیں ہوتی۔ فرشتہ کا یہ بیان کہ —

"در تاریخ محمد قندہاری مسطور است کہ پیر خواجہ معین الدین چشتی یعنی شیخ عثمان ہرونی در عہدِ شمس الدین محمد التمش بہ دہلی تشریف آورد و شمس الدین چوں مرید او بود در تعظیم و تکریمش دقیقہ فرو نگذاشت" ^(۲)

محمد قندہاری کی تاریخ میں لکھا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی کے پیر یعنی شیخ عثمان ہرونی شمس الدین محمد التمش کے عہد میں دہلی تشریف لائے اور چونکہ شمس الدین ان کا مرید تھا اس لیے اُن کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ اٹھا کر نہ رکھا۔

تصدیق طلب ہے۔ علاوہ ازیں گنج الاسرار میں بعض نظریات ایسے بھی ملتے ہیں جن کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ خواجہ اجمیری رح کے خیالات نہیں ہو سکتے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب میں مولانا جلال الدین رومی رح (المتوفی ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء) کے اشعار درج ہیں۔ لکھا ہے کہ خواجہ صاحب رح کی تعلیم کے زیرِ اثر التمش نے تین سال تک مہمات جنگ سے کلی اجتناب کیا تھا۔

---

^(۱) خیر المجالس ص ۵۲ ^(۲) تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۷۷۔

التتمش کی مصروف سیاسی زندگی میں تین سال کی ایسی کوئی مدت نہیں ملتی — ان تمام اعتراضات کے باوجود گنج الاسرار کی ایک اہمیت ہے۔ قرون وسطیٰ میں التتمش کے مذہبی افکار و رجحانات کے متعلق عوام و خواص کے خیالات کی ایک جھلک اس آئینہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خلافت سے تعلقات التتمش ہندوستان کا پہلا مسلمان فرمانروا تھا جس نے خلیفۂ بغداد کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا اور اپنی حکومت کے لیے مرکز خلافت سے منشور حاصل کیا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خود اس نے منشور کے لیے درخواست کی تھی، یا خلیفہ نے اپنی مرضی سے یہ اعزاز بخشا۔ بہر حال ۲۴۔ ۲ ربیع الاول ۶۲۶ھ مطابق ۱۹۔ فروری ۱۲۲۹ء کو سفراء خلافت ہندوستان پہنچے اور سلطان نے ان کا شاندار استقبال کیا۔[۱] اس موقع پر سارا شہر چراغاں کیا گیا اور خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔[۲] اس اذنِ خلافت کی یادگار کے طور پر ایک سکہ بھی جاری کیا گیا۔ تاج ریزہ نے اس موقع پر جو قصیدۂ تہنیت پیش کیا تھا، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مژدہ عالم را ز عالم آفریں آوردہ اند	زانکہ شہ را از خلیفہ آفریں آوردہ اند
شادی عامست در شہر اینکہ بہر شہر یار	خلعت خاص امیر المومنیں آوردہ اند
مرکبے زیں شاں مبارک خلعتے میموں چنیں	از برائے ظلِ یزداں شمسِ دیں آوردہ اند
حامی آفاق التتمش کہ عزم و حزم او	گرد بر گرد جہاں حصنِ حصیں آوردہ اند

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۂ بغداد سے تعلقات کا سلسلہ اس خلعت اور منشور کے بعد بھی قائم رہا اور سفراء کی برابر آمد و رفت ہوتی رہی بلکہ بعض تذکروں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۶۱۷ھ مطابق ۱۲۲۰ء میں یعنی منشو حاصل ہونے سے کم و بیش دس سال قبل، مولانا رضی الدین حسن صغانیؒ صاحب مشارق الانوار (جو اپنے وطن بدایوں کو چھوڑ کر لاہور اور پھر بغداد میں رہنے

۱۔ [۲] طبقات ناصری ص ۱۷۴، طبقات اکبری ج ۱ ص ۶۰۔

[۳] Wright p. 74 ; Thomas p. 46

لگے تھے) کو عباسی خلیفہ الناصر (۵۷۵ھ/۱۱۸۰ء تا ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء) نے اپنے سفیر کی حیثیت سے التتمش کے دربار میں بھیجا تھا۔ اور وہ ۶۲۴ھ میں بغداد واپس ہوئے تھے۔ ۶۳۲ھ میں وہ پھر ایک بار سفارت پر دہلی تشریف لائے تھے۔[1]

برنی نے ایک شخص قاضی جلال عروس کا ذکر کیا ہے۔ وہ خلیفہ بغداد کی جانب سے سفینۃ الخلفاء کا ایک نسخہ تحفہ کے طور پر لے کر التتمش کے دربار میں آئے تھے۔ اس نسخہ پر مامون الرشید کے قلم کی ایک عبارت درج تھی جس میں ہارون الرشید نے داؤد طائی اور محمد سماک کے مکانوں پر اپنی حاضری کا حال لکھا تھا۔ اور یہ بتایا تھا کہ یہ بزرگ فقیروں اور مسکینوں کو بلا تکلف مکان میں بلا لیتے تھے لیکن ہارون الرشید کے لیے دروازہ تک نہ کھولتے تھے اور وہ در پر بیٹھ کر ناکام واپس ہو جاتا تھا ــــ فقراء سے جس عقیدت کا اظہار اس نوشتہ میں کیا گیا تھا، وہ التتمش کے اپنے طرز فکر سے بہت ہم آہنگ تھا۔ اس بنا پر وہ قاضی جلال عروس سے اس قدر خوش ہوا کہ بقول برنی:

"خواست کہ نیمے ملک خود بدو ایثار کند"[2] چاہا کہ اپنا آدھا ملک اس کو دیدے۔

التتمش کے سکوں پر ناصر لدین اللہ (۵۷۵ھ/۱۱۷۹ء تا ۶۲۳ھ/۱۲۲۵ء)، ظاہر بامر اللہ (۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء تا ۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء) اور مستنصر باللہ (۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء تا ۶۴۰ھ/۱۲۴۳ء) کے نام ملتے ہیں۔ سلطان کے لیے "برہان امیر المومنین" "ناصر امیر المومنین" "یمین خلیفۃ اللہ" القاب استعمال کیے گئے ہیں۔[3]

عمارات میں مذہبی جذبہ التتمش کے عہد کی عمارتیں بھی اُس کے مذہبی احساس و فکر کی آئینہ دار ہیں۔ حوض شمسی کی تعمیر میں خاص طور پر مذہبی جذبات کارفرما تھے۔ التتمش نے خواب میں دیکھا کہ رسول اکرم صلعم ایک جگہ گھوڑے پر تشریف فرما ہیں اور اس کو ایک تالاب بنانے کا حکم دے رہے ہیں۔ سلطان کی آنکھ کھلی تو قطب صاحبؒ کو بھی اس خواب کی اطلاع کرادی

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب The Contribution of India to Arabic Literature p. 250,
[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۰۳۔
[3] ملاحظہ ہو N. Wright pp. 16-32

اور اُسی وقت اُس مقام پر پہنچ کر تالاب کھدوانا شروع کر دیا[۱]۔ بعد کو ایک پیالہ آب زمزم بھی اس میں ڈالا گیا تھا[۲]۔ اس طرح ایک روحانی اشارہ پر تعمیر ہونے والے حوض کا مذہبی اجتماعوں کا مرکز بن جانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ مفتاح الطالبین میں لکھا ہے:

حوض شمسی مقام عبادت و مقام مستجاب دعا ہاست و مقام بندگان خاص است و مقام رحمت و مقام مغفرت متعبدان و زاہدان و صالحان و مشائخان و ابدالان . . . . . . "[۳]	حوض شمسی عبادت کا مقام ہے، ایسا مقام جہاں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ وہ خاص بندوں کا مقام ہے۔ وہ مقام رحمت ہے، مقام مغفرت ہے۔ وہ عابدوں، زاہدوں، صالح لوگوں بزرگوں اور ابدالوں (کی جگہ ہے)

بہت سے صوفیوں نے یہاں اپنے حجرے بنائے تھے۔ ایک چھوٹی سی مسجد جواب تک اولیا مسجد کے نام سے مشہور ہے، صوفیہ ہی نے بنائی تھی[۴]۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنی مجلس میں اس حوض کی "برکت" اور "عذوبت" کا ذکر کیا تھا[۵]۔ بلکہ ایک مرتبہ انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ التتمش کی وفات کے بعد ایک شخص نے اُسے خواب میں دیکھا اور اس کی مغفرت کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اس حوض کے بنانے کے باعث اُس کی مغفرت ہوئی[۶]۔ تعجب کی بات ہے کہ منہاج نے سلطان کی عمارات کے متعلق کوئی تفصیل دینی ضروری نہیں سمجھی لیکن بعد کے مورخین، شعراء اور تذکرہ نویسوں نے اس حوض کی خاص طور پر تعریف کی ہے[۷]۔

قطب مینار[۸] کے متعلق بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ حضرت قطب صاحبؒ کے دھلی

---

[۱] فوائد السالکین (قلمی نسخہ)، سیرت فیروز شاہی (قلمی نسخہ)، طبقات اکبری ج ۱ ص ۶۱-۶۲۔
[۲] فتوح السلاطین ص ۱۱۵-۱۱۷۔ [۳] مفتاح الطالبین قطب صاحبؒ کے ملفوظات کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بیشتر مجلسیں حوض شمسی ہی کے کنارے منعقد ہوئی ہیں۔ خاکسار کے پاس اس کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ [۴] آثار الصنادید۔ ص ۴۷، عجائب الاسفار۔ ص ۴۶ [۵] فوائد الفواد۔ ص ۱۱۹ - [۶] ایضاً ص ۱۱۹
[۷] مثلاً ملاحظہ ہو امیر خسرو کی مثنوی قران السعدین ص ۳۲-۳۳۔ فتوح السلاطین ص ۱۱۴-۱۱۷۔
[۸] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، آثار الصنادید ص ۵۴-۵۷، عجائب الاسفار (ابن بطوطہ) ص ۴۲-۴۴

تشریف لانے کی یادگار میں بنایا گیا تھا۔ اس پر سلطان کے لیے "غیاث الاسلام والمسلمین" "المؤید من السماء" "مظہر کلمۃ اللہ" وغیرہ کلمات استعمال[1] کیے گئے ہیں۔ اسی طرح اجمیر[1] اور بلگرام[2] کے کتبات میں بھی سلطان کے دین سے تعلق اور مذہبی دلچسپیوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ جامع مسجد بدایوں کے کتبہ میں سلطان کے متعلق "اعلی الاسلام والمسلمون" الفاظ کندہ ہیں[3]۔ اسے التتمش کی نیت کا اثر سمجھیے، یا اس کی مذہبی شہرت کا نتیجہ، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اُس کی تعمیر کرائی ہوئی تمام عمارتیں، عوام وخواص سب کی نظر میں خاص مذہبی احترام کی مستحق سمجھی گئی ہیں۔

عصامی اس کی عمارتوں کے سلسلہ میں لکھتا ہے ؎

بنائے ہر چہ مقبول ایزد بود — ہمہ وصف او بر زبانہا رود[4]

التتمش کا انتقال اور مذہبی حلقوں میں اظہارِ غم

۲۰۔ شعبان ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۳۶ء کو سلطان التتمش کا انتقال ہوا۔ عصامی اُس کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

شنیدم چو خرشید در پردہ شد — چناں گنج در زیرِ گل کردہ شد
جہاں گشت تاریک بے آفتاب — قیامت شد اندر جہانِ خراب
ہمہ خلق نالاں شدہ سو بہ سو — ہمہ شہر گریاں شدہ کو بہ کو
کلہ از سر افگندہ اہلِ کلاہ — بہ ماتم کمر بستہ خاصانِ شاہ
دراں تعزیت عالمی خوں گریست — بہ ثلث مہی ربع مسکوں گریست[5]

شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی مجلس میں اُس کے سالِ وفات پر یہ شعر پڑھا تھا ؎

بسال شش صد وسی و سہ بود کہ از ہجرت — نماند شاہ جہاں شمس دین عالمگیر[6]

---

[1] Epigraphia Indo-Moslemica, J. Horovitz p.30.

[2] مآثر الکرام ص ۱۳، [3] کنز التواریخ، رضی الدین بسمل ص ۴۲۔ [4] فتوح السلاطین ص ۱۱۴-۱۱۹

[6] فوائد الفواد ص ۱۵۶ - سیر الاولیاء ص ۵۶ - تاریخ محمدی میں لکھا ہے "یکے از افاضل آں روزگار در مرتبہ آں شہریار مرضی آثار قصیدۂ مطول گفتہ است یک بیت ازاں کہ مشتمل تاریخ وفات آں خسرو عالی درجات بود دریں اوقات تحریر یافت (ص ۳۴۶ ب)

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے محبوب ترین خلیفہ شیخ جمال الدین ہانسویؒ نے سلطان کی وفات پر جو مرثیے لکھے تھے اُن سے مذہبی حلقوں میں اس کی عزت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سلطانِ جہاں بغزو چوں رائے زدے | فتحش چو رکاب بوسہ بر پائے زدے
بت خانہ بعون حق مساجد کردے | وز خنجر اسلام ہمہ رائے زدے
جمشید سریر مملکت شمس الدین | ناگہ بجز امید سوئے خلد بریں
ہر روبہ مادہ شیر نر خواہد شد | چوں رفت زبیشہ جہاں شیرِ عریں
درہم شد کار ملک بے شاہ بہ بیں | غراں شدہ ہمچو شیر روباہ بہ بیں
شہ زمانہ نماند و از و حکایت ماند | میان جاہل و دانا بدہر در افواہ[1]

التمش نے اپنی مذہبیت کا جو نقش اپنے معاصرین کے ذہن پر ثبت کر دیا تھا، اُس کے اثرات بعد کے تذکروں میں بھی نظر آتے ہیں[2]۔ اس میں شک نہیں کہ التمش مذہبی جذبات کا حامل تھا۔ علماء و مشائخ سے اُس کو گہری دلچسپی تھی، اُس نے دہلی میں ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس میں مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی ادارے نشو و نما پا سکے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ دین کا جو تصور اس کے ذہن میں تھا اُس میں معاملہ "شخصی نجات" سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا! آج کا مورخ بھی سید نور الدین مبارکؒ کی تنقید کا ایک ایک حرف دہرا کر یہ سوال کر سکتا ہے کہ آخر یہ دینی مذاکرات اور مباحث سلطان کی فکر میں ایسی تبدیلی پیدا کرنے میں کیوں ناکام رہے جو اس کو سیاسی نظام کی بنیادیں بدلنے اور اُس کو اسلام کی حقیقی روح سے قریب تر لانے پر مجبور کر دیتی! فخر نسب میں مبتلا امراء اُس کے دربار میں ایسے اشعار پڑھ کر ؎

---

[1] دیوان شیخ جمال الدین ہانسویؒ جلد اوّل ص ۹۸-۹۹، جلد دوم ص ۲۱۔
[2] مثلاً ملاحظہ ہو تاریخ محمدی (ص ۳۴ ب) میں سلطان کی وفات کا ذکر۔

بدست دوں مدہ خامہ کہ گردوں امجال افتد
سیہ سنگے کہ در کعبہ است سازد سنگِ استنجا

کم نسب لوگوں کا مذاق اُڑاتے تھے اور وہ "کم اصل" حکام کو ملازمتوں سے برطرف کرتا تھا۔[1] اسلام کے بنیادی سماجی تصورات سے یہ نظریہ جس قدر متصادم تھا اُسکی تفصیل کی ضرورت نہیں

علماء و مشائخ سے تعلقات کے باعث التمش کا دائرہ اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا تھا، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حکومت وقت سے تعلق سے علماء کے کردار پر نہایت ہی خراب اثر پڑا۔ ان کی جرأتِ فکر، بصیرتِ دینی، حق گوئی اور بے باکی سب درباری ماحول کی نذر ہو گئی۔ جن بزرگوں کی بے باکی کا یہ عالم تھا کہ التمش کی تخت نشینی کے فوراً بعد خط آزادی کے متعلق دریافت کرنے کے لیے اس کے دربار میں چلے گئے تھے، پچیس سال کی درباداری نے اُن کے دینی جذبات کو اس قدر سرد کر دیا تھا کہ جب التمش نے رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا، تو کسی ایک عالم کی بھی آواز اس کے خلاف نہیں اُٹھی۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح۔

"ایں قصہ بغایت عجیب و غریب است کہ باوجود موئث برخلاف حکم شریعت ماورا ولی عہد گردانیدند، امراء و مشایخ آں عصر آنرا مسلم داشتند"[2]

یہ بات انتہائی عجیب و غریب ہے کہ (سلطان نے) عورت ہونے کے باوجود اس کو (رضیہ کو) حکم شریعت کے منافی اپنا ولی عہد بنا دیا اور اس دور کے امراء (؟ علماء) و مشائخ نے اس کو تسلیم کر لیا۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۸-۳۹ [2] تاریخ حقی ص ۹ ب

باب سوم

التتمش کے جانشین

ضیاء الدین برنی کے ایک بیان سے یہ خیال ہوتا ہے کہ سلطان التتمش نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی ہوگی[1] لیکن جب شہزادوں کے کردار پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو کوئی ایسی دینی تعلیم نہیں دی گئی جو اُن میں اخلاقی قدروں کا احترام، ضبطِ نفس، اور مذہبی فرائض کی ادائیگی کا احساس پیدا کر دیتی۔ اپنی اولاد کی نا اہلیت کا احساس التتمش کو اپنی زندگی ہی میں ہو گیا تھا[2] سلطان ناصر الدین محمود کے علاوہ، التتمش کے کسی لڑکے یا پوتے میں وہ مذہبی احساس و شعور نہیں ملتا جس کی توقع بجا طور پر التتمش کی اولاد سے کی جا سکتی تھی۔

(۱) سلطان رکن الدین فیروز شاہ رکن الدین فیروز شاہ نے کل چھ مہینے اور اٹھائیس[3] دن حکومت کی۔ یہ ساری مدت رندی و سرمستی میں بسر ہوئی۔ التتمش کا وہ دربار جہاں کبھی علماء و مشائخ کے جھگٹے لگے رہتے تھے اب "مطربان و مسخرگان و مخنثان[4]" کا مرکز بن گیا۔ سلطان مستی کی حالت میں ہاتھی پر سوار ہو کر سونے کے سکے بکھیرتا ہوا بازاروں میں سے گزرتا تھا۔ اس بذل عطا سے متاثر ہو کر منہاج نے اس کو حاتم ثانی کا خطاب دیا ہے[5]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذاتی کردار کے اعتبار سے وہ کسی طرح التتمش کی جانشینی کا اہل نہیں تھا اور جیسا کہ شیخ

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۴۴-۱۴۵۔ [2] طبقات ناصری ص ۱۸۵ [3] ایضاً ص ۱۸۴۔

[4] طبقات ناصری ص ۱۸۱۔ امیر خسرو نے اس کے متعلق لکھا ہے ؎

بہ بخشش خلق عالم را دمی کرد ہمہ گنجینۂ شمسی تہی کرد!

[5] ملاحظہ ہو تاریخ محمدی ص ۳۵۰ الف، نیز فتوح السلاطین ص ۱۳۱۔

عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے اُس کی طبیعت کا رجحان کلیتاً لہو و نشاط اور فسق و فساد کی طرف تھا[1]۔ غلط بیانی اور مدح سرائی کا کمال دیکھیے کہ تاج الدین ریزہ اس کے متعلق لکھتا ہے:

ماحیِ کفر حامیِ اسلام رکن دیں — کایام دشمن مملکتش استور یافت

پھر ایک جگہ اس کو "فرشتہ خو" بتانے کے بعد اعلان کرتا ہے ؎

فیروز شاہ کعبۂ اقبال رکن دیں — کز خاکپائے او اثر آب زمزم است

مبالغہ آرائی اور غلط بیانی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے!

(۳) سلطان رضیہ | رکن الدین فیروز کے بعد سلطان رضیہ تخت پر آئی تاج و تخت حاصل کرنے کے لیے اس نے جو تدبیر کی تھی اس کی تفصیل ابن بطوطہ نے اس طرح بیان کی ہے:

"بادشاہ (رکن الدین) ایک روز جمعہ کی نماز کو جامع مسجد میں گیا ہوا تھا۔ رضیہ مظلوموں کی پوشاک پہن کر پرانے بادشاہی محل یعنی دولت خانہ کی چھت پر کھڑی ہو گئی جو مسجد جامع کے متصل واقع تھا اور لوگوں سے اپنے باپ کے عدل و احسان یاد دلا کر کہا کہ رکن الدین نے میرے بھائی کو مار ڈالا ہے اور مجھے بھی مروانا چاہتا ہے۔ اس پر لوگ برافروختہ ہوئے۔ اور رکن الدین پر شورش کر کے اس کو مسجد میں پکڑ لیا، اور رضیہ کے پاس لائے۔ اُس نے اپنے بھائی کے قصاص میں اُس کو مروا ڈالا"[2]

عصامی نے لکھا ہے کہ رضیہ نے باقاعدہ امراء و عوام سے اپیل کی تھی کہ محض امتحان کے طور پر اس کو تخت پر بٹھا دیں۔ اگر مردوں سے بہتر ثابت ہو تو اطاعت کریں ورنہ معزول کر دیں[3]

---

[1] تاریخ حقی (قلمی) ص ۹۔ نیز زبدۃ التواریخ ص ۱۲ اب، فتوح السلاطین ص ۱۳۰

[2] عجائب الاسفار جلد دوم ص ۵۴ [3] فتوح السلاطین ص ۱۳۲

رضیہ دل اور دماغ کی بہت سی خوبیوں کی حامل تھی۔ صلاحیتِ جہانبانی، تدبر، رعیت پروری، عدل گستری، شجاعت اور تہور میں وہ کسی طرح مردوں سے کم نہ تھی لیکن بقول منہاج

"چوں از حساب مرداں در خلقت نصیب نیافتہ بود ایں ہمہ صفات گزیدہ چہ سودش کند"۔ ؎۱

چونکہ مرد نہ تھی اس لیے یہ تمام صفات گزیدہ اس کے لیے کیا سود مند ہو سکتی تھیں؟

عورتوں کے متعلق قرونِ وسطیٰ میں مسلم سوسائٹی کے مختلف خیالات تھے۔ ایک طبقہ جس کے نظریات کی ترجمانی فخر مدبر اور عصامی نے کی ہے عورتوں کو گھر کی چہار دیواری کے باہر کسی کام میں دخیل دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ عصامی نے رضیہ کے ذکر میں عورتوں کے متعلق اس طرح اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔—

زناں جملہ در دامِ اہرمن اند — بہ خلوت ہمہ کارِ شیطاں کنند

نکردں تواں بر زناں اعتماد — نشاید بر آہرمناں اعتماد

چو شورید نفسِ زنِ پارسا — بہ خلوت دہد با سگے ہم رضا

زن آں بہ کہ با چرخہ سازد مدام — کہ مستش کند مسندِ احترام ؎۲

سوچنے کا یہ انداز تعصب و تنگ نظری سے زیادہ کور باطنی اور انسانی سماج کے مسائل سے نابلد ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ اس رویہ کی بنیاد اس شرعی نقطۂ خیال پر نہیں ہے جس میں عورتوں کی بعض عملی دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حکمرانی کی ذمہ داری سپرد کرنے سے منع کیا گیا ہے اس میں عورت سے نفرت اور اس پر اعتماد کی کمی کا جو جذبہ کار فرما نظر آتا ہے وہ سماجی اور اخلاقی اعتبار سے کس قدر مہلک ہے! — رضیہ یقیناً اس طرح سوچنے والے ہزاروں انسانوں کی ملامت کا نشانہ بنی ہو گی!

مشائخ کا ایک طبقہ اس مسئلہ کو بالکل دوسرے رنگ میں دیکھتا تھا۔ تقریباً اسی زمانہ

؎۱ طبقات ناصری ص ۱۸۵ ؎۲ فتوح السلاطین ص ۱۳۴

میں جس وقت التتمش نے رضیہ کو اپنا جانشیں مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تھا، بابا فرید گنج شکرؒ اپنی لڑکی بی بی شریفہؒ کو اپنا خلیفہ بنانے کے متعلق سوچ رہے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔

ولوکان النساء کمثل ھذا الفضلت	اگر کچھ اور عورتیں اس طرح کی ہوتیں تو عورتوں
النساء علی الرجال [۱]	کو مردوں پر فضیلت حاصل ہو جاتی۔

لیکن روحانی اصلاح و تربیت کی ذمہ داری ایک عورت بعض مجبوریوں کی بنا پر نہیں اٹھا سکتی تھی، اس لیے بابا صاحبؒ یہ فرما کر خاموش ہو گئے:

"اگر عورت را خلافت و سجادۂ مشائخ دادن	اگر عورت کو خلافت اور مشائخ کا سجادہ دینا
روا بودے من بی بی شریفہ می دادم" [۲]	مناسب ہوتا تو میں بی بی شریفہ کو دیتا۔

لیکن اُن کے جماعت خانہ میں بی بی رانی جیسی عورتیں موجود تھیں جو ماں اور بہن کی طرح جماعت خانہ میں رہنے والے صوفیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں [۳]۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے عورت کی فضیلت پر اپنے شیخ کے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"شیرے کہ از بیشہ بروں آید کسے نپرسد	جب کوئی شیر جنگل سے نکلتا ہے تو اس کی
کہ ایں شیر نر است و یا مادہ یعنی می باید	بابت یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ نر ہے یا مادہ یعنی
کہ فرزند آدم بطاعت و تقویٰ معروف	یہ بات ضروری ہے کہ خواہ مرد ہو خواہ عورت،
آید خواہ مرد باشد خواہ زن" [۴]	طاعت و تقویٰ میں معروف (ثابت قدم) ہو

اس گفتگو سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ مشائخ نے رضیہ کی تخت نشینی کو اچھی نظر سے دیکھا ہوگا بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ عصامی اور فخر مدبر نے عورتوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ مشائخ کی نظر میں یقیناً قابل اعتراض تھا۔

مولانا نور ترک کا ہنگامہ

مذہبی نقطۂ نظر سے رضیہ کے عہد کا سب سے اہم واقعہ نور ترک کا ہنگامہ تھا۔ مولانا منہاج السراج کا بیان ہے کہ نور ترک قرامطہ و ملاحدہ کے رہنما تھے۔ انہوں نے

---

[۱] سیر الاولیاء ص ۱۹۱ [۲] ایضاً ص ۱۱۵-۱۷۱ [۳] ... [۴] فوائد الفواد ص ۲۲

گجرات، سندھ، اطراف دہلی اور سواحل جون وگنگ سے اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو دہلی میں جمع کرلیا۔ وہ تذکیر کہتے تھے اور بقول منہاج دہلی کے "اوباش" اُن کے گرد جمع ہوجاتے تھے۔ علمائے اہلِ سنت کو وہ ناصبی اور مرجی کہتے تھے اور اُن پر سختی سے تنقید کرتے تھے۔ انہوں نے ملاحدہ و قرامطہ کو ورغلایا کہ سنیوں پر نماز کے دوران میں حملہ کردیں۔ چنانچہ ۶ رماہ رجب ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء کو جمعہ کے دن اُن کے معتقدین "سلاح وشمشیر، سپر وتبر" لے کر جامع مسجد دہلی پر حملہ آور ہوئے اور بہت سے نمازیوں کو شہید کردیا۔ پھر نصیر الدین ایتم بلارامی، امام ناصر شاعر اور دیگر "مردان باسلاح" مدد کے لیے مسجد کی طرف دوڑے۔ جو لوگ مسجد میں تھے اُنہوں نے مسجد کے اندر سے ملاحدہ وقرامطہ پر پتھر برسائے اور اس طرح بمشکل یہ فتنہ فرو ہوا[۱]

شیخ نظام الدین اولیاء، مولانا منہاج السراج کے اس بیان کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک بار اپنی محفل میں فرمایا تھا کہ مولانا نور ترک تو آب آسمان سے زیادہ پاکیزہ تھے۔ اور علماء نے اُن پر غلط الزام لگائے تھے وجہ یہ تھی:

"اورا با علماء شہر تعصبی تمام بود بسبب	وہ شہر (دہلی) کے علماء سے بڑا تعصب رکھتے تھے
آنکہ ایشاں را آلودۂ دنیا دیدے ایشاں	اور وہ اس بنا پر کہ اُن کو دنیا میں آلودہ دیکھتے
بداں سبب چیزہا منسوب کردند"[۲]	تھے۔ اسی وجہ سے (علماء دہلی) نے بہت سی چیزیں اُن سے منسوب کردیں۔

شیخ نظام الدین اولیاء رح اُن کے تبحر علمی اور قوت مجاہدہ کے بہت مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ شیخ فرید گنج شکر رح نے ہانسی میں اُن کے وعظ سنے تھے اور اُن کی قوتِ کشف کا مشاہدہ

---

[۱] طبقات ناصری ص ۱۸۹-۱۹۰، عصامی نے التتمش کے زمانہ میں بھی ملحدوں کی شورش کا ذکر کیا ہے (فتوح السلاطین ص ۱۲۲-۱۲۳) اور لکھا ہے کہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ "کہ شہ را کشند وبگیرند شہر" لیکن منہاج نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ غالباً عصامی نے رضیہ کے عہد ہی کے فتنہ کو التتمش کے دور کا ہنگامہ قرار دے دیا ہے نظام الدین بخشی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (طبقات اکبری جلد اول ص ۴۳) لیکن اس کا ماخذ بھی غالباً فتوح السلاطین ہی ہے۔

[۲] فوائد الفواد ص ۱۹۹۔

کیا تھا[1]

مولانا نور ترک کی گذر اوقات اس طرح ہوتی تھی کہ اُن کا ایک غلام اُن کو روزانہ ایک درم دیتا تھا۔ اسی سے وہ کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رضیہ نے اُن کو کچھ سونا بھیجا۔ اُنہوں نے لکڑی اُٹھائی اور شاہی تحفہ کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اور چلّا کر کہا۔

"ایں چیست، از پیش ببرید"[2] — یہ کیا ہے، اسے میرے سامنے سے لے جاؤ۔

ہندوستان چھوڑ کر مولانا نور ترک مکّہ چلے گئے، وہاں ایک ہندوستانی نے ان کو دو من چاول پیش کیے۔ انہوں نے دعا دی اور اس کا تحفہ قبول کر لیا۔ اس شخص نے رضیہ کے تحفہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ تو مولانا نے جواب دیا:

"اے خواجہ تو مکّہ را با دہلی قیاس مکن ونیز	اے خواجہ تو مکہ کو دہلی پر قیاس مت کر، اور وہاں
آں روز جوان بودم، آن قوت وحدت	اس وقت میں جوان تھا۔ اب وہ طاقت اور
کجا مانده است۔ ایں ساعت پیر شدم	گرمی کہاں باقی رہی ہے، اب تو بوڑھا ہو گیا
وحبوب ایں جا عزیز است"[3]	ہوں اور یہاں جو کے دانے بھی عزیز ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ مولانا نور ترک پر ملحد اور قرمطی ہونے کا الزام مولانا منہاج نے تراشا تھا۔ نور ترک اپنے زمانہ کے علماء کے کردار و اعمال پر کھُلم کھُلا تنقید کیا کرتے تھے۔ چنانچہ علماء نے بدلہ لینے کے لیے اُن پر یہ الزام لگا دیا تاکہ عام مسلمانوں کی نگاہ میں اُن کی عزت قائم نہ ہو سکے۔ مولانا نور ترک کا ذکر شیخ فریدالدین گنج شکرؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ، میر خورد، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ وغیرہم نے احتراماً کیا ہے۔ ایک ملحد یا قرمطی دہلی اور ہانسی میں اس طرح وعظ نہیں کہہ سکتا تھا، جس طرح مولانا نور ترک نے کیے تھے۔ علاوہ ازیں ایک ملحد عالم کا پیرانہ سالی میں مکّہ معظمہ جا کر بس جانا بھی مستبعد ہے۔

رضیہ کے چال چلن پر اعتراض اور رضیہ کا انتقال

رضیہ کے چال چلن پر شبہ کا اظہار کرتے ہوئے ابن بطوطہ

۱-۲-۳ فوائد الفواد ص ۱۹۹۔

نے لکھا ہے: "جب اس پر تہمت لگائی گئی کہ وہ ایک حبشی غلام سے تعلق رکھتی ہے تو لوگوں نے اتفاق کر کے اس کو تخت سے اُتار دیا"[1] منہاج نے رضیہ کے چال چلن پر کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا۔ ابن بطوطہ کا یہ بیان دہلی کے اُن حلقوں کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے جس کی ایک جھلک عصامی کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ حقیقتاً رضیہ کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ اُس نے ترک اُمراء کی طاقت کو توڑنے کے لیے بعض غیر ترکوں کو اعلیٰ عہدے دے دیے تھے۔ یاقوت جس کو امیر آخور بنایا گیا، ترک نہیں تھا۔ اُس وقت تک اس عہدہ پر صرف ترک ہی متعین ہوتے رہے تھے۔ ترک امراء کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ ایک غیر ترک اس عہدہ پر کام کرے۔ اسی سبب سے رضیہ کی مخالفت ہوئی۔ اس ہنگامہ کی ذمہ داری رضیہ کے کردار پر نہیں ترک امراء کی ہوس پر تھی۔

التونیہ اور رضیہ کے انتقال کے متعلق منہاج نے لکھا ہے: "بدست ہندواں گرفتار شدند و ہر دو شہید گشتند"[2] ابن بطوطہ نے جو تفصیل دی ہے وہ بڑی دردناک ہے[3]۔ رضیہ کی قبر بلبلی خانہ میں بتائی جاتی ہے اور اب رجی سجی کی خانقاہ کے نام سے مشہور ہے۔

۳۔ معز الدین بہرام شاہ | ۶۳۷ھ / ۱۲۴۰ء میں تخت نشین ہوا۔ منہاج نے گو اس کو قاہر، بے باک، پُر دل و خونخوار" بتایا ہے، لیکن اس کی بعض پسندیدہ خصلتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:۔

"اما چند اوصاف گزیدہ و اخلاق پسندیدہ داشت و در ذات خود شرمگین و بے تکلف بود و ہرگز از حلی و حلل کہ آئین بادشاہان دنیا باشد با خود نداشتی"[4]	لیکن وہ کچھ اچھے اوصاف اور پسندیدہ اخلاق (بھی) رکھتا تھا۔ اپنی ذات سے شرمگیں اور بے تکلف تھا۔ اور ہرگز سونے چاندی کا زیور اور قیمتی جامہ جن کا استعمال دنیا کے بادشاہوں کے نزدیک آئین میں داخل ہے اپنے پاس نہ رکھتا تھا۔

[1] عجائب الاسفار ص ۵۵ [2] طبقات ناصری ص ۱۹۰ [3] عجائب الاسفار ص ۵۵
[4] طبقات ناصری ص ۱۹۱۔

ابھی تخت نشین ہوئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ عیش و عشرت کی طرف راغب ہو گیا اور بقول عصامی:

بہ شہوت پرستی برآورد نام | وزو گشت شاکی ہمہ خاص و عام
بہ ہر جا زنے دیدے صاحب جمال | بکردے بہ زور و زرش دستمال
یکے شاہِ خونریز و بے باک شد | بہ ہندوستاں جائے ضحاک شد[۱]

نظام حکومت کی طرف سے بے توجہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور پر منگولوں کا قبضہ ہو گیا اور ملک میں ایک انتشار اور بدنظمی پھیل گئی۔ بہرام شاہ نے ان حالات میں مذہبی طبقہ کے ذریعہ اپنا اثر اور اقتدار برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ لاہور پر منگولوں کے قبضہ اور اُن کے مظالم کی اطلاع سے جب دہلی میں بے چینی پیدا ہوئی تو سلطان نے 'خلق شہر دہلی' کو قصر سپید میں جمع کیا اور منہاج السراج کو تذکیر کا حکم دیا۔ منہاج کے وعظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ — "خلق را با سلطان بیعت دادہ آمد"[۲]

جب سلطان نے لاہور کو فوج روانہ کی تو خواجہ مہذب الدین وزیر نے سلطان سے بعض باتوں کا انتقام لینے کے لیے فوج میں برگشتگی پیدا کر دی۔ اور تحریص و ترغیب دلا کر سلطان کو معزول کرنے پر بیعت لے لی۔ سلطان کو علم ہوا تو شیخ الاسلام سید قطب الدین[۳] کو اصلاح حال اور فتنہ فرد کرنے کے لیے بھیجا۔ منہاج السراج نے بھی اس سلسلہ میں بڑی جد و جہد کی[۴]

بہرام شاہ کو دہلی کے ایک درویش ایوب سے بڑی عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ ایوب

---

[۱] فتوح السلاطین ص ۱۳۷ [۲] طبقات ناصری ص ۱۹۵۔

[۳] نظام الدین بخشی (طبقات اکبری جلد اول ص ۷۰) ملا عبدالقادر (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۸۷) فرشتہ (ج ۱ ص ۷۰) وغیرہ نے اس نام میں 'بختیار اوشی' کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور اس طرح یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ یہاں مراد حضرت قطب صاحب سے ہے۔ حالانکہ قطب صاحب کا وصال التمش کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ [۴] طبقات ناصری ص ۱۹۶۔

مرد زاہد تھا، اور قصر حوض سلطان' پر اعتکاف میں بیٹھا رہتا تھا۔ جب سلطان سے ربط ضبط بڑھا تو ایوب نے "کارہائے ملکی" میں دخل اندازی شروع کر دی۔ اُس نے قاضی شمس الدین مہر کو ہاتھی کے نیچے ڈلوا دیا۔ اس حرکت سے عوام میں سلطان اور ایوب دونوں کے خلاف جذبات مشتعل ہو گئے۔[1] امراء کی سازشوں نے بہرام کے خلاف ایسی صورت پیدا کر دی کہ وہ زیادہ عرصہ تخت پر نہ رہ سکا اور ۸۔ ذیقعدہ ۶۳۹ھ / ۱۲۴۲ء کو قتل کر دیا گیا۔

۴۔ علاء الدین مسعود شاہ | بہرام شاہ کے بعد رکن الدین فیروز شاہ کا بیٹا علاء الدین مسعود تخت پر بیٹھا۔ ابتدائی زمانہ میں اس کا چال چلن نہایت پسندیدہ رہا، اور اس نے نیک سیرت اور صاحب خلق ہونے کا ثبوت دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں نااہلوں کی صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ

"طبیعت ستودۂ او از سنن پسندیدہ	اُس کی نیک طبیعت اچھی عادتوں کی طرف سے
بگشت و بطرف لہو و عشرت و شکار	پھر گئی اور لہو لعب، عشرت، شکار وغیرہ کی طرف
بافراط میل کرد تا حدے کہ فساد بملک	اس حد تک راغب ہو گئی کہ ملک میں فساد
سرایت کردن گرفت"۔[2]	پھیلنا شروع ہو گیا۔

۲۳۔ محرم ۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء کو امراء نے اُسے قید کر کے ناصر الدین محمود کو تخت پر بٹھا دیا۔

۵۔ سلطان ناصر الدین محمود | التمتش کی مذہبی دلچسپیاں اس کی اولاد میں اگر کسی کو ورثہ میں ملی تھیں تو صرف ناصر الدین محمود[3] کو۔ تاریخی کتابیں اُس کے زہد و تقویٰ کی داستانوں سے بھری

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۹۵ [2] ایضاً ص ۲۰۱۔

[3] سب مورخ متفق ہیں کہ سلطان ناصر الدین محمود، التمتش کا بیٹا تھا، لیکن عصامی نے اس کو التمتش کا پوتا بتایا ہے اور لکھا ہے ؎

مرا چوں درافسانہا دید رائے	چنیں گفت پیر فسانہ سرائے
کہ چوں ناصر الدین روشن ضمیر	کہ بُد پورِ التمتش ہند گیر
بہ اقلیم لکھنوتی آں شاہ زاد	بہ خطِ قضا و قدر سر نہاد
بہ شہزادہ ماندہ از و یک پسر	کہ بُد مولدش بعد فوت پدر
چو شد بالغ آں طفلِ فرخ نژاد	جہاں را بہ داد و دہش مژدہ داد

فتوح السلاطین ص ۱۰۸

ہوئی ہیں۔ مولانا منہاج السراج سے لے کر سجان رائے بھنڈاری تک ہر مورخ نے اس کے مذہبی جذبات واذکار کی تعریف کی ہے۔ مولانا نور الحق دہلوی کا خیال تو یہ ہے کہ قرونِ سابقہ کا کوئی سلطان اُن صفات اور خوبیوں کا حامل نہیں تھا جو ناصر الدین کی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھیں[1] معاصر مورخ منہاج السراج نے اُس میں "اوصافِ اولیاء" اور "اخلاقِ انبیاء" تلاش کیے ہیں[2] امیر خسرو نے اُس کو "شاہ فرشتہ سرشت"[3] قرار دینے کے بعد اس کے عہد کی تعریف اس طرح کی ہے۔

عجب عہدے ہمہ در کامرانی	بہر خانہ نشاط و شادمانی
نہ کس دادے کمند کینہ را تاب	نہ کس دیدے خیالِ فتنہ در خواب
مسلماں چیرہ دست و ہندواں رام	ندانستے کسے از جنسِ مغل نام
شہے در ذاتش از یزداں شکوہے	ہم از سنگ و ہم از گوہر چو کوہے
خود او مستغرق کارِ الٰہی	بامرش بندگاں در کار شاہی[4]

عہدِ شاہجہانی کا ایک مورخ اس کے دورِ حکومت کے متعلق لکھتا ہے:

بعد از جلوس بر سریر سلطنت ہر سال فتحے	تخت پر بیٹھنے کے بعد ہر سال اس نے ایسی
دگرے کرد کہ از آنجا عزتِ اسلام و شوکت	فتوحات کیں اور ایسے کام انجام دیے جن سے
مسلماناں بظہور رسید و شیوۂ عدل پروری	اسلام کی عزت اور مسلمانوں کی شوکت ظاہر
و دادگستری بوجود آمد"[5]	ہوئی اور شیوۂ عدل پروری اور دادگستری وجود میں آیا۔

عبادت میں انہماک منہاج السراج نے سلطان کے "قیام و صیام و تلاوتِ کلام"[6] میں انہماک کی تعریف کی ہے۔ عصامی نے لکھا ہے

۱؎ زبدۃ التواریخ (قلمی)، ص ۱۵ اب ۲؎ طبقاتِ ناصری ص ۲۰۷، عصامی لکھتا ہے

گروہش گویند از اولیا ست   گروہے ست خوانند از انبیا ست

۳؎ قران السعدین ص ۲۲۔ ۴؎ دول رانی خضر خاں ص ۵۰

۵؎ زبدۃ التواریخ ص ۱۶ الف ۶؎ طبقاتِ ناصری ص ۲۰۷

شنیدم کہ آں شاہِ فرخندہ رائے | یکے بود از خاصگان خدائے
بہ عاریت بود تاج و سریر | کہ بودے بہ کار پلاس و حصیر
شب و روز آں خوشتر از جانِ پاک | بدے مست از ذکرِ یزدانِ پاک[۱]

ملا عبدالقادر بدایونی نے ایک "افواہ" نقل کی ہے کہ وہ جب دربار میں آتا تھا تو لباس شاہی زیبِ تن کر لیتا تھا، ورنہ خلوت میں "ژندہ کہنہ" اس کے جسم پر ہوتا تھا[۲]

کتابت کلامِ پاک ناصرالدین اپنی فرصت کے اوقات کتابتِ کلامِ پاک میں صرف کرتا تھا۔

برنی کا بیان ہے:

"بیشتر نفقہ خود از وجہ کتابت مصحف ساختے"[۳] — اپنے نفقہ کا بیشتر حصہ کلامِ پاک کی کتابت سے حاصل کرتا تھا۔

عصامی نے بھی اس کی تائید کی ہے اور لکھا ہے:

شنیدم کتابت بکردے مدام | ازاں وجہ ہموارہ خوردے طعام
یکے حبہ از دخلِ ہندوستاں | پئے نفسِ خود آں شہِ کامراں
نکردہ تصرف دراں بیست سال | بدے محترز دائم از بیتِ مال[۴]

جب اُس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآنِ پاک کے نسخوں کو ہدیہ کرنے کے لیے بازار میں بھیجا جاتا تھا تو کاتب کا نام خریدار سے پوشیدہ رکھا جاتا تھا تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص زیادہ قیمت دے کر خریدنے کی کوشش کرے۔ ایک مرتبہ ایک امیر نے جس کو کسی طرح اس راز کا علم ہو گیا تھا معمول سے زیادہ زرِ ہدیہ دیا۔ ناصرالدین کو یہ بات ناگوار ہوئی[۵] اس کا خیال تھا کہ ایسی صورت

---

۱ فتوح السلاطین ص ۱۵۶، نیز بدایونی: منتخب التواریخ جلد اول ص ۸۹
۲ منتخب التواریخ ج ا ص ۸۹۔ ۳ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶، نیز ابن بطوطہ: عجائب الاسفار ص ۵۶۔ ۴ فتوح السلاطین۔ ص ۱۵۶۔
۵ طبقات اکبری جلد اول ص ۷۷، منتخب التواریخ جلد اول۔ ص ۸۹۔۹۰، تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۷۳۔

میں "قوتِ حلال" میں خلل واقع ہو جاتا ہے[1]

نظام الدین بخشی نے لکھا ہے کہ سلطان ایک سال میں کلام پاک کے دو نسخے تیار کر لیتا تھا[2] سلطان کے انتقال کے تقریباً سو سال بعد تک یہ نسخے دہلی میں موجود تھے۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے:-

"قاضی کمال الدین نے اُس کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف مجھے دکھایا۔ خط اچھا تھا اور کتابت منشیانہ تھی"[3]

ایڈورڈ ٹامس جس نے اسلامی ہند کے سکّوں اور کتبات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، لکھتا ہے کہ ناصر الدین کی خوش نویسی اور کتابت میں دلچسپی کا اثر اس کے عہد کے سکوں پر بھی پڑا۔ اس کے خیال میں عہد ناصری کے سکوں کی فارسی عبارت، پہلے سکوں سے یقیناً بہتر ہے۔ علی گڈھ مینار پر جو کتبہ درج تھا اُس کو ٹامس نے سلطان ہی کے خط کا نمونہ تصور کیا ہے[4]

---

[1] خلاصۃ التواریخ ص ۱۹۶۔ [2] طبقات اکبری جلد اول ص ۷۷۔

[3] عجائب الاسفار ص ۵۶-۵۷ [4] Chronicles of the Pathan Kings of Delhe pp. 129-130، علی گڈھ کا یہ مینار سر جان ایڈمنسٹن لفٹنٹ گورنر کے حکم سے منہدم کیا گیا تھا۔ سرسید مرحوم نے اس کا کتبہ نظام میوزیم میں (جہاں اب مسلم یونیورسٹی کا شعبہ تاریخ ہے) لا کر نصب کر دیا۔ اس کتبہ کی عبارت یہ ہے:-

هذه العمارة فی عهد مملکة السلطان الاعظم مالك رقاب الامم ناصر الدنیا والدین سلطان السلاطین ذی الامان لاهل الایمان وارث ملك سلیمان صاحب الخاتم فی ملك العالم ابی المظفر محمود بن السلطان خلد الله ملکه وسلطانه، الملك الکبیر المعظم قتلغ خان بها الحق والدین ملك ملوك الشرق والصین بلبن الشمسی فی ایام ایالته بامر منالة العاشر من رجب سنة اثنی خمسین وستمائة

اس مینار سے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: اخبار الجمال (قلمی)؛ R.A.S.B., 1872 p. 166; 1878 p 339., Epigraphia Indo-Moslemica, 1913-14

انڈین ہسٹری کانگریس کی روئداد، لاہور ۱۹۴۰ء ص ۱۹۵؛ نیز علی گڈھ سیشن ۱۹۴۳ء کی روئداد ص ۳۹۵۔

رسول اکرمؐ کا احترام | ناصر الدین، رسول اکرم صلعم کا اسم گرامی بغیر وضو زبان پر نہیں لاتا تھا۔ لکھا ہے کہ اس کا محمد نامی ایک مصاحب تھا۔ ایک دن اُسے تاج الدین کہہ کر پکارا۔ تو اس کو یہ خیال ہو گیا کہ شاید کسی ناراضگی کی بنا پر سلطان نے اُس کا نام نہیں لیا، اور اس رنج میں کئی دن تک دربار سے غیر حاضر رہا۔ سلطان نے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا:

"اے خداوند جہاں ہرگز مرا بجز محمد بانگ نمی کردی۔ آں روز بخلاف عادت تاج الدین خطاب فرمودی۔ استنباط کردم کہ نسبت بداعی تغیرے در مزاجِ سلطان پدید آمدہ"	خداوند جہاں، مجھے کبھی محمد کے سوا کسی نام سے نہیں پکارتے تھے۔ اُس روز خلاف عادت تاج الدین کہہ کر مخاطب کیا۔ میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مزاج سلطانی میں خاکسار کی طرف سے کوئی تبدیلی ہو گئی ہے۔

سلطان نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ اُس وقت وہ بے وضو تھا اس لیے

شرمم آمد کہ بے وضو نام محمد بر زبان رانم[1]	مجھے شرم آئی کہ بغیر وضو نام محمد زبان پر لاؤں

عجز و انکسار | ناصر الدین کی طبیعت میں حد سے زیادہ عجز و انکسار تھا۔ کسی شخص کی دل شکنی سے اُس کو تکلیف ہوتی تھی۔ ایک دن قرآن مجید پڑھ رہا تھا کہ ایک شخص اس کے پاس آیا اور قرآن پر نظر ڈال کر کہنے لگا کہ یہاں "فیہ فیہ" غلطی سے مکرر لکھا گیا ہے۔ سلطان نے قلم دوات منگایا اور "فیہ" کے گرد حلقہ کھینچ دیا۔ جب وہ شخص چلا گیا تو چاقو منگا کر اُس حلقہ کو چھیل دیا۔ ایک غلام نے سبب پوچھا تو کہا کہ اگر اس شخص سے میں کہتا کہ تو غلط کہہ رہا ہے تو اس کو رنج پہنچتا اور

"حک رقم کاغذ آسان تر ست از حک غبار کدورتے کہ بر خاطرے نشیند"[2]	کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت کو مٹانا آسان ہے بہ نسبت کسی کے دل پر سے غبار کدورت دور کرنے کے

بیگم اور امور خانہ داری | عصامی، برنی اور ابن بطوطہ کے بیانات سے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ سلطان اپنی گذر اوقات بیت المال کے پیسہ سے نہیں کرتا تھا۔ جب گزارہ کا انحصار

[1-2] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۷۴۔

کتابت پر ٹھہرا تو یقیناً اُس کی خانگی زندگی ایک معمولی مزدوری پیشہ کے معیار زندگی سے اونچی نہیں ہوسکتی تھی۔ دہلی کا وہ پہلا اور غالباً آخری سلطان تھا جس نے بیت المال کے سلسلہ میں وہ احتیاط برتی جو خلفاءِ راشدین کے عہد کی یاد تازہ کرتی تھی۔ بدایونی نے لکھا ہے:

"حکایات دیگر غرائب کہ باحوال خلفائے راشدین مشابہ باشد" [۱]	اس کے متعلق بعض ایسی عجیب حکایتیں مشہور ہیں جو خلفاء راشدین کے احوال کے مشابہ ہیں۔

گو منہاج نے اُس کی درویشانہ زندگی کی تفصیل نہیں دی لیکن بعد کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے اس سلسلہ میں کثرت سے روایات نقل کی ہیں۔ لکھا ہے کہ ناصر الدین کی بیوی کنیزوں کی طرح گھر کا کام کاج کرتی اور کھانا پکاتی تھی۔ ایک دن اُس نے شکایت کی کہ روٹی پکانے میں اُس کے ہاتھ جل جاتے ہیں۔ ایک لونڈی کھانا پکانے کے لیے خزانۂ شاہی کے خرچ سے رکھ لی جائے۔ سلطان نے جواب دیا:

"بیت المال حق بندہ ہائے خدا است مرا نمی رسد"	بیت المال بندگانِ خدا کا حق ہے۔ میری ملکیت نہیں ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اُس کو اس طرح تلقین صبر بھی کی:

"چند روزے برمحنت صبر کن کہ خدائے تعالےٰ فردائے قیامت آں را صد تنا بہ اجرایں مشقت حوِرے را تو برائے خدمت خواہد داد" [۲]	اس محنت پر چند روز صبر کرو، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (جس کا آنا یقینی ہے) اس مشقت کے بدلے تمہاری خدمت کے لیے ایک حور دیگا۔

مولانا نور الحق دہلوی ؒ نے مختصراً اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد "واللہ اعلم" لکھا ہے[۳] جس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً اُنہیں اس قصہ کی صداقت پر یقین نہیں تھا۔ طبقات ناصری کے انگریز مترجم ریورٹی نے اس واقعہ کی سچائی میں شبہ ظاہر کیا ہے[۴]۔ اس کے دلائل یہ ہیں:

---

[۱] منتخب التواریخ جلد اول ص ۹۰ [۲] ایضاً ص ۹۰، طبقات اکبری ج ا ص ۷۷، تاریخ فرشتہ ج ا ص ۷۴۔
[۳] زبدۃ التواریخ (روٹوگراف) ص ۱۵ ب
[۴] Raverty, pp. 675, 686.

(۱) ناصرالدین کی بیگم الغ خاں (یعنی بلبن) کی بیٹی تھی۔ ناصرالدین خادمہ کی طرح اُس سے خدمت نہیں لے سکتا تھا۔

(۲) ناصرالدین کے دربار کی شان وشوکت کی جو تفصیل طبقات ناصری میں ملتی ہے اس کے پیش نظر سلطان کی درویشانہ زندگی کے متعلق یہ بیانات قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔

(۳) ناصرالدین نے منہاج کو ایک موقع پر چالیس "نفر بردہ" دیے تھے تاکہ وہ اپنی ایک بہن کی جوان دنوں تکلیف میں تھی، مدد کر سکے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ناصرالدین اپنے ایک ملازم کو تو اتنے غلام دے سکتا تھا لیکن اپنی بیوی کے لیے ایک خادمہ تک بھی نہیں رکھ سکتا تھا!

ریورٹی نے یہ اعتراض کرتے وقت اس چیز کو نظرانداز کر دیا کہ ناصرالدین اپنی "ذاتی زندگی" اور "شاہی زندگی" میں فرق کرتا تھا۔ اس کے دربار کی شان وشوکت مسلم لیکن اس کا تعلق اس کی ذاتی زندگی سے نہیں تھا۔ وہاں تو وہ خود لباس شاہی میں آتا تھا۔ جہاں تک منہاج کو غلام دینے کا سوال ہے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ عطیہ اُس نے حکومت کے ایک ملازم کو اپنے وزیر الغ خاں اعظم (یعنی بلبن) کی سفارش پر دیا تھا۔[۱]

علماء سے تعلقات منہاج السراج نے منجملہ اور خوبیوں کے سلطان کی ایک خوبی یہ بتائی ہے کہ وہ علم اور علماء سے محبت کرتا تھا۔[۲] عصامی کا بیان ہے کہ ؎

همه بیت مال آں شاہِ محتشم ۔۔۔ سپردے بہ اصحابِ علم و علم[۳]

بعد کے مورخوں مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلوی، محمد بہادر خانی، نظام الدین بخشی وغیرہ نے بھی اُس کی علم دوستی اور علماء پروری کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس اجمال کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ اُس کے عہد

---

[۱] طبقات ناصری (مترجمہ ریورٹی) ص ۶۸۶ [۲] طبقات ناصری ص ۲۰۷، طبقات اکبری ج ۱ ص ۷۲-۷۳

[۳] فتوح السلاطین ص ۱۵۶، سجن رائے نے لکھا ہے: "از بسکہ سلطان حق پرست و ایزد شناس بود خراج و باج ممالک در مواجب سپاہ و نذر درویشان خدا آگاہ و وظائف و ادرار فضلاء و علماء و بذل مستحقان و انعام مسکیناں و زیردستاں و صرف عمارات مساجد و خانقاہ و قنطرہ و منازل و برائے مسافراں ... کہ از آثارِ سعادت و اسباب ذکر جمیل است خرج کردے" خلاصۃ التواریخ ص ۱۹۶۔

کے اکابر علماء اور شعراء میں مولانا منہاج السراج، قاضی جلال الدین کاشانی، قاضی شمس الدین بہرائچی، مولانا قطب الدین، عمید سنامی، امام اثیر الدین منتخب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ موخرالذکر نے سلطان کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع تھا۔

اے چراغِ دودۂ افراسیاب ناصرالدنیا شہِ مالک رقاب

محمد بہامد خانی نے اس قصیدہ کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں[1]

اتباعِ شریعت گو منہاج نے ناصرالدین محمود کی مذہبی دلچسپیوں کی تعریف میں بڑا زورِ قلم صرف کیا ہے، لیکن پھر بھی کوئی ایسی تفصیل بہم نہیں پہنچائی جس سے سلطان کے مذہبی افکار و رجحانات کی کوئی واضح تصویر بنائی جا سکے۔ محمد بہامد خانی نے لکھا ہے:

"در اتیان سنن نبوی و اتباع احکام شرع مصطفوی غلوئے تمام داشت"[2]

لیکن اس اجمال کی تفصیل ممکن نہیں۔

سلطان اور خلافت بغداد ناصرالدین محمود کے بعض سکوں پر تو خلیفہ مستعصم کا نام ملتا ہے[3]، لیکن اُس کے عہد کے کتبات میں خلافت سے کسی قسم کے تعلق کا اظہار نہیں کیا گیا[4]۔ ممکن ہے کہ سقوطِ بغداد کے بعد عمارتوں پر اس عقیدت کا اظہار بے معنی سمجھا گیا ہو۔

جس وقت ہلاکو نے خلافت بغداد کو نیست و نابود کیا تھا، ناصرالدین دہلی کے تخت پر تھا۔ اس حادثہ نے معاصرین کے دل و دماغ پر جو اثر کیا اُس کی ایک ہلکی سی جھلک طبقاتِ ناصری کے صفحات میں بھی نظر آتی ہے جہاں خروجِ مغل کو آثارِ قیامت میں شمار کیا گیا ہے[5]۔ اس وقت مسلمانوں میں ایک طرف تو قنوطیت اور افسردگی پھیل گئی تھی اور دوسری طرف مغلوں کے خلاف نفرت کے شدید جذبات بھڑک اُٹھے تھے[6]۔ لیکن اس حادثہ کو ابھی دو سال بھی نہیں

[1-2] تاریخ محمدی ص ۳۵۶ الف - ۳۵۸ ب۔

[3] Thomas p.129; Nelson Wright p. 64

[4] مثلاً ملاحظہ ہو علی گڑھ مینار کا کتبہ یا میرٹھ کی جامع مسجد کا کتبہ [5] طبقاتِ ناصری ص ۳۲۵-۳۲۶۔

[6] یحیی سرہندی کے بیان کے مطابق تو یہ سفراء ۶۵۶ھ میں ہی ہندوستان آئے تھے، تاریخ مبارک شاہی ص ۳۶

گزرنے پائے تھے کہ ۶۵۸ھ ۱۲۶۰ء میں ہلاکو کے سفیر دہلی آئے اور حکومت کی طرف سے اُن کا شاہانہ استقبال کیا گیا[1]۔ اس موقع پر منہاج ؔ نے ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا ایک شعر تھا۔

زہی جشنے کز و اطراف چوں خلد بریں گشتہ　　خہی بزمے کز و اکناف عدل راستیں گشتہ

اور یہ سب کچھ اس وقت ہوا تھا جب بغداد کی تباہی اور بربادی کا زخم دلوں میں ہرا تھا!

تعمیر مساجد ناصر الدین کے متعلق بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اُس نے بہت سی مسجدیں تعمیر کرائی تھیں لیکن میرٹھ کی جامع مسجد کے علاوہ کسی اور مسجد کے متعلق معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ میرٹھ کی مسجد پر یہ کتبہ درج ہے:

"در عہد ہمایوں خدائیگاں عالم سلطان المعظم، شہنشاہ الاعظم المالک رقاب الامم کہف العرب نی العالمین سلطان السلاطین المخصوص بعنایت رب العالمین ابو المظفر ناصر الدنیا والدین محمود بن سلطان شمس الدین ایلتمش خلد اللہ ملکہ۔ باہتمام وزیرش غیاث الدین بلبن کہ خطاب الغ خاں داشت جامع مسجد ضمن میرٹھ شہور ۶۴۷ھ سبع و اربعین وستہ مائتہ"

بابا فرید گنج شکرؒ اور سلطان شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ عہد ناصری کے سب سے مشہور و معروف بزرگ تھے۔ سیر الاولیاء کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو اُن سے عقیدت تھی، اور ایک بار اُن کی خدمت میں حاضر ہونا بھی چاہا تھا لیکن بلبن نے بہانے بنا کر ملاقات کرنے سے روک دیا تھا[2]۔

سیاسی حالات کا اثر سلطان کی مذہبی زندگی پر اس میں شک نہیں کہ ناصر الدین محمود پر کافی گہرا مذہبی رنگ تھا، اور یہ بھی سچ ہے کہ ایلتمش کے بیٹے میں یہ مذہبی شغف کچھ تعجب خیز بھی نہ تھا لیکن مورخوں نے جن رنگوں سے اس کا مرقع تیار کیا ہے اُس سے سلطان کے اصلی خد و خال نمایاں نہیں ہو سکے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو طبقات ناصری ص ۳۱۷ ـ ۳۱۸　[2] سیر الاولیاء، ص ۷۹۔

ہیں۔ طبقات ناصری کے مطالعہ کے بعد ناصر الدین کی جو تصویر ذہن میں ابھرتی ہے وہ ایک ایسے پیرانہ سال شخص کی ہے جس کو اپنے رجحان اور طبیعت کے خلاف تخت پر بٹھا دیا گیا ہو، اور جس کی حقیقی دلچسپی اور رنگ سلطنت سے زیادہ تسبیح وسجادہ میں ہو! بعض مورخوں نے تو یہ لکھا ہے کہ اُس نے تخت نشینی کے بعد سارا انتظام حکومت یہ کہہ کر بلبن کے سپرد کر دیا تھا کہ ـــ

"زنہار کارے نہ کنی کہ فردا در حضرت بے نیاز در مانی ومرا و خود را خجل و شرمسار گردانی" [۱]	ہرگز کوئی ایسا کام نہ کرنا جس کی وجہ سے کل کو بارگاہ خداوندی میں شرمندہ ہونا پڑے، اور مجھے اور خود تمہیں (بھی) خجالت اور شرمندگی ہو۔

ناصر الدین کے مذہبی افکار ورجحانات کا کوئی مطالعہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اُن سیاسی حالات کو نہ سمجھ لیا جائے جن سے مجبور ہو کر ناصر الدین نے اپنے دل کا سکون عبادت میں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی!

ابتدائی زمانہ میں ناصر الدین کافی سیاسی جوڑ توڑ کرنے والا شہزادہ تھا۔ تقریباً سولہ سال کی عمر میں وہ بہرائچ کا والی مقرر ہوا تھا، اور وہاں اس نے اپنی انتظامی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ قرب وجوار کے پہاڑی علاقوں میں فوجیں اُسی کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھیں اُس نے اپنے علاقہ میں رعایا کی خوشحالی، بالخصوص کاشتکاروں کی فلاح وبہبود کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ جب ترک امراء علاء الدین مسعود سے منحرف ہوئے تو ان کی نظرِ انتخاب ناصر الدین محمود ہی کی طرف اُٹھی۔ ناصر الدین نے ان سیاسی حالات سے پورا فائدہ اُٹھایا اور مسعود کے احسانات کو فراموش کر کے امراء سے خفیہ خط وکتابت شروع کر دی، اور پھر دہلی اس طرح پہنچا کہ

"خلق را چناں نمود کہ بجہت تداوی و معالجت عارضہ بحضرت دہلی میرود" [۲]	لوگوں کو ایسا معلوم ہوا گویا علاج معالجہ کی غرض سے دہلی جا رہا ہے۔

---

[۱] منتخب التواریخ جلد اول ص ۸۹، طبقات اکبری جلد اول ص ۷۳۔ [۲] طبقات ناصری ص ۲۰۹۔

ناصرالدین محمود تخت نشین تو ہو گیا، لیکن یہ زمانہ بڑا ہی ہوش رُبا تھا۔ ترک امرا اور حکام کی سازشوں کا جال ہر طرف بچھا ہوا تھا، اور اس کے مسموم اثرات محلات اور محلات کے باہر ہر جگہ حالات کو ناگفتہ بہ بنا رہے تھے۔ سیاسی اقتدار کی ہوس نے دیوانگی کی صورت اختیار کر لی تھی ترکانِ چہل گانی سب ہی پیش پیش تھے۔ ان میں ہر شخص بادشاہوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی طاقت کے استحکام میں مصروف تھا۔ ان امرا میں سب سے زیادہ پختہ کار بلکہ برنی کے الفاظ میں "گرگ کہنہ"، بلبن تھا، جو اپنی سیاسی سمجھ بوجھ، طبیعت کی تیزی، اور اقتدار کی ہوس میں سب سے بڑھا ہوا تھا۔ ناصرالدین کے لیے اس نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ گوشہ نشینی اور عبادت گزاری کے سوا اُس کے پاس کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ناصرالدین نے از خود نظام حکومت اُس کے حوالہ کر دیا تھا بلکہ بقول برنی بلبن نے یہ حالت کر دی تھی کہ

"او سلطان ناصرالدین را نمونہ می داشت و بادشاہی خود می راند" [1]	اُس نے سلطان ناصرالدین کو محض دکھانے کے لیے رکھ چھوڑا تھا ورنہ بادشاہی تو وہ خود کرتا تھا۔

اور اس نمونہ کو رکھنے کی ضرورت بھی اس لیے پیش آئی تھی تاکہ اس کی آڑ میں حریف امرا و حکام کو نیست و نابود کیا جا سکے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور فرشتہ نے لکھا ہے کہ التمش نے اپنی ایک لڑکی کی شادی بلبن سے کر دی تھی[2]۔ اس طرح شاہی خاندان سے اس کا قریبی تعلق قائم ہو گیا تھا بعد کو اُس نے اپنی ایک لڑکی ناصرالدین کے نکاح میں دیدی۔ اور شادی کے دو ماہ بعد بلبن نائب الملک اور فوجوں کا افسر اعلیٰ مقرر ہو گیا اور الغ خان اعظم کے لقب سے پکارا جانے لگا[3]۔ ناصرالدین نے اُس کے اقتدار کو ختم کرنے کی ایک کوشش کی اور اس کو معطل کر کے

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۔ [2] تاریخ حقی (قلمی)، تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۷۔ [3] طبقات ناصری ص ۲۹۳

عمادالدین ریحان کو اُس کی جگہ مقرر کر دیا لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی، بلکہ اس واقعہ کے بعد الغ خاں کا تسلط اور بڑھ گیا۔ سلطان ناصرالدین کو مجبور کر کے اُس نے شاہی نشانات چترشاہی، وغیرہ بھی حاصل کر لیے[1] اور بڑے امراء مثلاً قطب الدین حسن غوری وغیرہ کو قتل کرادیا اور اس سلسلہ میں زہر دینے، پانی میں ڈبونے، بلندی سے گرانے، زندہ جلانے، غرض کسی حرکت سے گریز نہیں کیا[2] فرشتہ نے لکھا ہے:

"بسیارے از اولادِ شمسی راکہ معاندانِ سلطنت خود می دانست سراً وعلانیہ بکشت"[3] اس نے سلطان شمس الدین کی بہت سی اولاد کو جنہیں وہ معاندانِ سلطنت سمجھتا تھا خاموشی سے یا علانیہ مروا ڈالا۔

ان حالات میں ناصرالدین کے لیے صرف ایک راہ تھی، اور وہ یہ کہ نظام حکومت کو بلبن کے سپرد کر کے خود عبادت و ریاضت میں اس قدر ڈوب جائے کہ بے رحم حالات کا احساس ہی اُس کو نہ رہے!

ناصرالدین محمود کا انتقال یہ تمام مراعات اور اختیارات سپرد کر دینے کے باوجود ناصرالدین محمود بلبن کی ہوسِ ملک گیری کو تسکین نہیں پہنچا سکا۔ بالآخر بلبن نے ناصرالدین محمود کو زہر دے دیا[4] عصامی نے لکھا ہے:

بہ شہ در فقاعے بدادند زہر برآمد بہر سوئے شورے بشہر[5]

ابن بطوطہ کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔[6] شیخ نور الحق دہلوی نے اس سلسلہ میں اہم اور دلچسپ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ لکھتے ہیں:

---

[1] اس سلسلہ کی دلچسپ تفصیل کے لیے فتوح السلاطین کا مطالعہ کرنا چاہیے

[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۷۔۴۸۔ [3] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۷۶۔

[4] اس مسئلہ پر میں نے اپنی کتاب Studies in Medieval Indian History میں تفصیلی بحث کی ہے۔

[5] فتوح السلاطین ص ۱۶۳، [6] عجائب الاسفار۔ ص ۵۷۔

"در بعضے تاریخہائے معتبر نظر در آمدہ کہ سلطان ناصر الدین را غیاث الدین شربتِ شہادت درکام کردہ۔ می گویند کہ دریں باب سہ روایت منقول ست، اشہر آنکہ ناصر الدین را بخانہ در آوردہ و در از بیروں فراز کردہ چنداں نگہداشت کہ ہم درون خانہ بہ تشنگی و گرسنگی ہلاک شد" ؎1

بعض معتبر تاریخوں میں نظر سے گزرا ہے کہ غیاث الدین نے سلطان ناصر الدین کو شربتِ شہادت پلا دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں تین روایات ہیں سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ ناصر الدین کو اپنے مکان میں لاکر باہر سے دروازہ بند کر دیا یہاں تک کہ وہ بھوک اور پیاس سے وہیں ہلاک ہو گیا۔

شیخ نور الحق ؒ نے بتایا ہے کہ بلبن کی اس ظالمانہ حرکت کی بنا پر سلطان فیروز شاہ تغلق اس کو "غلام خواجہ کُش" کہا کرتا تھا۔ اور گو وہ ہر مہم سے پہلے دہلی کے سب اولیاء اور سلاطین کے مزارات پر جاتا تھا، لیکن بلبن کے مزار کی طرف کبھی التفات نہ کرتا تھا؎2

ناصر الدین کی تجہیز و تکفین کے متعلق لکھا ہے :۔

"و این ناصر الدین الآن بہ نصیر الدین غاری اشتہار دارد۔ گویند چوں وصیت کردہ بود کہ پس از مردن ریسمانے بر پائے بستہ اورا در غارے بیندازند، قبر او درون غار کردہ سردابہ راست ساختہ اند" ؎3

اس وقت یہ ناصر الدین، نصیر الدین غاری کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کے پاؤں میں رسی باندھ کر غار میں ڈال دیں (چنانچہ) اس کی قبر غار کے اندر بنا کر تہ خانہ بنا دیا گیا ہے۔

؎1-2 زبدۃ التواریخ ص ۱۶۔ الف   ؎3 زبدۃ التواریخ ص ۱۵ ب

اس وقت دہلی کی جو قدیم عمارت مقبرۂ سلطان غازی کے نام سے مشہور ہے اس کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ سر سید نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مقبرہ کس کا ہے۔ آثار الصنادید کا جو نسخہ (مطبوعہ نول کشور سنہ ۱۹ء) پیشِ نظر ہے، اس میں غاری کو غازی لکھا گیا ہے (ص ۸۳-۸۴)۔ غالباً سر سید اس کو کسی بزرگ کا مزار سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں اس میں حضرت کی قبر اور اس پر ایک ..." مولوی بشیر الدین نے اس کو التمش کے بڑے بیٹے کا مقبرہ بتایا ہے (واقعات دار الحکومت دہلی جلد سوم ۳۵۳-۳۴۵) کار اسٹیفن کی رائے بھی یہی ہے۔
(Archaeology & Monumental Remains of Delhi, pp. 70-73) (باقی بر صفحہ ۱۵۴)

ناصر الدین محمود کی عبادت و ریاضت نے عوام و خواص سب کو اس قدر متاثر کیا کہ اس کی روحانی بلندی کا نقش دلوں پر جم گیا اور اس کے متعلق صدہا قصے لوگوں میں مشہور ہو گئے۔ عصامی لکھتا ہے ؎

من اوصاف آں خسرو نیک نام
نہ چنداں شنیدم کہ گویم تمام

اُسی کا کہنا ہے کہ خضرؑ بھی ناصر الدین کے پاس آتے تھے اور

بداں ناصر الدین شہ نیک نام
گہ از گہ شدے ہمدم و ہم کلام[1]

ان افسانوں کی جو بھی اصلیت ہو، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ شاہ جہاں کے عہد تک عوام کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ کثیر تعداد میں زائرین اس کے مزار پر جاتے تھے۔ شیخ نور الحق رحمٰن کا بیان ہے —

سائر مردم دہلی بزیارت قبر تبرک می جویند و مطاف و مزار عموم خلائق است"[2]

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۳) اس مزار کا کتبہ صاف نہیں پڑھا جاتا۔ سر سید نے جو عبارت پڑھی ہے وہ یہ ہے:-
"امر بنا هذه البقعة المباركة السلطان المعظم شاهنشاه الاعظم المالك رقاب الامم ... في العالمين سلطان السلاطين شمس الدنيا والدين المخصوص بعنايت رب العالمين ابي المظفر التمش السلطان ناصر امير مومنين خلد الله ملكه في سنه تسع وعشرين وستماة" (ص ۸۴)
مولوی بشیر الدین نے خط کشیدہ مقامات کو اس طرح پڑھا ہے "امر بہ بنائے" "ظل الله في العالم ذو الاحسان" اور سنہ تعمیر سے پہلے عبارت میں ایک جملہ کا اور اضافہ کیا ہے: "ابي الفتح محمود تغمده الله بغفرانه بجبوبہٖ" (ص ۳۴۹-۳۵۰) (نوٹ صفحہ ہذا) [1] فتوح السلاطین ص ۱۵۶-۱۵۷۔

[2] زبدۃ التواریخ ص ۱۵ ا ب۔ یہی بات شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحؒ نے اکبرؒ کے عہد میں لکھی تھی: قبر او مطاف و مزار عموم خلق است" (تاریخ حقی ص ۱۲ ا ب)، بدایونی کا بھی بیان یہی ہے: قبر او در دہلی مشہور است چنانچہ ہر سال در وے جمع عظیم می شود" (جلد اول ص ۹۴)

بابِ چہارم

سلطان غیاث الدین بلبن

ضیاء الدین برنی نے بلبن کے عہد کو "خیر الاعصار" بتایا ہے۔[1] حقیقت یہ ہے کہ اُس کا دورِ حکومت صرف تاریخِ ہند ہی میں نہیں، بلکہ عالمِ اسلام کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جس وقت وہ دہلی کے تخت پر بیٹھا تھا، دنیائے اسلام پر مصائب کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ سیلِ تاتار طوفانِ بلاخیز کی طرح کف بردہاں اُمنڈتا چلا آرہا تھا۔ مسلمان حکومتیں یکے بعد دیگرے نہایت سفاکی اور بے دردی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے معدوم کی جارہی تھیں۔ ہلاکو کی خون آشام فوجیں اسلامی دنیا کے سیاسی مرکز کو تباہ و برباد کرچکی تھیں اور بغداد کے کھنڈروں میں سعدیؒ کے یہ جانسوز مرثیے گونج رہے تھے۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں ۔۔۔ بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المؤمنین

اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری ز خاک ۔۔۔ سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں

استہلاک و تخریب کے اس ہولناک دور میں بلبن ہی صرف ایک ایسا مسلمان بادشاہ تھا جس نے نہ صرف اپنی سلطنت ہی کو ان طاغوتی طاقتوں کی دست برد سے محفوظ رکھا بلکہ وسطِ ایشیا کے سیکڑوں برگشتہ قسمت انسانوں کو اپنے دامن میں پناہ دی۔ اس کے زمانہ میں دہلی اسلامی دنیا کی اُمیدوں کا مرکز بن گئی اور سلطان کی سیاسی بصیرت، انتظامی صلاحیت اور دینی دلچسپیوں کا شہرہ دور دور پھیل گیا اور بقول عصامی ؎

بہ عہدش جہاں راہ بیداد بست ۔۔۔ بدورش زماں پائے ظالم شکست[2]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۱۱۔ [2] فتوح السلاطین ص ۱۶۴۔

تخت نشینی سے پہلے اور اُس کے بعد

تخت نشینی سے پہلے بلبن کو شراب نوشی اور عیش و نشاط میں کافی دلچسپی تھی۔ برنی کا بیان ہے:

"سلطان بلبن در ایام ملکی و نوبت خانی بشراب خوردن و مجلس آراستن مشہور بود"[1]

جس زمانہ میں سلطان بلبن صرف ملک اور خان تھا اس زمانہ میں شراب نوشی اور مجلس آرائی میں اس کی شہرت تھی۔

ہفتہ میں دو تین بار محفلِ نشاط منعقد ہوتی تھی، جس میں دل کھول کر دادِ عیش دی جاتی تھی۔ لیکن تخت نشین ہونے کے بعد بلبن نے اپنی زندگی کو بالکل بدل دیا اور پھر —

"گرد مناہی نہ گشت واز جملہ مسکرات توبہ کرد و مجلس شراب ترک آورد و نام شراب و شراب خواراں نہ گرفت"[2]

ناجائز باتوں کے قریب تک نہ گیا اور تمام مسکرات سے توبہ کرلی مجلس شراب کو بند کردیا اور شراب اور شراب خواروں کا نام تک نہ لیا۔

اس تبدیلی کا اور لوگوں پر بھی اثر ہوا اور بقول صاحب مآثر رحیمی۔

"تقویٰ و پاکیزگی در زمان او رواج یافت واگر کسے بزہد و صلاح متصف نبود مہم نمی داد و نام شراب خوردن و مناہی از ملک خود برانداخت"[3]

اس کے زمانہ میں تقویٰ اور پاکیزگی کو رواج ہوا اور (اس کا یہ حال تھا کہ) اگر کسی شخص میں زہد و صلاح کی خوبیاں نہیں ہوتی تھیں تو کوئی مہم اس کے سپرد نہیں کرتا تھا۔ اور اس نے شراب نوشی اور غیر مشروع حرکات کو اپنے ملک سے اُکھاڑ پھینکا۔

پابندئ نماز

سلطان بلبن نماز جماعت[4] کے ساتھ ادا کرتا تھا اور ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ رات کا کافی حصہ وہ عبادت میں صرف کرتا تھا۔ برنی نے لکھا ہے کہ تخت نشینی کے بعد اُس کا یہ عالم ہو گیا

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۵۔ [2] ایضاً ص ۴۶۔ لیکن شیخ نور الحق[رح] نے اُس کے متعلق لکھا ہے: "در بعض اوقات داد عیش و عشرت بحد اعتدال نیز دادے"۔ (زبدۃ التواریخ ص ۱۷ ب) نیز ملاحظہ ہو تاریخ حقی ص ۱۳، طبقات اکبری جلد اول ص ۸۱-۸۲۔ [3] مآثر رحیمی جلد اول۔ ص ۳۰۵

[4] زبدۃ التواریخ ص ۱۷ الف۔

تھا کہ —

"در طاعت و عبادت و صیام نفل و قیام شب مبالغہ نمود و بہ مواظبت جمعہ و جماعت و نماز اشراق و چاشت و اوابین و تہجد بیکبارگی میل کرد و شبہائے مواسم تمامی شب قیام کردے و اوراد در سفر و حضر از و فوت نہ شدے"[1]

طاعت و عبادت، نفلی روزے اور شب بیداری میں کافی کوشش کرنے لگا۔ نماز جمعہ، نماز بجماعت، اشراق، چاشت، اوابین اور تہجد کی طرف یک لخت دلچسپی پیدا ہوئی اور اُن پر پابندی سے قائم رہا۔ شبہائے مواسم میں تمام تمام رات قیام کرتا تھا اور سفر و حضر میں اوراد اس سے فوت نہ ہوتے تھے۔

اُس کے بیٹے بغرا خاں کا ایک قول برنی نے نقل کیا ہے کہ :

"ہیچ دانشمندے و شیخے راآں مقدار طاقتِ صیام و قیام نہ بود کہ سلطان بلبن"[2]

کسی عالم یا صوفی کو اس قدر صیام و قیام کی طاقت نہیں تھی جتنی کہ سلطان بلبن کو۔

بلبن کی عبادت میں دلچسپی کا شہرہ مشائخ و صوفیہ کے حلقوں تک پہنچ گیا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے ایک بار اُس کے "عقیدۂ خوب" کے متعلق جس طرح اپنی رائے کا اظہار فرمایا اُس کی تفصیل امیر حسن سجزیؒ نے یوں بیان کی ہے :

دریں میان حکایت سلطان غیاث الدین بلبن در افتاد رحمۃ اللہ علیہ۔ و ملازمت او در نماز جمعہ و اوقات خمسہ و عقیدۂ خوب آنگاہ فرمود کہ وقتے با قاضی لشکری گفت: شب گزشتہ چہ شب بزرگوار بود۔ قاضی لشکر گفت: شمارا ہم روشن شدہ است

اسی دوران میں سلطان غیاث الدین بلبن کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ اور اس کی نماز جمعہ، نماز پنجگانہ اور اچھے عقیدہ کے متعلق بات چیت ہوئی) فرمایا کہ ایک مرتبہ اس نے قاضی لشکر سے کہا: گزشتہ شب کیسی متبرک تھی۔ قاضی لشکر نے کہا: آپ پر بھی روشن ہو چکا ہے

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶، طبقات اکبری ج ۱ ص ۸۱-۸۲، فرشتہ جلد اول ص ۷۶۔ [2] ایضاً ص ۱۰۲

سلطان گفت: آرے۔"[1] — سلطان نے کہا: ہاں۔

اولاد کو نماز کی تاکید

بلبن اپنے بیٹوں کو نماز باجماعت ادا کرنے کی ہمیشہ تاکید کرتا تھا۔ اگر کبھی یہ سُن پاتا کہ شہزادہ محمد یا شہزادہ محمود سے ایک وقت کی بھی نماز فوت ہوگئی ہے یا نمازِ فجر کے وقت سوتے رہ گئے اور جماعت سے نماز ادا نہ کر پائے تو ایک مہینہ تک اُن سے بات نہیں کرتا تھا۔[2] کہا کرتا تھا کہ نمازِ پنجگانہ اظہارِ عبودیت کا طریقہ ہے اس لیے آدمی کسی حالت میں بھی ہو لیکن نماز کی طرف سے اُسے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔[3] بغرا خاں کا بیان ہے کہ:

"آنکہ از و یک وقت نماز فوت شدہ شنیدے ہر بار کہ او خدمت کردے روئے از و بگردانیدے"[4]	جس کسی کے متعلق یہ سُن لیتا کہ اس سے ایک وقت کی نماز فوت ہوگئی ہے، جب بھی وہ شخص آداب بجالاتا، اس کی طرف سے مُنہ پھیر لیتا تھا۔

نماز باجماعت کی اہمیت کو وہ ان احادیث کے ذریعہ ذہن نشین کراتا تھا ـــ

الجماعۃ سنۃ من سنن الھدیٰ لا یترکھا اِلا منافق.

تارك الجماعۃ ملعون

التکبیر الاولیٰ مع الامام خیر من الدنیا وما فیھا.[5]

تذکیر میں دلچسپی

بلبن کو علماء کی صحبت اور دینی مذاکرات و مباحث میں بڑی دلچسپی تھی۔ برنی نے لکھا ہے:

"بے حضور علماء دست بطعام نبردے و از علماء در وقت طعام خوردن مسائل دین پرسیدے و در مجلس طعام دانشمندان درپیش او بحث کردندے۔"[6]	جب تک علما موجود نہ ہوتے کھانا نہیں چھوتا تھا۔ کھانے کے دوران میں علماء سے مسائلِ دین دریافت کرتا تھا اور مجلسِ طعام میں علماء اس کے سامنے (دینی مسائل پر) بحث کرتے تھے۔

[1] فوائد الفواد۔ ص ۲۳۱-۲۳۲، شب بزرگوار سے شب قدر مراد تھی۔

[2] تا [6] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۴۶-۴۷-۱۰۲۔

اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ کسی مسجد میں وعظ ہو رہا ہے تو فوراً وہاں پہنچ جاتا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ جو شخص شریف و رذیل کے غیر اسلامی تصورات پر اتنا زور دیتا تھا اور عوام سے گفتگو کرنا یا دربار میں مسکرانا تک پسند نہیں کرتا تھا وہ ــــ

"درمیان خلق بنشستے و تذکیر بشنیدے	عام لوگوں میں بیٹھ جاتا تھا اور وعظ سنتا تھا
و در مواعظ و نصائح مذکران رقت و	اور مذکروں کے مواعظ و نصائح سن کر بہت
گریہ بسیار کردے"۔[۱]	گریہ وزاری کرتا تھا۔

علمائے ظاہر و علمائے باطن میں فرق بلبن کو اپنے ہم عصر علماء سے وہی شکایت تھی جو مولانا نور ترک کو اپنے زمانہ کے علماء سے تھی۔ وہ ان کی دنیا پرستی اور حرص و ہوا سے سخت نالاں تھا۔ اور اسی وجہ سے علماء کی دو قسمیں کیا کرتا تھا: علمائے آخرت اور علمائے دنیا۔ علمائے آخرت سے مراد وہ علماء تھے جو دنیا اور اس کی محبت سے بالکل آزاد تھے۔ علمائے دنیا وہ تھے جن پر دنیا کی حرص اور دوستی غالب تھی اور وہ حیلہ بازی اور تاویلوں میں پھنسے رہتے تھے۔ بلبن کہا کرتا تھا کہ ہمیشہ علمائے آخرت سے ہی دینی معاملات میں مشورہ کرنا چاہیے اور ان ہی کی ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ اور

"دانشمندان حیلہ گو و بدآموز پیش خود	بدآموز اور حیلہ گو علماء کو اپنے پاس تک نہیں
آمدن نباید گذاشت"[۲]	پھٹکنے دینا چاہیے۔

جلوس شاہی علماء کے مکانوں پر بلبن کے متعلق برنی نے تفصیل سے بتایا ہے کہ وہ عام لوگوں سے ہم کلام ہونا دون مرتبت سمجھتا تھا اور منصب شاہی کے متعلق اس کے خیالات عجمی تصورات کا پرتو تھے لیکن علماء کے ساتھ اُس کا برتاؤ بالکل مختلف تھا۔ وہ انتہائی عقیدت لیکن پورے تزک و احتشام کے ساتھ نماز جمعہ کے بعد مولانا برہان الدین بلخی کے مکان پر حاضر ہوتا تھا[۳] مولانا برہان الدین اپنے زمانہ کے متبحر عالم تھے۔ علوم شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ وجد و سماع سے دلچسپی تھی اور شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ مشارق الانوار خود مولانا رضی الدین صغانیؒ

[۱] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۱۰۲ [۲] ایضاً ص ۱۵۴ [۳] ایضاً ص ۴۶۔

سے پڑھی تھی اور ہدایہ کا درس صاحب ہدایہ مولانا برہان الدین مرغینانیؒ سے لیا تھا بچپن میں جب مولانا مرغینانی نے اُنہیں دیکھا تو فرمایا تھا:

"ایں کودک چناں بزرگ شود کہ بادشاہاں بردراو بیایند"[۱]	یہ بچہ ایسا بزرگ ہوگا کہ بادشاہ اُس کے دروازہ آئینگے۔

اور یہ پیشین گوئی بلبن کے ذریعہ پوری ہوئی تھی۔

عہد بلبنی کے مشہور علماء بلبن کے عہد کے علماء میں مندرجہ ذیل بزرگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ مولانا برہان الدین بلخ
۲۔ مولانا برہان الدین بزاز
۳۔ مولانا نجم الدین دمشقی
۴۔ مولانا سراج الدین سنجری
۵۔ مولانا شرف الدین ولوالجی
۶۔ منہاج الدین جرجانی
۷۔ قاضی رفیع الدین گازرونی
۸۔ قاضی شمس الدین مراجی
۹۔ قاضی رکن الدین سامانہ
۱۰۔ قاضی جلال الدین کاشانی
۱۱۔ قاضی سدید الدین
۱۲۔ قاضی ظہیر الدین
۱۳۔ قاضی جلال الدین[۲]

ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ علم کا ایک سمندر تھا۔ افسوس ہے کہ اُن میں سے بیشتر علماء کا حال معاصر تذکروں اور تاریخوں میں نہیں ملتا۔ بلبن کو قاضی شرف الدین ولوالجی، مولانا سراج الدین سنجری اور مولانا نجم الدین دمشقی سے خاص عقیدت تھی[۳]۔ موخرالذکر امام فخرالدین رازیؒ کے شاگرد رشید تھے[۴]۔

برنی نے سلطان کے متعلق لکھا ہے:

---

[۱] فوائد الفواد ص ۲۳۸-۲۳۹، نیز اخبارالاخیار - ص ۴۵-۴۶۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ اُن کے "وفورِ علم" اور "کمال صلاحیت" کے مداح تھے۔ (ص ۲۳۹)
[۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۱۱
[۳] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۴۶۔
[۴] تاریخ فیروز شاہی میں صرف شاگرد لکھا ہے۔ مولانا نورالحق دہلویؒ نے "شاگرد خاص" بتایا ہے (زبدۃ التواریخ ص ۱۷ ب)

"و قاضیان لشکر را کہ ایشاں را بحرمان گفتندے و در تقوی و دین داری مشہور و معروف بودند، حرمت بسیار داشتے و شفاعتے کہ ایشاں کردندے قبول کردے"[1]

اور لشکر کے قاضیوں کی جنہیں "بحرمان" کہتے تھے اور جو پاکی اور دین داری میں مشہور و معروف تھے، بہت عزت کرتا تھا اور اُن کی سفارش کو قبول کر لیتا تھا۔

جب بلبن نے طغرل کے مددگاروں اور ساتھیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تو سارے شہری نہایت درجہ پریشاں اور مغموم ہوئے۔ بالآخر قاضی لشکر سے مدد کے طالب ہوئے۔ قاضی لشکر جمعہ کی شب میں سلطان کے پاس گیا اور سفارش کی۔ سلطان نے اُس کی شفاعت کو قبول کیا اور لوگوں کو رہا کر دیا۔[2]

اپنے عہد کے قاضیوں کے متعلق بلبن کا ایک قول سرور الصدور میں نقل کیا گیا ہے۔ لکھا ہے :-

من سہ قاضی دارم یکے قاضی آنست کہ از من نترسد و از خدامی ترسد۔ دویم قاضی از خدا نترسد و از من بترسد۔ سویم کہ است نہ از من بترسد و نہ از خدا بترسد۔ بعدہ فرمودے۔ فخر ناقلہ از من بترسد و از خدا نترسد، و قاضی لشکر از خدا بترسد و از من نترسد و عالم منہاج نہ از من ترسد و نہ از خدا ترسد"[3]

میرے تین قاضی ہیں، ایک قاضی ایسا ہے کہ مجھ سے نہیں ڈرتا اور خدا سے ڈرتا ہے، دوسرا قاضی خدا سے نہیں ڈرتا، اور مجھ سے ڈرتا ہے۔ تیسرا ایسا ہے کہ نہ مجھ سے ڈرتا ہے اور نہ خدا سے۔ اس کے بعد کہتا تھا۔ فخر ناقلہ مجھ سے ڈرتا ہے لیکن خدا سے نہیں ڈرتا۔ قاضی لشکر خدا سے ڈرتا ہے لیکن مجھ سے نہیں ڈرتا۔ عالم منہاج نہ مجھ سے ڈرتا ہے نہ خدا سے۔

بلبن اپنے قاضی لشکر کا احترام غالباً اسی بنا پر کرتا تھا کہ خدا سے ڈرتا تھا۔ مولانا منہاج السراج

۱-۲ تاریخ فیروز شاہی ص ۴۷، ۱۰۸

۳ سرور الصدور (قلمی نسخہ)، برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں قاضی فخرالدین ناقلہ کا صرف نام لکھا ہے (ص ۲۴)

کے متعلق گو بعض مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے[1] لیکن اُن کی زندگی میں دینی شغف کم اور سیاسی توڑ جوڑ زیادہ تھا۔ ان کی حیثیت مجموعی طور پر ایک کامیاب سیاست داں کی تھی۔ بلبن اسی بنا پر اُن کے متعلق اس طرح کی رائے ظاہر کیا کرتا تھا۔

مولانا کمال الدین زاہد اور بلبن مولانا کمال الدین زاہدؒ[2] عہد بلبنی کے متبحر عالم اور مرتاض بزرگ تھے۔ علم حدیث میں مولانا برہان الدین بلخیؒ کے شاگرد اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے اُستاد تھے۔ بلبن نے اُن سے شاہی امام کا عہدہ قبول کرنے کی درخواست کی تھی، لیکن مولانا نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ہمارے پاس نماز کے سوا اور رہ ہی کیا، کیا سلطان اُسے بھی ہم سے چھین لینا چاہتا ہے[3]۔

علماء و مشایخ شاہی ملازمین کی حیثیت سے گو چشتیہ سلسلہ کے مشایخ اور مولانا زاہدؒ کے ہم خیال علماء حکومت کی ملازمت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور بالعموم سرکاری ملازمتوں سے گریز کرتے تھے لیکن بلبن کی دینی دلچسپیوں سے متاثر ہو کر بعض اہم مذہبی شخصیتیں دامن حکومت سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ اس سلسلہ میں مولانا شمس الدین خوارزمیؒ، مولانا شمس الدین پانی پتیؒ، حسن سجزیؒ اور شمس دبیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا شمس الدین خوارزمیؒ اور بلبن مولانا شمس الدین خوارزمیؒ اس عہد کے مشاہیر علماء میں تھے مولانا جامیؒ کا بیان ہے:

"دراں زماں در شہر دہلی درویشاں بسیار	اس زمانہ میں شہر دہلی میں بہت سے درویش اور
و عالماں بے شمار بودند، فاما سرآمد روزگار	بے شمار عالم تھے، لیکن علمائے کبار میں سرآمد
در علمائے کبار شمس الدین خوارزمی بود	روزگار شمس الدین خوارزمی تھے۔ تمام علماء شہر
کہ ہمہ علماء شہر بدو رجوع داشتند داو	اُن سے رجوع کرتے تھے اور وہ جامع علوم تھے۔

---

[1] مولانا نور الحق محدثؒ منہاجؒ کے متعلق لکھتے ہیں: "از اکابر علماء بود و بتقوی و دیانت مقتدائے روزگار" زبدۃ التواریخ ص ۱۵ الف [2] مولانا کمال الدین زاہدؒ کے متعلق ملاحظہ ہو: سیر الاولیاء ص ۱۰۹، اخبار الاخیار ص ۷۱۔
[3] سیر الاولیاء ص ۱۰۶۔

جامع علوم در فروع و اصول و در معقول و منقول نظیرے نداشت"[1]	فروع و اصول اور معقول و منقول میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔

قاضی فخر الدین ناقلہ، مولانا برہان الدین اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ اُن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔[2] بلبن نے انہیں شمس الملک کا خطاب دیا تھا[3]۔ اور مستوفی ممالک[4] بنا دیا تھا۔ اُن کے متعلق تاج ریزہ کا یہ شعر شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے نقل کیا ہے ؎

صدرا کنوں بہ کام دل دوستاں شدی   مستوفی ممالک ہندوستاں شدی[6]

شیخ شمس الدین پانی پتیؒ اور بلبن شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ خواجہ علاء الدین علی احمد صابرؒ کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ بلبن کی فوج میں نوکری کی تھی۔ سیر الاقطاب میں لکھا ہے:

"آنحضرت . . . نوکری سلطان غیاث الدین بلبن اختیار نمود"[7]

ایک مرتبہ ایک مہم پر سلطان کی فوج میں ملازم کی حیثیت سے گئے۔ قلعہ کی تسخیر میں کچھ دشواریاں پیش آئیں اور رات کو ایسی سخت آندھی آئی کہ ہر جگہ کی روشنی ختم ہو گئی، لیکن ایک سقہ نے دیکھا کہ ایک خیمہ میں چراغ روشن ہے اور ایک درویش قرآنِ پاک کی تلاوت میں مصروف ہے۔ سقہ نے اُن کی بزرگی کا حال بلبن سے بیان کیا۔ وہ نہایت ہی عقیدتمندانہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔[8]

مشائخ سے عقیدت برنی نے سلطان کے متعلق لکھا ہے ؎

"علمائے آخرت و مشائخ ہر جادہ را بغایت	علماء آخرت اور ہر سلسلہ کے مشائخ کا نہایت

---

[1] سیر العارفین - ص ۵۹-۶۰   [2] فوائد الفواد - ص ۶۸   [3] سیر العارفین - ص ۶۰

[4] مستوفی ممالک کے فرائض و اختیارات کے متعلق ملاحظہ ہو دستور الالباب فی علم الحساب (قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور)، نیز پروفیسر شیخ عبد الرشید کا ترجمہ

Medieval India Quarterly Vol No : 3-4 p.30 et Seq.

[5، 6] فوائد الفواد - ص ۶۸، سیر العارفین ص ۶۰

[7] سیر الاقطاب، ص ۱۸۶۔   [8] ایضاً ص ۱۸۶-۱۸۸۔

حرمت داشتے"[1]	درجہ احترام کرتا تھا۔

لکھنوتی سے واپسی پر سلطان خود بزرگوں کے مکانوں پر حاضر ہوا اور ہر ایک کو فتوح پہنچائیں[2]۔
اس کے عہد کے مشائخ وصوفیہ میں شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ، شیخ بدرالدین غزنویؒ، شیخ صدر الدین ملتانیؒ، شیخ ملک یار پراںؒ، دہی سامؒ، اور سیدی مولا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
برنی نے لکھا ہے کہ۔

"از میامن وبرکات ایشاں در عہد و عصر سلطان بلبن فیض و رحمت آسمانی بریں دیار متواتر نازل می شد"[3]	ان کی (موجودگی کی) برکت سے سلطان بلبن کے عہد میں اس ملک پر آسمان سے مسلسل فیض و رحمت کی بارش ہوتی تھی۔

ابن بطوطہ نے ایک قصہ بیان کیا ہے کہ بخارا کے ایک فقیر نے بلبن کو ایک انار کے بدلے ہندوستان کا ملک بخشا تھا[4] لیکن اس قصہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاسکتی اس لیے کہ شاید ہی دہلی کا کوئی ایسا سلطان ہو جس کے متعلق اس قسم کے قصے عوام میں مشہور نہ ہوں۔

بابا فرید گنج شکرؒ اور بلبن

شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلیفہ اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مرشد حضرت بابا فرید گنج شکرؒ عہد بلبنی کے سب سے زیادہ مشہور و معروف بزرگ تھے۔ اور بقول برنی اُنھوں نے "اہالی ایں دیار را زیر بال گرفتہ" والا معاملہ کیا تھا[5]۔ محمد بولاق چشتیؒ نے لکھا ہے:

"سلطان ہیں.. نسبت اخلاص و اعتقاد در خدمت خواجہ گنج شکر داشت"[6]	سلطان بلبن، خواجہ گنج شکرؒ کی خدمت میں اخلاص و اعتقاد کی نسبت رکھتا تھا۔

ابتدائی زمانہ میں جب تاج و تخت کی تمنا نے اس کے دل کو بے چین کر دیا تھا، تو وہ بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور بابا صاحبؒ نے جن کا نفس گیرا بہت قوی تھا، اس کے دل

١،٢ تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶؛ ۱۰۷ ٣ ایضاً ص ۱۱۲ ۴ عجائب الاسفار۔ ص ۷۵۔
۵ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۱۲ ٦ مطلوب الطالبین (قلمی نسخہ)

کی آواز کو سُن لیا تھا۔ میر خورد نے اس ملاقات کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے[1]:

"جناب سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ جس زمانہ میں سلطان ناصر الدین اوچہ اور ملتان کی جانب گیا ہے تو اس کے تمام لشکر نے شیخ شیوخ العالم فرید الدین قدس سرہ کی زیارت کی طرف توجہ کی۔ یہاں تک کہ جس مقام پر آپ سکونت پذیر تھے خلق کے ہجوم و کثرت سے بھر گیا۔ اور تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہی۔ اس وقت لوگوں نے شیخ شیوخ العالم کی آستین مبارک کو کوٹھے کی طرف سے کوچہ کی جانب لٹکائی۔ لشکری جوق جوق آتے تھے اور آستین مبارک کو چوم کر چلے جاتے تھے۔ پھر بھی آستین کی یہ حالت تھی کہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ اس وقت شیخ مسجد میں تشریف لائے اور مریدوں کو ارشاد فرمایا کہ تم میرے گرداگرد حلقے کر کے کھڑے ہو جاؤ تاکہ لوگ حلقہ کے اندر نہ آسکیں اور دور ہی سے سلام کر کے چلے جائیں .... اسی اثنا میں ایک بڈھا فراش آیا اور مریدوں کے حلقہ سے تجاوز کر کے شیخ کے پاؤں میں گر پڑا۔ شیخ کا پاؤں پکڑ کر کھینچا اور بوسہ دے کر کہنے لگا۔ شیخ فرید اس قدر تنگی و سختی نہ کرو، اور خدا کی نعمت کا شکریہ اس سے بہتر ادا کرو۔ شیخ شیوخ العالم نے بڈھے کی جب یہ بات سنی ایک نعرہ مارا۔ بعدہ فراش کو بہت نوازا اور بے انتہا معذرت کی۔ کاتب حروف (یعنی میر خورد) نے اپنے والد سید محمد کرمانی رح سے سنا ہے کہ فرماتے تھے۔ اسی اثنا میں جب کہ سلطان ناصر الدین کا لشکر نہر والہ کے قریب پہنچا تو سلطان نے چاہا کہ اجودھن میں جا کر شیخ شیوخ العالم کی سعادت قدم بوسی حاصل کرے۔ سلطان غیاث الدین نے جو اس زمانہ میں نائب مملکت تھا اور الغ خاں کے خطاب سے شہرت رکھتا تھا، سلطان ناصر الدین سے عرض کیا کہ ہمارا لشکر بہت ہے اور اجودھن کے راستہ میں پانی کم یاب ہے۔ لشکر کو سخت تکلیف ہوگی، اور عجب نہیں کہ لوگ تلف ہو جائیں

[1] فوائد الفواد میں دو موقعوں پر اجمالاً اس ملاقات کا ذکر آیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۹۹، ۱۴۵-۱۴۶۔
لشکریوں کی عقیدت کے متعلق لکھا ہے: "جملہ لشکر روئے بزیارت شیخ نہادند تا آں مقام کہ بود از انبوہ حیران شد، آنگاہ آستین شیخ از بامے جانب کوچہ بیاویختند، خلق می آمد و می بوسید و می رفت تاہم پارہ پارہ شد"

اگر حکم ہو تو میں شیخ شیوخ العالم کی خدمت میں حاضر ہوں اور تحفے تحائف پیش کر کے خداوند عالم کی طرف سے معذرت کروں۔ سلطان غیاث الدین کے دل میں ان دنوں سلطنت اور جہانگیری کی ہوس تھی اور سلطان ناصر الدین کی جگہ خود بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ اگر سلطنت و حکومت میرے نصیب میں ہے اور تاج و تخت مجھے پہنچنے والا ہے تو اس بارے میں شیخ شیوخ العالم کی زبان مبارک پر میرے حق میں وہ الفاظ جاری ہو جائینگے جن سے میں اپنے مقصد پر استدلال کر سکونگا۔ یہ بات سوچ کر اور سلطان سے اجازت لے کر چلا۔ چاندی کی ایک کافی مقدار اور چار گاؤں کا فرمان لے کر شیخ شیوخ العالم کی خدمت میں پیش کیا۔ شیخ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ الغ خاں نے عرض کیا: یہ چاندی ہے اور یہ چار گاؤں کا فرمان ہے جو خاص آپ کے واسطے لایا ہوں۔ شیخ شیوخ العالم نے مسکرا کر فرمایا کہ نقد تو ہم کو دیدو کہ ہم سے درویشوں کو تقسیم کر دینگے اور گاؤں کا فرماں لے جاؤ کیونکہ اس کے خواستگار بہت ہیں۔ اس گفت و شنید کے بعد الغ خاں کے دل میں اس معنی کے کشف کی نسبت خلش پیدا ہوئی جس لیے وہ اس اہتمام سے یہاں آیا تھا، اور منتظر تھا کہ دیکھیے شیخ شیوخ العالم اس معنی کا کشف کب کرتے ہیں۔ اس بات کے دل میں کھٹکتے ہی فوراً شیخ شیوخ العالم کی زبان مبارک پر ذیل کی ابیات جاری ہوئیں ؎

"فریدونِ فرخ فرشتہ نبود   زعود و زعنبر سرشتہ نبود
زداد و دہش یافت آں نیکوئی   تو داد و دہش کن فریدوں توئی"[1]

معلوم نہیں کہ تخت نشینی کے بعد بلبن نے بابا صاحبؒ سے کس عقیدت کا اظہار کیا، اور تعلقات کو کس حد تک بڑھایا۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ بابا صاحبؒ نے چشتیہ سلسلہ کی روایات پر عمل کرتے ہوئے سلطان سے کوئی خاص تعلق پیدا نہیں کیا۔ اور دنیاوی طاقتوں کے سامنے دینی وقار کو قائم رکھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے بلبن کے نام سفارش نامہ لکھنے

[1] سیر الاولیاء، ص ۷۹-۸۰، اردو ترجمہ ص ۸۶-۸۷۔

پر اصرار کیا تو آپ نے صرف اتنا لکھا:۔

رفعت قصتہ الی اللہ ثم الیک	میں نے اس کا حال پہلے اللہ تعالیٰ سے اور پھر تمہارے
فان اعطیتہ شیئاً فالمعطی ھو	آگے پیش کیا۔ اگر تم اُسے کچھ دوگے تو اصلی عطا کرنے
اللہ وانت المشکور وان لم تعطہ	والا اللہ تعالیٰ ہے تم اُس کے لیے مشکور ہوگے اور اگر
شیئاً فالمانع ھو اللہ وانت المعذور[۱]	تم نے کچھ نہ دیا تو اصلی مانع اللہ تعالیٰ ہے تم اس
	میں معذور ہو۔

جواہر فریدی میں گلشن اولیاء کے حوالہ سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ بلبن کی ایک بیٹی کی شادی بابا صاحبؒ سے ہوئی تھی اور بعد کے تذکروں میں اس سلسلہ میں بہت سے قصے بھی بیان کیے گئے ہیں لیکن کئی وجوہ کی بنا پر ہم اس روایت کو صحیح تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ اول تو یہ کہ کسی معاصر مورخ یا تذکرہ نویس نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ برنی کی تاریخ اور میر خورد کے تذکرہ میں متعدد مقامات ایسے آئے ہیں جہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ روایت کسی حقیقت پر مبنی ہوتی تو وہ اس کا ضرور ذکر کرتے۔ علاوہ ازیں بابا صاحبؒ کا سلاطین اور امراء کی طرف جو رویہ تھا اُس کے پیش نظر اس قسم کے رشتہ کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

شیخ علی چشتی اور بلبن چشت کے ایک بزرگ خواجہ علی دہلی میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے وطن میں سجادہ نشینی پر کچھ جھگڑا ہوا اور وہاں کے دو صاحب نسبت بزرگ خواجہ زور اور خواجہ غور ہندوستان آئے تا کہ خواجہ علی کو وطن واپس لے جا کر سجادہ پر بٹھائیں۔ خواجہ علی نے دہلی سے روانگی کا ارادہ کیا تو بلبن کو سخت تکلیف ہوئی اور بقول میر خورد

"در پائے خواجہ علی افتاد و سوگند خورد	خواجہ علی کے قدموں میں گر پڑا اور قسم کھائی کہ اگر
اگر خواجہ عزیمت چشت کند من ترک	خواجہ صاحب چشت کا ارادہ کرینگے تو میں سلطنت

۱؎ سیر الاولیاء ص ۷۲ ۲؎ جواہر فریدی، علی اصغر چشتی (قلمی نسخہ)

مملکت گیرم و در رکاب خواجہ در چشت بیایم"	چھوڑ دونگا اور خواجہ صاحب کی ہم رکابی میں چشت چلا چلونگا۔

خواجہ صاحب نے فرمایا۔

"تو عہدِ رعایت بندگان خدائے تعالےٰ تکفل کردۂ و عالمے در کنف حمایت تو آسودہ اند، اگر تو بیائی آشوب در عالم افتد و تو مواخذ باشی"	تم بندگان خدا کی نگہداشت کے متکفل ہو اور ایک عالم تمہارے سایۂ حمایت میں آرام سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر تم (مملکت سے دست بردار ہو کر چشت) چلے جاؤ گے تو عالم میں پریشانی پھیل جائیگی اور اس پر خدا تم سے مواخذہ کریگا۔

لکھا ہے کہ بلبن نے جواب دیا، جو کچھ ہونا ہے، ہونے دیں "من از رکاب خواجہ دور شدنی نام" جب خواجہ علی نے سلطان کی عقیدت اور تعلق خاطر کا یہ عالم دیکھا تو دہلی ہی میں قیام کا فیصلہ کرلیا[1]۔ بلبن منصب شاہی کے متعلق جو نظریات رکھتا تھا اور جس طرح اپنے آپ کو عام لوگوں سے اعلیٰ اور ارفع خیال کرتا تھا، اس کے پیش نظر ایک درویش سے اس طرح پر عقیدت کا اظہار بہت ہی تعجب خیز ہے۔ لیکن میر خورد کے بیان پر شبہ کی گنجائش اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ ایک ایسے خانوادہ سے متعلق تھے جو چشتیہ سلسلہ کی سچی اور حقیقی روایات کا امین تھا۔

مولانا عبدالرحمن چشتی نے بلبن کو خواجہ علی کا مرید بتایا ہے[2]۔ لیکن یہ بیان محتاج ثبوت ہے اور کسی معاصر تذکرہ یا تاریخ میں نظر سے نہیں گزرا۔

جنازوں میں شرکت اور مزارات پر حاضری

برنی کا بیان ہے:

"بعد از نماز ہر جمعہ بزیارت روضات بزرگان برفتے۔ اگر بزرگے از سادات و مشائخ و علمائے بزرگ در شہر نقل کردے در جنازۂ	نماز جمعہ کے بعد بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کے لیے جاتا تھا۔ اگر سادات میں سے کوئی بزرگ یا کوئی شیخ یا عالم رحلت کر جاتا تو اس کے جنازہ میں

[1] سیر الاولیا، ص ۲۱۲، ۲۱۳
[2] مرآۃ الاسرار (قلمی نسخہ)

بگذارد ے و در سیوم او بزیارت برفتے و	شرکت کرتا تھا۔ اس کی نماز جنازہ ادا کرتا تھا اور
برادران و پسران او را جامہ دادے و	سویم میں جاتا تھا اور متوفی کے بھائیوں اور بیٹوں
بنواختے"۔ [۱]	کو کپڑے دیتا تھا اور نوازشیں کرتا تھا۔

اولاد کی تربیت — برنی کی کتاب میں بکھرے ہوئے مختلف مباحث کو یکجا کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بلبن ہمیشہ اپنی اولاد میں صحیح مذہبی جذبات پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ نماز کے معاملہ میں اس کی سختی کا ذکر اوپر گزر چکا۔ نماز و روزہ سے متعلق فقہی تعلیم اس نے اپنی اولاد کو دلوائی تھی۔ کہا کرتا تھا۔

"انچہ بہ نماز و روزہ و حکم وضو و جز آں تعلق دارد ازاں چارہ نیست"۔ [۲]

جہاں تک اولاد کے اخلاق و عادات کی نگرانی اور اُن کی تربیت کا تعلق تھا، بلبن کی سختی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے کیقباد کے لیے

"چنداں رقیباں درشت خو بر و گماشتہ	اس پر اتنے بہت سے درشت خو نگراں مقرر کر دیے
بودند کہ او را پروائے گرفتن لذتے و امکان	تھے کہ اس کو نہ کسی عیش و عشرت میں پڑنے کا
استیفار ہیچ ہوائے نبود، و از ترس سلطان	موقع ملتا تھا نہ کسی خواہش کے پورا کرنے کا
بلبن رقیبان او را نگذاشتندے کہ	امکان تھا۔ سلطان بلبن کے خوف سے اس کے
طرف خوبروئے نظر کند و یا پیالہ شرابے	نگراں اس کو اتنی مہلت ہی نہ دیتے تھے کہ کسی
بخورد و شب و روز اتابکان خشن مزاج	خوبرو کی طرف نظر کر سکے یا شراب کا ایک پیالہ
بر سر او نصب بودند و در تادیب و تہذیب	پی سکے۔ رات اور دن سخت مزاج اتالیق اس کے سر پر
او کوشیدندے"۔ [۳]	مسلط رہتے تھے اور اس کی تادیب و تہذیب میں کوشاں
	رہتے تھے۔

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶-۴۷، ۴۴، طبقات اکبری جلد اول ص ۸۲۔

[۲، ۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۴۵، ص ۱۲۸، طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۰۳-۱۰۴۔

بلبن نے اپنی اولاد کو مختلف موقعوں پر جو نصیحتیں کی تھیں اور جن کے نقش ان کے دلوں پر قائم ہوگئے تھے، یہ ہیں :۔

(۱) "در داد دہی و انصاف ستانی روئے ہیچ آفریدہ را نہ بینم، شما کہ فرزندان و نزدیکان من اید، پائے بر ہوش نہید کہ اگر ظلم شما بر عاجزے مرا معلوم شود من شما را سزائے آں برسانم ... نزدیکی شما و حقوق خدمت شما مرا در انصاف ستانی مانع نباشد" [۱]

داد دہی اور انصاف ستانی میں میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتا۔ تم جو میرے فرزند و اقربا ہو یہ بات کان کھول کر سُن لو کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائیگا کہ تم نے کسی بے بس پر ظلم کیا ہے تو میں تم کو اس کی سزا دونگا ... تمہاری مجھ سے نزدیکی یا رشتہ داری کا پاس مجھے انصاف کرنے سے نہیں روکیگا۔

(۲) "چناں زید کہ قول و فعل و حرکات و سکنات او در میان اہل اسلام در غایت و نہایت اعتبار گیرد" [۲]

(آدمی کو) اس طرح سے جینا چاہیے کہ اُس کے قول فعل، حرکات اور سکنات سب پر مسلمانوں کو انتہائی اعتبار پیدا ہو جائے۔

(۳) "ہر معاملہ کہ در امور جہانداری با بندگان خدا ورزد، چناں ورزد کہ بندگان خدا از امر و امارت و قول و فعل و اوصاف و اخلاق او بر جادۂ شریعت و معاملت زندگانی ورزند و از فسق و فجور و معاصی و مآثم بطاعات و عبادات و حسنات و مبرات گرانید و در دنیا سزاوار احسان و در عقبیٰ مستحق نجات گردند" [۳]

امور جہانداری میں خدا کے بندوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرے اور اس طرح پیش آئے کہ اس کے امر و امارت، قول و فعل، اوصاف و اخلاق سب سے (متاثر ہو کر) راہِ شریعت پر چلنے کی توفیق ہو اور فسق و فجور (گناہوں سے (لوگ) عبادت اور نیک کاموں کی طرف آجائیں، اور دنیا میں احسان کے سزاوار اور آخرت میں نجات کے مستحق ٹھہریں

[۱ تا ۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۳، ۷۱، ۷۲، نیز ملاحظہ ہو طبقات اکبری جلد اول ص ۸۹-۹۱۔

(۴) "... حشم و خدم و خزائن و دفائن را واسطۂ قلع و قمع کفر و کافری و شرک و بت پرستی و وسیلۂ محو فسق و فجور و بغی و طغیان گرداند و دشمنان خدا و رسول خدا و مخالفان امر خدا و دین مصطفیٰ را از بیخ و بن برکند" ۱؎

نوکروں چاکروں، خزانوں اور دفینوں کو کفر اور کافروں، شرک اور بت پرستی کے قلع قمع کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے، اور فسق و فجور، اور بغاوت و نافرمانی کو ختم کرنے کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ خدا کے اور رسول خدا کے دشمنوں اور اس کی نافرمانی کرنے والوں اور دین مصطفیٰ کی مخالفت کرنے والوں کو جڑ بنیاد سے اُکھاڑ دینا چاہیے۔

(۵) "فسق و فجور را در کام فاسقان و فاجران و عاصی و مذنبان تلخ تر از زہر سازد" ۲؎

فسق و فجور کو فاسقوں، فاجروں اور گناہگاروں کے حلق میں زہر سے زیادہ تلخ بنا دینا چاہیے۔

(۶) "از اہتمام دین پروری و دین پناہی او قضات و حکام و امر دادان و محتسبان متقی و متدین و خداترس و صلب و حق شناس و حق گذار بر سر بندگان خدا نصب شوند، و احکام شرع بر خواص و عوام و بر ہفتاد و دو ملت جاری گردد، و رونق امر معروف و نہی منکر پیدا آید و شعار اسلام بقبۂ آسمان رسد" ۳؎

(بادشاہ ایسا ہونا چاہیے کہ) اس کے اہتمام دین پروری اور دین پناہی سے ایسے قاضی، حاکم امیر داد اور محتسب خدا کے بندوں پر مقرر ہوں جو متقی، دیندار، خداترس، سخت اور حق شناس اور حق گزار ہوں تاکہ شریعت کے احکام خاص و عام سب پر بلکہ بہتر فرقوں پر جاری ہو جائیں اور امر معروف و نہی منکر کی رونق پیدا ہو جائے اور شعار اسلام گنبد نیلگوں تک پہنچ جائے۔

(۷) "معنی الناس علی دین ملوکھم نیکو دریابد" ۴؎

اس مقولہ کے معنی کہ "لوگ اپنے بادشاہ کے راستہ یا دین پر چلتے ہیں" سمجھ لینے چاہییں۔

(۸) "از برائے بادشاہی خود اجازت

اپنی بادشاہی کے لیے خلفائے عباسی سے

---

۱ تا ۴؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۷۳، نیز ملاحظہ ہو طبقات اکبری جلد اول ص ۸۹-۹۱

خلفائے عباسی بیار" ۱	اجازت حاصل کرنی چاہیے۔
(۹) "دار الملک خود را از علمار و مشائخ و سادات و مفسران و محدثان و حافظان و مذکران و فاضلان و ماہران ہر ہنری پر کن" ۲	اپنے دار السلطنت کو علمار، مشائخ، سادات مفسروں محدثوں، حافظوں، واعظوں، فاضلوں اور ہر فن کے ماہروں سے بھرنا چاہیے۔
(۱۰) "نماز جمعہ از اجازت خلیفہ گذارد" ۳	جمعہ کی نماز خلیفہ کی اجازت سے ہونی چاہیے۔
(۱۱) "خود را در پناہ کسے اندازی کہ او صورةً و معنیً روئے از دنیا گردانیدہ باشد و کلی و جزوی خود را در بندگی خدا وقف کردہ باشد" ۴	اپنے آپ کو کسی ایسے بزرگ کی پناہ میں دیدینا چاہیے کہ اُس نے ظاہراً و باطناً دنیا سے مُنہ پھیر لیا ہو اور مکمل طور پر خدا کی بندگی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہو۔

ان نصیحتوں کا بلبن کے بیٹوں پر کیا اثر ہوا؟ فطرت انسانی کی پیچیدگیوں کے مدنظر اس سوال کا جواب آسان نہیں۔ ایک ہی ماحول اور ایک ہی نگرانی میں پرورش پانے والے دو شہزادے ــــ محمد اور محمود ــــ بعد کو کتنی متضاد خصوصیات کے حامل ثابت ہوئے! شہزادہ محمود (یعنی بغرا خاں) تو بقول برنی "پادشاہزادہ عجول" تھا، لیکن محمد کو اللہ نے دل و دماغ کی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ صحیح معنی میں "اے داشتہ در سایہ ہم تیغ و قلم را" کا مصداق تھا۔ ملتان میں اُس کا دربار علم و فضل کا مرکز تھا۔ دور دور سے علمار و شعرار وہاں آکر جمع ہوتے تھے۔ امیر خسروؒ اور امیر حسنؒ اسی کے دربار سے منسلک تھے۔ شیخ سعدیؒ کو بھی ہندوستان آنے کی دعوت دی گئی تھی لیکن اُنھوں نے پیرانہ سالی کا عذر کر دیا تھا۵۔ شاہزادہ محمد مشائخ سے بھی بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ جب شیخ عثمانؒ ملتان تشریف لائے تو ان کی بیحد خاطر مدارات کی اور اُن کے لیے خانقاہ تیار کرانی چاہی لیکن اُنھوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ ایک دن محفل سماع

---

۱ تا ۴ تاریخ فیروز شاہی ص ۷۳، ۱۰۳

۵-۶ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲۱، ۶۸، طبقات اکبری جلد اول ص ۸۸-۸۹

منعقد کی جس میں شیخ عثمانؒ، شیخ قدوہ پسر شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور دیگر مشائخ نے شرکت کی۔ درویشوں نے رقص شروع کیا تو شہزادہ بھی دست بستہ مودبانہ کھڑا ہو گیا[۱]۔ اگر بلبن کے بعد شہزادۂ محمد تخت نشین ہوتا تو سلطنت دہلی کی تاریخ بالکل دوسرے ہی انداز سے لکھی جاتی[۲]۔ اس میں اور بلبن میں ایک زبردست فرق تھا اور وہ یہ کہ نسبی امتیازات جو بلبن کی سیاسی فکر کا جزو بن گئے تھے، اس کی نظر میں بالکل بے معنی تھے۔ برنی نے لکھا ہے:

"خان شہید چوں از اہل معانی بود اہل معانی را بجان و دل خریداری می کرد، و آنکہ او از اہل دانش نبود نزدیک او حسب و نسب و معانی و ہنر را اعتبارے و مقدارے نباشد و گوہر و خرمہرہ را بیک نظر بیند" [۳]	خان شہید چونکہ اہل معانی میں سے تھا اس لیے اہل معانی کی دل و جان سے قدر کرتا تھا۔ جو اہل دانش نہ ہوتا تو اس کے نزدیک اس کا حسب و نسب، معانی و ہنر کوئی چیز قابل اعتبار نہیں ہوتی تھی۔ موتی اور کوڑی کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔

گویا اس کا عمل اس شعر پر تھا ؎

لیس الجمال لجمال الوجہ والحسب　　فانما فخرنا بالعلم والادب

بلبن کا نظریۂ حکومت بلبن کے متعلق سب سے پہلی بات جو ضیاء الدین برنی نے لکھی ہے یہ ہے کہ:

بیشترے رسم جہانداراں قدیم را اتباع نمود و بر دارات سلاطین عجم درو درگاہ خود بیاراست" [۴]	(اس نے) پرانے بادشاہوں کی بہت سی رسموں کا اتباع کیا اور سلاطین عجم کے محلوں کے طرز پر اپنے دربار کو سجایا۔

بس ایک جملہ میں بلبن کے نظریۂ حکومت اور سیاسی کردار و اعمال کے متعلق سب کچھ کہہ دیا گیا

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۶۸　　[۲] "بارہا از امیر خسرو و از امیر حسن شنیدہ ام کہ بر طریق حسرت و نالش روزگار گفتندے کہ اگر ما را و ہنرمندان دیگر را بخت بودے خان شہید زندہ ماندے و بر سر تخت بلبنی متمکن گشتے و ماہران ہنرمند را در زر غرق کردے" تاریخ فیروز شاہی ص ۶۸۔　[۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۶۸

[۴] ایضاً ص ۲۵۔ شیخ نور الحقؒ نے لکھا ہے: بادشاہی برسم پادشاہان عجم بنیاد نہاد (زبدۃ التواریخ ص ۱۶ ب)

ہر حقیقتاً اُس کے سیاسی افکار کا چشمہ ساسانی نظریات سے پھوٹتا تھا۔ اس نے اپنے دربار کا پورا ماحول اور اس کے آداب و رسوم کی ہر تفصیل ایرانی روایات سے اخذ کی تھی۔ اور اسی کے سہارے سلطان کو عام انسانوں کی سطح سے اُٹھا کر "ظل اللہ" کی مسند پر بٹھایا تھا۔ اس کے سیاسی افکار کی عمارت ان بنیادوں پر قائم تھی۔

(۱) "از روے مجاز بادشاہی نیابت خدائے است[1]... بادشاہی ضد بندگی است[2] و... دل پادشاہاں منظر ربانی است و این منظرے بس شگرف است و با منظرہاے دیگر فرزنداں آدم نسبتے ندارد[3]... بادشاہی ہمہ عزت و عظمت و حرمت و حشمت است و چوں آں حشمت و عظمت و ہیبت در خلا و ملا از بادشاہ برود و حق آں محافظت نتواند نمود و بادشاہ را از رعیت تفردے نماند"[4]

مجازاً بادشاہی خدا کی نیابت ہے۔۔۔ بادشاہی بندگی کے برعکس ہے۔۔۔ بادشاہ کا دل منظر ربانی ہوتا ہے اور یہ منظر بہت ہی نادر ہے اور کسی اور بنی آدم کے منظر سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔۔۔ بادشاہی مکمل عزت، عظمت، حرمت اور حشمت ہے۔ اور یہ حشمت، عظمت اور ہیبت خلا ملا کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے اور اس کی پورے طور پر نگرانی نہیں ہو سکتی، اور راعی و رعایا کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) اگر بادشاہ از جد و پدر بادشاہ باشد و او حسباً و نسباً مستحق بادشاہی بود، حرمت و حشمت او البتہ در سینہ ہا نگاشتہ گردد[5].... از آل افراسیابم و نسب جدان و پدران من با افراسیاب می رسد و

اگر بادشاہ ایسا ہو کہ اس کے باپ دادا بھی بادشاہ رہے ہوں تو وہ اپنے حسب اور نسب کے اعتبار سے بادشاہی کا مستحق ہوتا ہے۔ اس کی عزت اور حشمت سینوں میں نقش ہو جاتی ہے۔۔۔ میں آل افراسیاب سے ہوں میرے باپ دادا کا سلسلہ نسب افراسیاب

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۴۴ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۰۲

[3] [4] تاریخ فیروز شاہی ص ۷۰ [5] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۴

می دانم کہ باری تعالیٰ درمن خاصیتے آفریدہ کہ ہیچ کم اصلے و دونے و سفلہ و رذالہ را در شغل و منصب و دولت نتوانم دید[1]... بمجرد آنکہ ایں چنیں طائفہ در نظر من در آیند جملہ رگہائے اعضائے من در جنبش در آید... من نتوانم کہ لئیم و کم اصل و ناکس زادہ را در صدد دولتے کہ از خدا یافتہ ام شریک کنم"[2]

تک پہنچا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے میری یہ فطرت بنائی ہے کہ میں کسی کم اصل یا چھوٹے آدمی یا سفلہ اور رذیل کو کسی سرکاری عہدے یا منصب پر نہیں دیکھ سکتا ... جوں ہی اس طبقہ کے آدمیوں پر میری نظر پڑتی ہے، میرے جسم کی رگ رگ میں جنبش پیدا ہو جاتی ہے... میں یہ نہیں کر سکتا کہ کسی رذیل، کم اصل یا حرام زادے کو اس سلطنت کے کاموں میں جو مجھے خدا سے ملی ہے شریک بناؤں۔

(۳) بادشاہی بچند چیز قائم است و آں چیز ایں ست: عدل و احسان و حشم و خدم و خزائن و دفائن و رغبت رعایا و اعتماد رعایا"[3]

بادشاہی چند چیزوں سے قائم ہے۔ اور وہ چیزیں یہ ہیں: عدل و احسان، حشم و خدم، خزانے دفینے، اور رعایا کی رغبت اور اعتماد۔

ان ہی تصورات کے زیر اثر بلبن نے "وقار بادشاہی و داب و آداب شاہی" کے لیے وہ طریقے اختیار کیے کہ "براں مزید صورت نتواں بست"[4] پائبوس کی ایرانی رسم تو دربار میں التمش کے زمانہ سے جاری تھی۔ بلبن نے ایرانی تہوار نوروز بڑی شان سے منانا شروع کر دیا۔ پوتوں کے ایرانی نام رکھے گئے۔ اس کے دربار میں زربفت کے پردوں، منقش فرشوں اور چاندی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۷، برنی نے لکھا ہے: "لیام .. و اسافل طبعاً تنفر کردے" ص ۳۰
[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۷ [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۷۷.
[4] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۷، طبقات اکبری جلد اول ص ۸۰
[5] پائبوس کا رواج غزنویوں کے زمانہ میں بھی تھا، ملاحظہ ہو تاریخ آل سبکتگین ص ۲۷، ۴۸، ۵۸ وغیرہ۔ نیز ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۵۔

سونے کے برتنوں نے شان و شوکت کا عدیم المثال ماحول پیدا کر دیا تھا۔ دربار کے چاؤشوں اور نقیبوں کی آوازیں دو دو میل تک سنائی دیتی تھیں اور لوگوں کے دل سہم جاتے تھے۔ کوکبۂ شاہی نکلتا تھا تو سو سو دو دو سو میل سے لوگ دیکھنے کے لیے آجاتے تھے۔ قدم قدم پر صدائے بسم اللہ اس زور سے بلند ہوتی تھی کہ ساری فضائیں گونج اٹھتی تھیں۔ "رسولان دور دست درایان وراؤزادگان" دربار میں پہنچتے تو "مدہوش" اور "بے خبر" ہو جاتے تھے۔ بلبن نے نہ اپنے "ایام خانی" میں، نہ "عصر بادشاہی" میں، کسی کم مرتبہ یا کم حیثیت اور کم اصل شخص کو شرفِ ہم کلامی نہیں بخشا۔[1]

بلبن نے اپنے سیاسی افکار و اعمال کا جواز 'مصلحت وقت' میں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ جب تک سلطان کا رعب دلوں پر نہیں بیٹھتا

حق رموز جہاں بانی و مصالح جہانداری	رموز جہانبانی اور مصالح جہانداری کا حق
چنانچہ باید و شاید گزاردہ نشود"[2]	جس طرح ادا ہونا چاہیے، ادا نہیں ہوتا۔

اور یہ بات ایک حد تک ان حالات میں صحیح بھی تھی لیکن بعض اوقات وہ غیر شرعی حرکات کو جائز ثابت کرنے کے لیے اپنے نفس کو یہ دھوکا دیتا تھا کہ ان تمام چیزوں سے "جریان امر معروف و نہی منکر" میں مدد ملتی ہے۔[3]

برنی نے بلبن کے متعلق لکھا ہے کہ

"بکمال اوصاف متضادہ موصوف بود"[4]	وہ متضاد خصوصیات کا حامل تھا

اس تضاد کی ایک مثال اس کے سیاسی فکر میں بھی ملتی ہے۔ جس شخص نے اپنی پوری زندگی ساسانی روایات کو زندہ کرنے میں بسر کر دی ہو اس کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر کہ:

حقوق نعمت بادشاہی چنانچہ باید و شاید	بادشاہی کے حقوق کو عمر خطابؓ اور عمرو بن
عمر خطابؓ و عمرو بن عبدالعزیزؒ تواند گزارد"[5]	عبدالعزیزؒ کی طرح ادا کرنا چاہیے۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۳ [2,3] ایضاً ص ۳۵ [4] ایضاً ص ۳۹ [5] ایضاً ص ۴۷۔

اس کی زندگی کے تضاد کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں سید نورالدین مبارک غزنوی کے وعظ بھی محفوظ تھے اور ان کو رو رو کر بیان بھی کر لیتا تھا۔ "دین پناہی" اور "دین پروری" کے مطالبات سے بھی وہ آگاہ تھا[1] لیکن ذاتی مفاد اور سیاسی مصالح نے اُسے کبھی یہ اجازت نہ دی کہ ساسانی نظریات حکومت سے دست بردار ہو کر خلفاء راشدین کے قائم کیے ہوئے اصولوں پر گامزن ہو سکے چنانچہ وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا:

"من حق دین پناہی نمی توانم گذاردو من	میں دین پناہی کا حق ادا نہیں کر سکتا میری
کیستم کہ ایں تمنا برم کہ خداوندان ہمہ	کیا ہستی ہے جو اس کی تمنا کروں جبکہ میرے پیشرو
نتوانستند کہ حق دین پناہی بگذارند"[2]	اور آقا بھی دین پناہی کا حق ادا نہ کر سکے۔

بلبن کے نظریہ حکومت کا سب سے اہم عنصر جہاں وہ اسلامی اصولوں سے پورے طور پر متاثر معلوم ہوتا ہے اُس کا نظریہ انصاف ہے۔ اور اس معاملہ میں جیسا کہ نظام الدین احمد بخشی نے لکھا ہے: "ہیچ یک از سلاطین سابق عدیل او نبود"[2] وہ خود بھی یہ کہا کرتا تھا کہ گو میں "حق دین پناہی" پوری طرح ادا نہیں کر سکتا، لیکن

"ایں قدری توانم کہ مظلمۂ مظلومان را فرو نگذارم"[3]

وہ انصاف کے معاملہ میں کسی رشتہ یا منصب کا مطلقاً کوئی خیال نہیں کرتا تھا۔ اور حسب تک بقول برنی "انصاف مظلوم از مقرب خود نہ ستدے دل او نیارامیدے"[4] وہ مظلوموں اور عاجزوں کے ساتھ ماں اور باپ کا سا مشفقانہ برتاؤ کرتا تھا[5]۔ اس نے اپنی انصاف پسندی سے غریبوں کے دل میں اعتماد پیدا کر دیا تھا، اور کسی طاقتور کو یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ کمزور پر ظلم کا تصور بھی کر سکے[6]۔ برنی نے غریبوں سے ہمدردی کے متعلق لکھا ہے:

"سلطان بلبن را عادتے و رسمے بود کہ در لشکر ہا از برائے گذرانیدنِ خلق ریزہ پا و

۱؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۴۴ ۲؎ طبقات اکبری، جلد اول ص ۹۷۔ ۳؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۴۴
۴؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۴۰۔ ۵؎-۶؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۴۰

ضیعفان ورنجوران وعاجزان برسرآبهائے بزرگ وپلہا وخلیشہا وخلابہا خودنشستے، وارکان دولت را فرمودے کہ چوب در دست گیرند و در میان خلیش درآیند و عاجزان وپیران وعورات واطفال وچارپایانِ لاغر را نگذانند، واگر آب غرقاب بے کشتی بودے، دہ دوازدہ روز برسرآب مقام کردے، تا خلق بہ آسانی وسہولت بگذرد وکالائے کسے تلف نشود"[۱]

اسی عدل گستری، رعیت پروری، اور "دست گیری بے یاوران" نے اس کو مقبول عام بنا دیا تھا۔

فخر نسب | اسلام نے فخر نسب کا بت ان الفاظ میں توڑا تھا:

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ان اللہ علیم خبیر۔	اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا، تمہارے گروہ اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو پہچانے جاؤ۔ بے شک تم میں بہتر خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی ہے۔ بیشک خدا جاننے والا اور خبیر ہے۔

لیکن جب حکمراں طبقہ نمودار ہوا تو فخر نسب اور غرور خاندان کے جذبات بھی پیدا ہو گئے۔ اور امتیازات حسب ونسب پر زور دیا جانے لگا۔ ہندوستان کے راجپوت خاندانوں نے تو چاند اور سورج سے اپنے رشتے قائم کیے تھے۔ مسلمان بادشاہوں نے ضحاک، فریدوں وافراسیاب سے اپنا نسبی تعلق قائم کر لیا۔

فخر نسب کے جذبہ کو دوسرے کی تذلیل وتضحیک سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ بلبن کے یہاں غرورِ نسب کے ساتھ ساتھ کم نسل لوگوں کی جو تذلیل وتحقیر ملتی ہے وہ مذہبی اور اخلاقی کسی نقطۂ نظر سے بھی جائز قرار نہیں دی جا سکتی۔ کمال مہیار کا قصہ برنی نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کمال مہیار کو خواجگی امروہہ کے لیے پیش کیا گیا۔ بلبن نے براہ راست نہیں

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۵، طبقات اکبری ص ۸۱۔

بلکہ "کارداران" کے ذریعہ کمال "مہیار" سے دریافت کرایا کہ لفظ مہیار کے کیا معنی ہیں اور اس سے کونسی نسبت مراد ہے۔ جب سلطان کو اس کے نسب کا علم ہوا تو غصہ میں دربار سے اُٹھ گیا اور مجلسِ خلوت میں چند اعیانِ سلطنت کو بلا کر اپنے غصہ کا اظہار کیا اور نسب و حسب کے متعلق اپنے خیالات کی وضاحت کی۔[1] سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ اس واقعہ کے بعد سلطان نے ایک ایک عامل اور کارکن کے حسب و نسب کے متعلق تحقیق کرائی اور ماہرانِ فن نسب دور دور سے اس کام کے لیے دہلی آکر جمع ہو گئے۔[2]

تعجب کی بات ہے کہ سید اشرف جہانگیرؒ جیسے عالم اور شیخ نے اس سلسلہ میں بلبن کے طرزِ عمل کو سراہا ہے اور لکھا ہے ؎

زہے بادشاہِ عالی نژاد — کہ با کم نژاداں نپرداختہ[3]

بلبن اور احترامِ شریعت | نظام الدین احمد بخشی نے بلبن کے متعلق لکھا ہے :۔

"و اوامر و نواہی را کما ینبغی رعایت نمودے"۔[4]

برنی نے بلبن کا علاء الدین خلجی سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ بات اس کی تعریف میں کہی ہے کہ

"و از خود حکم نامشروع پیدا نیاوردے"۔[5]

شریعت کے معاملہ میں اس کا اصول یہ تھا کہ جہاں تک شرعی اصول، ضروریاتِ ملکی سے نہیں ٹکراتے تھے وہ اُن کا پورا احترام کرتا تھا، لیکن جہاں صورتِ حال مختلف ہوتی تھی وہاں اس کا عمل بھی مختلف ہوتا تھا۔ نظام الدین نے صحیح لکھا ہے کہ

"مصالحِ ملک بر ہمہ مقدم داشتے"۔[6]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶؛ مکتوبات سید اشرف جہانگیرؒ (قلمی نسخہ) میں کمال مہیار کی جگہ محمد مہیار لکھا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ بلبن ایک "ماہر علم محاسبہ و ہندسہ" کو چندیری بھیجنا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں محمد مہیار کو پیش کیا گیا تھا۔ چونکہ کوئی دوسرا شخص ان خصوصیات کا حامل نہ تھا۔

[2] و [3] مکتوبات اشرفی (قلمی نسخہ) ص ۷۶ الف [4] طبقات اکبری جلد اول ص ۷۹۔

[5] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۸۶ [6] طبقات اکبری جلد اول ص ۸۲۔

بلبن کے نظامِ حکومت کا وہ پہلو جس میں اس نے حدودِ شریعت سے تجاوز کیا تھا اور جس میں اس کی شریعت سے بے اعتنائی برنی، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، شیخ نورالحقؒ وغیرہ نے خاص طور پر بیان کی ہے، سزاؤں سے متعلق تھا۔ اس معاملہ میں بلبن نے احکام شریعت کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی تھی۔ برنی نے لکھا ہے:-

"سلطان بلبن باآں شفقت و مہربانی و دادِ دہی وانصاف ستانی و روزہ و نماز بسیار ... در سیاست بغی و طغیان ملکی قہارے و جبارے بودہ است و در باب طغات اصلا محابائی نکردے و از جرم بغی لشکری و شہری بر انداختے و در قسم سیاست ملکی سر سوزنے از رسوم جبابرہ فرو نگذاشتے و در حالت قہر و سطوت پادشاہی، خدا ناترسی را کار فرمودی و در کشتن و بستن بلغاگیان و سرتابان صلاحیت و دین داری را پشت دادے، و آنچہ صلاح ملک خود دانستے خواہ مشروع خواہ نامشروع آنرا در کار در آوردی"[۳]	سلطان بلبن باوجود اس شفقت، مہربانی، داد دہی اور انصاف ستانی کے (جس کے ساتھ وہ لوگوں سے پیش آتا تھا) اور باوجود دلتے روزہ اور نماز کے باغیوں کے قتل کرنے اور بغاوت کو فرو کرنے میں بڑے قہر اور جبر سے کام لیتا تھا۔ اور باغیوں کے معاملہ میں بالکل مروت نہیں کرتا تھا۔ اور بغاوت کے جرم میں لشکری اور شہری (سب کو) اکھاڑ پھینکتا تھا، اور سیاست ملکی میں جابروں کی رسم سے سوئی کی نوک کی برابر بھی نہیں ہٹتا تھا اور بادشاہی کے قہر و سطوت کی حالت میں خدا کے خوف سے کام نہیں لیتا تھا۔ باغیوں کو بند کرنے اور مارنے میں دین داری کو پس پشت ڈال دیتا تھا، اور جس چیز میں صلاح ملک دیکھتا تھا خواہ وہ شرعاً جائز ہو یا ناجائز اس پر عمل کرتا تھا۔

تاج و تخت کی محبت میں اُس نے اپنے مخالفوں کا خون ہر طریقہ سے بہایا۔ مخالفوں ہی کا نہیں

---

[۱] تاریخ حقی قلمی نسخہ، ص ۱۳ ب   [۲] زبدۃ التواریخ (قلمی نسخہ) ص ۱۷ ب

[۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۷، ۴۸۔ طبقات اکبری جلد اول ص ۸۲۔

بلکہ ایسے عزیزوں کا بھی جن کی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے وہ ڈرتا تھا۔ اس نے لوگوں کو خفیہ زہر دلوایا، اور کوئی ایسی سزا نہ تھی جو اپنے مخالفین کو نہ دی ہو۔

"خواہ بہ تیغ وخواہ بزہر وخواہ بخفیہ وخواہ	تلوار سے قتل کرا دیتا، یا زہر دلوا دیتا، کبھی خفیہ یہ
بلت وچوب وخواہ بغدر وخواہ بے نانی	کام کرتا، کبھی لت وچوب استعمال کرتا، یا اعضا
وبے آبی وخواہ از بلندی فرو انداختن	کٹوا دیتا، یا بھوکا پیاسا مار دیتا، یا اونچائی پر سے
وخواہ درآب غرق کردن و بآتش سوختن	پھنکوا دیتا، یا پانی میں ڈبوا دیتا، یا آگ میں جلوا
کہ جواب خون او فردائے قیامت خواہند	دیتا، ان سب طریقوں سے خون بہانے کا
طلبید ....."[1]	جواب کل قیامت کے دن اس سے پوچھا جائیگا۔

شکار میں دلچسپی برنی نے سلطان کی شکار میں دلچسپی کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا یہ شغل دین داری کے منافی تھا۔ لکھتا ہے:-

"وسلطان بلبن را باوجود اشتغال وتعبد دینی واستغراق مصالح جہانداری در شکار علوئے واہتمامے تمام بودہ است"[2]

لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بلبن کی شکار میں دلچسپی کا مقصد تفریح نہ تھی بلکہ[3]

"لہو گرم رکھنے کا تھا اک بہانہ"

خلافت بغداد اور بلبن گو بلبن کی تخت نشینی سے پہلے ہی خلافت عباسیہ کا پیراہن تار تار ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنے سکوں پر خلیفہ کا نام بدستور جاری رکھا[4]۔ اور کتبات میں اپنے آپ کو "ناصر امیر المومنین"[5] کہتا رہا۔ بلکہ اپنے بیٹے کو ہدایت بھی کی کہ وہ اپنی فرمانروائی کی اجازت خلیفہ سے ضرور حاصل

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۷۷، ۴۸، طبقات اکبری جلد اول ص ۸۲ - [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۴ -
[3] طبقات اکبری ص ۸۳ - [4] Wright p 58 ; Thomas p 134.
[5] گڑھ مکتیسر کی جامع مسجد کا کتبہ ملاحظہ ہو: "مبنی هذه العمارة فی عهد السلطنة السلطان الاعظم شاهنشاه المعظم غياث الدنيا والدين ابو المظفر بلبن السلطان ناصر امير المومنين .... سنة اثنى وثمانين وست مائة ۶۸۲"

کرے[1]

سقوط بغداد نے وسط ایشیا اور عجم میں مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی زندگی کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا۔ ہزاروں برگشتہ قسمت شہزادے، وزراء، علماء اور مشائخ ہندوستان کی طرف رجوع ہو گئے تھے۔ بلبن نے نہ صرف ایسے لوگوں کا استقبال کیا بلکہ اُن کی آمد کی یادگار میں مختلف محلے آباد کیے۔ فرشتہ نے ملحقات طبقات ناصری کے حوالہ سے لکھا ہے :۔

"و ہر یک را محلہ علیحدہ تعین می کرد چنانکہ در دہلی پانزدہ محلہ از ایشاں بہم رسیدہ بود یکے محلہ عباسی، دوم محلہ سنجری، سوم محلہ خوارزم شاہی، چہارم محلہ دیلمی، پنجم محلہ علوی، ششم محلہ اتابکی، ہفتم محلہ غوری، ہشتم محلہ چنگیزی[2]، نہم محلہ رومی، دہم محلہ سنقری، یازدہم محلہ یمنی، دوازدہم محلہ موصلی، سیزدہم محلہ سمرقندی، چہاردہم محلہ کاشغری، پانزدہم محلہ خطائی"[3]	اور اُن میں سے ہر ایک کو علیحدہ ایک محلہ متعین کر دیا۔ اس طرح دہلی میں پندرہ محلے وجود میں آ گئے۔ ایک محلہ عباسی تھا، دوسرا محلہ سنجری تیسرا محلہ خوارزم شاہی، چوتھا محلہ دیلمی، پانچواں محلہ علوی، چھٹا محلہ اتابکی، ساتواں محلہ غوری آٹھواں محلہ چنگیزی[2]، نواں محلہ رومی، دسواں محلہ سنقری، گیارہواں محلہ یمنی، بارہواں محلہ موصلی، تیرہواں محلہ سمرقندی، چودہواں محلہ کاشغری، پندرہواں محلہ خطائی۔

ممالک اسلامیہ کے بہت سے ایسے شہزادے جن کو سیلِ تاتار نے ہندوستان پہنچا دیا تھا، اس کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ صرف دو شہزادوں کو بیٹھنے کی اجازت تھی اور یہ شہزادے خلفائے عباسی کی اولاد سے تھے۔[4]

ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ پالم میں سنسکرت کا ایک کتبہ ملا ہے جس سے بلبن کے متعلق ہندوؤں کے جذبات و احساسات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کتبہ ۱۳۳۷ء وکرمی سال یعنی ۱۲۸۰ء کا ہے۔ اس میں لکھا

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۰۳۔ [2] چنگیز کے نام پر کسی محلہ کا آباد کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو۔ [3] و [4] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۷۵۔

ہے کہ بلبن کے عہد میں لوگ گور سے غزنین اور درویدلے سے رامیشورم تک خوش اور فارغ البال ہیں۔ اس کی حکومت میں لوگوں کو آرام اور سکون میسر ہے۔ سلطان اپنی رعایا کی اس قدر خیر خبر رکھتا ہے کہ دشمنو کو اب دنیا کی فکر نہیں رہی اور وہ اطمینان کے ساتھ آرام کرتا ہے۔[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے اُن تمام غیر مسلموں نے جن میں ذرا بھی سیاسی احساس اور شعور ہوگا، بلبن کی حکومت کو اپنے لیے رحمت سمجھا ہوگا۔ یہ اسی کا سیاسی تدبر اور صلاحیت جہانبانی تھی جس کے طفیل ہندوستان اس آگ کے شعلوں سے بچ گیا جس نے وسط ایشیا کا پورا سیاسی نظام خاک کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ ہندوؤں نے یقیناً یہ محسوس کیا ہوگا کہ ترکوں سے پہلے کی کوئی ہندو حکومت سیل تاتار کو روکنے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتی تھی۔ ہندوؤں کے دل میں بلبن کی جو عظمت اور محبت تھی اس کا ثبوت اس استقبال میں ملتا ہے جو لکھنوتی سے واپسی پر علماء و مشائخ کے دوش بدوش "متصرفان، مالکیان، و مفروزیان، و رائیگان، و چودھریان، و مقدمان" نے ہر ہر قصبہ اور گاؤں میں کیا تھا۔[2]

بلبن کے آخری دن بلبن نے جس وقت دہلی کے تخت پر قدم رکھا تھا سلطان ناصر الدین محمود کے خون کے دھبے اس کے دامن پر تھے۔ وہ ایک طرف تو اپنے نماز روزے اور دادگری سے ان دھبوں کو مٹانے کی کوشش کرتا رہا، دوسری طرف اُس نے خاندانی وراثت کے استحکام کے لیے کتنے ہی بے گناہوں کو علانیہ موت کے گھاٹ اُتار دیا، یا پوشیدہ طور پر زہر دے کر ختم کر دیا۔ چالیس سال کی مسلسل سیاسی جدوجہد کے بعد جب وہ موت کے دروازہ پر کھڑا تھا تو اس کی پوری زندگی ایک المیہ کی صورت میں اس کی نظروں کے سامنے رقص کرنے لگی جس بیٹے کو ولی عہد بنایا تھا اور جس کی تخت نشینی میں سہولتیں پیدا کرنے کے لیے کتنی ہی حق تلفیاں اس

---

[1] اس کتبہ کا سر سید مرحوم نے پتہ لگایا تھا اور انھوں نے ہی آثار الصنادید میں سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کی تھی۔ ۱۸۷۱ء میں ایڈورڈ ٹامس نے اس کی اہمیت کا ذکر کیا (p. 136-38) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔
Epigraphia Indo-Moslemica (1913-1914)

[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۰۶۔

سے ہوئی تھیں، اس سے پہلے دوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ دوسرا بیٹا ہزاروں میل دور لکھنوتی میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا تھا ــــ عمر بھر کی آرزوئیں اور تمنائیں جن کو اس نے اپنے خون جگر سے زیادہ دوسروں کے خون سے پالا تھا، خاک ہو چکی تھیں۔ نامرادی و ناکامی ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھی کہ پیغام اجل آپہنچا اور کوشک لعل کی اس شاندار عمارت میں جہاں دنیا نے اس کے جلال اور دبدبۂ شاہی کے ہنگامے دیکھے تھے، اس نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اور آخری رات کی تاریکی میں اس کا جنازہ دارالامان[1] میں لاکر سپرد خاک کر دیا گیا۔

عصامی نے ایک قصہ نقل کر کے اس کی زندگی کے المیہ کو اور دردناک بنا دیا ہے۔ لکھا ہے کہ کچھ لوگ قلبکاری یعنی جعلی سکہ بنانے کے جرم میں قید ہو کر بلبن کے سامنے لائے گئے ان میں ایک بڑھیا کا اکلوتا بیٹا بھی تھا جو بالکل بے گناہ تھا لیکن اس طائفہ کے ساتھ پکڑ لیا گیا تھا۔ بڑھیا نے اپنے بیٹے کو بچانے کی بڑی کوشش کی لیکن بلبن نے پورے طائفہ کو قتل کرا دیا۔ بڑھیا نے اپنے بیٹے کے بے گناہ قتل پر ماتمی لباس پہن لیا اور شب کی خاموشیوں میں محل شاہی کے قریب کھڑی ہو کر با آواز بلند اللہ سے داد خواہی اپنا معمول بنا لیا۔ ساری فضائیں اس کی درد بھری آواز سے کانپ اٹھتی تھیں۔ بلبن نے ہر ممکن طریقے سے اس کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اُسے ڈرایا بھی اور لالچ بھی دیا لیکن ع نشد ہیچ شب غائب از کوئے شاہ۔ جس دن شاہزادہ محمد مغلوں کے ہاتھ سے مارا گیا، اس رات سے بڑھیا نے بھی آہ و فغاں بند کر دی۔ بلبن نے دور دور تلاش کرایا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا![2] ۔

بسے جست شہ آں زنِ بیوہ را ‌ ‌ ‌ ‌ کہ سازد حریفش بہ بزم عنا

بلبن کے انتقال سے عوام و خواص سب کو یکساں صدمہ ہوا۔ اس نے ایک نہایت ہی پرفتن دور میں لوگوں کو آرام و آسائش کی زندگی بہم پہنچائی تھی۔ جب اس کا جنازہ کوشک لعل سے نکالا گیا تو ارکانِ دولت نے رنج و غم سے مغلوب ہو کر اپنے کپڑوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور

---

[1] دارالامان کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو آثار الصنادید ص ۷۰، نیز Carr Stephen pp 79-81 فتوحات فیروز شاہی ص ۱۸، عجائب الاسفار ص ۵۷ [2] فتوح السلاطین ص ۱۸۲-۱۸۳۔

ننگے سر جنازہ کے پیچھے چلنے لگے۔ ملک الامراء کوتوال چھ مہینے تک اور دوسرے امراء چالیس دن تک زمین پر سوئے اور ماتم کرتے رہے۔ تمام بزرگانِ شہر نے سلطان کی روح کو ایصال ثواب کے لیے کھانا تقسیم کیا[1]۔ بلبن نے خود اپنے بیٹے کو وصیت کی تھی کہ

"پدر خود را بدعائے خیرے ودادن صدقہ بر روح او یاد آرد"[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلبن کے انتقال کے کافی عرصہ بعد تک اس کی روح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے کھانا اور روپیہ تقسیم ہوتا رہا۔ سیر الاولیا میں شیخ نظام الدین اولیاؒ کے متعلق لکھا ہے کہ

"می فرمود کہ کافور نام خواجہ سرائے بود در دار الامان دہلی، دو تنکہ پیش من آورد۔ من آں را قبول کردم، او گفت مرا فرمان است کہ ہر جمعہ بروح سلطان غیاث الدین بلبن چیزے میدہم"[3]

فرمایا کہ دار الامان دہلی میں ایک خواجہ سرا تھا، جس کا نام کافور تھا۔ وہ دو تنکے میرے پاس لایا۔ میں نے قبول کر لیے۔ اس نے کہا: مجھے حکم ہے کہ ہر جمعہ کے دن سلطان غیاث الدین بلبن کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے کچھ خیرات کروں

بلبن کے اخلاق کا اثر عوام کی زندگی پر

بلبن "الناس علیٰ دین ملوکھم" کا قائل تھا[4]۔ اس کا خیال تھا کہ بادشاہ کے اطوار و عادات کا عوام کی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے اُس نے نہ صرف اپنی ہی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کی[5]۔ بلکہ عوام کی اخلاقی حالت کو بھی سدھارنے کے لیے مسلسل جد و جہد کرتا رہا۔ وہ زاہد اور صالح آدمیوں کو مہم کا کام سپرد کرتا تھا[6]۔ اور دیگر حکام بھی ہمیشہ متدین مقرر کرتا تھا تاکہ "رواج دین و رونق عدل میان علائق پذیر آید"[7]

برنی نے لکھا ہے کہ اس کے ڈر سے لہو و لعب کی تمنا لوگوں کے دل سے نکل گئی تھی اور شراب و شاہد کا نام تک بھی خانان و ملوک کی زبان پر آنا بند ہو گیا تھا۔

۱؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲۳
۲؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۰۰
۳؎ سیر الاولیا ص ۵۰۶
۴؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۷۳
۵؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶
۶؎ مآثر رحیمی جلد اول ص ۳۰۵
۷؎ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۸۲۔

"و نام ہوا پرستی و خود کامی و مزاح و خندہ و مسخرہ و مطرب بر سر ارکان و اعوان ملک نمی رفت"[1]

بلبن کی عبادت میں دلچسپی، مشائخ و علماء سے عقیدت، دادگری و انصاف ستانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی حلقوں میں وہ خاص احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ لکھا ہے کہ جب وہ مہمات سے واپس آتا تھا تو "صدور و معارفِ شہر" کئی کئی منزل تک اس کے استقبال کے لیے جاتے تھے[2] شیخ حمید الدین سوالیؒ اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات میں اس کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا گیا ہے اور "انار اللہ برہانہ" اور "رحمۃ اللہ علیہ" وغیرہ کلمات استعمال کیے گئے ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چشتی سلسلہ کے بزرگوں کی نظر میں اس کے تعبدِ دینی کی کتنی قدر تھی!

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۱۲۹

[2] ایضاً ص ۶۰

باب پنجم

سلطان معزالدین کیقباد

بلبن کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے خلاف اعیان وملوک نے معزالدین کیقباد کو ۶۸۶ھ (مطابق ۱۲۸۷ء) میں تخت پر بٹھا دیا۔ اُس وقت اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی بلبن نے اس کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی تھی۔ انتہائی درشت خو اور سخت گیر اتالیق اس کی نگرانی کے لیے مقرر کیے گئے تھے اور یہ کوشش کی گئی تھی کہ اس میں کوئی اخلاقی کمزوری پیدا نہ ہو۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ اس تعلیم میں کچھ نفسیاتی نقائص تھے جن کی وجہ سے اس کے جذبات وقتی طور پر دب تو گئے لیکن اُن کی ایسی تربیت نہ ہو سکی جس سے اخلاقی قدروں کی صحیح عظمت اس کے دلنشین ہو جاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس نے تخت پر قدم رکھا تو ساری دبی ہوئی آرزوئیں پوری شدت کے ساتھ اُبھر آئیں اور جب اُن کو پورا کرنے کے لیے میدان وسیع پایا تو ایک دم وہ عیش و عشرت اور بدمستی و ہوا پرستی میں غرق ہو گیا۔ برنی نے لکھا ہے:

"از ہرچہ خواندہ و شنیدہ و آموختہ و دریافتہ بود فراموش کرد و سبق تعلیم و تادیب را در طاق نہاد" [1]	جو کچھ اس نے پڑھا تھا، سنا تھا، یا حاصل کیا تھا سب کچھ بھلا دیا اور تعلیم و تادیب کے سبق کو بالائے طاق رکھ دیا۔

جس دربار کے رُعب اور ہیبت کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑے امیر کو بھی (ال)زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اب لہو ولعب کا مرکز بن گیا۔ لیکن کوشک لعل ایک ایسے بادشاہ کی رہائش گاہ تھی جس نے تخت نشینی کے بعد عیش و نشاط کا عنصر ہی اپنی زندگی سے نکال دیا تھا، اس لیے

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲۸۔

نئے مسکن کی تلاش شروع ہوئی اور کیقباد نے کوشک لعل کی سکونت ترک کرکے دریائے جمنا کے کنارے ایک عالی شان محل میں جو خاص اسی مقصد کے لیے تیار کرایا گیا تھا، رہنا شروع کر دیا۔ قصر شاہی کے چاروں طرف شاہد و ساقی، حسینانِ دلربا، مطرب، لطیفہ گو وغیرہ آکر آباد ہو گئے اور بہت جلد ایک نیا شہر وجود میں آگیا۔

اس نئے شہر کی زندگی "مے و رامش و رنگ و بو" سے بنی تھی۔ یہ حسن کا مرکز اور عشرت کا گہوارہ تھا۔ برنی نے اس شہر کا نقشہ کھینچنے میں بڑا زور قلم صرف کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح "دختران خوبرو" کو اس سے پہلے کہ "شگوفہ پستاں در بستان جوانی سر بر آرد"[۱] تربیت دے کر دربار کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ اُن کو ایک طرف غزل خوانی، لطیفہ گوئی وغیرہ سکھائی جاتی تھی۔ دوسری طرف گھوڑے پر سواری کرنے، نیزہ چلانے، تیراندازی وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لڑکوں کو بھی مثل "عروسان جلوہ گاہ" آراستہ کیا جاتا تھا۔ شاہی مجالس اندر سبھا کا نمونہ تھیں۔ میرٹھ اور کول تک کے مشہور شراب ساز وہاں پہنچتے تھے اور دربار شاہی کی ضروریات کو پورا کرتے تھے۔

برنی جس وقت کیقباد کے دربار کا حال لکھنے بیٹھا تھا اُس وقت بقول خود اس کے مُنہ میں ایک دانت تک نہیں رہا تھا، لیکن جب حسینوں کے ان جھمگٹوں، شعر و شراب کی ان محفلوں اور رقص و سرود کے ان ہنگاموں کو وہ یاد کرتا تھا تو اس کی جان پر بن جاتی تھی۔[۲] بیچارے برنی کا تو ذکر ہی کیا، جب امیر خسروؒ اودھ میں بیٹھ کر دہلی کی ان محفلوں کو یاد کرتے ہیں تو الفاظ میں آتشِ دل پگھلا کر بھر دیتے ہیں۔ ایک عزیز کو لکھتے ہیں ؎

لیک از غم دوریت چنانم	کز تن بلب آمدہ است جانم
شبہا من و دل بغم نوازی	با یاد تو در خیال بازی
کو آں بوفا بہم نشستن	دل در طرب و نشاط بستن
گاہے غزلے جواب گفتن	گاہے سخنِ شراب گفتن

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۵۷ [۲] ایضاً ص ۱۶۵-۱۶۶۔

گہ جامِ نشاط نوش کردن — گہ زخمۂ تر بگوش کردن
گہ کردن گشت سوئے بستاں — گلہے بطوافِ حوض سلطاں
ہر شب منم و دلے و دردے — غم را بدو چشم آب خوردے
یک شب من و دل چراغ در پیش — جانے بہزار داغ در پیش[1]

کیقباد کی خواہش تھی کہ اس ہنگامۂ نشاط سے وہ تنہا ہی لطف اندوز نہ ہو بلکہ سب لوگ اس کا ساتھ دیں۔ برنی نے لکھا ہے:

"وچنانکہ خود در عیش و عشرت مشغول بودے ہمہ خلق را ہمچناں در عیش و عشرت خواستے کہ مشغول باشند"[2]

اور جس طرح خود عیش و عشرت میں مشغول رہتا تھا، اسی طرح چاہتا تھا کہ سب لوگ عیش و عشرت میں مشغول رہیں۔

اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ "چھوٹا ہو یا بڑا، پیر ہو یا جوان، عالم ہو یا جاہل، عاقل ہو یا ابلہ، ہندو ہو یا مسلمان"[3] غرض سماج کا کوئی طبقہ درباری زندگی کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا اور ہر گلی کوچہ میں ایک پری پیکر اور ہر گوشۂ بام پر ایک غزل خواں نظر آنے لگی[4]۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ

"عالماں در معصیت افتادند و زاہداں از تعبد دست برداشتند"[5]

علما معصیت میں پڑ گئے اور زاہدوں نے عبادت سے ہاتھ کھینچ لیا۔

علانیہ شراب نوشی ہونے لگی اور وہ سماجی توازن اور ٹھہراؤ جو بلبن کے عہد میں قائم ہوا تھا، درہم برہم ہو گیا۔ شیخ نور الحق نے لکھا ہے کہ اس عہد میں "احکام شریعت نماند"[6] برنی نے شکایت کی ہے کہ مسجد[7]

---

[1] عزۃ الکمال، اس سلسلہ میں ان کی غزل جس کا مطلع ہے ؎ اے دہلی! واے بتان سادہ ؛ پگ بستہ و ریشہ کج نہادہ ۔بھی مطالعہ کے قابل ہے۔ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۶۷ [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۳۰
[4] ایضاً ص ۱۲۹۔ [5] ایضاً ص [6] زبدۃ التواریخ ص ۲۰ الف
[7] لیکن کیقباد کے عہد میں ایک مسجد امروہہ میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس مسجد پر مندرجہ ذیل کتبہ ہے:۔
"امر ببناء ھذہ العمارت المسجد المبارکۃ فی عہد دولۃ السلطان المعظم ظل اللہ فی العالم معز الدنیا والدین المخصوص بعباد رب العالمین القائم بتائید الرحمٰن ابو المظفر کیقباد السلطان خلد اللہ ملکہ وسلطانہ العبد الضعیف الراجی الی رحمۃ الربانی عنبر سلطانی فی الغرۃ من شہر المبارک ربانی برضہ ۱۹

نمازیوں سے خالی ہوگئیں مے خانے آباد ہو گئے، اور فسق و فجور عام ہو گیا۔[۱]

ٹھیک اس وقت جب کیقباد کا یہ شہر، شہر طرب بنا ہوا تھا اور اس کے در و دیوار سے نغمے اُٹھتے ہوئے سُنائی دیتے تھے، شیخ نظام الدین اولیاءؒ، اُن عناصر کے جائزے میں مصروف تھے جن میں اُن کو اگلے چالیس سال میں اصلاح و تربیت کا کام کرنا تھا۔

کیقباد کی مذہب سے بے تعلقی کیقباد نے جس طرح کا ماحول دربار میں پیدا کر لیا تھا اس میں مذہبی فرائض کی ادائیگی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ سلطان نے نماز اور روزہ کو ترک کر دیا۔ اور علماء سوء نے اس بات کی اجازت بھی دیدی۔[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کے گرد بہت سے ایسے علماء سوء جمع ہو گئے تھے جو روپیہ اور اقتدار کی لالچ میں ہر شرعی اور غیر شرعی کام میں سلطان کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان علماء کے اخلاق و کردار کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو سیر الصدور میں حسام درویش کے متعلق بیان کیا گیا ہے:۔

"ایں حسام درویش چناں قبول یافتہ	اس حسام الدین درویش نے دہلی میں وعظ گوئی
بود در دہلی در تذکیر گفتن تا آں کہ او در دہلی	میں ایسی مقبولیت عامہ حاصل کر لی تھی کہ
بود ہیچ کس تذکیر بہتر از و نگفتے و جملہ	جب تک وہ دہلی میں رہا کوئی شخص اس سے
خلائق روئے بدو آوردے۔ بہ چنداں	بہتر وعظ نہیں کہتا تھا، اور تمام مخلوق اس کی
قبول و بزرگی میل بہ دنیا کرد و دنیا اورا	طرف رجوع ہوتی تھی، لیکن اتنی مقبولیت حاصل
از راہ ببرد۔ و بخود مغرور کرد تا چناں کہ	کر لینے اور اتنی بزرگی کے باوجود وہ دنیا کی طرف
پیش سلطان معزالدین آمد و شاد کردن	راغب ہو گیا اور (جب) دنیا نے اس کو گمراہ کر دیا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸۹) رمضان سنہ ست و ثمانین وستمائتہ"
آج کل یہ مسجد شیخ صدو کی مسجد کہلاتی ہے اور مشرکانہ حرکات و بدعات کا مرکز ہے، ملاحظہ ہو تاریخ امروہہ محمود احمد عباسی جلد اول ص ۹۳-۹۸۔
(نوٹ صفحہ ہذا) [۱] و [۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۳۰، ص

گرفت چنانکہ ندیم اُو شد و پیش او مسخرگی کردن گرفت و در لہو و لعب مشغول شدند چنانکہ می آرند وقتے کسے بر سلطان بوزنۂ زریں آوردہ بود و آں ساعت تماج می خوردند سلطان فرمود کہ ہر کہ تماج بے از دست می خورد، من ایں بوزنہ اُو را می دہم۔ ایں حسام درویش می گویند نشیب شد و دہن در صحنک کرد تا بخورد عورتے ہوری نام کہ او ہم پیش سلطان بودے، سلطان او را فرمود کہ یک سیلے بزن، او بسِ قفا چناں بزد کہ تمام روو ریش او پُر شد"[۱]

اور وہ مغرور ہوگیا اور اس نے سلطان معزالدین (کیقباد) کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس کا ندیم ہوگیا، اور اس کے سامنے مسخراپن کرنا شروع کر دیا اور لہو و لعب میں مشغول رہنے لگا۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوئی شخص سلطان کے پاس سونے کا بندر لایا۔ اس وقت (سب) تماج کھا رہے تھے۔ سلطان نے کہا جو کوئی بھی تماج بغیر ہاتھ لگائے کھا جائیگا اس کو میں یہ بندر دیدونگا کہتے ہیں کہ یہ حسام درویش (فوراً) نیچے کو جھکا اور کھانے کے لیے اپنا منہ رکابی میں ڈال دیا سلطان نے ایک عورت ہوری نام سے جو وہاں موجود تھی، حسام درویش کے ایک مُکّا مارنے کو کہا۔ اس نے گدی پر ایسا چانٹا مارا کہ حسام درویش کا تمام مُنہ سن گیا۔

بغرا خاں کی تشویش اور کیقباد کو نصیحت

جب دہلی کے ان حالات کی خبریں بغرا خاں کے کانوں تک پہنچیں تو وہ لکھنوتی سے اودھ آیا تاکہ اپنے بیٹے کو ہدایت کرکے راہ راست پر لائے اور ملک کو تباہی اور بربادی سے بچائے۔ اس ملاقات کا حال امیر خسرو نے مثنوی قرآن السعدین میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خسرو کی یہ پہلی مثنوی ہے، لیکن اُنھوں نے پوری شاعرانہ چابک دستی کے ساتھ یہ کوشش کی ہے کہ اس مثنوی کا ماحول، اس کے اشعار کا اُتار چڑھاؤ، اس کے

۱؎ سرور الصدور، ملفوظات شیخ حمید الدین صوفی سوالی ؒ (قلمی نسخہ)، ص ۴۸۔ برنی نے لکھا ہے: "ضیا جہجی و حسام درویش کہ ظرفائے زمانہ و شیریں کلاماں عصر و ندیمان نادر آمدہ گویاں بوالعجب بودند ... در مجلس خاص سلطان (کیقباد) ندیم شدند" (ص ۱۳۱) برنی نے عہد علائی کے مذکروں میں ایک مولانا عماد الدین حسام درویش کا ذکر کیا ہے (ص ۳۵۵)، غالباً وہ کوئی دوسرے بزرگ تھے۔

بیانات کی رنگینی مناظر کی دلکشی اور نفسیاتی کیفیات کی تصوری، غرض ایک ایک تفصیل عہد کیقبادی کے عام ماحولِ عیش و طرب سے ہم آہنگ ہو۔

بغرا خاں نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی تھیں وہ خسرو نے بھی بیان کی ہیں اور برنی نے بھی۔ خسرو نے جس بے باکی سے بادشاہ پر تنقید کی ہے وہ حیرت انگیز ہے، اس لیے کہ یہ مثنوی کیقباد کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ امیر خسرو بغرا خاں کی زبان سے بادشاہ کو ہدایتیں کرتے ہیں۔

دولت دنیا کہ مسلّم تراست — جانبِ دین کوش کہ ہم تر است
ترسِ خداوند جہاں کن بدل — تا ز خداوند نمانی خجل
کار چناں کن کہ بہنگامِ کار — از در یزداں نشوی شرمسار
باز طلب صحبت مردانِ پاک — صحبت آلودہ رہا کن بخاک
غفلت شاہ است زیان ہمہ — خوابِ شبان ست، بلائے رمہ
شاہ بود از پئے پاسِ جہاں — خواب نشاید کہ کند پاسباں
چوں تو خوری بادہ کا فور بو — پس غم گیتی کہ خورد؟ خود بگو
پیشۂ تقویٰ ست پسندیدہ فر — از ہمہ۔ وز شاہ پسندیدہ تر
کوششِ پوشیدہ کن اندر شراب — تا نشود رکن شریعت خراب[1]

بغرا خاں نے اُن "دانشمندان حیلہ گو" کی سخت مذمت کی جنھوں نے کیقباد کو نماز اور روزہ ترک کرنے کی شرعی رخصت دے دی تھی اور یہ سمجھایا کہ مساکین کو کھانا کھلانے اور خیرات کرنے سے اس فریضہ کا کفارہ ادا نہیں ہوتا۔ روزہ نہ رکھنے والا جوان مرتا ہے[2]۔ ساتھ ہی ساتھ بغرا خاں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اب تک اس کے خلاف بغاوت نہ ہونے اور اس کے تخت پر رہنے کا سبب صرف بلبن کا رعب ہے[3]، ورنہ عیش و طرب کا یہ ماحول کب کسی بادشاہ کو تخت پر رہنے دیتا ہے!

---

[1] قرآن السعدین ص ۳۹ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۴۵ [3] ایضاً ص ۱۵۵

باپ کی نصیحتوں کا کیقباد کے دل پر اثر ہوا اور چند روز تک وہ شاہد و شراب ہر چیز سے دور رہا لیکن حالات گرد و پیش جس حد تک خراب ہو چکے تھے اُن میں یہ اُمید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اس توبہ پر قائم رہ سکیگا۔ جب لشکر سلطانی اودھ سے دہلی کو واپس ہوا تو حُسن کا وہ سارا قافلہ جو اس کے ساتھ اودھ گیا تھا، اس کوشش میں لگ گیا کہ سلطان کو پھر بزم نشاط میں واپس لائے۔ چنانچہ ایک 'مہ پارہ' سیاہ پرچم ہاتھ میں لیے، پوری دلربایانہ اداؤں کے ساتھ کیقباد کے سامنے آیا اور یہ شعر پڑھا ؎

گر قدم بر چشم ما خواہی نہاد　　دیدہ بر رہ می نہم تا می روی

اور بولا کہ اس غزل کا مطلع نہایت مناسب حال ہے لیکن سوءِ ادبی کے ڈر سے پڑھنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ بادشاہ کے ہاتھ سے دامن صبر چھوٹ گیا اور بے اختیار پکار اُٹھا: "بخواں، مترس"۔ اُس نے یہ شعر پڑھا ؎

سرو سیمینا بصحرا می روی　　نیک بد عہدی کہ بے ما می روی

اور عیش و نشاط کی محفلیں پھر جم گئیں۔ جب مغبچہ نے جام شراب پیش کیا تو سلطان نے یہ شعر پڑھ کر قبول کر لیا ؎

اگر ساقی تو خواہد بود مارا　　کہ می گوید کہ می خوردن حرام است

اور رنگ رلیوں میں غرق ہو گیا[1]۔ اس عیش و عشرت اور بدمستی و ہوا پرستی نے اگر ایک طرف خود کیقباد کے اعضاء کو مفلوج کر دیا تو دوسری طرف سلطنت کے سارے اعضاء بھی کمزور اور مضمحل ہو گئے۔

برنی نے کیقباد کے کردار کے بعض پہلوؤں کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ

"بادشاہزادہ صاحب مکارم اخلاق بود و طبع نظم و خلقے پاکیزہ و جمالے وافر داشت"[2]

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی ص ۱۵۸-۱۶۲

[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲۷، ۱۶۷، ابن بطوطہ لکھتا ہے "یہ بادشاہ نکی اور کریم تھا۔ (باقی بر صفحہ ۱۹۴)

اس کی طبیعت کی نرمی اور سہل گیری کا یہ عالم تھا کہ مورچہ کو آزردہ کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا امیر خسرو نے اپنے مخصوص انداز میں اس کے عہد پر اس طرح تنقید کی ہے ؎

تا تو گرفتی ہمہ عالم بنام
تیغ فرو خفت میان نیام

کیقباد کا انتقال

کیقباد کا انتقال بڑے حسرتناک حالات میں ہوا۔ مسلسل شراب نوشی اور عیاشی نے اُس کے قوائے عمل شل کر دیے اور وہ درباریوں کے رحم و کرم پر اپنی زندگی کے آخری دن گزارنے لگا۔ ابن بطوطہ کو ایک شخص نے بتایا تھا کہ اس زمانہ میں ایک پڑوسی اس کو کھانا بھیجا کرتا تھا۔ ایک دن ایک ملک نے جس کے باپ کو اُس نے قتل کرا دیا تھا، قصر کیلوکھڑی میں داخل ہو کر سلطان کو ایک شطرنجی میں لپیٹا اور خوب زد و کوب کر کے دریائے جمنا میں ڈال دیا۔ یحیٰی سرہندی نے لکھا ہے کہ وہ تشنگی اور گرسنگی سے مرا تھا اور آخری وقت میں اس کی زبان پر یہ رباعی تھی۔

اسپ ہنرم بر سرِ میداں ماندست | دستِ کرمم درتہِ سنداں ماندست
چشمم کہ صدکانِ گہر کم دیدی | امروز بیا ببیں چہ حیراں ماندست

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۹۳)

اس کے دیکھنے والوں میں سے بعض اشخاص سے میری ملاقات ہوئی وہ اس کے حلم اور انسانیت اور سخاوت کی بہت تعریف کرتے تھے" عجائب الاسفار ص ۶۱۔

(نوٹ صفحہ ہذا)

۱؎ قران السعدین ص ۱۰۳۔ ۲؎ عجائب الاسفار، ص ۶۲
۳؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۶۳، فتوح السلاطین ص ۲۰۶-۲۰۷
۴؎ تاریخ مبارک شاہی ص ۵۹۔

خلجی سلاطین

باب ششم

سُلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی

کیقباد کے مفلوج ہو جانے کے بعد امراء اور اعیان سلطنت میں اقتدار کی کشمکش تیز تر ہو گئی کچھ دنوں قدیم ترک امراء اور خلجیوں[۱] میں سیاسی ہنگامہ آرائی جاری رہی۔ بالآخر خلجیوں کو فتح ہوئی اور ۳۔جمادی الثانی ۶۸۹ھ (مطابق ۱۳۔جون ۱۲۹۰ء) کو جلال الدین ستر سال کی عمر میں دہلی کے تخت پر بیٹھا، اور کیلوگرھی کو اپنا دار السلطنت بنا کر "شہر نو" کی تعمیر شروع کر دی۔ جب اپنی طاقت کے استحکام کی ابتدائی منزلیں طے کر لیں، تو بلبن کے کوشک لعل کو دیکھنے کے لیے گیا۔ اس موقع پر اُس نے جن جذبات اور احساسات کا مظاہرہ کیا اُن سے اُس کے کردار پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ہر چند کہ اُس کی عمر کا بیشتر حصہ میدانِ کارزار میں بسر ہوا تھا،

---

[۱] خلجیوں کے نسب کے متعلق مورخین میں اختلاف رائے ہے۔ برنی کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلجی ترک نہیں تھے اور ان کے تخت حاصل کر لینے پر لوگوں کو تعجب ہوا تھا کہ

"خلجیاں چگونہ بجائے ترکان بر تخت نشینند و بادشاہی از اصل ترکاں در اصل دیگر رود" (ص ۱۷۵)

لیکن عصامی نے جلال الدین کے متعلق لکھا ہے ع کہ عالی حسب بود و والا نسب (ص ۲۰۹)

نظام الدین کا خیال ہے کہ خلجی، چنگیز خاں کے داماد قلیج خاں کی اولاد سے تھے۔ (طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۱۶)

لیکن یہ رائے اس لیے قابلِ قبول نہیں کہ خلجیوں کا ذکر چنگیز خاں سے بہت پہلے خوارزمیوں، غزنویوں اور غوریوں کے سلسلہ میں ملتا ہے۔ نظام الدین نے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جس میں سلجوق نامہ کی سند پر ان کو ترک بتایا گیا ہے۔ فخر مدبر، ابن حوقل، صاحب حدود العالم، بارتولڈ وغیرہ کی رائے یہی ہے کہ خلجی ترک تھے اور افغانستان کے ایک علاقہ میں جو خلج کے نام سے موسوم تھا آباد تھے۔ اس مسئلہ پر پروفیسر شیخ عبد الرشید نے اپنے مضمون مطبوعہ

Proceedings of the Indian History Congress 1938
pp. 297-303

میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

[۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۷۸۔

لیکن طبیعت میں انکسار اور حلم تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حق گوئی، حق شناسی اور احترام مذہب کے جذبات کوٹ کوٹ کر اس میں بھرے گئے تھے۔

جلال الدین جب دولت خانہ میں داخل ہوا تو دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ اور پھر سلاطین ماضیہ کے تخت پر بیٹھ کر ملوک و امراء کو اس طرح خطاب کیا:

من چگونہ شکرانۂ خدا توانم گفت کہ در پیش تختے کہ چندیں گاہ سر بر زمین نہادہ ام پائے براں نہادم و یاران من و خواجہ تاشان و ہمسران من.... دست بر کمر بستند و پیش من ایستادہ شدند"[1]

میں خدا کا شکر کس طرح ادا کر سکتا ہوں کہ آج وہ تخت میرے پاؤں کے نیچے ہے جس کے سامنے مدتوں میں نے زمین پر سر رکھا ہے.... اور میرے ساتھی، خواجہ تاش اور ہمسر میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے ہیں

جب کوشک لعل میں داخل ہوا تو اپنے دستور کے مطابق گھوڑے سے اتر پڑا۔ احمد چپ نائب باربک نے متعجب ہو کر کہا: یہ کوشک تو خداوند عالم ہی کی ہے۔ یہاں اترنے کا سبب کیا ہے؟ سلطان نے جواب دیا کہ

"... ایں کوشک سلطان بلبن است و در ایام خانی بر آوردہ است۔ ملک فرزندان اوست و من تغلب تصرف میکنم"

یہ کوشک سلطان بلبن کی ہے اس نے اپنے ایام خانی میں بنائی تھی۔ یہ اس کے بیٹوں کی ملکیت ہے، میں تو اس پر ناجائز قبضہ کر رہا ہوں۔

احمد چپ نے کہا کہ مصالح ملکی میں موروثی، غیر موروثی کا سوال بے معنی ہے۔ سلطان نے فوراً جواب دیا:-

انچہ تو میگوئی من ہم میدانم، فاما چہ میگوئی از برائے مصلحت چند روزہ یا چندگاہ از مسلمانی بیروں آیم و اعتقاد

جو تو کہتا ہے وہ میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن کیا تو مجھ سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ چند روزہ مصلحت کی خاطر میں اپنے مذہب کو چھوڑ دوں اور احکام شرع

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۷۸۔

برخلاف احکام شرع کنم" — کے خلاف کام کروں۔

اس کے بعد بتایا کہ اس کے اسلاف میں سے کوئی بادشاہی کے مرتبہ کو نہیں پہنچا ہے اس لیے نخوت و کبر کی میراث بھی اُسے نہیں ملی ہے۔ اس کی آنکھوں میں سلطان بلبن کی تصویر پھر رہی ہے اور اُسے ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا وہ تخت پر بیٹھا جلوس کر رہا ہے۔

"من آں بادشاہ را دریں کوشک بسیار خدمت کردہ ام و مرا دل میزند وہیبت و حشمت او ہنوز از دل من نرفتہ است" — میں نے اس کوشک میں اس بادشاہ کی بہت خدمت کی ہے۔ میرا دل دھڑکتا ہے۔ اور اس کی ہیبت و حشمت اب تک میرے دل سے نہیں گئی ہے۔

یہ کہہ کر وہ پیادہ پا کوشک میں داخل ہوا، اور جس جس مقام پر سلطان بلبن کی خدمت میں مودبانہ حاضر رہا تھا وہاں اُسی طرح کھڑا رہا۔ جب "صفہ ملوک خانہ" پر پہنچا تو دنیا کی ناپائداری کے احساس نے اس کے دل میں ایک طوفان برپا کر دیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جب دل قابو میں آیا تو امراء سے یوں مخاطب ہوا:

"بادشاہی ہمہ فریب و نمائش است و اگرچہ بیروں نقش و نگار می نماید ولیکن دروں زار زار است" — بادشاہی تو بالکل فریب اور نمائش ہے۔ ظاہر میں اگرچہ نقش و نگار نظر آتے ہیں لیکن اندر سے غم ہی غم ہے۔

اور پھر دنیا کی بے ثباتی پر ایسی پُرتاثیر گفتگو کی کہ بڑے بڑے امراء اور ملوک کی آنکھیں پُرنم ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ بعض مدمغ اور 'نودولتے' لوگوں نے اس چیز کو سلطان کی نااہلیت پر محمول کیا اور یہ طرز گفتگو شاہانہ قہر و سطوت کے منافی قرار دیا لیکن ضیاء الدین برنی کی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہونگے جنہوں نے اس واقعہ میں جلال الدین خلجی کے "دین و دیانت و اسلام و اعتقاد و انصاف"[۱] کی جھلک دیکھی ہوگی۔

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۸۰۔

سلطان کا اخلاق برنی نے جلال الدین کے "مکارمِ اخلاق" اور "دین داری" کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ بڑا پاک اعتقاد مسلمان تھا۔ اس کی طبیعت کی پاکی کا یہ عالم تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "از آبِ حیات سرشتہ بود"[۱] عصامی اور برنی دونوں نے اس کو حلیم و کریم کے لقب سے یاد کیا ہے۔[۲] اس کی شرافتِ طبع اور وسعتِ قلب کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو برنی نے کسی قدر تفصیل سے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ جس زمانہ میں جلال الدین بلبن کا سرجاندار تھا، سامانہ کی نیابت بھی اسی کے حوالہ تھی۔ مولانا سراج الدین ساوی سامانہ کے مشہور شاعر تھے۔ اُنہیں لگان کی ادائیگی کے سلسلہ میں عمال سے کچھ شکایت پیدا ہوئی تو جلال الدین سے رجوع کیا۔ لیکن جلال الدین نے توقع کے خلاف اپنے کارکنوں کو تنبیہ نہیں کی۔ اس پر سراج الدین کو بڑا رنج ہوا اور انہوں نے جلال الدین کی ہجو میں خلجی نامہ تصنیف کیا۔ جلال الدین کو کسی طرح اس بات کی اطلاع ہو گئی تو سراج الدین کو ڈر پیدا ہوا اور وہ سامانہ چھوڑ کر دوسری جگہ جا بسے۔ اسی زمانہ میں جلال الدین نے کیتھل کے منڈاہر پر حملہ کیا اور ان کے علاقوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ ایک منڈاہر نے جل کر جلال الدین کے چہرہ پر تلوار سے حملے کیے اور ایسے زخم پہنچائے کہ آخر عمر تک وہ نشانات اس کے چہرہ پر قائم رہے ـــــ جب جلال الدین تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو مولانا سراج الدین اور منڈاہر دونوں نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لیے اور اپنے رشتہ داروں سے رخصت ہو کر دہلی پہنچے اور خود اپنی گردنوں میں رسیاں ڈال کر محل شاہی کے دروازہ پر کھڑے ہو گئے۔ جلال الدین نے دونوں کو اندر بلا لیا۔ مولانا سراج الدین سے بغل گیر ہوا۔ اور اُنہیں خلعت شاہی اور جاگیر دے کر ندیمان خاص میں شامل کر لیا۔ منڈاہر کو بلا کر دربار کے سامنے اس کی تعریف کی اور ایک لاکھ جیتل دے کر وکیل دربنا دیا۔[۳] سلطان جلال الدین

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۷۔ [۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۵،۱۷۴ وغیرہ،
فتوح السلاطین ص ۲۱۵۔ [۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۴-۱۹۵۔

کے اس عفو اور کریم النفسی نے لوگوں کے دلوں کو اتنا متاثر کیا کہ عرصہ تک اس واقعہ کی یاد اُن کے ذہنوں سے محو نہ ہوئی۔

روزہ اور نماز کی پابندی | جلال الدین خلجی، نماز اور روزہ کا بے حد پابند تھا۔ ایک موقع پر خود کہتا ہے

"من کہ روزے یک سپارہ قرآن بخوانم	ہیں روزانہ ایک سیپارہ پڑھتا ہوں اور پنج
و پنج وقت نماز گذارم" [۱]	وقتہ نماز ادا کرتا ہوں۔

روزہ کی پابندی کا یہ حال تھا کہ جب علاءالدین سے ملنے کے لیے کڑہ گیا تو باوجود اتنے لمبے سفر کے روزہ نہیں چھوڑا۔

احترام شرع | جلال الدین خلجی میں احترام شرع کا جذبہ ایک حد تک کافی گہرا تھا۔ بعض اوقات نہایت صفائی سے اس کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ باغیوں اور سرکشوں کو سزائے موت دینے میں اس کو اس لیے تامل ہوتا تھا کہ

"در شریعت پیغمبر ما جز کشندہ را و مرتد را	ہمارے پیغمبر کی شریعت میں سوائے قاتل، مرتد
و آنکہ باوجود زن با زن دیگر زنا کند	اور شادی شدہ زانی کے اور کسی کو قتل کرنا
دیگرے را کشتن بنیامدہ است" [۲]	نہیں آیا ہے۔

ضیاءالدین برنی نے اپنے باپ مؤیدالملک کی مجلسوں میں مختلف لوگوں کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ۔۔۔

عہد جلالی از نوادر عہود داشت و چگونہ	عہد جلال الدین خلجی عجیب و غریب عہد ہے کیسا
عہدیست کہ مکابرہ و مصادرہ و در	اچھا عہد ہے کہ اس میں جرمانہ، دوسروں کے مال
مال و اسباب دیگراں بازیدن و در	و اسباب سے کھیلنا لوگوں کے املاک و اوقاف
املاک و اوقاف مردماں دست زدن	میں تصرف کرنا، میراثِ گذشتگان اور ان
و در میراث گذشتگان و در ذخائر و	کے ذخائر و دفائن میں نظر ڈالنا۔

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۳۔ [۲] ایضاً۔ ایک اور موقع پر کہتا ہے: "من مردے مسلمانم و در مسلمانی بزرگ شدہ ام مسلماناں را نتوانم کشانید" اس کو اس سلسلہ میں "خشم خدا" کا بڑا خیال تھا اور قیامت کے دن سے ڈرتا تھا۔ (ص ۱۸۶) (ص ۱۸۵)

دفائن ایشاں نظر انداختن و بہ لت و چوب و بند و زنجیر از مسلماناں مال ستدن اصلا مشاہدہ نمی شود و از فرماندہان ایں عہد نامشروع گفتن و کردن از معائب بزرگ می نماید... و در بادشاہ جز حلم و خدا ترسی و در اعوان و انصار ملک جز علم و عقل و کرم و شفقت و بر احکام شریعت و معاملت کار کردن چیزے دیگر معائنہ نمی گردد" ؎۱

سخت سے سخت سزا دے کر اور قید کر کے مسلمانوں کا مال چھیننا۔ بالکل نظر نہیں آتا۔ اس عہدِ مبارک میں حاکموں کا خلاف شرع بات کہنا یا کرنا سخت عیب سمجھا جاتا ہے.... بادشاہ کے اندر حلم و خدا ترسی دکھائی دیتی ہے اور اس کے اعوان و انصار میں علم و عقل، کرم و شفقت احکام شریعت کی پابندی اور معاملہ داری پائی جاتی ہے۔

بلکہ برنی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جلال الدین خلجی کے زمانہ میں یہ حال ہو گیا تھا کہ

"اگر کسے غیر احکام شریعت و معاملت مردم آں زمانہ پیش آمدے آں کس مطعون شدے ولا اعتبار گشتے" ؎۲

اگر کوئی احکام شریعت اور معاملے کے خلاف کرتا نظر آتا تھا تو وہ مطعون اور ساقط الاعتبار ہو جاتا تھا۔

سلطان کے سیاسی نظریات

۶۸۹ھ (مطابق ۱۲۹۰ء) میں سلطان جلال الدین خلجی رنتھنبور کی مہم پر روانہ ہوا۔ کچھ عرصہ محاصرہ کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ جب تک کافی سپاہیوں کی قربانی نہ دی جائیگی قلعہ فتح نہ ہوگا، چنانچہ محاصرہ اُٹھا لیا اور دار السلطنت کو یہ کہتا ہوا واپس آگیا:۔

"من دہ ہمچو ایں حصار را در مقابلہ یک تار موئے مسلمانے روا ندارم و آں غنائم و اسباب و اموال در دنیا مرا چہ کار آید

میں اس جیسے دس قلعوں کو ایک مسلمان کے تارِ مو کے مقابلہ میں اچھا نہیں سمجھتا۔ بھلا ایسے غنائم اور اسباب و اموال دنیا میں میرے

؎۱ و ؎۲ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۲-۲۰۵۔

کہ بعد کشائیدن چندیں مسلمانان در دست	کس کام آئینگے کہ اتنے مسلمانوں کے قتل ہونے
من افتد واں لحظہ کہ زنان بیوہ گشتہ و	کے بعد میرے ہاتھ لگیں۔ جس وقت بیوہ عورتیں
اطفال یتیم شدہ کشتگان بیایند وپیش	اور مقتولوں کے یتیم بچے میرے پاس آکر کھڑے
من باستند ہرچہ من دریں حصار یافتہ	ہونگے اُس وقت اس قلعے سے جو کچھ مجھے حاصل
باشم نزدیک من تلخ تراز زہر گردد"[۵۱]	ہوا ہوگا، زہر سے زیادہ تلخ ہو جائیگا۔

یہ طرزِ فکر اُس عہد اور اُن حالات میں کچھ عجیب سا تھا۔ احمد چپ نے اس کو سلطان کی کم ہمتی پر محمول کرتے ہوئے کہا کہ بڑے فاتح یا تو کسی قلعہ کی تسخیر کا ارادہ کرتے ہی نہیں، لیکن اگر کر لیتے ہیں تو اس طرح واپس نہیں آتے۔ اس طرح سے تو بادشاہ کا رعب دلوں سے جاتا رہیگا۔ جلال الدین خلجی نے جواب میں ایک طویل تقریر کی جس میں اپنے سیاسی نظریات اور دینی رجحانات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:۔

"اے احمد! میں جانتا ہوں کہ بادشاہ اپنے اقتدار کا سکہ جمانے کے لیے کس طرح ہزاروں آدمیوں کو مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جب دور دراز اقالیم میں ہزاروں جانیں محاصرہ وغیرہ میں تلف ہو جاتی ہیں تو وہ مطلق کوئی غم نہیں کرتے .... برس گزر گئے کہ میرے سامنے متواتر بادشاہوں کی تاریخ پڑھی جا رہی ہے۔ جب سے بادشاہ ہوا ہوں اس وقت سے لے کر آج تک کوئی دن نہیں گزرتا کہ میں چند ورق تاریخ کے نہ پڑھتا ہوں۔ تو میری نظر میں بیٹے کی مانند ہے، لیکن مجھے اس طرح مشورہ دیتا ہے گویا حکومت کا طریقہ تجھے معلوم ہے، مجھے نہیں معلوم میں تجھے بتاتا ہوں کہ مسلمانی اور جو کچھ خدا اور رسول نے فرمایا ہے وہ دوسری چیز ہے اور جو کچھ جبابرہ اور فراعنہ نے کیا ہے وہ دوسری چیز ہے .... میں اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ جو کچھ پیغمبروں نے کہا ہے، بالکل سچ ہے۔ اور قیامت ایک

---

[۵۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۱۳-۲۱۴۔

دن آئیگی اور نیک و بد ہر چیز کا خدا کے سامنے جواب دینا ہو گا۔ جو کچھ جابروں اور ظالموں نے کیا ہے اس کی پرسش اُن سے ہو گی۔ اُن لوگوں کے اقتدار سے اگرچہ رعب اور ہیبت لوگوں کے دلوں پر قائم ہو سکتی ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی دائرۂ اسلام سے اس طرح باہر نکل جاتا ہے جس طرح آٹے سے بال نکال کر پھینک دیتے ہیں ... میں نے تجھ سے زیادہ کار ہائے ملکی کے متعلق سُنا ہے"۔

یہ سُن کر احمد چپ نے کہا کہ مجھے تو سلطان ہی کے کرم نے گستاخ بنا دیا ہے۔ میں جو بات ملک کے لیے مفید سمجھتا ہوں، خدمت عالی میں عرض کر دیتا ہوں۔ اگر خداوند عالم سلطان محمود اور سلطان سنجر کے طرز پر جو "پناہ دین محمدی" بھی تھے اور کشور کشائی بھی کرتے تھے، کام کریں تو کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔ یہ بات سُن کر سلطان ہنس پڑا اور کہنے لگا:

"اے احمد! تجھے غلط خیال ہے۔ سلطان محمود اور سلطان سنجر کے سلاح دار اور رکاب دار بھی ہم سے بہتر تھے، اور ہم سے بدرجہا زیادہ شرف رکھتے تھے۔ ہماری کہاں یہ ہمت ہو سکتی ہے کہ اس چندروزہ بادشاہی میں جو عاریتاً ہم تک پہنچ گئی ہے ان جہانبانوں اور جہانگیروں کے اتباع کا خیال بھی دل میں لائیں .... وہ بادشاہان اسلام دین پناہ اور دین پرور تھے۔ کیا تو نے نہیں سُنا کہ محمود کے تمام ملک میں جو کس قدر پھیلا ہوا تھا، ایک بے دین یا ایک بدمذہب بھی نہیں تھا۔ اور اس بادشاہ دیندار اور دین پناہ کی قوت اور شوکت کے باعث شعار اسلام آسمان تک پہنچ گئے تھے۔ بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ .... ہم میں کہاں یہ دم ہے اور کہاں بادشاہی کی وہ قوت اور شوکت ہمارے پاس ہے کہ جو کچھ سلطان محمود اور سلطان سنجر نے کیا تھا ہم بھی اس کے کرنے کا خیال دل میں لائیں۔ اے بیوقوف! اپنے آپ کو بزرجمہر سمجھتا ہے لیکن یہ نہیں دیکھتا کہ ہر روز ہندو جو خدا اور رسول کے سخت ترین دشمن ہیں اپنے سنکھ اور باجے بجاتے ہوئے، میرے محل کے نیچے سے

گزرتے ہیں، دریائے جمنا کے کنارے آکر بت پرستی کرتے ہیں، اور احکام شرک و کفر کو ہماری نظروں کے سامنے رواج دیتے ہیں، لیکن ہمیں یہ طاقت نہیں کہ اس کو روک سکیں ... ہماری دین پروری اور دین پناہی تو یہاں تک محدود ہے کہ جمعہ کے دن منبروں پر ہمارے نام کا خطبہ پڑھ لیا جاتا ہے اور خطیب دروغ گوئی سے کام لے کر ہم کو "حامی الاسلام" کے نام سے پکارتے ہیں"۔ [1]

اس کے بعد سلطان نے کہا کہ اس کی عمر اسی تک پہنچ گئی ہے، اُسے اپنی موت کا انتظار ہے اور وہ ایسے کام کرنے چاہتا ہے جو قیامت کے دن اس کے لیے منفعت بخش ہوں۔

منگولوں کی تبدیلی مذہب اور ہندوستان میں قیام

۶۹۱ھ / ۱۲۹۲ء میں ہلاکو کے پوتے عبداللہ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ جلال الدین خلجی نے اس کا مقابلہ کیا، لیکن چند ابتدائی معرکوں کے بعد مصالحت کی صورت پیدا ہوگئی۔ جلال الدین اور عبداللہ دونوں نے خلوص و محبت کا اظہار کیا اور عبداللہ نے جلال الدین کو باپ کہہ کر مخاطب کیا۔ اس کے بعد عبداللہ تو ہندوستان سے چلا گیا لیکن چنگیز کا ایک پوتا الغو یہاں رہ گیا اور چند امیران ہزارہ اور امیران صدہ کے ساتھ مسلمان ہوگیا۔ جلال الدین نے اپنی ایک لڑکی اس کے نکاح میں دیدی۔ نومسلم مغلوں کا یہ چھوٹا سا گروہ دہلی میں آباد ہوگیا۔ برنی نے لکھا ہے: ۔

"از سلطان مواجب و نوازش یافتند و	بادشاہ سے اُنہوں نے وظیفے اور انعام پائے۔
در عمرانات کیلوگھری و غیاث پور و اندرپت	اور کیلوگھری دغیاث پور اور اندرپت اور تلوکہ
و تلوکہ سراہا ساختند و ساکن شدند و	کی بستیوں میں اپنے مکانات بنا کر ساکن ہوگئے۔
آبادانیہائے ایشاں را مغل پور می گفتند" [2]	ان کی آبادیوں کو مغل پور کہا جاتا تھا۔

سلطان مجاہد فی سبیل اللہ کی حیثیت سے

ایک مرتبہ سلطان کے دل میں خیال آیا کہ اُس نے سالہا سال تک مغلوں سے جہاد کیا ہے، اگر اُسے خطبہ میں "المجاہد فی سبیل اللہ" کہا جائے تو بے محل

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۱۷-۲۱۸ [2] ایضاً ص ۲۱۸، ۲۱۹

نہ ہو گا۔ چنانچہ اُس نے ملکہ جہاں سے کہا کہ جب قضاۃ و صدور شہر تہنیت اور مبارکبادی کے لیے آئیں تو وہ اُن کو مشورہ دے کہ خطبہ میں "المجاہد فی سبیل اللہ" کہنا شروع کردیں اور اس کی اجازت سلطان سے حاصل کریں۔ ایک شادی کی مبارک باد کے سلسلہ میں جب صدور و بزرگان شہر دربار میں حاضر ہوئے تو ملکہ جہان نے وہ پیغام اُن تک پہنچوادیا۔ اور سب نے اس کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرلیا۔ قاضی فخرالدین ناقلہ نے جو اپنے عہد کے علّامہ تھے، اس مضمون کی ایک عرضداشت تیار کی لیکن جب جلال الدین کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو اس نے پرنم آنکھوں کے ساتھ یہ انکشاف کیا کہ خود اُس نے 'مادر محمود' (یعنی ملکہ جہاں) سے اس بات کے لیے کہا تھا اور اُسی کے ایما سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔

"بعد آں ہمدرداں سہ چہار روز اندیشہ کردم مرا یاد نیامد کہ من وقتے در عمر خویش بے شائبہ طمع و طلب صیتے للہ و فی اللہ تیغے زدہ ام و تیر طرف دشمنان خدا فرستادہ، و جہادے از برائے خدا کردہ وازیں آرزو کہ کردہ بودم ہمدردان ایام متاسف شدم و پشیمان گشتم کہ من ہر مقاتلہ کہ با مغل کردہ ام از برائے صیت و خود نمائی کردہ ام و مطلوب من دراں ناموری بودہ خاما چنانچہ بجہت اعلاء کلمۂ حق جہاد کنند و تمنائے شہادت متضمن آں بود ہمچناں جہاد نکردہ ام" [1]	میں نے اس کے بعد تین چار روز کے اندر غور کیا۔ مجھے یاد نہ آیا کہ میں نے عمر بھر میں کسی وقت بھی، شائبہ طمع اور طلب شہرت کے بغیر اللہ کے لیے تیغ زنی کی ہو یا دشمنان خدا کی طرف کوئی تیر پھینکا ہو اور برائے خدا کوئی جہاد کیا ہو۔ میں اپنی اس آرزو سے جو کی تھی اسی وقت شرمندہ تھا کیونکہ میں نے مغلوں سے جو مقابلہ کیا ہے وہ شہرت کی خاطر کیا ہے۔ اعلاء کلمۂ حق کے لیے تمنائے شہادت کے ساتھ جہاد نہیں کیا ہے

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۶ - ۱۹۷۔

اس کے بعد صدورِ شہر نے سلطان سے ہر چند اصرار کیا لیکن وہ رضامند نہیں ہوا۔ برنی نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ جلال الدین کے ظاہر و باطن کی یکرنگی اور صدق معاملات کا بہترین ثبوت ہے

سیدی مولا کا قتل

سیدی مولا کا قتل جلال الدین خلجی کے عہد کا ایک اہم واقعہ ہے وہ ایک عابد او زاہد بزرگ تھے۔ بلبن کے عہد میں "ولایت ملک بالا"[1] سے ہندوستان آئے اور پھر یہیں کے ہوگئے۔ دو تین دن اجودھن میں بابا فرید گنج شکرؒ کے مہمان رہے[2]۔ بابا صاحب نے ان کو رخصت کرتے ہوئے نصیحت کی تھی۔

سیدی در دہلی می روی۔ و می خواہی کہ	سیدی تم دہلی جا رہے ہو اور چاہتے ہو کہ وہاں
درے بکشائی۔ و باز نام پیدا آری۔ تو	دروازہ کھولو اور نام پیدا کرو۔ جو چیز اپنے حق
دانی ہرچہ دراں صواب و صلاح خود	میں درست، بہتر سمجھتے ہو اس کو تم جانو اپنے
بینی۔ ہم چناں بکنی۔ اما یک وصیت من	صوابدید کے مطابق ہی کر لینا لیکن میری ایک
نگاہ داری۔ با ملوک و امرا اختلاط نہ	وصیت کا خیال رکھنا اور وہ یہ ہے کہ ملوک و
کنی و آمد و شد ایشاں در خانۂ خود از	امراء کے ساتھ اختلاط نہ رکھنا اور اپنے گھر میں
مہلکات تصور کنی کہ ہر درویش کہ در	ان کی آمد و رفت کو مہلکات میں سے تصور
اختلاط با ملوک و امرا بکشاید عاقبت او	کرنا جو درویش، ملوک و امراء پر اختلاط کا دروازہ

[1] یہ نہیں معلوم کہ برنی کی مراد "ولایت ملک بالا" سے کونسا ملک ہے۔ مطہر نے اپنے قصائد میں "ملک بالا" کا ذکر کیا ہے اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں "ملک بالا" سے کونسے علاقے مراد لیے جاتے تھے لکھتا ہے

ہندوستاں سفر بسیار کردم ہر سوئے لیکن — ہوس دارم کہ یک چندے بہ بینم ملک بالا را
درآیم از حجاز اندر یمن زانجا سوئے مکہ — بہ بینم (مر) صفا و مروہ و عرفات و بطحا را (دیوان مطہر)

فرشتہ نے لکھا ہے کہ سیدی مولا جرجان سے ہندوستان آئے تھے (جلد اول ص ۹۲) لیکن میرا خیال ہے کہ وہ عرب تھے۔ محمد غوثی شطاری نے بھی ان کو عرب بتایا ہے (گلزار ابرار قلمی نسخہ) شیخ نظام الدین اولیاء کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رہے: "رسم عرب آنست کہ چوں کسے را بہ بزرگی یاد کنند سیدی گویند" (فوائد الفواد۔ ص ۲۵۴)

غالباً عربی نژاد ہونے کی بنا پر ہی وہ سیدی کہلانے لگے تھے۔

[2] برنی کے بیان (ص ۲۰۹) سے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ وہ بابا صاحبؒ کے یہاں بلا کسی خاص سبب یا ارادے کے دو تین دن مقیم رہے تھے۔ لیکن فرشتہ (جلد اول ص ۹۲) نے ملحقات عین الدین بیجاپوری (باقی بر صفحہ ۲۰۷)

وخیم گردد" ؎۱ کھولتا ہے اُس کا انجام خراب ہوتا ہے۔

لیکن سیدی مولا، دہلی آگئے، اور یہاں آکر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ بلبن کے عہد میں تو انہیں موقع نہیں ملا، لیکن اس کی وفات کے بعد جب کیقباد کی سہل گیری نے نظام حکومت میں ابتری پیدا کردی تو اُنہوں نے بھی ایک عظیم الشان خانقاہ قائم کرلی۔ رات اور دن بے شمار فقراء اور مساکین وہاں جمع رہنے لگے۔ دو ہزار من میدہ، پانسو من گوشت اور اسی حساب سے شکر اور دوسری چیزیں روزانہ لنگر میں خرچ ہوتی تھیں۔ جس طرح کا کھانا اس خانقاہ میں تقسیم ہوتا تھا ویسا امراء و ملوک کو بھی میسر نہیں آتا تھا۔ سیدی مولا کے عادات و اطوار کچھ عجیب تھے پانچ وقت کی نماز تو وہ پڑھ لیتے تھے لیکن نماز باجماعت کے پابند نہ تھے اور جمعہ میں بھی حاضر نہ ہوتے تھے، لیکن مجاہدہ اور ریاضت بہت کرتے تھے۔ ایک چادر میں لپٹے ہوئے اپنی خانقاہ میں بیٹھے رہتے تھے اور چاول کی نہایت ہی معمولی غذا استعمال کرتے تھے۔ نہ اُن کے پاس کوئی نوکر تھا نہ کوئی کنیز۔ خود تو ان کی زندگی اتنی سادہ اور بے تکلف تھی، لیکن دوسروں کے لیے بہت تکلیف اُٹھاتے اور بڑا اہتمام کرتے تھے۔ جس کسی کو روپیہ دینا ہوتا تو کہتے کہ فلاں طاق یا فلاں اینٹ کے نیچے سے نکال لو۔ اور وہاں سے ایسے چمکتے ہوئے سکے نکلتے تھے گویا اسی وقت ٹکسال سے ڈھل کر آئے ہیں۔ اکثر لوگ اُن کو کیمیاگر سمجھتے تھے؎۲ بعض جادوگر خیال کرتے تھے؎۳، کچھ کا خیال تھا کہ جن اور دیو اُن کے تابع ہیں؎۴۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ اُن کے خرچ کو دیکھ کر اُن کے ذرائع آمدنی کے متعلق اس بنا پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کبھی کسی سے فتوح قبول نہیں کرتے تھے۔ ان کی بزرگی کی شہرت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور بالآخر اُن کی مقبولیت

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۶) کی سند پر یہ لکھا ہے کہ وہ "بقصد زیارت شیخ فریدالدین شکر گنج بہ ہندوستان شتافت"

(نوٹ صفحہ ہذا) ؎۱ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۹۔ ؎۲ ایضاً ص ۲۰

؎۳ فتوح السلاطین ص ۲۱۶، اخبار الاخیار ص ۷۳۔ ؎۴ ایضاً ص ۲۱۶

یکے گفت "ایں صاحب کیمیاست | وگر نے چنیں زر برو از کجاست؟
دگر گفت "دیوش مسخر شدست | ازاں خان و مانش پُر از زر شدست"

کا یہ حال ہو گیا کہ ہزاروں امراء اور اعیان مملکت اُن کے عقیدتمندوں میں شامل ہو گئے۔ جلال الدین خلجی کا بڑا بیٹا خانخاناں بھی تو اُن کا مُنہ بولا بیٹا بن گیا۔ اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہنے لگا۔ جس طرح کی مادی آسائشیں سیدی مولا اپنے متوسلین اور متعلقین کے لیے فراہم کرتے رہتے تھے اُن کا لازمی نتیجہ تھا کہ بعض ایسے لوگ بھی اُن کے گرد جمع ہو جائیں جن کا مقصد نہ روحانی سعادت حاصل کرنا ہو، نہ محض پیٹ بھرنا۔ بلکہ جو اس ماحول کو سیاسی سازشوں کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہوں۔ چنانچہ اس قماش کے بہت سے لوگ جن میں قاضی جلال الدین کاشانی، ہتھیا پائک اور برنجن تن، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اُن کی خانقاہ میں بہت رات گئے تک حاضر رہنے لگے۔ قاضی جلال مشہور قاضیوں میں تھا، لیکن طبیعت کا مفسد تھا۔ ہتھیا پائک اور برنجن تن عہد بلبنی کے معروف لوگوں میں تھے، لیکن جلال الدین نے ان کو معزول کر دیا تھا اور وہ اس بنا پر سلطان سے ذاتی پرخاش رکھنے لگے تھے۔ ان سب لوگوں نے مل کر ایک سازش کا جال پھیلایا اور یہ طے کیا کہ سلطان جب جمعہ کی نماز کے لیے نکلے تو ہتھیا پائک اور برنجن تن اس کو قتل کر دیں، اور سیدی مولا کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ سیدی مولا کی خاندانی حیثیت مضبوط بنانے کے لیے یہ طے کیا گیا کہ سلطان ناصر الدین کی دختر سے اُن کی شادی کر دی جائے، اور اُن کو دہلی میں "خلیفہ" بنا دیا جائے۔ ایک شخص نے جو اس سازش میں شریک تھا، سلطان کو صورت حال سے مطلع کر دیا۔ جلال الدین نے سیدی مولا اور ان کے جملہ متوسلین اور لواحقین کو گرفتار کر کے دربار میں بلوا لیا[1] اور حالات دریافت کرنا چاہے، لیکن سب منکر ہو گئے۔ جلال الدین نے

[1] عصامی نے اس واقعہ کی تفصیل برنی سے کچھ مختلف دی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ سلطان مندوور میں تھا جب اس کی غیر موجودگی میں کچھ "خرقہ پوشان خام" نے جو سیدی مولا سے حسد رکھتے تھے، تہمت لگا کر ان کو گرفتار کرا دیا تھا۔ اور یہ سب کچھ ارکلی خاں کی مدد سے ہوا تھا۔ اور سیدی مولا کو سلطان کی اجازت کے بغیر سزا دی گئی تھی ؎

ہماں ارکلک خانِ خود کامہ مرد ‏ ‏ ‏ شنیدم کہ در خونِ او سعی کرد

کشانید آں مرد را بے گناہ ‏ ‏ ‏ گناہے قوی کرد بے اذنِ شاہ

(فتوح السلاطین، صفحہ ۲۱۳)

جنگل میں آگ جلوائی اور کہا کہ یہ لوگ اس آگ سے گزریں، اگر سچے ہیں تو آگ سے انہیں کوئی نقصان نہ ہوگا، اگر جھوٹے ہیں تو جل کر خاک ہو جائیں گے۔ علماء و مشایخ نے سزا کے اس طریقہ کو ناجائز قرار دیا اور کہا کہ آگ بالطبع جلانے والی ہے سچے اور جھوٹے دونوں کو یکساں جلا دیگی۔ چنانچہ سلطان نے یہ ارادہ ترک کر دیا، اور قاضی جلال کو بدایوں بھیج دیا، اور دیگر ملزمین کو دارالسلطنت سے دور علاقوں میں پھینک دیا۔ پھر سیدی مولا سے مختلف قسم کے سوالات کیے گئے اور یہ کوشش کی گئی کہ وہ اقبال جرم کرلیں، لیکن وہ برابر اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے رہے۔ اس مجمع میں شیخ ابوبکر طوسی حیدری معہ اپنے حیدری قلندروں کے موجود تھے۔ سلطان نے اُن کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۸) یحیی سرہندی نے اس واقعہ کے متعلق کچھ اہم تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ لکھا ہے کہ سیدی مولا پر جو کچھ الزام لگایا گیا تھا وہ ملک الغو کا تراشا ہوا تھا، اور اسی نے سلطان کو سیدی مولا اور ان کے ساتھیوں کو قید کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس اطلاع کے تیسرے دن جمعہ کو محضر طلب کیا گیا اور اکابر و صدور دہلی کو دعوت دی گئی۔ سیدی مولا اور اُن کے ساتھی بھی لائے گئے۔ سلطان نے اُن کی طرف مخاطب ہو کر کہا "درویشاں را در کار مملکت و امور سلطنت چہ گذر؟" شیخ نے بتایا کہ یہ سب بہتان ہے، دوسرے ساتھیوں نے بھی بے گناہی کا عذر کیا۔ سلطان نے غصہ میں امیر ہندو کی طرف مخاطب ہو کر کہا، ایک بار تو نے بغاوت کی تھی تو میں نے معاف کر دیا تھا، اب کیا کہتا ہے؟ امیر ہندو نے جواب دیا کہ جب بغاوت کی تھی تو جان بخشی کر دی تھی، خدا کی قسم اب بے گناہ قتل کیا جا رہا ہوں "اگر فرمان شود دب کنم" اس کے بعد سلطان نے درویشوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا "شما چرا بر سیدی مولا ماجرائی کنید۔" دو قلندر اور ایک حیدری چاقو نکال کر آگے بڑھے اور سیدی مولا کو داڑھی پکڑ کر زمین پر گرالیا اور "سوزن جوالقیاں" ان کے پہلو میں چھانی شروع کیں۔ ایک سنگ مرہ پڑا تھا اس کو اُٹھا کر سیدی پر مارا۔ اسی دوران میں ارکلی خاں نے فیلبان کو اشارہ کیا اور ہاتھیوں نے سیدی مولا کے جسم کو پارہ پارہ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے ایک ماہ قبل سیدی مولا رات دن یہ اشعار پڑھ کر ہنسا کرتے تھے۔

در مطبخ عشق جز نکو را نکشند — لاغر صفتاں و زشت خو را نکشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز — مردار بود ہر آنچہ او را نکشند

اس واقعہ کے تیسرے دن سلطان نے حکم دیا کہ باقی طائفہ کو نذر آتش کر دیا جائے۔ لیکن ارکلی خاں دستارچہ گردن میں ڈال کر سلطان کے پاس گیا اور اس کے پیروں پر گر کر شفاعت کی۔ چنانچہ سلطان نے باقی سب ملزموں کی جان بخشی کر دی۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۶۵-۶۶، ۷۔ (نوٹ ملے صفحہ ہذا بر صفحہ ۲۱۰)

"اے درویشاں انصاف من ازیں مولا بستانید" ۱؎	اے درویشو! سیدی مولا سے میرا انصاف چاہو۔

سلطان کی زبان سے اس جملہ کا نکلنا تھا کہ بجری نامی ایک حیدری قلندر آگے بڑھا اور استرے اور جوال دوز سے سیدی مولا کو زخمی کرنا شروع کر دیا۔ ارکلی خاں نے کوشک کے اوپر سے پیلبانوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے سیدی مولا کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈال کر روند ڈالا۔

عصامی اور برنی دونوں نے لکھا ہے کہ سیدی مولا کے قتل کے بعد غیر معمولی واقعات رونما ہوئے اور عہدِ جلالی کا زوال شروع ہو گیا۲؎۔ برنی کا بیان ہے:

"و من کہ مؤلف ام یاد دارم کہ روز قتل	مجھ مؤلف کو خوب یاد ہے کہ سیدی مولا کے قتل والے
سیدی مولا بادے سیاہ برخاست کہ	دن ایک ایسا سیاہ بادل اُٹھا کہ دنیا تاریک
عالم تاریک شد و بعد قتل سیدی مولا	ہو گئی اور سیدی مولا کے قتل کے بعد جلال الدین
مُلک جلالی در فتور گرفت کہ بزرگان گفتہ	کے ملک میں خلل آ گیا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ
اند درویش کشتن شوم باشد و ہیچ	درویش کا قتل کرنا بدبختی ہے، کسی بادشاہ کو
بادشاہ را نیکو نیامدہ است، و ہم در آں	راس نہیں آتا۔ سیدی مولا کے زمانۂ قتل کے
نزدیکی کہ مولا کشتہ شد امساک باراں	بالکل متصل بارش ہونی موقوف ہو گئی اور
شد و در دہلی قحط افتاد و غلہ بیک جیتل	دہلی میں قحط پڑ گیا۔ غلہ ایک جیتل کا ایک سیر ہو
سیرے رسید و در زمین سوالک قطرہ	گیا۔ سوالک میں بارش کا ایک قطرہ نہ برسا وہاں
باراں نہ چکید، ہندواں آں زمین با	کے ہندو اپنے بیوی بچوں سمیت دہلی میں آتے
زن و بچہ در دہلی می آمدند و بستگان بہ	تھے اور بیس بیس تیس آدمی ایک جگہ جمع ہو کر

(نوٹ صفحہ ۲۰۹) ۲؎ شیخ ابوبکر طوسی ؒ دہلی کے مشہور بزرگوں میں تھے (مختصر حال کے لیے ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۳۷) وہ قلندروں کے حیدری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ (حیدریوں کا مختصر حال فوائد الفواد ص ۱۹، ۲۰ میں دیکھا جا سکتا ہے)

(نوٹ صفحہ ہذا:) ۱؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۱۰

۲؎ محمد بہادر فانی نے لکھا ہے: "از شامت آں خاندان جلالی ابتر و پریشان شد" تاریخ محمدی ۳۷۶ - الف

سی یکجا می شدند و در گرسنگی خود را در آب | بھوک کی وجہ سے اپنے آپ کو دریائے جمنا میں
جمن می انداختند و غرق می شدند[1] | ڈال دیتے تھے اور غرق ہو جاتے تھے۔

عصامی نے اس قحط کا نہایت ہی دردناک نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ جب دو سال تک پانی کا ایک قطرہ آسمان سے نہیں گرا تو شہر کے علماء اور فقراء نماز استسقاء کے لیے نمازگاہ دہلی میں جمع ہوئے

گروہے فقیہانِ احکام دیں | گروہے فقیرانِ گوشہ نشیں
برآوردہ دستے بہ سوئے ہوا | بہ زاری ہمی کرد ہر یک دعا

ایک قاضی عالم جو دیوانہ مشہور تھا، اس موقع پر آگے بڑھا اور منبر پر چڑھ کر لوگوں سے اس طرح مخاطب ہوا ؎

بدانید کیں فتنہ از جرم ماست | گمانِ غلط بر درِ حق خطاست
گراز ما نگردد گنہ آشکار | نیاید عتاب از درِ کردگار

سب نے نہایت ہی خشوع و خضوع سے دعا مانگی اور اپنے گناہوں سے توبہ کی۔ جب کہیں دہلی میں پانی برسا اور قحط دور ہوا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے۔

"سلطان جلال الدین را بہ مشاہدہ ایں حال | سلطان جلال الدین کو ان حالات کا مشاہدہ
باوے اعتقادے کہ نبود پیدا شد"[2] | کر کے اُن کے ساتھ وہ اعتقاد جو پہلے نہ تھا اب پیدا ہو گیا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ گو اس قسم کے حادثات و واقعات سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا، چونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ سب محض اتفاقات ہوں، لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے بعض اس قسم کے واقعات دیکھے ہیں[3] ــــــ یہ تمام مصائب سیدی مولا کے قتل کی وجہ سے رونما ہوئے ہوں یا کسی دوسرے سبب سے، لیکن برنی اور عصامی کے بیانات سے اس زمانہ کے لوگوں کی

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۱۲ [2] اخبار الاخیار ص ۸۳ [3] منتخب التواریخ جلد اول ص ۱۷۳

ذہنیت اور نفسیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے!

شیخ نظام الدین اولیاءؒ اور سلطان | سلطان جلال الدین خلجی کے زمانہ تک شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں فتوح کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اور وہ اپنے تمام مریدوں کے ساتھ نہایت تنگی اور عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بعض اوقات پوری پوری فصلیں گزر جاتی تھیں اور خربوزہ کی ایک قاش تک چکھنے کو نہ ملتی تھی، حالانکہ خربوزہ ان دنوں ایک جیتل کا من بھر ملتا تھا۔ شیخ کے تمام متعلقین اور مریدین پیہم روزے رکھتے تھے اور بڑی دشواری سے وقت کاٹتے تھے۔ سلطان جلال الدین خلجی کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو کچھ تحائف شیخ کی خدمت میں بھیج کر یہ درخواست کی کہ اگر آپ کا حکم ہو تو ایک گاؤں خدمت گاروں کے لیے مقرر کردوں۔ سلطان المشائخ نے جواب دیا: "مجھے اور میرے خدمت گاروں کو تمہارے گاؤں کی چنداں ضرورت نہیں، میرا اور ان کا خدا کارساز اور رہبر ساماں ہے"۔ لکھا ہے کہ جلال الدین نے چند بار سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی لیکن انہوں نے ہر بار ملنے سے انکار کردیا۔ بالآخر اس نے بلا اطلاع شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام بنایا اور امیر خسروؒ کو جو اس کے مصحف دار تھے[۱]، اس کی اطلاع کردی۔ امیر خسروؒ شیخ کے محبوب ترین مریدین میں تھے۔ انہوں نے یہ بات مناسب نہ سمجھی کہ اپنے مرشد سے سلطان کا ارادہ پوشیدہ رکھ کر ان کے رنج کا سبب بنیں۔ چنانچہ انہوں نے شیخ کو اس کی اطلاع کردی اور وہ ملاقات سے بچنے کے لیے اجودھن روانہ ہوگئے۔ سلطان کو جب اس کا علم ہوا تو امیر خسرو سے خفا ہو کر کہا:

تو سرِ ما کشف کردی و از سعادت پائے	تو نے میرا بھید کھول دیا اور سلطان المشائخ کی
بوسی سلطان المشائخ محروم گردانیدی	پائے بوسی کی سعادت سے محروم کردیا۔

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۸، امیر خسروؒ نے سلطان کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کی مہمات کی تفصیل ایک مختصر سی مثنوی مفتاح الفتوح میں دی ہے۔ لیکن یہ مثنوی جیسا کہ انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے، بے حد صاف اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہے، اور شاعرانہ خوبیوں میں دوسری مثنویوں کو نہیں پہنچتی۔

امیر خسروؒ نے جواب دیا:-

"از رنجش بادشاہ ہمیں خوف جان باشد	بادشاہ کے رنجیدہ ہونے سے بس خوف جان ہی
فاما از رنجش سلطان المشائخ خوف	ہے، لیکن رنجش سلطان المشائخ سے سلب
سلب ایمان باشد"	ایمان کا خطرہ تھا۔

جلال الدین خلجی نے اس جواب کو پسند کیا۔[1]

تصویر کا دوسرا رُخ | جلال الدین خلجی اپنی پیرانہ سالی اور گہری مذہبیت کے باوجود ایک زندہ دل انسان تھا۔ عیش و طرب کا شوق رکھتا تھا۔ اس کے امراء کہا کرتے تھے کہ بادشاہ سے شعر کہنے، شعر سننے اور شطرنج کھیلنے کے سوا آتا ہی کیا ہے۔ اس کی مجالس نشاط کی تصویر برنی نے بڑے دل سے کھینچی ہے اور اس کی ایک ایک تفصیل کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دربار کا پورا ماحول آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک طرف تاج الدین عراقی، امیر خسروؒ، موید جاجرمی، پسر ایبک دعاگو، موید دیوانہ، صدر عالی، امیر ارسلاں کلاہی، اختیار باغ اور تاج خطیب اس کے ندیم تھے، جو سخن سنجی اور علم تاریخ اور آداب ملوک میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، تو دوسری طرف ہیبت خاں، نظام خریطہ دار وغیرہ اس کے ساقیان مجلس تھے جن کے حسن و جمال کا عالم یہ تھا کہ

"ہر زاہدے و عابدے کہ نظر در روئے	جو زاہد و عابد اُن کے چہرے کا مشاہدہ کرتا زنار
ایشاں کردے زنار درمیان بستے و مصلا	باندھ لیتا تھا اور مصلا کو بوریائے خمار خانہ بنا
را بوریائے خمار خانہ ساختے و سبوئے خماراں	لیتا تھا سبوئے خماراں کھینچتا تھا اور ان توبہ
بر کشیدے و در عشق اں بے بدلاں توبہ شکن	شکن حسینوں کے عشق میں رسوا ہوتا تھا۔
فضیحت و رسوا شدے"[2]	

پھر کچھ مطربان مجلس تھے جن میں نصرت بی بی اور مہر افروز کے غمزہ و ادا کی دور دور شہرت تھی۔

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۳۵۔ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۹۔

امیر خسرو ہر رات کوئی غزل لکھ کر لاتے تھے اور دربار میں "درحالت نوشانوش" یہ غزلیں عجیب کیفیت پیدا کر دیتی تھیں۔ برنی اپنی پیرانہ سالی میں جب ان "جوانان جاں نواز" و "مہ پیکران مایۂ ناز" کا حال لکھنے بیٹھا تو یادِ ماضی نے اُس کا دل بے چین کر دیا اور وہ یہ سوچنے لگا کہ

"نوحہ کناں وجامہ دراں وسر وریش کناں بروم و در زیر پاے گور ایشاں جاں دہم"[1]

یحییٰ سرہندی نے سلطان کی ایک رباعی نقل کی ہے، جس سے اس کے شاعرانہ جذبات پر روشنی پڑتی ہے ؎

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم	واں روئے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی	ہاں بانگ بلند است ایں پوشیدہ نمی خواہم[2]

برنی نے لکھا ہے :-

سلطان جلال الدین بادشاہے ہنر شناس و ہنر پرور بود و طبع موزوں داشت و توانستے کہ دوبیتے و غزلے بگوید"[3]	سلطان جلال الدین، ہنر شناس اور ہنر پرور بادشاہ تھا۔ طبع موزوں رکھتا تھا اور یہ صلاحیت اس کے اندر تھی کہ چند شعر یا غزل کہہ لیتا تھا۔

جلال الدین کا قتل جلال الدین انتہائی حسرتناک حالات میں قتل ہوا۔ رمضان کے مہینے میں وہ اپنے بھتیجے اور داماد علاء الدین سے ملنے کے لیے کڑہ گیا تھا۔ افطار کا وقت قریب تھا اور کشتی میں قرآنِ پاک کی تلاوت سے ابھی فارغ ہوا تھا کہ نصرت خاں کے اشارہ پر محمود سلیم نے اس پر حملہ کیا۔ لیکن وار خطا ہو گیا اور اس کا اپنا ہی ہاتھ زخمی ہو گیا۔ پھر دوسرا حملہ کیا تو سلطان کشتی کی طرف یہ کہتا ہوا دوڑا: "علاء بدبخت چہ کردی"۔ اسی اثناء میں اختیار الدین ہود نے دوڑ کر سلطان کو زمین پر گرا لیا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ برنی نے لکھا ہے :

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۰۔ [2] تاریخ مبارک شاہی ص ۶۵، منتخب التواریخ جلد اول ص ۱۸۲
[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۷۔

شنیدم کہ سلطان جلال الدین درحالت سر بریدن دو کلمۂ شہادت گفت و نزدیک افطار بدولت شہادت رسید"	میں نے سنا ہے کہ سلطان جلال الدین نے سر کٹتے وقت کلمۂ شہادت پڑھا اور افطار کے وقت دولت شہادت کو پہنچا۔

اس قتل پر اپنے غم اور غصہ کا اظہار کرتے ہوئے برنی لکھتا ہے:۔

"آہ صد ہزار آہ وافسوس ہزار افسوس کہ برسر چنیاں کافر نعمتاں مکابرو برچنیاں حرام خواراں بے شرم در ساعت حرام خوارگی در زمان گندہ نمکی از آسمان قہر باری تعالیٰ سنگ نبارید وشعلہ ہائے آتش سقر زندہ از زمین زیر پائے ایشاں برنیایدواں جمع حرام خوار گندہ نمک سنگدل نامسلماں رانیست و پست نگردانید..."[1]	آہ اور صد ہزار آہ۔ افسوس اور ہزار افسوس کہ ایسے ایسے کفرانِ نعمت کرنے والوں اور بے شرم حرام خوروں پر اُن کی نمک حرامی کرتے وقت قہر خداوندی کے باعث آسمان سے پتھر کیوں نہیں برسے اور آتش دوزخ کے شعلے اُن کے پاؤں کے نیچے سے کیوں نہ برآمد ہوئے اور کیوں نہیں اس حرام خور نمک حرام سنگدل نامسلمان گروہ کو تہ و بالا کردیا گیا...

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۳۶ -

بابِ ہفتم

سلطان علاء الدین خلجی

سلطان علاء الدین خلجی کے عہدِ حکومت کو سلطنت دہلی کی سیاسی اور تمدنی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی اور روحانی دونوں ادارے مشکلات و مصائب کی ابتدائی منزلوں سے گزرنے کے بعد ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں اُن کے اثرات اور افادیت کا جائزہ صاف طور پر ممکن تھا۔ ایلتمش اور بلبن نے جس عمارت کی بنیادیں رکھی تھیں، اس کو علاء الدین نے اپنے تدبر اور صلاحیت جہانبانی سے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا تھا۔ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار شمالی ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی طاقت نے تسلیم کر لیا تھا اور حکومت کا اصلاحی ہاتھ اب شہروں سے گزر کر دیہاتوں میں کاشتکاروں کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔ روحانی دنیا میں جس چراغ کو خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں کے درمیان روشن کیا تھا، اس کی ضیا پاشیوں نے ہزاروں تیرہ و تاریک زندگیوں میں اُجالا کر دیا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ سے حقیقت و معرفت کے چشمے اُبل رہے تھے۔ محلاتِ شاہی میں اگر مسلمانوں کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے نظارے دکھائی دیتے تھے تو غیاث پور میں وہ "شاہنشۂ بے سریر و بے تاج"[۱] جلوہ افروز تھا جس کے جمال جہاں آرا نے دہلی کو بقول برنی "رشکِ بغداد، غیرتِ مصر، ہمسرِ قسطنطنیہ، موازی

---

[۱] مثنوی لیلیٰ مجنوں میں امیر خسروؒ اپنے مرشد کے متعلق لکھتے ہیں:-

شاہنشہِ بے سریر و بے تاج　　شاہانش بخاکِ پائے محتاج

بیت المقدس[1]" بنا دیا تھا۔ ساری فضائیں امیر خسروؒ کے ان قصیدوں سے گونج رہی تھیں[2]

خوشا ہندوستان و رونقِ دیں | شریعت را کمالِ عزّ و تمکیں
زعلم با عمل دہلی بخارا | زشاہاں گشتہ اسلام آشکارا
مسلمانانِ نعمانی روش خاص | زدل ہر چار آئیں را با خلاص
نہ کیں با شافعی نے مہر با زید | جماعت را و سنت را بجاں صید[2]

ایک طرف "فقر" تھا، دوسری طرف "شاہی" —— دونوں کے طریقۂ کار مختلف تھے اور دائرۂ عمل بھی مختلف لیکن اُن کی کوششوں کا نتیجہ ایک ہی نکلا۔ برنی کا بیان ہے :۔

"سبحان اللہ عجب ایامے و بوالعجب روزگارے	سبحان اللہ! عجیب دن اور عجیب زمانہ تھا جو
کہ در دہ سال آخر عہد علائی خلق رامشاہدہ	علاء الدین خلجی کی حکومت کے آخری دس سال
افتاد کہ از طرفے سلطان علاء الدین از	میں نظر آیا یعنی ایک طرف سلطان نے اپنے
جہت صواب و صلاح ملک خود جمیع	ملک کی فلاح اور بہبودی و اصلاح کے لیے
مسکرات و مناہی و اسباب فسق و فجور	تمام نشہ آور چیزیں، ممنوعات اور فسق و فجور کے
بہ قہر و غلبہ و تعزیر و تشدید و بند و زنجیر	تمام اسباب، جبر و قہر اور تشدد و سخت گیری
منع می کرد . . . و از طرف دیگر ہمدراں	کے ساتھ روک دیے تھے . . . . دوسری
ایام شیخ الاسلام نظام الدین در بیعت	طرف انہی دنوں میں شیخ الاسلام نظام الدینؒ
عام کشادہ بود و گناہگاراں را خرقہ و	نے عام بیعت کا دروازہ کھول رکھا تھا اور
توبہ میداد و بارادتِ خود قبول می کرد و	گنہگاروں کو خرقہ و توبہ عطا فرماتے اور اپنی مریدی
خاصا و عاما و غنیا و مفلسا و ملکا و فقیرا	میں قبول کر لیتے تھے اور ہر شخص کو خواہ خاص ہو
و متعلما و جاہلا و شریفا و سوقیا و	یا عام، مالدار ہو یا مفلس، ملک ہو یا فقیر، متعلم ہو
مصریا و روستائیا و غازیا و مجاہدا	یا جاہل، شریف یا بازاری، شہری ہو یا گنوار،

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۱ [2] دول رانی خضر خاں۔ ص ۴۶-۴۷۔

داحرار و عبید اً طاقیہ و توبہ و مسواک پاکی
می فرمود و جماہیر طوایف مذکور از آنکہ خود
را مرید خدمت شیخ می دانستند از بسیاً
ناکردنیہا دست می داشتند و اگر کسے
را از درآمدگان در شیخ لغزشے افتادے
باز بہ تجدید بیعت کردے و خرقہ توبہ
ستدے و شرم مریدی شیخ خلق را از
بسیاری منکرات سراً و علانیۃً مانع
می شد و خلق عامہ تقلیداً و اعتقاداً در
طاعت و عبادت رغبت نمودہ بودند
.... و دلہائے خواص و عوام نیکی و
نیکوکاری گرائیدہ و حاشا و کلا در چند
سال آخر عہدِ علائی نام شراب و شاہد
و فسق و فجور و قمار و فحش و لواطت و
بچہ بازی بر زبان اکثر مردمان گذشتہ
باشد" ؎

غازی اور مجاہد ہو، آزاد ہو یا غلام، سب کو
طاقیہ اور پاکی کی مسواک عطا فرماتے تھے اور
توبہ کی تلقین کرتے تھے۔ اور سب لوگ چونکہ
اپنے آپ کو حضرت کا مرید اور خدمت گزار سمجھتے
تھے اس لیے بہت سے ناکردنی باتوں سے پرہیز
کرتے تھے۔ اگر حضرت کے یہاں آنے والوں میں
سے کسی سے کوئی لغزش ہو جاتی تھی تو وہ پھر
بیعت کی تجدید کر کے توبہ کا خرقہ لیتا تھا اور حضرت
سے مرید ہونے کی شرم بہت سے لوگوں کو کھلم کھلا
یا چھپے چوری بہت سے منکرات کے ارتکاب سے بچاتی
تھی اور خلق خدا عام طور پر تقلیداً اور اعتقاداً
طاعت اور عبادت کی طرف رغبت رکھتی تھی خواص
اور عوام کے دلوں میں نیکی اور نکوکاری نے جگہ پکڑ
لی تھی۔ حاشا و کلا جو علاءالدین کے عہد کے آخری
چند سالوں میں کہیں شراب و شاہد فسق و فجور، قمار
فحش، لواطت، بچہ بازی وغیرہ کا نام بھی لوگوں کی
زبان پر گزرا ہو۔

اسلامی ہند کے اس دور میں حکمرانی کرنے والے سلطان کے مذہبی معتقدات و رجحانات کے متعلق بے شمار غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ علاءالدین خلجی کے متعلق برنی کے بیانات پر غور کرنے سے قبل خود برنی کے رجحانات، مذہبی معتقدات و نظریات پر

؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۳-۳۴۶۔

غور نہیں کیا گیا۔ حالانکہ صورت یہ ہے کہ جب تک برنی کے دینی شعور، سیاسی تصورات، پایان عمر کی تلخیوں اور اُن سے پیدا شدہ اثرات کو ذہن میں نہ رکھا جائیگا اس کے بیانات کا صحیح تجزیہ دشوار ہے۔ بعض مورخین نے تو پہلے سے قائم کیے ہوئے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے برنی کے جملے سیاق و سباق سے علیحدہ بیان کیے ہیں اور اس طرح خود برنی کا مافی الضمیر بھی غلط سمجھا گیا ہے۔

برنی کے ذہن میں بعض سماجی تعصبات کام کر رہے تھے۔ وہ خاندانی نجابت و شرافت کا قائل تھا اور چاہتا تھا کہ شریف و رذیل کے امتیازات قائم رکھے جائیں۔ علاء الدین اور محمد بن تغلق نے ذات و نسل کے یہ سب امتیازات مٹا دیے تھے۔ ان دونوں کی نظر میں "ذاتی قابلیت" سب سے بڑا معیار تھی۔ یہ چیز برنی کے بنیادی سماجی تصورات سے ٹکراتی تھی اور اس بناء پر یہ دونوں سلطان اس کی نظر سے گر گئے تھے۔

برنی کے سوا کسی معاصر مورخ یا تذکرہ نویس نے علاء الدین خلجی کی مذہب سے بے تعلقی کا شکوہ نہیں کیا۔ امیر خسروؒ، امیر حسنؒ، عصامی اور وصاف نے اس کی "دین پروری" "دین داری" اور "پاس شریعت" کی تعریف کی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر برنی کے بیانات کو بھی مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے اور عہد علائی کی جو تصویر اس نے پیش کی ہے اسے نظر کے سامنے رکھا جائے تو سلطان کے مذہبی افکار و رجحانات کے متعلق جو خیالات عام طور پر مشہور ہو گئے ہیں، اُن کا بے بنیاد ہونا پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

نیا مذہب جاری کرنے کا ارادہ سلطان علاء الدین کے ابتدائی زمانہ کا سب سے اہم واقعہ نئے مذہب کے اجراء کا ارادہ ہے۔ برنی نے لکھا ہے کہ جب علاء الدین کی فوجیں فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتی ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئیں اور جب دولت کی ہر طرف سے فراوانی ہوئی اور سلطان کے اقتدار کا سکّہ جم گیا تو دولت و قوت کے اس نشہ نے اس کا دماغی توازن خراب کر دیا اور اُس نے ایک نیا مذہب جاری کرنے کی تدبیروں پر سوچنا شروع کر دیا۔

برنی نے لکھا ہے کہ سلطان اکثر اپنی شراب کی مجلسوں میں اس ارادہ کا ذکر کیا کرتا تھا۔[1] بعض مصنفوں کا خیال ہے کہ مذہب کے جاری کرنے کے متعلق اس کے خیالات محض سطحی تھے[2] لیکن برنی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس ارادہ کے متعلق مجالس شراب کے علاوہ بھی مشورہ کیا کرتا تھا۔ لکھتا ہے:۔

"در مجلس شراب بگفتے۔ و در پیدا آوردن دین و مذہب علیحدہ با ملوک مجلس مشورت کردے و از حاضران بپرسیدے کہ چگونہ چیزہا پیدا باید آورد تا نام من دامن قیامت گیرد"[3]

مجلس شراب میں کہتا اور دین و مذہب کی ایجاد کے بارے میں امراء کے ساتھ مشورے کرتا اور حاضرین سے پوچھتا تھا کہ کس طرح ایسی چیزیں کرنی چاہئیں جن سے میرا نام قیامت تک رہے۔

بعض مصنفوں کا خیال ہے کہ سلطان کے یہ خیالات اس کے مخصوص مصاحبوں تک محدود رہے[4] لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ برنی نے بتایا ہے کہ سلطان کے اس ارادے کی خبر عوام تک پھیل گئی تھی[5] اور مسلم سوسائٹی کے مختلف حلقوں میں مختلف قسم کے اثرات پیدا ہو گئے تھے۔ اور ہر طبقہ نے اپنی فکر اور اپنی ہمت کے مطابق تشویش کا اظہار کیا تھا۔ لکھا ہے:۔

بعضے بزرگان شہر بخندیدندے و بر جہل و حمق او حمل کردندے، و بعضے دانایان بترسیدندے و با یک دیگر بگفتندے کہ ایں مرد فرعون صفت است و علمے

شہر کے بعض بزرگ ہنستے اور بادشاہ کی جہالت وحماقت پر اس کو محمول کرتے تھے اور بعض عقلمند ڈرتے اور آپس میں کہتے تھے کہ شخص فرعون صفت ہے اور علم اور واقفیت رکھتا

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۳۔

[2] R.P. Tripathi : Some Aspects of Muslim Administration p. 49

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۳۔

[4] I.H. Qureshi : Administration of the Sultanate of Delhi p. 45

[5] "در شہر منتشر شدہ بود" تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۴۔

وخبرے ندارد و گنجہائے بسیار کہ دیدۂ
حکما را کور کند تا بدیدہ بے خبران و غافلان
چہ رسد بدست ایں بے خبر افتادہ است
کہ اگر شیطان راہ و روشے کثیر بر خلاف
دین در دل او القا کند و ایں مرد در
تلقین کردن آں بے راہی آدمی شصت
و ہفتاد ہزار بکشد حال مسلمانان و مسلمانی
چہ باشد و چہ شود" [1]

نہیں ہے او بہتیرے خزانوں کا مالک ہے جو
حکماء کو بھی اندھا کر سکتے ہیں پھر بے خبر اور
غافل لوگوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اگر شیطان
نے دین کے خلاف کوئی راہ و روش اسے
بتادی اور اس نے اس کی تلقین کرنے میں ساٹھ
ستر ہزار آدمیوں کو قتل کر دیا تو پھر مسلمانوں
اور مسلمانی کا کیا حال ہوگا۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ و دیگر بزرگان دہلی کو جب سلطان کے اس ارادہ کی خبر ہوئی تو وہ آزردہ خاطر ہوئے اور اُنہوں نے دعا کی کہ سلطان

"از وساوس شیطانی برآمدہ بر جادۂ
مستقیم شریعت مصطفوی ثابت و
راسخ گردد" [2]

وسواس شیطانی سے نجات پاکر شریعت
مصطفوی کے جادۂ مستقیم پر قائم و ثابت
رہے۔

سلطان کے یہ خیالات اگر محض سطحی ہوتے تو یقیناً اُن کی اتنی اہمیت نہ ہوتی اور شہر کے علماء و مشائخ اس قدر پریشانی کا اظہار نہ کرتے۔

سلطان نے اس ارادہ کا ذکر دہلی کے کوتوال علاء الملک سے کیا۔ سلطان کو اس پر بڑا اعتماد تھا اور اہم مسائل پر اس کی رائے لیا کرتا تھا۔[3] علاء الملک نے پوری جرأت اور حق گوئی سے کام لیتے ہوئے علاء الدین کو ان حقائق سے آشنا کر دیا جن پر اس کے سپاہیانہ دماغ نے اب تک پردہ ڈالے رکھا تھا۔ اس نے نہایت صفائی سے کہا:۔

خداوند عالم! سخن دین و شریعت و مذہب

خداوند عالم! دین و شریعت اور مذہب کی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۴ - [2] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۰۵ [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۵۹

اصلا و البتہ بہ زباں نباید آورد کہ ایں کار	باتوں کو ہرگز زبان پر نہیں لانا چاہیے کیونکہ یہ
انبیاء است نہ پیشۂ بادشاہاں" [۱]	پیغمبروں کا کام ہے نہ کہ بادشاہوں کا۔

اس کے بعد علاء الملک نے اس مسئلہ میں سلطان کی بنیادی غلطی اور عملی دشواریوں کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ

"دین اور شریعت کا تعلق وحی آسمانی سے ہے اور انسانی تدبیر و رائے سے ہرگز دین اور شریعت کی بنیاد قائم نہیں ہوتی۔ آدم سے لے کر اب تک دین اور شریعت پیغمبروں اور رسولوں سے جاری ہوئے ہیں اور جہانداری و جہانبانی بادشاہوں نے کی ہے۔ جب سے دنیا ہے اور جب تک رہیگی، ایسا ہی ہوگا۔ بادشاہوں نے پیغمبری نہیں کی ہے، ہاں البتہ بعض پیغمبر بادشاہ ضرور ہوئے ہیں مجھ بندۂ درگاہ کی التماس یہ ہے کہ اب آئندہ دین و شریعت اور نئے مذہب کے قائم کرنے کی بات چیت جو حقیقتاً انبیاء کرام کا کام ہے اور جو ہمارے پیغمبر پر ختم ہو چکی ہے، نہ مجلس شراب میں نہ کسی اور مجلس میں بادشاہ کی زبان پر آئے۔ اگر یہ باتیں خواص و عوام کے کانوں تک پہنچیں تو تمام لوگ بادشاہ سے منحرف ہو جائینگے اور ہر طرف سے فتنہ اُٹھ کھڑا ہوگا اور ایک مسلمان بھی بادشاہ کے پاس نہ آئیگا۔" [۲]

علاء الملک کے اس جواب نے سلطان کو خواب سے چونکا دیا۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ اس طرح ملک میں ایسا فتنہ و فساد برپا ہو جائیگا کہ "برائے صد بزرجمہر فرو نہ نشیند" تو اس نے اپنے ارادہ سے توبہ کی اور علاء الملک کی صاف گوئی اور حقیقت بیانی سے متاثر ہو کر کہنے لگا

من ایں ساعت فکر کردم کہ ہمچنیں	میں نے اب سوچا کہ تو جیسا کہتا ہے ویسا ہی
است کہ تو میگوئی۔ مرا ایں سخناں	ہے، مجھ کو ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں اور
نمی باید گفت و بعد ازیں گاہے در ہیچ	اب کسی مجلس میں کوئی شخص مجھ سے ایسی باتیں نہیں

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۵۔ [۲] ایضاً ص ۲۶۵ و ۲۶۷

مجلس کسے ایں چنیں سخناں از من نشنود	نہیں سُنیگا۔ تیرے اوپر اور تیرے ماں باپ
وصد رحمت بر تو باد و بر مادر و پدر تو کہ بر	پر صد رحمت کہ تو نے مجھ سے حق بات
روئے من راست گفتی" [۱]	کہی۔

مسلمان امرا اور مشائخ کو علاء الملک کے اس جواب کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے اُسے دعائے خیر دی۔[۲]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر علاء الدین خلجی کے دل میں نیا مذہب جاری کرنے کا خیال آیا ہی کیوں تھا؟ —— اس کا جواب زمانہ کے حالات اور سلطان کی نفسیات میں تلاش کرنا چاہیے۔ علاء الدین غیر منقسم، لا محدود اور محکم سیاسی اقتدار کا خواہاں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا دائرہ اختیار انسانی کردار کے ہر گوشے کو اپنے اندر سمیٹ لے، تاکہ وہ رعایا کی زندگی پر پوری طرح حاوی ہو جائے۔ اور یہ اس وقت ممکن تھا جب مذہب بھی اس کے ظلِ حمایت میں پرورش پانے لگے۔ مذہب سے حکومت کے تعلق کا اعلان گو مختلف انداز میں ہوتا رہتا تھا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ سیاست کو اب مذہب سے کوئی تعلق نہ رہا تھا، چنانچہ حالات اور توقعات کی خلیج کو پُر کرنے، اور اپنے اقتدار کو بڑھانے کی ہوس نے اس کو ایک نئے مذہب کے جاری کرنے کی تدبیر سجھادی۔ اس کا علمی سرمایہ محدود تھا، اس لیے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر تاریخی تجربات کی روشنی میں غور و فکر کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں لوگوں کے معتقدات پر قبضہ کرنا بھی اسی قدر آسان تھا جتنا ارضِ ہند پر سیاسی اقتدار کا سکہ بٹھانا۔ دل میں خیال آیا اور معاً یہ سمجھ بیٹھا کہ اس میں اس کو کامیابی ہوگی۔ لیکن جب علاء الملک نے اس کو حقائق سے روشناس کیا تو اس ارادہ کو اس طرح ترک کر دیا گویا کبھی اس کے متعلق سوچا ہی نہ تھا۔

مذہبی معلومات | علاء الدین کی مذہبی معلومات کا سرمایہ صرف اسی قدر تھا جتنا وراثت میں

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۵-۲۶۷۔ [۲] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۰۵

اُسے مل سکتا تھا۔ خود کہا کرتا تھا:۔

"من کہ جاہلم وناخواندہ ونانویسندہ ام جز الحمد وقل ہو اللہ ودعائے قنوت والتحیات چیزے دیگر خواندن نمی دانم"[1]

میں جاہل ہوں، پڑھا لکھا نہیں ہوں سوائے الحمد اور قل ہو اللہ اور دعائے قنوت اور التحیات کے کچھ اور پڑھنا نہیں جانتا۔

لیکن علم سے بے بہرہ ہونے کے معنے یہ نہیں تھے کہ وہ مذہب سے بھی بے بہرہ تھا۔ کہتا تھا:

"من اگرچہ علمے وکتابے نخواندہ ام، اما ازیں چندیں پشت مسلمان ومسلمان زادہ ام"[2]

میں نے اگرچہ علم حاصل نہیں کیا ہے اور کتاب نہیں پڑھی ہے لیکن کتنی ہی پشتوں سے مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں۔

پشتوں کی "مسلمانی" مذہبی معلومات کا جس قدر سرمایہ اس تک پہنچا سکتی تھی وہ اس کے پاس محفوظ تھا۔ اور وہ اس پر مکمل اعتقاد رکھتا تھا۔ فلاسفہ اور بد اعتقاد لوگوں کی صحبت اُسے زندگی میں کبھی نہیں ملی تھی، اس لیے اس کی جہالت سے کسی کو فائدہ اُٹھانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ وہ اپنے تقلیدی مذہب پر قانع تھا۔ برنی کا بیان ہے:

"در اسلام اعتقاد تقلیدی بر طرفے عامیاں راسخ داشت وسخنے بد مذہبان وکلام بد دینان نگفتے ونشنیدے ونہ دانستے"[3]

اسلام میں عام لوگوں کی طرح بڑا پختہ تقلیدی اعتقاد رکھتا تھا اور بد مذہب اور بد دینوں کا سا کلام نہ کہتا تھا، نہ سنتا تھا اور نہ جانتا تھا۔

نماز روزہ کی طرف بے توجہی ہر چند کہ علاء الدین خلجی اسلام میں تقلیدی اعتقاد رکھتا تھا لیکن نماز روزہ کی طرف سے بے توجہی برتتا تھا۔ برنی نے اس کے متعلق لکھا ہے:

"نماز وروزہ اورا معلوم نبود کہ حال چہ بود"[4]

پھر ایک اور سلسلہ میں لکھا ہے:

"از تعبدات فارغ بود وسخن در ادائے فرائض می رفت"[5]

۱؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۶ ۲؎ ایضاً ص ۲۹۵ ۳؎ ایضاً ص ۲۳۹ ۴؎ ایضاً ص ۳۳۸ ۵؎ ایضاً ص ۳۸۲

لیکن قاضی مغیث سے گفتگو کے دوران میں اُس نے حق تعالیٰ سے اپنی مناجات کا ذکر کیا ہے[1] جس سے خیال ہوتا ہے کہ اُس میں مذہبی جذبہ کی کمی نہ تھی، گو اپنی غفلت اور تساہل کی بنا پر وہ نماز کا پابند نہیں تھا۔

نجومیوں میں دلچسپی علاء الدین کے زمانہ میں عوام و خواص سب کو نجومیوں میں بڑی دلچسپی تھی۔ برنی نے لکھا ہے کہ عہد علائی میں "علم نجوم رواجے تمام داشت"[2] دہلی کا کوئی محلہ ایسا نہ تھا جہاں نجومی نہ ہوں۔ ملوک و امراء اپنے بچوں کے زائچے تیار کراتے تھے اور اُن کو بڑے بڑے انعام دیتے تھے۔ ہندو اور مسلمان منجم سیکڑوں کی تعداد میں اپنے کاروبار میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی امیر بغیر منجم سے پوچھے کوئی کام ہی نہیں کرتا تھا۔ معاصر مورخ کا بیان ہے:

اشراف شہر را رسمے موروث بودہ است کہ بے اختیار منجم در ہیچ جہے دست نہ زندے وہیچ تطہیرے وکار خیرے و خواستگاری بے اختیار منجم در دہلی نشدے"[3]	اشراف شہر کی موروثی رسم ہے کہ بغیر منجم سے دریافت کیے کوئی بڑا کام نہیں کرتے۔ دہلی میں کوئی کار خیر اور کوئی معاملۂ خواستگاری بغیر منجم کی استصواب رائے کے نہیں ہوتا تھا۔

اس عام ماحول سے علاء الدین بھی متاثر تھا بالخصوص اس کے حرم پر نجومیوں کا بہت اثر تھا۔ لکھا ہے:۔

وبنیابان و فتحیان و صلاجیان و مولانا شرف الدین مطرز و فرور کن عجائب کہ از منجمان استاد بودند از سلطان علاء الدین دیہہ ہا و ادرار ہا داشتند و بنیانان کہ از ہمہ دریں علم بیشتر بودند چنداں صدقات از سلطان علاء الدین و از حرم او

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۹۶

[2] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۶۳۔ ابن خلدون نے علم نجوم کے سماجی اثرات سے متعلق جو بحث اپنے مقدمہ میں کی ہے وہ مطالعہ کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہو اردو ترجمہ، حصہ سوم، فصل بست و ششم۔ ص ۱۹۶۔۲۰۰

[3] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۶۳۔

می یافتند کہ ایشاں را ازاں اسبابہا می شد"[1]

لیکن علاء الدین کو رمالوں اور کیمیا گروں سے سخت نفرت تھی۔ اس زمانہ میں مولانا صدر الدین لوتی غزلی رمال، معین الملک زبیری اپنے فن کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور "کشف احکام مغیبات" اور کھوئی ہوئی چیز کا پتہ لگانے میں کمال رکھتے تھے۔ لیکن

"از خوف سطوت سلطان علاء الدین زہرہ نبودے کہ کسے علم رمل و کیمیا را اظہار کند"

سلطان علاء الدین کے رعب کی وجہ سے کسی کی ہمت نہ تھی کہ وہ علم رمل اور کیمیا کا اظہار کر سکے۔

اگر سلطان کو کسی کے متعلق علم کیمیا جاننے کا شبہ ہو جاتا تو وہ اسے قید کر دیتا تھا[2]۔ سید محمد گیسو دراز کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ ایک دن سلطان نے غصہ میں کہا: "ایں منجمان چہ کار میکنند، مال ضائع می خورند" پھر ان کا امتحان لینے کے لیے کہا کہ اُن سے پوچھا جائے کہ کل ہم کیا کام کرینگے۔ نجومیوں نے ایک پرچہ پر لکھ کر دیا کہ رات کو بادشاہ شکار کے لیے بدایوں دروازہ اور کمال دروازہ کے درمیان ایک نیا دروازہ پھوڑ کر باہر جائیگا اور وہاں "بھات و شکر و روغن و جغرات" کھائیگا۔ یہ پرچہ سربمہر رکھ لیا گیا۔ دوسرے دن سلطان نے وہی سب کام کیے، جب پرچہ کھولا تو حیرت میں رہ گیا اور منجموں پر نہایت درجہ کرم کیا۔ "برایشاں مرحمت کرد"[3]

عہد علائی کے علماء اور سلطان سے اُن کے تعلقات

اسلامی عہد کی علمی تاریخ میں عہد علائی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس زمانہ میں جس پایہ کے علماء دہلی اور اس کے اطراف میں موجود تھے اس کی مثال بعد کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ شیخ نور الحق نے تو یہ لکھا ہے کہ:

"... و طوایف اہل فضل و خداوند کمال (کہ) در عصر دے جمع آمدہ بودند

اہل فضل اور اہل کمال حضرات کے گروہ جتنے اس کے عہد میں جمع ہو گئے تھے کسی عہد میں

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۶۳-۳۶۴۔ [2] ایضاً ص ۳۶۴

[3] جوامع الکلم۔ ص ۲۰۱۔

... در ہیچ عصرے بنا مدہ بلکہ نخواہند آمد[1] نہیں ہوئے تھے اور نہ آئندہ توقع ہے۔

برنی کا بیان ہے کہ ان علماء میں سے ہر ایک علامۂ وقت تھا اور اپنے فن کا ایسا امام سمجھا جاتا تھا کہ اس وقت کی اسلامی دنیا یعنی بخارا، سمرقند، بغداد، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، سفاہان رے اور روم میں بھی اُس کا ثانی نہیں مل سکتا تھا۔ علم کا کوئی شعبہ ہو، منقولات و معقولات کا کوئی گوشہ ہو، تفسیر ہو یا فقہ اور اصول فقہ، اصول دین ہو یا نحو و لغت، کلام ہو یا منطق، ہر فن میں کامل دستگاہ رکھنے والے یہاں موجود تھے۔ بعض علماء تو امام غزالیؒ اور امام رازیؒ کی علمی وجاہت اور تبحر کے مالک تھے۔ فقہ کے ایسے ایسے ماہرین موجود تھے کہ ابو یوسفؒ اور محمد شیبانیؒ کا مرتبہ اُن کو حاصل تھا۔ مولانا جمال الدین شاطبیؒ، مولانا علاء الدین مقریؒ خواجہ زکی ایسے ماہرین قرأت تھے کہ خراسان اور عراق میں بھی اُن کے مرتبہ کا کوئی قاری نہیں مل سکتا تھا۔ اسلامی دنیا کے دور دراز حصوں سے علماء دہلی آتے تھے اور ان بزرگوں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنا اپنے لیے باعثِ عزت و سعادت سمجھتے تھے۔ جس علمی تصنیف پر یہاں کے عالم مہر توثیق ثبت کر دیتے وہ علمی دنیا میں معتبر سمجھی جاتی تھی۔ برنی نے خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل علماء کا ذکر کیا ہے:۔

(۱) قاضی فخر الدین ناقلہ[2]	(۲) قاضی شرف الدین سرباہی
(۳) مولانا نصیر الدین غنی	(۴) مولانا تاج الدین مقدم
(۵) مولانا ظہیر الدین لنگ	(۶) قاضی مغیث الدین بیانہ
(۷) مولانا رکن الدین سنامی	(۸) مولانا تاج الدین کلاہی
(۹) مولانا ظہیر الدین بھکری	(۱۰) قاضی محیی الدین کاشانی[3]

[1] زبدۃ التواریخ ص ۳۰ ب   [2] شیخ نظام الدین اولیاء اور مولانا برہان الدین کے ہم جماعت تھے اور مولانا شمس الملک مستوفی کے ارشد تلامذہ میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کا بیان ہے کہ دہلی کے ایک قصاب کی دعا سے انہیں قاضی کا عہدہ ملا تھا۔ ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۶۸، ۲۴۲۔

[3] قاضی محیی الدین کاشانیؒ شیخ نظام الدین اولیاء کے خاص مریدوں میں تھے۔ جب مجلس میں آتے تھے تو حضرت شیخ اُن کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے مختصر حال آگے آئیگا

(۱۱) مولانا کمال الدین کولی

(۱۲) مولانا وجیہ الدین پائلی [1]

(۱۳) مولانا منہاج الدین قابنی

(۱۴) مولانا نظام الدین کلاہی

(۱۵) مولانا نصیر الدین کٹرہ

(۱۶) مولانا نصیر الدین صابولی

(۱۷) مولانا علاء الدین تاجر

(۱۸) مولانا کریم الدین جوہری

(۱۹) مولانا حجت ملتانی قدیم

(۲۰) مولانا حمید الدین مخلص

(۲۱) مولانا برہان الدین بھکری

(۲۲) مولانا افتخار الدین برنی

(۲۳) مولانا حسام الدین سُرخ

(۲۴) مولانا وحید الدین ملھو

(۲۵) مولانا علاء الدین کرک

(۲۶) مولانا حسام الدین ابن شادی

(۲۷) مولانا حمید الدین بنیانی

(۲۸) مولانا شہاب الدین ملتانی

(۲۹) مولانا فخر الدین ہانسوی

(۳۰) مولانا فخر الدین سفاقل

(۳۱) مولانا صلاح الدین سترکی

(۳۲) قاضی زین الدین ناقلہ

(۳۳) مولانا وجیہ الدین رازی

(۳۴) مولانا علاء الدین صدر الشریعۃ

(۳۵) مولانا میراں مار یکلہ

(۳۶) مولانا نجیب الدین ساوی

(۳۷) مولانا شمس الدین تم

(۳۸) مولانا صدر الدین گندھک

(۳۹) مولانا علاء الدین لوہوری

(۴۰) مولانا شمس الدین یحییٰ [2]

[1] مولانا وجیہ الدین پائلی رح شیخ نظام الدین اولیاء رح کے حلقۂ مُریدین میں شامل تھے۔ علمی تبحر کی دور دور شہرت تھی۔ لکھا ہے کہ ایک بار بابا فرید گنج شکر رح کے مزار پر حاضر ہوئے تو آواز آئی: "ابو حنیفہ پائلی تم خوب آئے" صاحب سیر الاولیاء کا بیان ہے کہ "آپ اپنے پاس کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے، لیکن ذہانت کی یہ کیفیت تھی کہ درس دیتے وقت بڑے بڑے نامی علماء آپ کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرتے تھے آپ پڑھاتے وقت کوئی نسخہ ہاتھ میں نہ لیتے اور جس مرتبہ کسی بحث کی تقریر کرتے دوسری دفعہ اسی بحث کی دوسرے پیرایہ میں تقریر کرتے جو پہلی تقریر سے زیادہ موثر اور دل کش ہوتی" (اُردو ترجمہ ص ۲۹۵)

[2] مولانا شمس الدین یحییٰ رح شیخ نظام الدین اولیاء کے ممتاز ترین خلفاء میں تھے۔ جید عالم اور مرتاض بزرگ تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح جنھوں نے اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، (باقی بر صفحہ ۲۲۹)

(۴۱) قاضی شمس الدین گاذرونی (۴۲) مولانا صدر الدین تاوی

(۴۳) مولانا معین الدین لونی (۴۴) مولانا افتخار الدین رازی

(۴۵) مولانا معز الدین اندہینی (۴۶) مولانا نجم الدین انتشار[۱]

اگر عہد علائی کے کسی مورخ کو ان علمار کا تذکرہ مرتب کرنے کا خیال آجاتا تو ہندوستان کی علمی تاریخ کا ایک اہم باب روشن ہو جاتا۔ اس وقت ہمارے پاس ان چھیالیس علمار میں سے صرف چند کے متعلق کچھ سطحی معلومات ضرور ہیں، ورنہ بیشتر علمار کے تو ناموں سے بھی تاریخ کے صفحات ناآشنا ہیں۔ حالانکہ ان کے علمی کمالات کا یہ عالم تھا کہ برنی کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ

"اگر در کمالاتِ علوم و فنون ہر یکے مجلدے بنویسم مقصر باشم" [۲]

اگر ہر ایک کے کمالات علمیہ سے متعلق ایک ایک کتاب بھی لکھوں تب بھی قاصر رہونگا۔

برنی نے ان علماء کا ذکر کرنے کے بعد علاء الدین کی شکایت کی ہے کہ:

"افسوس ہزار افسوس کہ قدر و قیمت بزرگی و فضل آن اُستادان سلطان علاء الدین نہ دانست کہ یک حق از صد حقوق ایشاں نگذاردہ" [۳]

افسوس ہزار افسوس ان علمار کی بزرگی و فضیلت سلطان علاء الدین نے نہیں جانی اور اُن کے حقوق کو ایک فیصدی بھی ادا نہیں کیا۔

اس میں شک نہیں کہ علاء الدین نے ان بزرگوں کی وہ قدر نہیں کی جو اُسے کرنی چاہیے تھی لیکن اس کا سبب احترام علم کا فقدان نہیں تھا بلکہ سلطان کا یہ اصول بڑی حد تک کارفرما رہا کہ دولت کی افراط کسی طبقے کے پاس نہیں ہونی چاہیے اور کوئی طبقہ سیاست میں ایک طاقت کی حیثیت سے دخیل نہیں ہونا چاہیے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۲۸) ایک شعر میں اُن کے متعلق کہتے ہیں:-

سالت العلم من احیاک حقا فقال العلم شمس الدین یحییٰ

مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو سیر الاولیاء ص ۲۲۳-۲۳۵، اخبار الاخیار ص ۹۶-۹۷، مآثر الکرام ص ۱۸۲،

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۳-۳۵۴۔ [۲-۳] ایضاً ص ۳۵۴۔

برنی نے ایک جگہ شکایت کی ہے کہ:

"از علم خبر نداشت و بعلماء ہم نشست و برخاست نکردہ بود"[1]	(وہ) علم سے واقفیت نہیں رکھتا تھا اور نہ علماء کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔

پھر دوسری جگہ اسی شکایت کو دہرا کر لکھا ہے:۔

"در امور جہانداری خود مسئلہ و روایتے نہ پرسیدے"[2]	اپنے امور جہانداری میں نہ کسی سے کوئی مسئلہ پوچھتا نہ کوئی روایت دریافت کرتا تھا۔

برنی کی اس شکایت سے بظاہر ایسا خیال ہوتا ہے کہ سلطان نے کبھی کسی معاملہ میں شرعی نقطۂ خیال معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ برنی نے خود قاضی مغیث سے سلطان کی گفتگو کا حال لکھا ہے۔ دہلی کے سلطان کی سیاسی زندگی میں ان مسائل سے زیادہ اہم مسائل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ہمہ گیر نوعیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نہایت ہی اہم اور بنیادی معاملات پر اسلامی نقطۂ خیال معلوم کرنا چاہتا تھا۔

علماء کی طرف علاء الدین خلجی کا رویہ عہد بلبنی اور عہد کیقبادی کے علماء کے کردار کا ردِعمل تھا جن علماء سور کا ذکر بلبن نے نہایت ہی حقارت سے کیا ہے اور جن کی مذمت مولانا نور ترک نے بھی شدت سے کی تھی، اُن کی سیاسی ہنگامہ آرائی کی داستانیں تاریخ کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ علاء الدین کسی قیمت پر اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ ملک کا کوئی طبقہ خواہ وہ علماء کا ہو یا جاگیرداروں کا، صوبائی گورنروں کا ہو یا فوجی افسروں کا، ہندوؤں کا ہو یا مسلمانوں کا، علماء کا ہو یا صوفیہ کا ــــ کسی طرح سیاسی طاقت حاصل کرنے کے بعد اُمور جہانداری میں دخیل ہو جائے۔ علاء الدین نے علماء کی اُس سیاسی طاقت کو ختم کر دیا جس نے اُن کو بساط سیاست کا مہرہ بنا کر دینی اور علمی زندگی کے تقاضوں سے غافل کر دیا تھا۔ اسی جذبہ کے ماتحت علاء الدین نے وہ رویہ اختیار کیا جس کو برنی نے اس طرح

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۲ [2] ایضاً ص ۲۸۹

پیش کیا ہے:

"چوں در بادشاہی رسید در دل او ہم چنیں نقش بستہ کہ ملک داری و جہانبانی علیحدہ کاریست و روایت و احکام شریعت علیحدہ امریست و احکامِ بادشاہی بہ بادشاہ متعلق است و احکام شریعت بروایت قاضیان و مفتیان مفوض است، و بر حکم اعتقاد مذکور ہر چہ در کار ملک داری او را فراہم آمدے و صلاح ملک دراں دیدے آں کار خواہ مشروع و خواہ نامشروع بکردے"۔ [1]

بادشاہ ہونے پر اس کے دل میں یہ خیال جم گیا کہ ملک داری اور جہانبانی ایک علیحدہ کام ہے اور احکام شریعت و روایت ایک الگ کام ہے۔ احکام بادشاہی کا تعلق بادشاہ سے ہے اور احکام شریعت کا تعلق قاضیوں اور مفتیوں سے ہے۔ بادشاہ اپنے اسی اعتقاد کے مطابق ملک داری کے کاموں میں جو مناسب سمجھتا اور جس میں وہ اپنے ملک کی بھلائی دیکھتا تھا وہ کرتا تھا، خواہ وہ شرعاً جائز ہو یا ناجائز۔

اسلامی ہند کی علمی تاریخ میں علاء الدین خلجی کا یہ کارنامہ کبھی نہیں بھلایا جا سکتا کہ اُس نے علماء کو گندی سیاست سے نکال کر علمی اور مذہبی کاموں میں لگا دیا۔ گو اس عمل کا محرک جو جذبہ تھا وہ سیاسی تھا لیکن اُس کے اثرات علماء کے کردار اور عادات پر بہت اچھے مرتب ہوئے۔ وہ سیاست کا میدان چھوڑ کر اصلاح و تربیت کے کاموں کی طرف رجوع ہو گئے چنانچہ عہد علائی کے علماء اپنے کردار کی بلندی اور جذبۂ حق گوئی میں بے مثال تھے۔ اُن کے پیشرو علماء کیقباد جیسے کمزور اور رنجاں مرنج سلطان کے سامنے حق گوئی کی جرأت نہیں رکھتے تھے، لیکن اس دور کے علماء علاء الدین جیسے جابر اور سخت گیر بادشاہ کے سامنے سچی بات کہہ سکتے تھے اور اس کے لیے تکلیف اٹھانے اور سر کٹانے کی ہمت رکھتے تھے۔ علاء الدین

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۲۸۹۔

کے کردار کی بھی بہت بڑی خوبی ہے کہ اُس نے قاضی مغیث سے اپنے نظام حکومت، شاہی اخراجات اور حرم کی زندگی پر شرعی حیثیت سے سخت تنقید سُننے کے بعد بھی انہیں خلعت سے نوازا اور اُن کی حق گوئی کی تعریف کی۔ ہر چند کہ علاء الدین، بلبن کی طرح علماء سے گہرے تعلقات نہیں رکھتا تھا، لیکن پھر بھی یہ خیال درست نہیں کہ اُن سے قطعًا بے تعلق تھا۔ کم از کم تین علماء کا تو ذکر برنی نے کیا ہے یعنی قاضی ضیاء الدین بیانہ، مولانا ظہیر لنگ اور مولانا مشید کہرامی جو دستر خوان شاہی پر موجود رہتے تھے۔ قاضی مغیث الدین کے متعلق تو یہ لکھا ہے کہ وہ نہ صرف دربار میں آتے جاتے تھے بلکہ "در مجلس خلوت بنشستے"۔ [1]

قاضی مغیث الدین سے گفتگو بیانہ کے قاضی مغیث الدین کا شمار برنی نے عہد علائی کے مشاہیر علماء میں کیا ہے۔ ایک دن سلطان علاء الدین خلجی نے اُنہیں بلایا اور کہا کہ میں آج تجھ سے کچھ مسائل پوچھنا چاہتا ہوں۔ جو بات سچ ہو وہ مجھ سے کہنا۔ قاضی مغیث نے عرض کیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ سلطان نے پوچھا: یہ خیال تجھے کیسے ہوا؟ عرض کیا: خداوند مجھ سے مسائل دینی دریافت فرمائینگے، میں حق بات کہونگا۔ یہ بات ناراضگی کا باعث ہوگی اور بالآخر مجھے مروا ڈالا جائیگا۔ اس پر علاء الدین نے کہا:

"من نخواہم کشت، ہر چہ از تو ہر سم پیش من راست بگو" [2]	میں تجھ کو قتل نہیں کرونگا، جو میں دریافت کروں مجھ سے سچ سچ کہو۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد علاء الدین نے مندرجہ ذیل مسائل پر قاضی مغیث کی رائے طلب کی:

۱۔ خراج گزار و خراج دہ در شرع چگونہ ہندوی را گویند؟

۲۔ دزدے و اصابت و رشوت کارکناں و آنانکہ سیاقت قلم می کنند و از جمع می برند جائے در شریعت آمدہ است؟

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۹،

[2] اس پوری گفتگو کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۰-۲۹۶۔

۳۔ ایں مالے کہ من با چنداں خونابہ دیدن در وقت ملکی از دیوگیر آوردہ ام، آں مال ازاں من است و یا از بیت المال مسلماناں؟

۴۔ مرا و فرزنداں مرا در بیت المال چہ مقدار حق است؟

یہ سوالات فی نفسہ بے حد اہم ہیں حقوق الذمیین، حدود شرعی، مشاہرہ سلطان اور انتظام بیت المال کسی مسلمان بادشاہ کی زندگی میں ان سے زیادہ اہم مسائل اور کیا ہو سکتے ہیں اور سلطان کا ان مسائل پر شرعی زاویۂ نگاہ معلوم کرنا، شریعت میں اس کی دلچسپی کا کھلا ہوا ثبوت ہے!

ہندوؤں کی شرعی حیثیت کے متعلق سلطان نے جو سوال کیا تھا اس کا جواب قاضی مغیث نے یہ دیا:

"شرع کے مطابق اس ہندو کو خراج گزار کہیں گے جو اس وقت جبکہ محصل دیوان اس سے چاندی طلب کرے تو وہ پوری تعظیم اور عاجزی کے ساتھ اور بلا کسی تامل کے سونا پیش کر دے۔ اور اگر محصل اس کے منہ میں تھوکے تو وہ بغیر کسی کراہت کے اپنا منہ کھول دے۔ اور اس حالت میں بھی محصل کی پوری طرح خدمت کرے مراد اس لینت سے یہ ہے کہ وہ تواضع سے پیش آئے اور محصل کے اس کے منہ میں تھوکنے سے مطلب یہ ہے کہ ذمی انتہائی اطاعت کا اظہار کرے۔ اور دین اسلام اور حق کی سربلندی ہو اور دین باطل کی خواری۔ خدا ان لوگوں کی خواری کے متعلق فرماتا ہے: عن ید وھم صاغرون۔ ہندوؤں کو خوار رکھنا لوازم دین داری میں سے ہے۔ اس لیے کہ وہ مصطفےٰ کے سخت ترین دشمن ہیں۔ اور چونکہ حضرت مصطفےٰ علیہ السلام نے ہندوؤں کے قتل اور ان سے مالِ غنیمت لینے اور ان کو غلام بنانے کا حکم دیا ہے۔ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا اُن کو قتل کیا جائے، اور غلامی میں لیا جائے، اور اُن کے مال و ملک پر قبضہ

کیا جائے۔ اور سوائے امام اعظمؒ کے جن کے ہم پیرو ہیں جو ہندوؤں سے جزیہ قبول کرنے کے حق میں ہیں، دوسرے ائمہ کے مذہب کے نزدیک ہندوؤں سے جزیہ قبول کرنا جائز نہیں۔ اور علماء دیگر کے نزدیک ہندوؤں کی بابت یہ حکم ہے کہ "اما القتل واما الاسلام" [۱]

قاضی مغیث الدین کی یہ تقریر سُن کر علاء الدین ہنس پڑا۔ چونکہ یہ پوری گفتگو اجتہادی بصیرت کی کمی، ہندوستان کے مخصوص حالات سے ناواقفیت، اور حقائق سے چشم پوشی کو ظاہر کرتی تھی، علاء الدین نے جواب دیا:

"یہ باتیں جو تونے کہیں، میں ان کو بالکل نہیں جانتا۔ لیکن مجھے خوب معلوم ہے کہ خوط اور مقدم عمدہ گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں، اچھے اچھے کپڑے پہنتے ہیں، فارسی کمان استعمال کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور شکار پر جاتے ہیں، لیکن (جہاں تک ٹیکسوں کی ادائیگی کا تعلق ہے) خراج، جزیہ، کری و چرائی کا ایک جیتل بھی ادا نہیں کرتے۔ اور اپنا حق خدمت دیہات (والوں) سے علیحدہ وصول کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی مجلسیں آراستہ کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور بعض (کی سرکشی کا تو یہ عالم ہے) کہ نہ از خود، نہ بلانے پر ہی دیوان آتے ہیں۔ اور سرکاری ٹیکس

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۰۔ اس گفتگو کے سلسلہ میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں۔ (۱) اس پوری گفتگو کا انداز وہی ہے جو برنی نے علماء کے ایک وفد سے التتمش کے سامنے کرائی ہے۔ کیا برنی نے اپنے خیالات ان علماء کی زبان سے ادا کرادیے ہیں؟ یا واقعی التتمش کے عہد سے لے کر علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت تک علماء کا کوئی ایسا طبقہ دہلی میں موجود تھا جو ہندوؤں کو ذمیوں کے حقوق دینے کے حق میں نہ تھا؟ (۲) ایسی صورت میں جبکہ ہندی مسلمانوں کی اکثریت اور خود قاضی مغیث فقہ حنفی کو مانتے تھے، کسی دوسرے مذہب کی رائے پر عمل کی توقع بے معنی معلوم ہوتی ہے (۳) ... اس تقریر میں رسولِ اکرمؐ کی احادیث یا امام ابو حنیفہؒ کے اقوال کو ہندوؤں کے سلسلہ میں نقل کرنا صریحاً غلط ہے۔ نہ رسولِ اکرمؐ نے کبھی ہندوؤں کے متعلق کوئی رائے ظاہر کی، نہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنی فقہ میں ہندوؤں سے بحث کی۔ — جزیہ کی نوعیت پر تفصیلی گفتگو کے لیے ملاحظہ ہو، مقدمہ۔

وصول کرنے والوں کو نظر میں نہیں لاتے (یہ صورت حال دیکھ کر) مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں دوسرے ملکوں کی فتح کے تو ارادے رکھتا ہوں اور اُن میں اپنا نظم ونسق جاری کرنا چاہتا ہوں، لیکن یہ جو سو کوس کی ولایت میرے زیرنگیں ہے اس میں بھی میری فرمانبرداری کا حق جیسا کہ ادا ہونا چاہیے، ادا نہیں ہوتا۔ تو میں دوسری ولایت میں اپنی اطاعت کس طرح کراؤنگا! چنانچہ میں نے اب ایسے انتظامات کیے ہیں اور رعایا کو اس طرح اپنا فرماں بردار بنایا ہے کہ اگر میرا حکم ہو تو سب چوہوں کی طرح بلوں میں گھس جائیں! اور اس وقت تو نے بھی یہ کہا کہ شرع کا بھی یہی حکم ہے کہ ہندو کو پوری طرح اور انتہائی طور پر فرمانبردار بنایا جائے"۔

اس کے بعد سلطان نے کہا:۔

"اے مولانا مغیث تو عالم ضرور ہے لیکن تجربہ تیرا کچھ نہیں۔ میں اگرچہ ناخواندہ ہوں لیکن تجربہ بہت رکھتا ہوں۔ اس بات کو سمجھ لے کہ ہندو کبھی بھی مسلمان کا مطیع اور فرماں بردار نہیں ہوگا، جب تک اس کو بے نوا اور بے حیثیت نہ کردیا جائے۔ چنانچہ میں نے حکم دیا ہے کہ آئندہ رعیت کے پاس فقط اتنا چھوڑا جائے کہ وہ زراعت اور دودھ دہی کے لیے سال بہ سال سامان کرسکیں لیکن ذخیرہ جمع کرنے کا موقع نہ ملے"

رشوت خور عمال کی سزاؤں کے متعلق سلطان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے قاضی مغیث الدین نے کہا کہ اس مسئلہ پر فقہ کی کتابوں میں کوئی بحث اُن کی نظر سے نہیں گزری، لیکن بہرنوع صورت یہ ہے کہ اگر عمال کو بقدر کفایت تنخواہ نہ ملے اور وہ بیت المال سے جو خراج رعایا سے جمع ہوتا ہے، کچھ چرالیں یا رشوت لے لیں، تو اولوالامر یہ کرسکتا ہے کہ جو مصلحت دیکھے ویسی سزا دے، خواہ مال ضبط کرلے یا قید کرے یا ایذا پہنچائے۔ لیکن یہی

صورت میں قطع ید کی سزا دینا جائز نہیں۔ علاء الدین نے جواب دیا کہ میں نے حکم دے رکھا ہے کہ متصرفوں اور عہدہ داروں کی اتنی تنخواہ مقرر کی جائے کہ وہ آبرو کے ساتھ گزر اوقات کر سکیں لیکن اگر اس کے باوجود کوئی چوری کرے یا خیانت کرے تو "بزخم چوب" اس سے وہ رقم واپس لے لی جائے۔

دیوگیر سے حاصل کیے ہوئے مال کے متعلق سلطان کے استفسار کا جواب قاضی مغیث الدین نے یہ دیا۔

"جو مال کہ خداوند عالم نے دیوگیر سے حاصل کیا ہے وہ لشکر اسلام کی قوت سے کیا ہے۔ اور جو مال لشکر اسلام کی قوت سے حاصل کیا جائے وہ مسلمانوں کے بیت المال کا مال ہوتا ہے۔ ہاں اگر خداوند کسی مباح طریقہ پر تنہا کوئی مال حاصل کرتے تو بیشک وہ خداوند عالم کا مال ہوتا۔"

اس پر سلطان کا اعتراض یہ تھا کہ اس نے یہ سب مال اپنی "ذاتی حیثیت" میں اپنے "ذاتی نوکروں" کی مدد سے اس وقت حاصل کیا تھا جب وہ محض ملک تھا۔ اس لیے یہ مال کس طرح بیت المال کی ملکیت ہو سکتا ہے!

جب بیت المال پر بادشاہ اور اس کے متعلقین کے حقوق کے متعلق علاء الدین نے سوال کیا تو قاضی مغیث نے کہا: میری موت کا وقت آگیا۔ سلطان نے پوچھا کیسے، جواب دیا: خداوند عالم نے جو مسئلہ مجھ سے پوچھا ہے اگر اس کا صحیح جواب دونگا تو خداوند عالم کو غصہ آجائیگا اور مجھے مروا دینگے، اگر جھوٹ کہونگا تو کل قیامت کے دن دوزخ میں جاؤنگا۔ علاء الدین نے کہا:-

ہرچہ حکم شرع است بگو، من ترانخواہم کشت"

اس اطمینان دلانے پر قاضی مغیث نے جواب دیا:

اگر خداوند عالم خلفائے راشدین کی پیروی کریں اور آخرت کے درجات طلب

کریں تو جیسا کہ اہل جہاد کے لیے دو سو چونتیس تنکہ مقرر کر دیے ہیں، اتنی ہی مقدار خداوند عالم خاص اپنے اور اپنے اہل و عیال کے اخراجات کے لیے لے لیں۔ اور اگر خداوند عالم میانہ روی کو اختیار کریں۔ اور یہ سمجھیں کہ اس مقدار میں جو تمام ملازمین کو دیتے ہیں گزر نہیں ہو سکتی اور بادشاہی کی شان قائم نہیں رہ سکتی تو جتنی رقم کہ درگاہ کے بڑے بڑے لوگوں کو دی جاتی ہے، اتنی ہی رقم بیت المال سے اپنے اور حرم کے اخراجات کے لیے لے لیں اور تیسری صورت یہ ہے کہ خداوند عالم علماء دنیا کی روایتی اجازت و رخصت کے مطابق بیت المال سے اپنا اور اپنے حرم کا خرچ لیں تو اتنا لینا چاہیے کہ دوسرے بزرگان درگاہ کی نسبت زیادہ اور اچھا لے لیں۔ جس کی وجہ سے آپ کو دوسروں سے امتیاز ہو جائے اور بادشاہی کی شان پر بھی دھبہ نہ آئے۔ یہ تینوں صورتیں جو میں نے بیان کی ہیں اگر خداوند عالم نے ان سے تجاوز کر کے بیت المال سے زیادہ لے لیا اور لاکھوں کروروں اور سونے کی اور جڑاول چیزیں خاص حرم کو دینی شروع کر دیں تو قیامت میں ان سب کے متعلق باز پرس ہوگی"۔

اس جواب پر علاء الدین کو غصہ آ گیا اور کہنے لگا کہ کیا تو میری تلوار سے نہیں ڈرتا جو یہ کہتا ہے کہ جو کچھ مال میرے حرم پر خرچ ہوتا ہے مشروع نہیں ہے! قاضی نے جواب دیا کہ میں خداوند عالم کی تلوار سے (ضرور) ڈرتا ہوں اور اپنا کفن جو میری دستار ہی کا بنیگا، اپنے ساتھ لایا ہوں لیکن اگر خداوند عالم مجھ سے مسئلہ شرع پوچھینگے تو اس کے متعلق جو میں جانتا ہوں وہی کہونگا۔ ہاں اگر خداوند عالم مصلحت ملکی کے متعلق دریافت کرینگے تو میں کہونگا کہ حرم پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے اس کو ہزار گنا بڑھا دینا چاہیے کیونکہ اس سے بادشاہ کی عزت لوگوں کی نگاہوں میں بڑھتی ہے۔

اس کے بعد علاء الدین نے کہا کہ میں جو ہر اس سوار سے جو (لڑائی کے وقت) حاضر نہیں ہوتا، گزشتہ تین سال کی تنخواہ وصول کر لیتا ہوں، اور شراب پینے والوں اور بیچنے والوں کو جو

"چاہ زندان" میں بند کردیتا ہوں، اور جو دوسری سخت سزائیں زانیوں کو دیتا ہوں تمہارے نزدیک تو یہ سب ہی نامشروع ہونگی! قاضی مغیث مجلس سے اُٹھکر پایاں پر پہنچے اور پیشانی زمین پر رکھ کر بلند آواز سے کہا کہ چاہے بادشاہ اسی لمحے میرے ڈو ٹکڑے کرادے، لیکن (سچ یہ ہے کہ) یہ سب نامشروع ہے۔

قاضی مغیث کی زبان سے یہ کلمات سُن کر علاءالدین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جوتے پہنے اور حرم سرائے میں چلا گیا۔ قاضی اپنے گھر واپس آگئے۔ اگلے دن غسل کیا، صدقہ تقسیم کیا اور اہل خانہ سے رخصت ہو کر دربار پہنچے۔ علاءالدین نے قریب بلایا، بڑی مہربانی سے پیش آیا اور اپنا خلعت خاص اُتار کر اُنہیں دیا اور ایک ہزار تنکہ بھی عنایت کیا۔ اور کہا:

"قاضی مغیث! من اگرچہ علمے وکتابے نخواندہ ام، اما از چندیں پشت مسلمان مسلمان زادہ ام، واز برائے آنکہ بلغاکے نشود کہ در بلغاک چندیں ہزار آدمی کشتہ می شود، بہر چیزیکہ درآں صلاح ملک وصلاح ایشاں باشد بر خلق امر می کنم ومردماں دہ دیدگی و بے التفاتی می کنند وفرمان مرا بجائے نمی آرند، مرا ضرورت می شود کہ چیزہا درشت در باب ایشاں حکم کنیم کہ ایشاں بداں فرماں برداری کنند ونمی دانم کہ آں حکم ہا مشروع است دیا نامشروع ومن درہر چہ صلاح ملک خود می بینم و مصلحت وقت مرا دراں

قاضی مغیث! میں نے اگرچہ علم حاصل نہیں کیا ہے اور کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے، لیکن کتنی ہی پشتوں سے مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور اس غرض سے کہ فساد نہ ہو کیونکہ فساد میں ہزاروں آدمی مارے جاتے ہیں، میں جس چیز میں ملک کی بھلائی دیکھتا ہوں، لوگوں کو اس کا حکم کرتا ہوں۔ لوگ بے پروائی اور بے توجہی برتتے ہیں اور میرا فرمان بجا نہیں لاتے (ایسی صورت میں) میرے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اُن کے متعلق سخت احکام نافذ کروں کہ اُن کی تعمیل کریں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ احکام جائز ہیں یا نہیں۔ میں تو جن چیزوں میں ملک کی بھلائی دیکھتا ہوں اور اُن کو وقت کے

مشاہدہ می شود، حکم می کنم، و نمی دانم کہ
خدائے تعالیٰ فردائے قیامت بر من چہ
خواہد کرد۔ فامّا اے مولانائے مغیث!
من یک چیز در مناجات خود با خدائے
تعالیٰ می گویم کہ بار خدائے تو می دانی
کہ اگر یکے با زن دیگر سفاح می کند مرا
در ملک من زیاں نمی دارد، واگر کسے
شراب می خورد، ہم مرا زیانے نیست،
واگر دزدی می کند جائے از میراث پدر
من نمی برد کہ مرا درد آید واگر مال می
ستانند و در نامزدی نمی روند و از نا
رفتن دہ بست نفر کار نامزدی نمی ماند
و در باب ایں چہار طائفہ انچہ حکم
پیغمبران است آں بکنم"

مناسب پاتا ہوں، اُن کا حکم کر دیتا ہوں میں
نہیں جانتا کہ کل قیامت کے دن خدا تعالیٰ
کا معاملہ میرے ساتھ کیا ہوگا لیکن اے مولانا
مغیث! میں ایک بات اپنی مناجات میں
خدا تعالیٰ سے کہتا ہوں اور وہ یہ کہ اے
خدا تو جانتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کے
ساتھ زنا کرے تو اس سے میرے ملک میں
کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شراب پیتا
ہے تو مجھ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔
اگر کوئی چوری کرتا ہے تو میرے باپ کی میراث
میں سے کچھ نہیں لیتا جس کا مجھے درد ہو۔ اگر کوئی
مال ہڑپ لیتا ہے اور اس کا اندراج نہیں ہوتا
اور دس بیس آدمیوں کے نہ جانے سے نامزدی کا
کام رکتا نہیں ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود ان
چاروں لوگوں کے متعلق میں وہی کرتا ہوں جو پیغمبروں کا حکم ہے"۔

قاضی محیی الدین کاشانی اور سلطان

قاضی محیی الدین کاشانیؒ[1] قاضی قطب الدین کاشانی کے پوتے اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ تھے "علم و حلم و زہد و تقویٰ و ورع" میں مشہور تھے۔ جب شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے تو مثالِ ادرار شیخ کی خدمت میں لاکر پارہ پارہ کردی۔ اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے لگے۔ کسی نے اُن کا حال سلطان علاء الدین خلجی کے کانوں تک پہنچا دیا سلطان نے حکم دیا کہ اودھ کی قضا جو اُن کے خاندان میں رہی ہے

[1] مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو، سیر الاولیا ص ۲۹۴-۲۹۷، اخبار الاخیار ص ۲۹۷-۲۹۸، معارج الولایت جلد اول ص ۳۲۲-۳۲۳

ان کو دیدی جائے اور ساتھ ہی "انعام و قربات بسیار" اُن کو پیش کیے جائیں[۲]۔ قاضی محیی الدین بادشاہ کا یہ حکم نامہ شیخ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے۔ شیخ کو اس بات سے رنج پہنچا اور قاضی محیی الدین سے کہا:۔

"البتہ مثل ایں معنی در خاطر تو گزشتہ باشد	یقیناً یہ بات تمہارے دل میں گزری ہوگی۔
انگاہ ایں معنی برائے تو پیش آوردہ اند[۳]	جب ہی تو تمہارے سامنے یہ حکمنامہ لایا گیا ہے۔

شیخ نظام الدین اولیاءؒ اپنے اعلیٰ مریدوں اور خلفاء کو سرکاری ملازمت کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس بناء پر انہیں قاضی محیی الدین کاشانیؒ سے شکایت پیدا ہوئی اور نہ صرف اپنا خلافت نامہ اُن سے واپس لے لیا بلکہ ایک سال تک ان کی طرف سے کبیدہ خاطر رہے۔

خواجہ مؤیدالدین کرئی اور سلطان خواجہ مؤیدالدین، علاء الدین کی شہزادگی کے زمانہ میں اس سے وابستہ رہے تھے۔ بعد کو دنیاوی علائق سے قطع تعلق کر کے شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت با برکت میں رہنے لگے۔ علاء الدین جب تخت پر بیٹھا تو شیخ المشایخ کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ:

"مخدوم کرم کنید و خواجہ مؤیدالدین را	مخدوم کرم کیجیے اور خواجہ مؤیدالدین کو اپنی خدمت
رخصت فرمائید تا کارے از پیش ما برگیرد"[۳]	سے رخصت کر دیجیے تاکہ وہ ہمارے کاموں کو سر انجام دے۔

سلطان المشایخ نے جواب دیا کہ اب خواجہ مؤیدالدین نے ایک اور کام اختیار کر لیا ہے اور اسی کی انجام دہی میں کوشش کر رہا ہے۔ جو شخص علاء الدین کا پیغام لایا تھا اُسے یہ جواب کچھ گراں گزرا اور کہنے لگا کہ مخدوم! آپ تمام لوگوں کو اپنا جیسا کرنا چاہتے ہیں۔ سلطان المشایخ نے فرمایا:

"ہمچو خود چہ باشد بہتر از خود، بہتر از خود	اپنا جیسا کیا معنی، اپنے سے بہتر (یقیناً) اپنے سے
می خواہم"[۴]	بہتر چاہتا ہوں۔

[۱-۲] سیر الاولیاء ص ۲۹۵ [۳] ایضاً ص ۳۱۱ [۴] ایضاً ص ۳۱۱۔

علاء الدین نے جب شیخ کا یہ جواب سُنا تو خواجہ مؤید الدین سے ہاتھ اُٹھالیا۔

مولانا شمس الدین ترک کی آمد | سلطان علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں ایک مشہور مصری محدث اور عالم مولانا شمس الدین ترک ہندوستان تشریف لائے تھے، اُن کے ساتھ حدیث کی چار سو کتابیں تھیں۔ وہ ابھی ملتان ہی میں تھے کہ اُن کو معلوم ہوا کہ سلطان نماز ادا نہیں کرتا اور جمعہ میں بھی حاضر نہیں ہوتا۔ یہ سنتے ہی انھوں نے دہلی کا ارادہ ترک کردیا اور سلطان کو علم حدیث کی تشریح میں ایک رسالہ لکھ کر بھیجا جس میں بقول برنی "در مدح سلطان مبالغت نمود"[1] ساتھ ہی انھوں نے فارسی میں ایک اور رسالہ لکھ کر سلطان کے پاس بھیجا جس میں لکھا تھا کہ

"میں مصر سے بادشاہ اور شہر دہلی کا ارادہ کرکے آیا تھا، اور مقصد یہ تھا کہ میں خدا اور رسول کے لیے دہلی میں علم حدیث کا درس جاری کروں اور مسلمانوں کو بے دیانت فقیہوں کی روایت پر عمل کرنے سے نجات دلاؤں لیکن جب میں نے سنا کہ بادشاہ نماز نہیں پڑھتا اور جمعہ میں نہیں آتا تو اب میں ملتان ہی سے واپس جاتا ہوں"

اس رسالہ میں مولانا ترک نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے بادشاہ کی دو تین صفات ایسی سنی ہیں جو "بادشاہان دیندار" کی خصوصیات ہیں اور دو تین باتیں ایسی سُنی ہیں جن کی "شاہان دیندار" سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ خوبیوں کو وہ اس طرح گناتے ہیں —

(۱) "خواری وزاری علاء اعتباری وبے مقداری ہندواں"

سلطان کے اس "کارنامہ" کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"آفریں اے بادشاہ اسلام، بریں دین پناہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم"

(۲) شنیدہ ام کہ غلّہ واقمشہ واسباب چناں ارزاں کردہ کہ سر سوزنے براں — میں نے سنا ہے کہ اناج اور کپڑے اور دوسری چیزیں آپ نے اتنی ارزاں کردی ہیں کہ سوئی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۷

زیادت تصور ندارد" کے ناکہ کی برابر بھی اس پر زیادتی کا تصو نہیں ہو سکتا

پھر کہتے ہیں کہ یہ کام اتنا سخت تھا کہ بہت سے بادشاہوں نے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے تعجب ہے کہ آپ کے لیے ایسا کرنا کیونکر ممکن ہو گیا۔

(۳) "شنیدہ ام کہ جملہ مسکرات را بادشاہ برانداختہ است و فسق و فجور در کام فاسقاں و فاجران از زہر تلخ تر شدہ" سُنا ہے کہ تمام نشہ آور چیزوں کو بادشاہ نے باہر نکال پھینکا ہے اور فسق و فجور فاسق لوگوں کے کام و دہن میں زہر سے بھی زیادہ کڑوا ہو گیا ہے

اس پر بادشاہ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

(۴) شنیدہ ام کہ بازاریان اہل السوق رط کہ اہل اللعنت اند در سوراخ موش درآوردہ" سنا ہے کہ بازاری لوگوں کو آپ نے چوہے کے بل میں گھسا دیا ہے۔

اس پر بھی مبارک باد دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کام ایسا ہے کہ آدم کے وقت سے اب تک کسی بادشاہ کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہو سکا۔

ان چاروں خوبیوں اور کارناموں پر علاءالدین کو مبارک باد دینے کے بعد کہتے ہیں:

"اے بادشاہ مبارکت باد کہ بدیں چہار عمل درمیان انبیاء رجائے تست" اے بادشاہ تجھ کو مبارک ہو کہ ان چار کاموں کی وجہ سے تیرا مقام پیغمبروں کے درمیان ہے۔

اس کے بعد جن باتوں کی شکایت کی ہے وہ بھی غور طلب ہیں۔ لکھتے ہیں

(۱) تم نے قضاء کا کام حمید ملتانی جیسے شخص کے سپرد کر رکھا ہے۔ وہ دنیا دار آدمی ہے اور قضاء کا کام "نازک ترین اشتغال دین" میں سے ہے، اس میں احتیاط لازم ہے۔

(۲) میں نے سنا ہے کہ تمہارے شہر میں احادیث مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک کیا جاتا ہے اور دانشمندوں کی روایت پر عمل ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ جس شہر میں حدیث کے باوجود فقہ کی روایت پر عمل کریں وہ شہر تباہ کیوں نہیں ہو جاتا اور اس پر آسمانی مصائب کیوں نہیں برسنے لگتے۔

(۳) میں نے سُنا ہے کہ تمہارے شہر میں "دانشمند بدبخت سیاہ رو" مسجدوں میں بیٹھتے ہیں اور رشوت لے کر فتویٰ دیتے ہیں اور ان کی بددیانتی کی خبریں قاضی کی وجہ سے تم تک نہیں پہنچتیں۔"

ان سب کمزوریوں میں سب سے زیادہ وزنی اعتراض جو سلطان کے ذاتی کردار سے متعلق ہے وہ نماز سے غفلت ہے۔ اس پر مولانا ترک نے بڑی حیرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ برنی نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ اور کتاب مولانا شمس الدین نے سلطان کو بھیجی تھی۔ بہار الدین دبیر نے کتاب تو اس کی خدمت میں پہنچادی لیکن رسالہ اپنے پاس رکھ لیا۔ سعد منطقی نے علاء الدین کو اس رسالہ کی اطلاع کردی۔ بہار الدین کی اس حرکت پر سلطان بے حد برہم ہوا اور مولانا شمس الدین کے واپس چلے جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔[۱]

درستی اخلاق کے لیے کوشش علاء الدین خلجی نے عوام کے اخلاق درست کرنے کے لیے بڑی جدو جہد کی۔ امیر خسروؒ اور ضیاء الدین برنی نے اس سلسلہ میں اس کی مساعی کا ذکر جس تفصیل سے کیا ہے اس سے سلطان کے مقاصد پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ شیخ نور الحقؒ کا خیال ہے کہ ان تمام کوششوں کا مقصد سیاسی تھا اور ضمناً اُن سے شریعت کو تقویت پہنچ گئی تھی۔ لکھتے ہیں:

اگرچہ وے آنرا بقصد ملک داری وجہانبانی خود کرد لیکن بر ضمن آں عزت دین و شریعت ورواج ورونق مسلمانی صورت یافت"[۲]

اس میں شک نہیں کہ علاء الدین نے اس سلسلہ میں جو جدوجہد کی تھی اس سے مقصد اولیں یہی تھا کہ تمام خراب اور سرکش عناصر کو دبا کر ایسے معاشرہ کی تشکیل کردی جائے جو ایک مضبوط سیاسی نظام قائم کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوسکے، لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس میں مذہبی جذبات کو مطلقاً دخل نہیں تھا۔ اگر قاضی مغیث الدین سے اس کی گفتگو، اس کے رجحانات افکار کی کسی حد تک بھی ترجمانی کرتی ہے تو اس جملہ پر غور کرنا چاہیے ——

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۹ [۲] زبدۃ التواریخ ص ۲۸ ب۔

"میں خدا تعالیٰ سے اپنی مناجات میں کہتا ہوں کہ کسی چور یا زانی یا شراب خوار نے میرا کیا بگاڑا ہے جو میں اس کو سزا دوں اس کے باوجود جو میں اس کو سزا دیتا ہوں تو صرف پیغمبروں کے نقش قدم پر چلنے کی غرض سے دیتا ہوں"[۱]

انسداد شراب نوشی علاء الدین خلجی پہلا ہندوستانی فرمانروا تھا جس نے مے نوشی و مے فروشی کے مکمل انسداد کی کوشش کی[۲] اس نے بگنی[۳]، بھنگ اور جوئے کو ممنوع قرار دے دیا۔ شراب پینے والوں کی سزا کے لیے قید خانے بنوائے گئے اور "خماران و قماران و بگنی گران"[۴] کو شہر سے باہر نکال دیا گیا سلطان نے خود اپنے عمل سے نمونہ قائم کیا۔ اس کے "مجلس خانۂ خاص" کے تمام شیشے و پیمانے "صراحی و معبری و بطلکہائے چینی زراندود و شفاف و شیشہ" سب چیزیں جمع کر کے بداؤں دروازے کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئیں اور شراب کو میدان میں اس طرح لنڈھا دیا گیا کہ ایک دلدل سی پیدا ہو گئی[۵] امراء کو حکم دیا گیا کہ وہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر شہر کے بازاروں، گلی کوچوں سڑکوں اور محلوں میں شراب نوشی کے انسداد کی منادی کریں۔

برنی نے لکھا ہے کہ اس حکم کا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ حیادار تھے انہوں نے اس کے بعد شراب پینا بند کر دیا۔ جو لوگ "بدنفس" اور "بے شرم" تھے انہوں نے اپنے گھروں میں بھٹیاں کھول لیں اور پوشیدہ طور پر تجارت کرنے لگے شہر کے باہر سے لوگ

۱؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۶۔ ۲؎ کوٹلیا کے ارتھ شاستر میں شراب بنانے اور فروخت کرنے پر کچھ پابندیاں لگانے کا ذکر ضرور ہے (ملاحظہ ہو ص ۱۳۱) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں انسداد شراب نوشی کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا تھا، لیکن مکمل انسداد کے قوانین بنانے کا سہرا علاء الدین ہی کے سر ہے۔

۳؎ "بگنی بفتح با و سکون کاف فارسی۔ نوعے از شراب باشد کہ آں را با عربی نبیذ خوانند ... و بالکے فارسی یعنی بگنی نیز بہ نظر آمدہ" صائب کا شعر ہے ؎

مست گشتم ز جرعہ بگنی　　　　شد مزاجم ز بھنگ مستغنی

۴؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۴ ۵؎ ایضاً ص ۲۸۵۔

شراب مشکوں میں بھر کر لاتے تھے اور ہزاروں حیلوں اور بہانوں سے خفیہ کاروبار کرتے تھے۔ سلطان نے سختی سے ان کارروائیوں کو روکنے کی کوشش کی۔ شہر کے دروازوں پر لوگ متعین کیے گئے۔ جو ان معاملوں میں تفتیش کرتے تھے اور جو شخص بھی اس جرم کا مرتکب ہوتا اُس کو زدوکوب کرنے کے بعد کنوئیں جیسے قید خانوں میں بند کر دیا جاتا تھا اور ساری شراب ہاتھیوں کو پلا دی جاتی تھی۔ یہ قید خانے اس قدر تنگ و تاریک تھے کہ ایک مرتبہ جو شخص وہاں بند کر دیا جاتا اس کا صحیح حالت میں نکلنا مشکل تھا۔ چنانچہ بہت سے قیدی تو ان کنوؤں میں "تنگی و صعوبت" سے مر گئے۔ اگر کچھ لوگ زندہ نکل بھی آئے تو اس حالت میں کہ

"مدت ہا می بایست تا ایشاں بتداوی نیکو شوند و قوت گیرند" [1]	انہیں علاج معالجہ سے ٹھیک ہونے اور قوت حاصل ہونے کے لیے مدت درکار ہے۔

بداؤں دروازہ کے باہر ان قید خانوں کا منظر اس قدر خوفناک اور ہوش ربا تھا کہ بہت سی لوگوں نے ان سے ڈر کر ہی شراب سے توبہ کر لی [2]

یحییٰ سرہندی نے لکھا ہے کہ ایک خاص واقعہ نے سلطان کی طبیعت کو شراب نوشی ترک کرنے اور عوام کو اس سے روکنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ ایک رات مجلس شراب جمی ہوئی تھی۔ سلطان نے نشہ کی حالت میں قاضی بہا کو مروا دیا۔ صبح کو قاضی بہا کو طلب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو گزشتہ شب قتل کیا جا چکا ہے۔ علاء الدین کو اس کا بیحد خیال ہوا، فوراً شراب نوشی سے توبہ کی اور اپنے شراب خانے کو تباہ کرا دیا۔ [3]

انسداد شراب فروشی سے سلطان کو بڑا مالی نقصان ہوا لیکن اس نے بقول برنی —

"خراجہائے بے اندازہ ایشاں از دفاتر دور کردند" [4]

بعض لوگ سلطان کی اس سخت گیری کے باوجود شراب نوشی ترک نہ کر سکے۔ غیاث پور،

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۶ — [2] ایضاً ص ۲۸۶

[3] تاریخ مبارک شاہی ص ۷۴-۷۵ — [4] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۴۔

اندرپت، کیلوگھری اور اس کے قرب وجوار میں تو اُن کو سلطان کے احکام کے خلاف کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، لیکن کچھ میل دور قصبات میں جاکر وہ شراب پی لیتے تھے۔ آخر میں سلطان نے ان شرابیوں کے ساتھ اتنی رعایت کردی تھی کہ اگر وہ خفیہ طور پر اپنے گھر کی بھٹی میں شراب تیار کرکے دروازہ بند کرکے تنہائی میں پی لیتے تھے تو حکومت "محتسب را درونِ خانہ چہ کار" پر عمل کرتی تھی اور ان کو کوئی ایذا نہیں پہنچائی جاتی تھی۔[۱]

اصحاب اباحت پر سختی علاء الدین خلجی کی دین داری کی تعریف کرتے ہوئے امیر خسرو لکھتے ہیں:

"باز از آنجا کہ کمال دین داری ایں معین	پھر جب اس مددگار شریعت کے کمال دینداری
شریعت جملگی اصحاب اباحت را احضار	نے تمام اصحاب اباحت کو بلوایا اور سچے
فرمود، ومتفحصان صادق را بر ایشاں	جاسوس اپنے مقرر کردیے تو ان میں سے ہر
گماشت تا ہر یک را پیش جستند واز	ایک کو دربار میں بلایا اور ان کی تفتیش کی۔
وے تفتیش کردند"[۲]	

برنی نے سلطان کے آخری سالوں کے احکام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

وہم در بیشتر سنوات مذکور در شہر اباحتیاں	اور ان ہی سالوں میں اباحتی اور بودھکان شہر
وبودھکان پیدا آمدند، سلطان علاء الدین	میں نمودار ہوئے، سلطان علاء الدین کے حکم
فرمود تا بہ تتبع وتفحص بلیغ ہر ہمہ را بدست	کے مطابق انہیں تلاش کرکے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ
آوردند وبہ بدترین سیاست بکشتند واره	کر جمع کیا گیا اور بُری طرح سے قتل کردیا گیا۔
سیاست بر سر ایشاں می راندند و درد	آرہ سیاست اُن کے سر پر پھیر کر اُن کے ٹکڑے
پرکالہ میکردند بعد سیاست مذکور نام	ٹکڑے کردیے گئے۔ اس قتل کے بعد اس شہر میں
اباحت دریں شہر بر زبان کسے نگذشتہ[۳]	اباحت کا نام تک کسی کی زبان پر نہیں آیا۔

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۶۔ طبقات اکبری جلد اول ص ۱۵۳ [۲] خزائن الفتوح ص ۲۱

[۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۳۶۔ نیز طبقات اکبری جلد اول ص ۱۶۸

یہ اصحاب اباحت کون تھے اور کس مذہب سے تعلق رکھتے تھے؟ نہ امیر خسروؒ نے اس کی وضاحت کی ہے اور نہ برنی نے۔ فیروز شاہ نے فتوحات میں "ملحدان و اباحتیان" کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "پیران ایشاں شیعہ بودند"[1] سیرت فیروز شاہی میں لکھا ہے:

"گروہے ملاحدہ در شہر باب اباحت را مفتوح گردانیدہ بودند۔ عمال شہر پیش سریر سلطنت خلد اللہ ملکہ بموقف عرض رسانیدند کہ گروہے ملحدان و اباحتیان در شہر پیدا شدہ اید و مردم را بسوئے مذہب باطل خویش دعوت می کنند روزے معین دارند کہ دراں روز در مقامے کہ برائے ایں کار مقرر کردہ اند آنجا جمع می شوند ۔۔۔ و برسم بت پرستاں برنج و گل آنجا می اندازند، آنرا کہ می خواہند متابع خود گردانند، برآں زمین سجدہ می کنانند و کلمات کفر تلقین می کنند و ایشاں را می گویند کہ از دین اسلام بگرد و اقرار کن کہ متابع شما شدم و دختران و زنان و مادران و خواہران را آنجا شب جمع می کنند و گوشت خوک و خمر می خورانند، و جامہائے

ملاحدہ کے ایک گروہ نے شہر میں اباحت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ عمال شہر نے سلطان (فیروز شاہ) کے حضور میں عرض کیا کہ ملحدوں اور اباحتیوں کا ایک گروہ شہر میں پیدا ہو گیا ہے اور لوگوں کو اپنے باطل مذہب کی طرف دعوت دیتا ہے (ان کی روش یہ ہے کہ) ایک مقررہ دن مقررہ مقام پر جو اس کام کے لیے منتخب کر لیتے ہیں جمع ہو جاتے ہیں اور ۔۔۔ بت پرستوں کی رسم کے مطابق چاول اور پھول وہاں ڈالتے ہیں۔ جن لوگوں کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہیں ان سے اس زمین پر سجدہ کراتے ہیں اور کلمات کفر کی تلقین کرتے ہیں۔ ان سے کہتے ہیں کہ دین اسلام سے دست بردار ہو جاؤ اور اقرار کرو کہ تمہارا تابع ہو گیا۔ اور بیٹیوں، عورتوں، ماؤں اور بہنوں کو اس جگہ رات کے وقت جمع کرتے ہیں اور ان کو شراب پلاتے اور سور کا گوشت کھلاتے

[1] فتوحات فیروز شاہی ص ۸۔ یہ بات قابل غور ہے کہ "پیران ایشاں شیعہ بودند" فتوحات کے صرف ایک نسخہ میں ہے

عورات میکشانند ... پس در تاریکی شب بردست هرکه ازایشان ... افتاد اگرچه مادر و خواهر و دختر اوست می بردو ... سفاح می کنند"[1]

ہیں، اور کپڑے اُتار دیتے ہیں ... پھر شب کی تاریکی میں جو عورت جس کے ہاتھ پڑ گئی، خواہ اس کی ماں ہو، بہن ہو یا بیٹی، اس کے ساتھ زنا کرتے ہیں

پروفیسر محمد حبیب کا خیال ہے کہ اصحاب اباحت سے قرامطہ، اسمٰعیلی اور دیگر مرتد شیعہ طبقے مراد ہیں[2] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اباحتیوں کو ہندوؤں کے وام مارگی فرقہ میں شمار کیا ہے[3]

جہاں تک اباحتی فرقوں کا تعلق ہے، قرون وسطیٰ میں مختلف مقامات پر اس قسم کے فرقوں کے وجود کی شہادتیں ملتی ہیں۔ فخر مدبر نے ترکوں کے بعض قبائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

جمله مردان بریک نیمهٔ آب باشند و جمله زنان بر دیگر نیمه، و شبیست در سالے معین که آں زنان ازآں آب بگذرند و بنزدیک مردان روند و با یک دیگر بباشند و هیچ کس را زنے یا شوے معین نیست، باهر که خواهند گرد آیند و همچناں ایستاده چوں ستوراں مباشرت کنند"[4]

کل مرد دریا کے ایک طرف ہوتے ہیں اور ساری عورتیں دوسری طرف۔ سال میں ایک رات ایسی مقرر ہے جب وہ عورتیں پانی سے گزر کر مردوں کے پاس جاتی ہیں اور اُن سے اختلاط کرتی ہیں، اور کسی کا مرد یا کسی کی عورت مقرر نہیں ہوتی۔ جس سے چاہتے ہیں مباشرت کرتے ہیں۔ جانوروں کی طرح کھڑے ہو کر

---

[1] سیرت فیروز شاہی (روٹوگراف قلمی نسخہ بانکی پور) ص ۷۲ ب، ۷۳ الف۔

[2] خزائن الفتوح کا انگریزی ترجمہ ص ۱۲، پروفیسر ہودی والا کا خیال بھی یہی ہے، ملاحظہ ہو: *Studies in Indo-Muslim History* p 282-283.

[3] *Administration of the Sultanate of Delhi* p. 254-257 (Second Edition)

[4] تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۴۰

بیلیو (Bellew) نے افغانستان کے چکنی فرقہ کا ذکر کیا ہے جس میں اسی طرح کی اباحتی رسمیں جاری تھیں[1]

فِرَقِ اسلامی پر تحقیق کرنے والے بعض علماء نے اسماعیلی فرقوں میں اباحتی روایات و اعتقادات کا ذکر کیا ہے[2] امام غزالیؒ نے اہل اباحت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایں جاہلان در قرآن نمی بینند"[3] جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان لوگوں کو مسلمانوں کے گمراہ فرقوں میں شمار کرتے تھے ___ بہر حال فتوحات فیروز شاہی اور سیرت فیروز شاہی کے بیانات کو سامنے رکھا جائے تو پروفیسر محمد حبیب ہی کے خیال کی تائید کرنا پڑتی ہے۔ عصامی نے واضح طور پر ان لوگوں کو ملاحدہ میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ علاء الدین کے مناقب میں لکھا ہے:۔

برانداره بر فرق الموتیاں　　　که فرق از زن و دخت کم بود شاں

مرآں قوم را اہل ہندوستاں　　　بخوانند "بورہ" بہ ہندی زباں[4]

بہر حال علاء الدین نے ان اصحاب اباحت کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کیا۔ علاوہ ازیں جب بھی اُسے کسی جگہ زنا کی اطلاع ملتی تھی تو وہ شریعت کے مطابق سزا دیتا تھا اور کہتا تھا کہ اس ضمن میں

"آنچہ حکم پیغامبران است آں مکنم"[5] جو پیغمبروں کا حکم ہے میں وہی کرتا ہوں۔

طوائفوں کے نکاح التمش کے عہد میں طوائفوں کا مسئلہ زیر غور آیا تھا لیکن اس وقت سید نور الدین مبارک غزنویؒ کی رائے یہ تھی کہ:

"ایں چنیں طوائف را منع نباید کرد　ان لوگوں کو منع نہیں کرنا چاہیے اس لیے

---

[1] ملاحظہ ہو H. W. Bellew: the Races of Afghanistan

[2] ملاحظہ ہو بغدادی: الفرق بین الفرق (مطبوعہ مصر ۱۹۲۳ء) ص ۱۷۶-۱۷۵، ابن حزم: کتاب الفصل والملل (مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ) ص ۱۸۵۔　[3] کیمیائے سعادت ص ۳۱

[4] فتوح السلاطین ص ۳۰۱، برنی نے جو "ملاحدہ و بودھکان" لکھا ہے کیا اس میں "بودھکان" سے مراد یہی "بورہ" ہیں؟　[5] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۶۔

کہ اگر ایں قوم نباشند بسیار بدبختاں از سر غلبۂ شہوت در محارم افتند"[1]	اگر یہ قوم نہ ہوگی تو بہت سے بدبخت شہوت سے مغلوب ہو کر محارم میں کو دپڑینگے۔

علاءالدین کی رائے اس معاملہ میں مختلف تھی۔ اس نے جب غیر سماجی عناصر کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا تو طوائفوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے پیشہ کو چھوڑ کر پاک دامنی کی زندگی بسر کریں۔ سلطان نے زبردستی اُن کے نکاح کرا دیے۔ امیر خسروؒ نے لکھا ہے "برہمہ بعقد حبالہ پائے بند گشتہ"[2] اس کا جو نتیجہ ہوا وہ بھی امیر خسروؒ ہی کی زبانی سُنیے:

"کار پرہیزگاری ایشاں بجائے کشیدہ کہ در پردہ ستر ہنگام تافتن ریشہ دامنے بندامت تمام دست بر دست می مالند۔ فی الجملہ ہرچہ مادۂ فسق وفجور بود، چناں منقطع گشت کہ

اذا بات فحل بیت الزنا   فقد حاض بالبیض حلقومہ"[3]

سحرۂ خون آشام کا خاتمہ امیر خسروؒ نے لکھا ہے کہ سلطان نے "سحرۂ خون آشام" کو گردن تک زمین میں گاڑ کر سنگسار کرا دیا۔ جادوگروں کا یہ گروہ بچوں کو زندہ کھا جاتا تھا[4]

اقتصادی نظام میں مذہبی جذبات علاءالدین خلجی کی اقتصادی اصلاحات کو قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ برنی نے لکھا ہے کہ سلطان نے "از کلاہ تا موزہ، واز شانہ تا سوزن واز نیشکر تا سبزی واز ہریسہ تا شوربہ واز حلوائے صابونی تا ریوڑی واز کاک وبریاں تا نان بہتی وماہی واز برگ تنبول ورنگ سپاری واز گل تا خضریات"[5] ہر چیز کا نرخ مقرر

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۴۔ [2][3] خزائن الفتوح ص ۱۹۔ فرشتہ (جلد اول ص ۱۱۴) نے ملحقات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک دن ایک ندیم نے سلطان کو خوش وقت پاکر یہ عرض کیا کہ حضور نے سب چیزوں کے تو نرخ مقرر کر دیے ہیں لیکن ایک چیز جو "ضرور ترین وبہترین" ہے وہ باقی رہ گئی ہے۔ سلطان کے پوچھنے پر اس نے "قحبہ ولولی" کی طرف اشارہ کیا۔ سلطان نے اُن کی اول، دوم وسوم، تین قسمیں کرنے کے بعد قیمتیں مقرر کر دیں ۔۔۔ امیر خسروؒ کے صاف اور واضح بیان کے پیشِ نظر فرشتہ کے اس قصہ کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ [4] خزائن الفتوح ص ۲۰۔

[5] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۱۵-۳۱۶

کر دیا تھا۔ اشیائے خوردنی بالخصوص غلہ کی بڑھتی قیمت کو روکا تھا اور احتکار کے خلاف سخت انتظامی تدابیر اختیار کرنے کے بعد ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ ـــــ

"در سالہائے کہ امساکِ باراں شدے	جن سالوں میں بارش کی کمی ہوتی تھی، اور جب
و در امساک باراں قحط لازم بود، در	بھی ایسی صورت پیش آتی تھی قحط لازمی پڑتا تھا
دہلی قحط نیفتادے و یک دانگ از نرخ	لیکن دہلی میں (اب) قحط نہیں پڑتا تھا اور
سلطانی بالا رفتن نہ در غلہ سلطانی و	یہ ممکن نہ تھا کہ غلہ سلطانی یا غلہ کاروانی میں سلطان
نہ در غلہ کاروانی ممکن نگشت" [۱]	کے مقرر کیے ہوئے نرخ سے ایک دانگ بھی بڑھ جائے

زمانۂ حال کے بعض مصنفین نے ان اصلاحات و تدابیر کا سبب فوجی ضروریات کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اپنی سیاسی اور ملکی ضروریات کے پیش نظر فوج کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہتا تھا، اس زمانہ میں فوجیوں کو جو تنخواہ ملتی تھی وہ اتنی قلیل تھی کہ اُن کا بخوبی گزارہ نہ ہوتا تھا۔ اور وہ تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ سلطان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ بیک وقت سپاہیوں کی تنخواہ میں بھی اضافہ کر دے اور اُن کی تعداد بھی بڑھا دے۔ چنانچہ اُس نے تمام ضروری اشیاء کی قیمتیں مقرر کر دیں اور اس طرح اس قلیل تنخواہ میں سپاہیوں کے لیے گزارہ کرنا ممکن ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ملکی ضروریات اور سیاسی مقتضیات نے بھی سلطان کو ان تدابیر کے اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا، لیکن ان اقتصادی اصلاحات میں عوام کی افادیت اور بہبود کا جذبہ سب سے بڑا محرک تھا۔ برنی نے جس طرح ان اصلاحات و تدابیر کی تفصیل دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی افادیت کا دائرہ صرف فوجیوں تک محدود نہ تھا۔ ملتان میں مولانا شمس الدین ترک نے اس کے اثرات محسوس کیے تھے اور اس سلسلہ میں سلطان کی تعریف کی تھی۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے عہد علائی میں ارزانی کے متعلق ایک بار فرمایا تھا ـــــ

چہ ارزانی بود، دریں زمستانہا ہیچ فقیر	(اس زمانہ میں) کتنی ارزانی تھی۔ ان جاڑوں

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۱۵-۳۱۶

بے لباچہ نبودے، وآں لباچہ چند شدے"۔ ؎۱

میں کوئی فقیر بے لباچہ نہ ہوتا تھا۔ بعضوں کے پاس تو کئی کئی ہوتے تھے!

اس سلسلہ میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے ملفوظات خیر المجالس میں بہت دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ لکھا ہے:

بعد ازاں حکایت فرمودند کہ قاضی حمید الدین ملک التجار درآں مدت در خطہ اودھ رفتہ بود۔ دعوت کردہ ومرا طلبید۔ چوں خلق بازگشت مایکجا نشستہ بودیم حکایت کرد کہ وقتے سلطان علاؤالدین را دیدم بر تنگے؎۲ نشستہ، وسر برہنہ وپا بر زمین، مبہوت در خیالے فرو شدہ می کوبد من پیش رفتم، سلطان را خبر نبود، باز گشتم۔ بیروں آمدم بر ملک قرابیگ گفتم کہ سلطاں را ایں چنیں دیدم، برو بیبیں چہ حالست۔ ملک قرابیگ در مجلس جلیس ہم بودے۔ پیش رفت وسلطان را در سخن درآورد۔ بعد ازاں ایں عرضداشت کرد کہ بادشاہ مسلماناں! عرضے دارم۔ فرمان داد: بگو۔ قاضی پیش شدہ گفت: من دروں آمدم، بادشاہ

اس کے بعد یہ حکایت بیان فرمائی کہ قاضی حمید الدین ملک التجار ان دنوں اودھ گیا ہوا تھا اس نے دعوت کی اور مجھے بلایا۔ جب (بعد دعوت) لوگ رخصت ہوئے تو میں اور وہ ایک جگہ بیٹھے۔ تو اس نے یہ قصہ بیان کیا کہ ایک بار میں نے سلطان علاء الدین کو دیکھا کہ تخت پر بیٹھا ہے، سر برہنہ، کسی خیال میں غرق زمین پر پاؤں مار رہا ہے۔ میں روبرو گیا۔ بادشاہ خیالات میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اُسے خبر نہ ہوئی میں واپس آگیا۔ باہر آکر میں نے ملک قرابیگ سے کہا کہ میں نے سلطان کو اس طرح دیکھا ہے تم بھی چلو اور دیکھو کہ کیا صورت ہے۔ ملک قرابیگ جلیس مجلس بھی تھا۔ اندر گیا اور سلطان کو باتوں میں لگایا۔ اس کے بعد عرض کیا کہ بادشاہِ مسلماناں! میری ایک عرض ہے۔ حکم ہوا: کہو قاضی نے آگے بڑھ کر عرض کیا: میں اندر آیا تھا،

؎۱ خیر المجالس ص ۲۴۰   ؎۲ تنگ = تخت (شمس اللغات)

را دیدم بدین حال، سر برہنہ و در تفکر
شدہ، بادشاہ در چہ تفکر بود۔ سلطان گفت:
بشنوید، چند باشد کہ مارا خیالے در دل
شدہ است، با خود می گفتم اے فلاں
خدائے تعالیٰ را در جہاں چندیں بندگان
اند، مارا بر سر ایشاں برگزید، اکنوں چیزے
می باید کرد کہ از من نفع ہمہ خلق رسد
با خود گفتم چہ باید کرد۔ جملہ خزائن کہ من
دارم و صد چندیں دیگر باشد بدہم بہمہ خلق
نرسد و اگر دیہ ہا و ولایتہا دہم، ہم نرسد
دریں تفکر بودم کہ چہ کنم کہ از من ہمہ کس
منفعت برسد۔ ایں زماں چیزے در
دل من گذشتہ است۔ با شما بگویم۔ گفتم
کہ غلہ ارزاں بکنم کہ نفع اں بہمہ خلق برسد،
و غلہ چگونہ ارزاں شود؟ فرمان بدہم کہ جملہ
نائکاں اطراف را بطلبند۔ ایشاں کہ غلہ ہا
از اطراف در شہر می آرند۔ بعضے در ہزار
ستور می آرند و بعضے بیست ہزار۔ ایشاں
را بطلبم۔ و جامہ بدہم و سیم از خزانہ بدہم
و خرج خانہ ہائے ایشاں بدہم، تا غلہ ہا
بیارند۔ نرخے کہ من کنم بداں نرخ بفروشند۔

سلطان کو اس حال میں دیکھا کہ سر برہنہ ہے اور
خیالات میں غرق۔ بادشاہ کو کیا فکر لاحق تھی۔
سلطان نے جواب دیا: سنو، مجھ کو چند روز سے
یہ فکر ہے کہ میں دل میں سوچتا ہوں کہ مجھ کو اللہ
تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر حاکم بنایا ہے، اب کچھ
ایسا کام کرنا چاہیے کہ مجھ سے تمام خلق کو فائدہ
پہنچے۔ دل میں سوچا کہ کیا کروں۔ اگر تمام خزانہ
جو میرے پاس ہے، بلکہ اس کا سو گنا اور بھی
اگر تقسیم کر دوں تب بھی سب خلق کو نفع نہ ہوگا۔ اگر
گاؤں اور ولایتیں تقسیم کروں، تب بھی سب کو
نہیں پہنچ سکتیں۔ اسی فکر میں تھا کہ کیا کروں
کہ مجھ سے تمام خلق کو فائدہ پہنچے۔ اس وقت
ایک تدبیر خیال میں آئی ہے، تم سے کہتا ہوں۔
میں نے سوچا کہ غلہ کی ارزانی کی تدبیر کروں تاکہ
اس سے سب خلقت کو فائدہ پہنچے۔ اور غلہ
کس طرح سستا ہو سکتا ہے؟ اس کی یہ صورت
ہے کہ میں فرمان دوں کہ تمام نائکوں کو اطراف سے
طلب کیا جائے۔ ان کو (یعنی) جو غلہ اطراف و جوانب
سے شہر میں لاتے ہیں۔ اُن میں سے بعض ہزار ستور
(بیل یا گھوڑے) لاتے ہیں اور بعض بیس ہزار۔ ان
کو میں بلاتا ہوں۔ ان کو کپڑے دونگا، چاندی دونگا

ہمچناں فرماں داد، غلہ ہا از اطراف رسیدن گرفت۔ میان چند روز ہفت جیتل من شدہ، روغن و شکر و نعمتہائے دیگر، جملہ ارزاں شد و بہ ہمہ خلق عالم ازو نفع رسید، چہ بادشاہے بود سلطان علاء الدین رحمۃ اللہ علیہ"[1]

اُن کے گھروں کا خرچ دونگا۔ تاکہ وہ غلہ یہاں لائیں (اور) جو نرخ میں مقرر کروں اُس پر فروخت کریں۔ چنانچہ اس نے یہی حکم دیا۔ اطراف و جوانب سے غلہ آنا شروع ہو گیا۔ چند دن کے اندر نرخ سات جیتل فی من ہو گیا۔ گھی، شکر اور ضروریات کی جملہ چیزیں ارزاں ہو گئیں اور اس سے تمام خلقت کو فائدہ پہنچا۔ کیسا بادشاہ تھا سلطان علاء الدین۔ اللہ کی رحمت ہو اس پر!

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح کے اس بیان کی اہمیت اور صداقت کا اندازہ لگانے کے لیے مندرجۂ ذیل حقائق کو ذہن میں رکھنا چاہیے:

(۱) شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح، علاء الدین خلجی کے معاصر تھے۔ اسی کے عہد میں اودھ سے دہلی تشریف لائے تھے اور شیخ نظام الدین اولیا رح کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جب تک اُن کی والدہ زندہ رہیں وہ متعدد بار دہلی سے اودھ آتے جاتے رہے۔ انہوں نے عہد علائی کی اصلاحات اور ان کے اثرات کا مطالعہ دہلی سے اودھ تک کیا تھا۔

(۲) شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح سلاطینِ وقت سے کسی قسم کا تعلق رکھنا روحانی سعادت کے منافی تصور کرتے تھے۔ نہ اُن کے مرشد نے اور نہ خود اُنہوں نے، نہ علاء الدین سے کبھی ملاقات کی، نہ سیاسی معاملات میں کبھی مداخلت کی۔ اس بیان میں درباداری یا مبالغہ آرائی کا کوئی عنصر تلاش کرنا تاریخی واقعات کو مسخ کرنے کے مترادف ہو گا۔

(۳) شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح کے والد تجارت کرتے تھے۔ اس طرح شیخ نصیر الدین رح کو بھی اس دور کے عام اقتصادی حالات کا علم ضرور ہو گا۔ انہوں نے تاجروں کی حالت کے متعلق جن تاثرات کا اظہار خیر المجالس میں کیا ہے وہ ان کے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں

[1] خیر المجالس ص ۳۴۱

(۴) جن دو شخصوں کے نام اس گفتگو میں آئے ہیں، وہ دونوں علاء الدین خلجی کے مقربین میں شمار ہوتے تھے۔ ملک قرابیگ کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے کہ "اخص الخواص پادشاہ علاء الدین خلجی بود"۔ ملک التجار حمید الدین کے متعلق برنی کا مندرجہ ذیل بیان ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

"در آخر عصر علائی کہ سلطان علاء الدین راچنداں استقامتے در مزاج نماندہ بود قضاء ممالک دہلی کہ مسندے بس بزرگ است وتزیید مگر بزرگان وبزرگ زادگان راکہ بوجود علم ونسب تقوی وحسب آراستہ باشد بملک التجار حمید الدین ملتانی کہ چاکر خانہ وپردہ دار وکلید دار کوشک او بود بدو تفویض کرد"۔[1]

عصر علائی کے آخری دنوں میں جب سلطان علاء الدین کے مزاج میں چنداں استقامت نہ رہی تھی۔ قضا ممالک دہلی جو بہت بڑا عہدہ ہے اور صرف ان بزرگوں اور بزرگ زادوں کو زیب دیتا ہے جو علم نسب، تقوی اور حسب سے آراستہ ہوں، اس نے ملک التجار حمید الدین ملتانی کے سپرد کر دیا جو چاکر خانہ، پردہ دار، کلید دار کوشک رہ چکا تھا۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ حمید الدین کس قسم کا آدمی تھا۔ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ وہ ان مخصوص لوگوں میں تھا جو سلطان سے قربت کی بنا پر اس کی خلوت وجلوت کے متعلق پوری معلومات رکھتے تھے۔

(۵) خیر المجالس، فیروز شاہ تغلق کے عہد میں مرتب کی گئی تھی۔ کتاب میں بکھرے ہوئے مختلف مباحث کو یکجا کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شیخ نصیر الدینؒ عہد علائی کو عہد فیروزی پر ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے متعدد جگہ "فراخی سال عہد سلطان علاء الدین" کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس زمانہ میں عام لوگ زیادہ خوش حال اور فارغ البال تھے ــــ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ علاء الدین کی اقتصادی اصلاحات وتدابیر سے عام لوگ بے حد خوش تھے۔

(۶) عصامی نے برن کے ایک طبیب کا قصہ لکھنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ خدمتِ خلق ہی کے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۲۔

جذبے نے علاءالدین کا دل ان اصلاحات کی طرف رجوع کیا تھا۔ لکھتا ہے ؎

وزاں پس شنیدم کہ تا زندہ بود | بہ دفع خیانت شرعے نمود
یکے حبّہ ہم تفاوت نخواست | بہ عہدش ہمہ سنگہا گشت راست
اثر کرد آں صدق در نرخہا | ہمہ چیز را شد بہ عشرے بہا
بعہدش بیاسود ہر خاص و عام | دعا گوئے او گشتہ ہر صبح و شام
ہم آخر چو زیں کوچگہ برگذشت | مر او را ہماں صدق ہمراہ گشت [1]

(۷) عصامی ہی نے ایک دوسری حکایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سلطان نے کن جذبات کے ماتحت اشیاء کے نرخ مقرر کیے تھے۔ لکھا ہے کہ ایک دن بزم مے و نشاط منعقد ہو رہی تھی۔ یک لخت ایک شخص داخل ہوا اور ــــــ

بگفتا کہ "شاہا سئے خوش گوار | گوارندہ بادت بسے روزگار!
و لے جائے نقل اندریں داوری | ہماں بہ غم زیر دستاں خوری
مبادا ضعیفے بہ دورت ہلاک | زمیں بادا از جرعہ ریز تو پاک
شنیدم کہ امروز در مسندہ | بہ عہدت کہ حق را گزیں بندہ
پئے غلّہ اے خسروِ کامراں | چناں گشت انبوہے مرداں
کہ از غایتِ قحط و خشکیِ سال | شد آں جا ضعیفے دو سہ پائمال" [2]

علاءالدین یہ گفتگو سن کر چونک پڑا (شد افسردہ، دستے ز ساغر کشید) اور کہنے لگا کہ کل قیامت کے دن اس کا کیا جواب دونگا! یہ کہہ کر ندامت سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، اور شراب کو بالکل ترک کر دیا، اور غلّہ کی ارزانی کے احکام نافذ کیے اور محتکروں کو سزائیں دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

گروہے کہ از فاقہ ہا سوختند | دل از آتشِ جوع افروختند
ہم از مطبخ خاص شفقت کناں | بہ ہر روز شاں را رسانند ناں [3]

---

[1] فتوح السلاطین ص ۳۱۲ [2] و [3] ایضاً ص ۳۱۴-۳۱۵

خیر المجالس اور فتوح السلاطین کے بیانات کو افسانہ سمجھ کر نظرانداز کردینا صحیح نہ ہوگا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سلطان علاء الدین خلجی کے متعلق یہ قصّے اس وقت تک مشہور ہو ہی نہیں سکتے تھے جب تک عوام کے خیالات سے وہ مطابقت نہ رکھتے اور جب تک لوگوں کو سلطان کے صدق نیت پر پورا اعتماد و یقین نہ ہوتا اور اس کی ان تدابیر سے معاصرین نے فائدہ نہ اُٹھایا ہوتا!—

جب ابن بطوطہ ہندوستان آیا تو اس نے لوگوں کو سلطان علاء الدین کا مداح پایا۔ لکھتا ہے:

"وہ بہت اچھے بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور اہل ہند اب تک اس کی تعریف کرتے ہیں... کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس نے محتسب سے دریافت کیا کہ گوشت کے گراں ہونے کا کیا سبب ہے۔ اس نے کہا کہ گائے اور بکری پر زکوٰۃ (یعنی محصول) لی جاتی ہے۔ بادشاہ نے اُسی روز سے کل محصول اس قسم کے معاف کردیے۔ اور سوداگروں کو بلا کر راس المال اپنے خزانہ سے دیا اور کہا کہ اس کی گائے اور بکریاں خرید لاؤ اور ان کو بیچ کر قیمت خزانہ میں داخل کرو۔ اور ان کی کچھ اجرت مقرر کردی۔ اسی طرح دولت آباد سے جو کپڑا آتا تھا۔ اس کا انتظام کیا۔ ایک دفعہ غلّہ بہت گراں ہوگیا تو اس نے سرکاری گودام کھلوا دیے اور نرخ سستا ہوگیا۔"[1]

عفیف نے لکھا ہے:

"فراخی سال کہ در عہد دولت علائی بود	جو فراخی عہد علائی میں تھی، کسی بادشاہ دین پناہ
در عہد ہیچ پادشاہے دیں پناہے نبود۔	کے عہد میں نہیں ہوئی۔ سلطان علاء الدین
وسلطان علاء الدین برائے ارزانی	نے چیزوں کی ارزانی کے لیے جو کوشش کی
نعمت چنداں کوشش کرد کہ آں قصّہا	کہ اس کے قصّے مشہور تاریخوں میں درج ہیں
در تواریخ مشہور مذکور است۔ مایہ	سوداگروں کو روپیہ دیا۔ بے شمار مال اور

[1] عجائب الاسفار۔ ص ٦٦۔

بسوداگراں داد۔ اموال فراواں وزرہائے بے پایاں پیش ایشاں نہاد۔ ابواب مراحم پادشاہی برایشاں کشاد۔ ایشاں را مواجب معین کرد ... آنگاہ در عہد علائی بحکمت کبریائی ارزانی نعمت پدید آمد[۱]	بے حد سونا اُن کے سامنے ڈال دیا۔ مراحم پادشاہی کے دروازے اُن پر کھول دیے اُن کی تنخواہیں مقرر کیں۔ جب کہیں عہد علائی میں حکمت کبریائی سے ارزانی ظہور میں آئی۔

آج کا مورخ علاء الدین خلجی کے ان اقتصادی احکام و تدابیر کو خواہ عسکری ضروریات کا نتیجہ قرار دے خواہ سلطان کی آمرانہ فطرت کے نقوش اس میں پڑھنے کی کوشش کرے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ رہیگی کہ معاصرین نے اس پورے نظام میں بہبودی خلق و فلاح عام کے جذبات کار فرما پائے تھے اور اُن کو سلطان کی نیک نیتی پر پورا یقین تھا۔

نظام تعزیرات میں شرعی حدود سے تجاوز سزاؤں کے معاملہ میں بلبن کی طرح علاء الدین نے بھی شرعی احکام اور پابندیوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ برنی نے لکھا ہے:

"حالت سیاست فرمودن نظر در مشروع و نامشروع نینداختے و مشروع و نامشروع ندانستے"[۲]	قتل کرتے وقت نہ یہ دیکھتا تھا کہ یہ عمل جائز ہے یا ناجائز، نہ وہ مشروع و نامشروع کو جانتا تھا۔

اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل اعتراض بات یہ تھی کہ وہ سزا کو صرف مجرم تک ہی محدود نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کے پورے خاندان کو تہ تیغ کرا دیتا تھا۔ اور یہ بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور شریعت اسلامیہ کے بالکل منافی تھی۔ رسول اکرمؐ نے اپنے آخری خطبہ میں واضح الفاظ میں فرمایا تھا ـــ

الا لا یجنی جانٍ الا علیٰ نفسہ الا لا یجنی جانٍ علی ولدہ ولا مولود علی	ہاں مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے۔ ہاں باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۳-۲۹۴ [۲] ایضاً ص ۳۳۸

والدہ (ابن ماجہ و ترمذی) جواب دہ باپ نہیں۔

ایک مرتبہ کچھ نومسلم مغلوں نے دہلی میں شورش پیدا کی۔ سلطان نے نہ صرف ان کو سزا دی بلکہ اُن کی عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کرادیا۔ برنی نے اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

پیش ازاں در دہلی از گناہ مرداں در	اُس پہلے دہلی میں مردوں کے جرم پر کسی نے
زن وبچہ ایشاں دست نمی انداختند و	عورتوں اور بچوں کو سزا نہیں دی تھی اور
زنان واطفال مجرماں رانمی گرفتند و	مجرموں کی عورتوں اور بچوں کو نہ پکڑا جاتا تھا نہ
حبس نمی کردند" [1]	قید میں ڈالا جاتا تھا۔

آگے چل کر برنی اس پر اپنے غم و غصہ کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

وایں ظلم در ہیچ دینے و مذہبے نکردہ	اور یہ ایسا ظلم ہے کہ کسی دوسرے دین اور
اند۔ [2]	مذہب والے نے بھی نہیں کیا ہے۔

برنی نے نصرت خاں کے مظالم[3]، الگ خاں کے ساتھیوں کے بہیمانہ قتل[4]، نومسلموں کی بربادی[5] پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ان حرکات کو "فرعونی و نمرودی" سے تعبیر کیا ہے۔

علاء الدین امیر خسروؒ کی نظر میں سلطان بلبن کے زمانہ سے لے کر سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد تک امیر خسروؒ دربار شاہی سے متعلق رہے تھے۔ اگر ایک طرف اُنہوں نے ملک چھجو، شہزادہ محمد، حاتم خاں وغیرہ کی مدح سرائی کی تھی تو دوسری طرف جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، مبارک خلجی اور غیاث الدین تغلق کے دربار بھی اُن کے قصیدوں سے گونج اُٹھے تھے۔ ان سب قصیدوں کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علاء الدین کی تعریف میں جو قصائد لکھے گئے ہیں وہ جذبات کی فراوانی اور تاثیر میں بے مثال ہیں۔

امیر خسروؒ نے اپنی مثنویوں میں علاء الدین کی مذہبی دلچسپیوں کا نہایت بلند آہنگی سے ذکر

---

[1] و [2] و [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۵۳ [4] ایضاً ص ۲۷۶

[5] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۳۶۔

کیا ہے[1]۔ مطلع الانوار میں لکھتے ہیں ؎

شاہ محمدؐ کہ بتائید رائے — کرد قوی شرع رسولِ خدائے[2]

اسی مثنوی میں ایک جگہ سلطان کو "ایمان پناہ" کہا ہے اور یہ اعلان کیا ہے ع

قاعدۂ ملکِ تو بنیادِ دیں

دول رانی میں کہتے ہیں ؎

علائے دین و دنیا شاہِ والا — بقدرت نائبِ ایزد تعالےٰ

چو انصافِ عمرؓ صیتش شنیدہ — زایام عمر سویش دو دیدہ[3]

خزائن الفتوح میں لکھتے ہیں :-

"اثرے از آثر جہانداری ایں خلیفہ محمد نام، ابوبکر صدق، عمر عدل، نیز باز گویم کہ عثمان وار آیات رحمت رحمانی را در جلد مصحف وجود چگونہ جمع آوردہ است و علی کردار ابواب علم را در مدینۃ الاسلام دہلی بکلید احسان بر چہ نمط باز کشادہ و ایں مصر جامع را از کف دجلہ فیض بچہ آب روشنی بغداد دادہ، و رایات عباسی از افتادن واقعات گراں خورد شکستہ بود بعلامات خلافت

یہ خلیفہ جو کہ محمد نام رکھتا ہے اور جو حضرت ابوبکر کا سا صدق اور حضرت عمر کا عدل رکھتا ہے اس کے کارناموں جہانداری میں سے ایک کارنامہ بیان کرتا ہوں کہ حضرت عثمان کی طرح اس نے خداوندی رحمت کی نشانیوں کو مصحف وجود کی جلد میں کس طرح جمع کر دیا ہے اور حضرت علی کی مانند علم کے دروازوں کو مدینۃ الاسلام دہلی میں کس طرح احسان کی کنجی سے کھول دیا ہے اور اس بڑے شہر کو فیض کے دجلہ کے پانی سے کس طرح بغداد کی سی روشنی بخشی ہے اور عباسی جھنڈے

---

[1] ملاحظہ ہو مجنوں لیلیٰ ص ۱۵-۱۷، آئینۂ سکندری ص ۱۴، مطلع الانوار ص ۲۴، ۲۷، ۲۸- شیریں خسرو- ص ۱۶، دول رانی خضر خاں ص ۱۷-۱۹

[2] مطلع الانوار ص ۱۴،

[3] دول رانی خضر خاں ص ۱۷-۱۹

خویش بر قاعدۂ عدل از سر برپائے کردہ، و عرصہ ممالک آفاق را از ارشاد رائے رشید بر چہ طریق مامون گردانیدہ در جمہور امور چہ نوع المستنصر باللہ و المستعصم بعونہ بودہ"[۱]

جو کہ سخت قسم کے واقعات پیش آنے کی وجہ سے سرنگوں ہو گئے تھے اُن کو کس طرح پھر اپنی خلافت کی نشانیوں سے عدل کے ستون پر قائم کر دیا ہے اور تمام دنیا کے ممالک کو اپنی پختہ اور صحیح رائے سے مامون الرشید کے طریقہ پر ڈال دیا ہے۔ عوام کے معاملات میں وہ کس طرح المستنصر باللہ اور المستعصم بنا ہوا ہے

علاء الدین، امیر حسن سجزیؒ کی نظر میں

خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ، عہد علائیؒ کے مشہور شاعر اور بزرگ تھے وہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے اور شیخ کے ملفوظات فوائد الفواد کے نام سے جمع کیے تھے، جو ہمیشہ "دستور صادقان ارادت"[۲] سمجھے گئے ہیں۔ وہ اپنے زمانہ میں سعدئ ہند کے نام سے مشہور تھے۔ قناعت اور تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے۔ معاصرین انہیں خاص عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُن کی زندگی میں متعدد بادشاہ تخت پر بیٹھے، بعض بادشاہ شعر و سخن سے دلچسپی بھی رکھتے تھے، مگر وہ سب درباروں سے علیحدہ رہے[۳] لیکن علاء الدین کے عہد میں انہوں نے خوب قصیدے کہے اور دل کھول کر سلطان کی تعریف کی۔ گو مبالغہ آرائی قصیدہ کی جان ہے، لیکن حقیقت نگاری اور قصیدہ نگاری میں تضاد نہیں امیر حسنؒ کے قصائد ذرا گہری نظر سے دیکھے جائیں تو مبالغہ کے پردے اُٹھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور سلطان کے اصلی خد و خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔

امیر حسنؒ نے جگہ جگہ علاء الدین کی "دین داری" اور "دین پروری" کی تعریف کی ہے۔ اور سلطان کو "دیں پرور"[۴] "دیں پناہ"[۵] "اسلام پرور"[۶] وغیرہ القاب سے مخاطب کیا ہے چند

۱؎ خزائن الفتوح ص ۲۷ ۲؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۰

۳؎ دیوان حسن سجزی (مطبوعہ حیدر آباد) مقدمہ ص ۶۳۔ ۴؎ دیوان حسن ص ۴۵۳، ۵۴۷، ۵۵۰۔ ۵؎ دیوان حسن ص ۴۵۵

۶؎ دیوان حسن ص ۵۲۵۔

اشعار ملاحظہ ہوں :-

فراہم می کند از فضل یزداں کار ملک و دیں　　بلے ایں کار ہا از فضل یزدانی ہمی باید
(ص ۴۸۵)

سلطان علاء دولت و دیں کز علو او
اسلام و شرع آمدہ ہر روز بیش بیش　　(ص ۵۰۱)

ہزار شکر کہ می پروریم جاں در ناز
بزیر رایتِ اسلام پرور سلطاں　　(ص ۵۲۵)

اے پشت و پناہ امم و بازوے خلقت
اے دیدۂ اسلام و پسندیدۂ سبحان　　(ص ۵۳۴)

شاہا! تو نگہ داشتۂ قاعدہ دیں
دیں را تو نگہبان و نگہبانِ تو یزداں　　(ص ۵۳۴)

ابو المظفر شاہ جہاں محمد شاہ
کہ چوں محمدؐ مقصود دہشت و چار آمد　　(ص ۴۸۴)

محمدؐ آشکارا کرد دیں حق بنام ایزد
کنوں در عہد ہم نامش شد ایں دیں آشکارا ہم　　(ص ۴۹۶)

ایک جگہ قسم کھا کر یقین دلاتے ہیں ؎

بجاں جملہ اسلامیاں خورم سوگند
کز وست بر ہمہ اسلام منت جانی[1]　　(ص ۵۵۵)

علاء الدین، عصامی کی نظر میں عصامی، محمد بن تغلق کے عہد کا مورخ اور شاعر ہے۔ اس نے اپنی کتاب فتوح السلاطین، برنی کی تاریخ فیروز شاہی سے آٹھ سال قبل لکھی تھی۔ اُس کے

---

[1] امیر حسن سجزی کے وہ تمام اشعار جن میں علاء الدین خلجی کے مذہبی افکار و رجحانات کی تعریف کی گئی ہے، خاکسار نے اپنے مضمون "علاء الدین خلجی کے مذہبی رجحانات" مطبوعہ برہان (مئی ۱۹۴۸ء) میں جمع کر دیے ہیں۔

آباواجداد سلاطین دہلی کے دربار میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے تھے۔ عصامی نے علاء الدین کے معتقدات مذہبی کی تعریف کی ہے اور اس کو "شاہِ دیں پرور" بتایا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے ؎

به عهدش کسے جز غمِ دیں نخورد — به دورش کس از غم شکایت نکرد
غم خلق می خورد تا زنده بود — زشاہاں ہمو گوئے عصمت ربود
غرض چوں ہمیں شاه فیروز فن — که بود ست دیں پرور و دوں شکن[1]

کتاب کے آخری حصہ میں محمد بن تغلق اور علاء الدین خلجی کا مقابلہ اور موازنہ کرنے کے بعد لکھا ہے ؎

محمدؐ اگر ہر دو را گشت نام — یکے از لئام است، دگر از کرام
گر او کرد اسلام را آشکار — ازیں کفر بگرفت یکسر دیار
گر او کرد در شرع احمد شروع — شد ایں منحرف از اصول و فروع[2]

عہد علائی کی مذہبی عمارتیں علاء الدین خلجی نے اپنے دورِ حکومت میں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں۔ امیر خسروؒ ان مسجدوں کی عظمت اور مضبوطی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مساجد دیگر در شہر باستحکامے بنا فرمود کہ چوں در زلزلہ قیامت نہ بام ہزار چشمہ فلک بیفتد، گوشۂ ابروے، ہیچ محرابے خم نہ گردد"[3]

متھرا میں بھی سلطان نے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی[4]۔ ۱۳۰۰ء میں الپ خان سنجری نے پٹن میں ادینہ مسجد سنگ مرمر کی تعمیر کرائی تھی[5]۔

اگر یہ صحیح ہے کہ عمارتوں کے طرزِ تعمیر اور کتبوں کے طرزِ تحریر سے بنانے والے کے احساسات و رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے تو علاء الدین کے عہد کی عمارتیں بغور مطالعہ کی مستحق ہیں۔ علائی

---

[1] فتوح السلاطین ص ۳۰۱ (مدراس ایڈیشن) [2] ایضاً ص ۶۰۵۔
[3] خزائن الفتوح ص ۲۵۔
[4] *Epigraphia Indo Moslemica, 1938 pp 59-61*
[5] *P. Brown: Indian Architecture p. 52.*

دروازہ کی محرابوں پر جو عبارتیں کندہ ہیں اُن کے مطالعہ کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ سلطان شریعت اسلامیہ کا بڑا احترام کرتا تھا اور مذہب سے بے اعتنائی کی داستان جو متعصب مورخوں نے پھیلائی ہے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

علائی دروازہ کی جنوبی محراب کا کتبہ ہے:

"بتوفیق ہیمتا و معاونت مینشی شرامثال المسجد اسس علی التقوی تعالیٰ امرہ وشانہ وتعالیٰ عدلہ واحسانہ بر مقتضی خیر مامور امر فول وجھك شطر المسجد الحرام محمد رسول اللہ علیہ السلام کما قال من بنی مسجد للہ بنی لہ بیتاً فی الجنۃ مجلس اعلیٰ خدایگاں سلاطین زماں شہنشاہ موسیٰ فر سلیماں مکاں راعی شرائط شریعت محمدی حامل مراسم ملت احمدی موکد معابر معالم ومساجد وموطد قواعد مدارس ومعابد وممہد بنیان رسوم مسلمانی ومؤسس مبانی مذہب نعمانی قالع اصول مردہ فجار وقاطع فروع قیدہ کفار وہادم بنا رصوامع اصنام، رافع اساس مجامع اسلام مظہر آیات اللہ، قاہر کفرہ رُوف متین قامع فجرۂ روئے زمین فاتح قلاع سامح امکان ضابط بقاع راسخ بنیان المعتصم الجلال اللہ المنان ابو المظفر محمد شاہ السلطان یمین الخلافت مبین اللہ ناصر امیر المومنین۔۔۔"[۱]

اسی طرح دوسری محرابوں پر بھی سلطان کے مذہب سے گہرے تعلق کا اظہار کیا گیا ہے۔ اگر درباری شعرار کی زبان اور شاہی معماروں کے ہاتھ سلطان کے جذبات کی ترجمانی کر سکتے ہیں تو ہمیں یہ کہنے میں قطعاً تامل نہیں ہونا چاہیے کہ سلطان مذہب سے اپنا تعلق ظاہر کرتا تھا اور اس کے دل میں شریعت کا کافی احترام تھا۔

عوام کے خیالات میں تبدیلی ابتدائے عہد میں علاءالدین کے مذہبی خیالات سے عوام بدظن ہو گئے تھے۔ اجراء مذہب کے متعلق اس کے منصوبوں نے خواص وعوام سب کو اس کی طرف سے

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو واقعات دارالحکومت دہلی جلد سوم ص ۱۸۳-۱۸۴!

مشکوک کر دیا تھا۔ لیکن اس ارادہ کو ترک کرنے کے بعد اُس نے اپنی زندگی میں اس قدر نمایاں تبدیلی کی کہ لوگوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ سلطان نے کبھی اس قسم کی حرکت کی بھی تھی یا نہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بہت سے مورخوں نے اجرا، مذہب سے متعلق اس کے خیالات کو بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ درستی اخلاق کے لیے اس کی مسلسل جدوجہد نے عام سماجی حالات پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ اسی زمانہ میں دربار سے احترامِ شریعت کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ایک طرف امیر خسروؒ کی یہ آواز کانوں میں پڑی ؎

شاہ محمد کہ بہ تائید رائے | کرد قوی شرع رسول خدائے

عمارتوں کی طرف نظر اُٹھی تو "حامیِ شریعت" "حاملِ مراسمِ ملّتِ احمدی" جیسے جملے نظر پڑے۔ تمام شکستہ مسجدوں اور محرابوں پر ایک بار پھر آب و تاب نظر آنے لگی[1]۔ برنی کا بیان ہے:

"در عہد علائی بسیار عمارت استحکام از مسجد و منارہ و حصار ہا و کاوانیدن حوض مشاہدہ و معائنہ شد، کدام بادشاہ را میسر شدہ است" [2]

سلطان علاء الدین کے عہد حکومت میں مسجدوں مناروں، قلعوں اور حوضوں کی جو مضبوطی اور استحکام دیکھنے میں آتا تھا (غور کرو)، یہ خصوصیت کسی بھی بادشاہ کو میسر ہوئی

ان حالات میں لوگوں کو سلطان سے عقیدت پیدا ہونے لگی۔ مغلوں کے حملوں کا کامیاب طور پر سدباب ہونے کی وجہ سے عوام کو بڑا ذہنی اطمینان اور قلبی سکون میسر تھا۔ غلہ کی ارزانی نے فارغ البالی اور خوش حالی کی صورت پیدا کر دی۔ لوگوں نے یہ سب کچھ نہ صرف علاء الدین کے تدبر اور صلاحیت جہانبانی کی طرف منسوب کیا بلکہ بقول برنی

"بر کرامت او حمل می کردند و سخنان او را کہ در بر آمد مہمات ملکی و در فتح و نصرت

(یہ باتیں) اس کی کرامت پر محمول کیں اور مہمات ملکی اور لشکر کی کامیابی کے سلسلہ میں

---

[1] امیر خسرو نے لکھا ہے کہ سلطان نے بہت سی مسجدوں کی مرمت کرائی تھی۔ خزائن الفتوح ص ۲۵ و ۲۶۔

[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۴۔

لشکر از زبان او بیروں آمدے بر کشف	جو بات اس کی زبان سے نکلتی تھی اس کے کشف
وکرامت او تصور می نمودند"[1]	وکرامت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

امیر حسن سجزیؒ نے غالباً اس شعر میں یہی بات کہی ہے ؎

امور ملک را ضابط رموز غیب را واقف

عباد اللہ را راعی بلاد اللہ را سلطاں[2] (ص ۵۲۸)

علاء الدین کی زندگی میں لوگوں کو اس سے جو مذہبی عقیدت قائم ہوگئی تھی وہ اُس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہی۔ آج ہم سلطان کی مذہب سے بے اعتنائی کا بار بار ذکر سنتے ہیں لیکن سلطان کے معاصرین کا اس کے متعلق جو خیال تھا وہ حمید قلندر، جامع ملفوظات شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی زبانی سُنیے ــــ حضرت چراغ دہلویؒ کے سامنے گفتگو ہو رہی ہے :-

"یکے گفت خلق در زیارت او میروند و	ایک شخص نے کہا لوگ اس کی قبر پر زیارت
ریسمان می بندند و حاجت ہا بر می آید	کو جاتے ہیں اور اپنی مراد کی ریسمان باندھتے
بندہ را دریں محل حکایت یاد آمد،	ہیں اور ان کی حاجتیں پوری ہو جاتی ہیں
عرضداشت کردم۔ ہمدریں ایام من	بندہ کو اس موقع پر ایک قصہ یاد آیا۔ وہ بیان
بندہ بہ زیارت سلطان علاء الدین	کیا۔ ان ہی دنوں میں بندہ سلطان علاء الدین
رفتہ بودم۔ بعد از نماز زیارت کردم	کے مزار کی زیارت کے لیے گیا تھا نماز کے بعد

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۲۴، آگے چل کر برنی لکھتا ہے: "بہ سلطان علاء الدین کہ بچندیں معاصی لازمہ معتد بہ مبتلا بود و از قتل وسفک بسیار قتال وسفاک شدہ کشف وکرامت چہ نسبت .... فراخی عیش و بسیاری امن ... از میان من شیخ نظام الدین روے آوردہ بود و در باب سلطان علاء الدین استدراج گشتہ" ص ۳۲۵۔ مآثر رحیمی میں لکھا ہے: "واکثر کار ہائے او را مردم از غرائب حمات میدانستند وکرامات می نامیدند" (جلد اول ص ۳۲۷)

[2] امیر حسنؒ ہی کا ایک اور شعر ہے ؎

بلے ایں "معجزات" "فتح شاہنشاہ دیں پرور" ؛ نہ در وہم فرو گنجد نہ در فہم خردمنداں (ص ۵۳۱)

وآنجا آمدم کہ خلق ریسمانہا می بندند۔
اگرچہ من بندہ حاجتے نداشتم، اما ریسمان
از دستارچہ کشیدم و آنجا بستم۔ شب در
خواب دیدم گوئی فریاد می کنند آں
کس کیست کہ در گور سلطان علاء الدین
ریسمان بستہ است۔ بعد از فریاد بسیار
من پیشتر شدم و گفتم کہ من بستہ ام۔
گفتند: چہ حاجت داری؟ بگو! گفتم کہ
من ہیچ حاجتے ندارم، چہ گویم۔ و در
دل می گذشت کہ حاجتے ہست از
روضۂ شیخ خواستہ ام۔ شیخ بسندہ است،
از دیگر چہ خواہم ہمچناں بیدار شدم"۔[۱]

زیارت کی اور وہاں پہنچا جہاں لوگ کلاوہ باندھتے
ہیں۔ اگرچہ میری کوئی حاجت نہیں تھی لیکن
میں نے اپنے دستارچہ میں سے ایک ڈورا کھینچا
اور وہاں باندھ دیا۔ رات کو خواب میں دیکھا
کہ کوئی شخص پکارتا ہے کہ وہ کون ہے جو سلطان
علاء الدین کی قبر پر کلاوہ باندھ گیا ہے۔ اس کے
چند بار پکارنے کے بعد میں آگے بڑھا اور کہا
میں نے باندھا ہے۔ کہا: تیری کیا حاجت ہے بیان
کر۔ میں نے کہا میری کوئی حاجت نہیں۔ کیا
بیان کروں۔ اور دل میں گزرا کہ مجھے جو حاجت
ہے وہ تو روضۂ شیخ پر عرض کر دی۔ شیخ کافی ہے
غیر سے کیا چاہوں۔ اسی حال میں بیدار ہو گیا"۔

اورنگ زیب کے عہد کا ایک ہندو مورخ سبحن رائے کھنڈاری لکھتا ہے کہ سلطان کو عام لوگ "از جنس ملائک گفتندے"[۲] فرشتوں میں شمار کرتے تھے۔

مشایخ سے تعلقات

علاء الدین خلجی، صوفیہ و مشایخ کا بڑا معتقد تھا۔[۳] مشکلات کے وقت وہ اکثر بزرگوں کی روحانی امداد کا طالب ہوتا تھا۔ کڑہ میں اپنے چچا جلال الدین خلجی کے قتل سے قبل وہ خواجہ کڑک کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور انہوں نے پیشین گوئی کی تھی ؎

ہر کس کہ کند با تو جنگ　　سر در کشتی تن در گنگ[۴]

تخت نشینی سے پہلے کا واقعہ ہے کہ دہلی میں ایک مجذوب قاضی عالم دیوانہ رہتا تھا۔ لب سڑک

---

۱ خیر المجالس ص ۲۴۱، ۲۴۲　۲ خلاصۃ التواریخ ص ۲۲۸　۳ اعجاز خسروی جلد چہارم ص ۱۱۶

۴ طبقات اکبری جلد اول ص ۱۳۶، تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۰۰۔ (باقی بر صفحہ ۲۶۸)

اس کا مکان تھا۔ وہ اوپر کھڑکی میں ہر وقت بیٹھا رہتا تھا، جو سڑک سے گزرتا اس کے سر پر اینٹ پھینک کر مارتا تھا۔ اس کا ایک غلام یاقوت تھا، اس کے پاس دو چابک رہتے تھے۔ اور ایک ڈورے میں کچھ انگوٹھیاں پڑی رہتی تھیں۔ قاضی عالم اگر کسی کی انگلی میں انگوٹھی دیکھ پاتا تو ڈانٹ کر اسے قریب بلاتا اور وہ انگوٹھی انگلی سے نکال لیتا اور یاقوت کو حکم دیتا کہ اس شخص کے کوڑے لگائے جائیں۔ بازار میں جب یہ دیوانہ گزرتا تو "طرقوا" کی صدائیں بلند ہو جاتی تھیں اور "شاہاں مالک رقاب" کی طرح اس کی سواری گزرتی تھی۔ اس کے رعب کا یہ عالم تھا کہ بقول عصامی ؎

کسے را دراں عہد قدرت نبود | کہ باوے درآید بہ گفت و شنود

ایک دن کھڑکی میں بیٹھا تھا کہ علاء الدین گھوڑے پر سوار ادھر سے گزرا، لیکن ڈر کے مارے کھڑکی کی طرف بار بار دیکھتا جاتا تھا کہ کہیں دیوانہ اینٹ نہ پھینک مارے۔ قاضی دیوانہ نے جب اُسے دیکھا تو جلدی سے نیچے اُترا اور اس کے پیچھے بھاگا اور ؎

بہ تعظیم گفتش کہ "اے مرزباں | مکن عطف از ملکِ ہندوستاں"

پھر یاقوت سے ایک انگوٹھی لے کر خود اس کو پہنائی۔ عصامی نے لکھا ہے کہ علاء الدین نے ؎

ہماں فال رابست در جاں گرہ | کزاں فال شد بر جہانے فرہ[1]

بعض تذکروں میں حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتی رح سے بھی اس کی عقیدت کا ذکر ملتا ہے۔ محمد غوثی شطاری نے ایک رسالہ حکم نامہ کی سند پر (جس کو قلندر صاحب رح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے) لکھا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی اُن کا مرید تھا[2]۔ لیکن یہ بیان محتاج ثبوت ہے۔ اور اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود حکم نامہ ایک موضوع رسالہ ہے، جیسا کہ شیخ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۶۷) خواجہ کرک کے ملفوظات کا ایک مجموعہ ملفوظ اسرار المجذوبین کے نام سے ۱۸۹۳ء میں فتح پور سے شائع ہوا تھا۔ خواجہ کرک، سہروردیہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اور شیخ اسمٰعیل قریشی رح خلیفہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رح کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے۔

(نوٹ صفحہ ہذا) [1] فتوح السلاطین ص ۲۲۴-۲۲۶ [2] گلزار ابرار (قلمی)

عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ "آں از مخترعات عوام است" [1]

مشہور ہے کہ علاء الدین خلجی نے ایک مرتبہ قلندر صاحبؒ کی خدمت میں کچھ تحائف بھیجنے کا ارادہ کیا۔ دربار میں مشورہ کیا گیا کہ اس خدمت کو کس کے سپرد کیا جائے۔ قلندر صاحبؒ کے جلال اور نازک مزاجی سے ہر شخص خائف تھا۔ بالآخر قرعۂ فال امیر خسروؒ کے نام نکلا۔ علاء الدین نے ایک امیر کو سلطان المشائخ کی خدمت میں بھیج کر امیر خسروؒ کے لیے اجازت طلب کی۔ شیخ نے پہلے تو تامل کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اجازت دے دی۔ امیر خسروؒ تحائف لے کر پانی پت روانہ ہوئے۔ قلندر صاحبؒ نہایت شفقت سے پیش آئے۔ اُن کا کلام سُنا، خود اپنا سُنایا اور یہ کہہ کر تحائف کو قبول کیا کہ اگر مولانا نظام الدینؒ کا درمیان نہ ہوتا تو ہرگز قبول نہ کرتا۔ امیر خسروؒ جب روانہ ہونے لگے تو ایک خط شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے نام اور دوسرا علاء الدین کے نام لکھ کر دیا۔ سلطان کے نام جو خط تھا اُس کی عبارت یہ تھی:

"علاء الدین فوطۂ دہلی مقرر داند کہ با بندگان خدائے نیکو کند"

جب دربار میں یہ خط پڑھا گیا تو بعض خوشامدی امراء نے کہا کہ بادشاہ کو ایسا لکھنا ترکِ ادب میں داخل ہے۔ علاء الدین نے کہا کہ غنیمت ہے کہ اس ذرۂ بے قدر کو اس مرتبہ فوطۂ دہلی تو لکھا، ایک مرتبہ تو شحنۂ دہلی [2] لکھا تھا [3] ـــــ اس خط کو محض اس بنا پر کہ کوئی شیخ سلطانِ وقت کو (اور وہ بھی علاء الدین خلجی کو) اس طرح مخاطب نہیں کر سکتا تھا، جعلی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دہلی کے بڑے بڑے سلاطین مشائخ وقت سے اس طرح کی بات سننے کے لیے تیار رہتے تھے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے بلبن کے نام جو خط لکھا تھا اس کا انداز بھی مودبانہ نہیں تھا۔

شیخ رکن الدین ملتانیؒ اور سلطان

شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ المتوفی ۷۳۵ھ/۱۳۳۵ء

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۲۷

[2] شحنہ۔ بکسر اول و سکون و حاء مہملہ و فتح نون۔ مردیکہ او را پادشاہ برائے ضبط کارہا و سیاست مردم در شہر نصب کند، بعرف آنرا کوتوال و حاکم گویند۔

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حیات خسرو (ص ۱۷ - ۱۸) مولوی سعید احمد مارہروی۔

اپنے زمانہ کے مشہور بزرگ تھے[1] برنی نے لکھا ہے :-

"تمامی اہالی دریائے سندھ با آستانِ متبرک شیخ رکن الدین قدس اللہ سرہ العزیز تشبث و تعلق نمودہ بودند و چندیں علما از شہر و دیار ہند مریدان خدمت او شدہ"[2]	دریائے سندھ کے قرب و جوار کے سب رہنے والے، شیخ رکن الدین قدس سرہ العزیز کے آستان مبارک سے بڑی عقیدت اور تعلق کا اظہار کرتے تھے اور ہندوستان کے شہر و دیار کے بہت سے علماء ان کے مرید ہوگئے تھے۔

علاء الدین خلجی بھی اُن کی بڑی عزت کرتا تھا۔ جمالی کا بیان ہے کہ وہ علاء الدین کے عہد میں دو بار[3] دہلی تشریف لائے تھے اور سلطان اُن کے استقبال کے لیے دور تک گیا تھا اور بڑے اعزاز سے شہر میں لایا تھا۔

"دو دو لک تنکہ بوقت آمدن بدیشاں رسیدے، ہماں روز ایثار نمودے و آں پنج لک تنکہ کہ در روز رخصت پیش ایشاں آمدے ہماں روز ایثار نمودے"[4]	اُن کی تشریف آوری کے دن دو لاکھ تنکہ ان کی خدمت میں پہنچتا تھا، اور وہ اسی دن خیرات کر دیتے تھے۔ اور پانچ لاکھ تنکہ جو وقت رخصت ان کے پاس پہنچتا تھا وہ بھی اسی دن خیرات کر دیا جاتا تھا۔

جمالی نے لاکھوں تنکوں کے نذر لانے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ ہم بتا آئے ہیں۔ علاء الدین کسی طبقہ یا فرد کو مالدار نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی بنا پر اس نے اپنے عہد کے کسی بڑے عالم یا ممتاز بزرگ کو نہ جاگیر دی، نہ اتنے زیادہ تحائف اور نذر لانے کہ ان کی مالی حالت غیر معمولی طور پر مستحکم ہو جائے۔ جمالی سہروردیہ سلسلہ سے منسلک تھے،

---

[1] اُن کے مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو: سیر العارفین ص ۱۴۰-۱۴۷، گلزار ابرار (قلمی)، اخبار الاخیار ص ۶۲-۶۶۔

[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۸

[3] سیر العارفین کے فارسی نسخہ میں دو بار لکھا ہے (ص ۱۴۲)، لیکن اردو ترجمہ میں صرف ایک بار (جلد دوم ص ۳)

[4] سیر العارفین ص ۱۴۲۔

انہوں نے سلسلہ سے تعلق کی بنا پر غالباً اس روایت کی تحقیق کی طرف توجہ نہیں کی۔

شیخ نظام الدین اولیاء اور سلطان | شیخ نظام الدین اولیاء عہد علائی کے سب سے زیادہ نامور اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ بقول برنی

"باری تعالیٰ شیخ نظام الدین را از نظیر شیخ جنید و شیخ بایزید در قرون متاخرہ پیدا آوردہ بود"[1]

باری تعالیٰ نے شیخ نظام الدین کو اس آخری دور میں شیخ جنید اور شیخ بایزید کے مثل بنا کر بھیجا تھا

ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ خاص و عام، مفلس و امیر، عالم و جاہل، شریف و رذیل، شہری اور دیہاتی، آزاد اور غلام[2]، سب ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اُن کے حلقۂ مریدین میں شامل ہونا اپنے لیے سعادت کا باعث سمجھتے تھے۔ برنی نے بڑی تفصیل سے اس سڑک کا حال لکھا ہے جو شہر سے غیاث پور جاتی تھی اور جہاں خانقاہ نظامیہ میں آنے جانے والوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی تھی[3]۔ ہزاروں فرسنگ سے عقیدتمند اُن کی خدمت میں آتے تھے[4] اور اُن کی آستاں بوسی کو دین دنیا کی دولت سمجھتے تھے۔ اُن کی نظر میں ایسی تاثیر تھی کہ بقول شاہ عبدالعزیز دہلویؒ

"چوں آدم داخل غیاث پور می شد، حالش دگرگوں می شد"[5]

جوں ہی آدمی غیاث پور میں داخل ہوتا تھا، اس کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی۔

کچھ لوگوں کو اُن کی اس مقبولیت سے حسد پیدا ہوا اور سلطان کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ

سلطان المشائخ مقتدائے عالم شدہ است و ہیچ خلقے از خلق نیست کہ خاک او را در تاج سرئی دارد ... زیراچہ

سلطان المشائخ مقتدائے عالم ہوئے ہیں اور کوئی متنفس ایسا نہیں جو ان کے در کی خاک کو اپنے سر کا تاج نہ بناتا ہو ... کہیں ایسا

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۶ [2] ایضاً ص ۳۴۳ [3] ایضاً ص ۳۴۳، ۳۴۴ [4] ایضاً ص ۳۶۶ [5] ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۶۳۔

خلل ملک آید"[۱] نہ ہو کہ اُن کے سبب سے سلطنت میں خلل آجائے۔

یہ علاء الدین کے عہد حکومت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ حاسدوں کی اس بات سے اس کے دل میں یہ شبہ ضرور پیدا ہو گیا۔ لیکن شیخ کے متعلق اس کی جو ذاتی رائے تھی، اُس کے پیش نظر کوئی نامناسب قدم اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے شیخ کے خیالات کا اندازہ لگانے کے لیے ایک خط خضر خاں کے ذریعہ اُن کی خدمت میں بھیجا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ چونکہ آپ مخدوم عالم ہیں اس لیے مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کار مملکت میں آپ سے مشورہ لوں اور آپ جس چیز میں سلطنت کی بھلائی اور بہبودی اور اس بندہ کی خلاصی اور رہائی دیکھیں اس کا حکم فرمائیں۔ سلطان کا خیال یہ تھا کہ اس طرح شیخ کی سیاسی خواہشات کا پورا اندازہ ہو جائیگا۔ خضر خاں جب یہ خط لے کر شیخ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے بے پڑھے واپس کر دیا اور فرمایا:

درویشاں را بہ کار بادشاہاں چہ کار۔ من	درویشوں کو بادشاہی امور سے کیا واسطہ
درویشم، از شہر گوشہ گرفتہ ام و بہ دعا گوئی	میں درویش ہوں، شہر سے علیحدہ گوشہ میں
بادشاہ و مسلماناں مشغولم۔ اگر بسبب	زندگی بسر کرتا ہوں اور بادشاہ اور مسلمانوں
ایں معنی بادشاہ بعد ازیں چیزے مرا بگوید	کی دعا گوئی میں مشغول ہوں۔ اگر بادشاہ
من ازینجا ہم بروم "ارض اللہ واسعۃ"[۲]	اس بارہ میں پھر مجھ سے کچھ کہیگا تو میں یہاں
	سے چلا جاؤنگا۔ اللہ کی زمین وسیع ہے۔

علاء الدین یہ جواب سُن کر بے حد خوش ہوا اور کہنے لگا کہ میں تو پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اس طرح کی باتوں کا حضرت سلطان المشائخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ دشمنوں نے یہ چاہا تھا کہ مجھے اللہ کے ایسے خاص بندوں سے لڑا دیں اور اس طرح ملک تباہ ہو جائے پھر علاء الدین نے شیخ کے پاس معذرت کے لیے آدمی بھیجا اور کہا:

من از معتقدان مخدومم جرأتے کردہ ام	میں خدمت مخدوم میں جرأتِ بے جا کا مرتکب

[۱] سیر الاولیاء ص ۱۳۳ [۲] ایضاً ص ۱۳۴

بخشیدہ باشند و اجازت کنند تا من بیایم
وسعادت پائبوس حاصل کنم"[۱]

ہوا ہوں۔ آنجناب میری اس جرأت کو معاف
کردیں اور اجازت دیں کہ میں حاضر ہو کر
سعادت قدمبوسی حاصل کروں

اس درخواست کے جواب میں شیخ نے یہ کہلا بھیجا کہ "میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ میں غائبانہ دعا کرتا ہوں، اور غیبت میں دعا کرنے کا اثر بھی ہوا کرتا ہے"۔ سلطان اس کے بعد بھی ملاقات پر مصر ہوا تو اُنھوں نے کہلا بھیجا :

"خانۂ ایں ضعیف دو در دارد، اگر از
یک در در آید، من از در دیگر بیروں
روم"[۲]

میرے گھر کے دو دروازے ہیں، اگر بادشاہ
ایک سے اندر داخل ہوگا تو میں دوسرے سے
باہر چلا جاؤنگا۔

حالانکہ سیاسی اور رُوحانی دنیا کے ان دو بادشاہوں کا کبھی قران السعدین نہ ہو سکا لیکن سلطان علاءالدین نے شیخ کی طرف عقیدت اور نیازمندی کا رویہ رکھا۔ اور مشکلات کے وقت شیخ کی دعاؤں کا طالب رہا۔ جب وارنگل کی فتح کے لیے بھیجے ہوئے لشکر کی اطلاع کافی دنوں تک نہیں ملی تو سلطان نے شیخ کی طرف رجوع کیا۔ برنی نے لکھا ہے :

سلطان متفکر خاطر گشتہ و خبر سلامتی
سلطان فکرمند اور پریشان خاطر ہو رہا تھا۔

---

[۱] سیرالاولیاء، ص ۱۳۴-۱۳۵ - برنی نے ملاقات نہ کرنے کی ذمہ داری سلطان پر رکھی ہے اور لکھا ہے: "سلطان علاءالدین راگاہے در دل نہ گذشتہ کہ خود بر شیخ آید یا شیخ را بر خود طلبد و ملاقات کند" تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۶ پروفیسر محمد حبیب نے برنی کے بیان کو ترجیح دی ہے (ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب Hazrat Amir Khusraw of Delhi p32) ہمارے خیال میں میر خورد کا بیان ہر طرح قابل اعتبار ہے۔
(۱) میر خورد ثقہ راوی ہیں۔ وہ ایک غیر مستند جملہ شیخ کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔
(۲) یہ رویہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے اس رویہ سے بالکل مطابق ہے جو انھوں نے اور سلاطین کے ساتھ رکھا تھا (۳) برنی کے اس جملہ سے پہلے جو اوپر نقل ہوا ہے ایک جملہ ہے جس میں لکھا ہے کہ لوگ ہزار ہزار دو دو ہزار میل سے "بہ صد حیل و تدبیر" شیخ کی خدمت میں پہنچتے تھے۔ کیا برنی کا مقصد یہ ہے کہ علاءالدین نے شیخ کے انکار کردینے کے بعد کسی تدبیر یا حیلے سے ملاقات کی کوشش نہیں کی؟

لشکر از شیخ نظام الدین از روئے کشف و کرامات پرسید" ؎۱

اور اس نے شیخ نظام الدین سے لشکر کی سلامتی کی بابت معلوم کرایا کہ وہ اپنے کشف سے کچھ بتائیں۔

سلطان نے ملک قرابیگ اور قاضی مغیث الدین کے ہاتھ جو پیغام بھیجا تھا وہ برنی نے نقل کیا ہے:

خاطر من از نارسیدن لشکر اسلام ملتفت شدہ است، شمارا غم اسلام بیش از من ست، کہ اگر بنور باطن خبرے از حال لشکر شمارا روشن شدہ باشد، بشارتے برمن بفرسید" ؎۲

لشکر اسلام کی خیریت نہ معلوم ہونے سے میرا دل پریشان ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ آپ کو اسلام کا غم مجھ سے زیادہ ہے۔ اگر نور باطن کے ذریعہ لشکر کی کیفیت آپ پر منکشف ہوگئی ہو تو مجھے اس کی بشارت سے مطلع فرمائیے۔

سلطان کو شیخ کی اس عادت کا علم تھا کہ وہ ایسے سوالات کے جواب میں اکثر کوئی پرانی حکایت سنا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس نے ہدایت کی کہ شیخ کی زبان سے اس پیغام کے جواب میں جو بھی حکایت یا سرگزشت سنیں وہ من وعن اس کے پاس پہنچائیں۔ شیخ نے سلطان کا پیغام سن کر کسی بادشاہ کی فتوحات کا ذکر شروع کر دیا۔ اور فرمایا:

ایں فتح چہ باشد کہ ما فتحہائے دیگر را اُمید دارم۔

یہ فتح کیا حقیقت رکھتی ہے، ہم تو اس سے بڑی فتوحات کی اُمید رکھتے ہیں۔

جب سلطان کو یہ خبر پہنچائی گئی تو وہ بیحد خوش ہوا اور

"دستارچہ خود را بر دست گرفت و در گوشہ دستارچہ گرہ زد و گفت کہ من کلمات شیخ را بفال گرفتم و میدانم کہ سخن از زبان شیخ بہرزہ بیروں نیامدہ است، وارنگل فتح شدہ است و ما را فتحہائے دیگر ہم

اپنے دستارچہ کو ہاتھ میں لیا اور اس کے ایک کونے میں گرہ دی، پھر کہنے لگا کہ میں نے کلمات شیخ اپنے پلّے سے باندھ لیے ہیں، مجھے یقین ہے کہ شیخ کی زبان سے جو بات نکلی ہے وہ یوں ہی بے معنی نہیں ہے، وارنگل فتح ہو چکا ہے اور ہمیں

؎۱؎۲ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۳۲، طبقات اکبری جلد اول ص ۱۶۶-۱۶۷۔

بنظر می باید داشت"۱

اس کے علاوہ دیگر فتوحات پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔

کچھ عرصہ بعد جب وارنگل فتح ہو جانے کی خبر ملی تو سلطان المشائخ میں سلطان علاء الدین کا اعتقاد اور بڑھ گیا۔ برنی نے لکھا ہے:

"و سلطان را اعتقاد در کرامت و بزرگی شیخ برمزید گشته و اگرچه سلطان علاء الدین را با شیخ نظام الدین قدس روحہٗ ملاقاتے نشد فاما در تمامی عصر او از زبان سلطان در باب شیخ سخنے بیروں نیامد کہ دراں سخن شیخ بنوعے آزردہ شود، و بانکہ دشمنان و حاسدان خدمت شیخ از بسیاری اعطائے شیخ و کثرت آمد و شد خلق در آستان شیخ و اطعام و اکرام عام شیخ بعبارتے موحش در سمع آں چناں غیورے میرسانیدند ولیکن او بسمع سخن دشمناں و بدگفت حاسداں التفات نہ کردو در سنوات آخر عہد خود بغایت مخلص و معتقد شیخ شد"۲

شیخ کی کرامت اور بزرگی میں سلطان کا اعتقاد بڑھ گیا۔ اور اگرچہ سلطان علاء الدین کی شیخ نظام الدین قدس روحہٗ سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن اپنی پوری مدت حکومت میں سلطان کی زبان سے شیخ کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں نکلی جس سے کسی طرح پر شیخ کو آزردگی پیدا ہو سکے۔ اور اگرچہ شیخ کے حاسد اور دشمن شیخ کے آستانہ پر خلقت کی آمد و رفت اور شیخ کے اطعام و اکرام کے متعلق طرح طرح کی باتیں ایسے غیور بادشاہ کے کانوں تک پہنچاتے تھے لیکن وہ دشمنوں کی باتوں اور حاسدوں کی بدگوئی کی طرف التفات نہیں کرتا تھا۔ اپنے عہد حکومت کے آخری سالوں میں تو وہ شیخ کا حد درجہ مخلص اور معتقد ہو گیا تھا۔

---

۱ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۳۲، طبقات اکبری جلد اول ص ۱۶۶-۱۶۷

۲ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۳۲۔ علاء الدین کی اس عقیدت کے پیش نظر بعض مصنفین نے اس کو شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا مرید بتایا ہے (مثلاً ملاحظہ ہو (Amir Ali : The Spirit of Islam p.471) لیکن یہ صحیح نہیں۔ بعض تذکروں میں اس کو بوعلی شاہ قلندر کا (گلزار ابرار) بعض میں شیخ ضیاء الدین رومی کا (خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۴۶) مرید بتایا گیا ہے لیکن یہ سب روایتیں ثقاہت سے گری ہوئی ہیں اور کسی معاصر تذکرہ یا تاریخ سے اُن کی تائید نہیں ہوتی۔

نظام الدین احمد بخشی نے لکھا ہے کہ سلطان ہمیشہ "رسل و رسائل" بھیج کر نہ صرف "اظہار اخلاص واعتقاد" کرتا رہا بلکہ اُن کی روحانی امداد کا بھی طلبگار رہا[1]۔

جمالی نے لکھا ہے کہ سلطان نے قرابیگ[2] کو ہدایت کی تھی کہ محفل سماع میں شیخ کو جن اشعار پر وجد آئے انہیں لکھ کر اس کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ ایک مرتبہ حدیقہ سنائی کے یہ اشعار۔

بیش منما جمال جاں افروز ۔۔۔ در نمودی برو سپند بسوز

آں جمال تو چیست مستیٔ تو ۔۔۔ واں سپند تو چیست مستیٔ تو

سُن کر حضرت شیخ پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ملک قرابیگ نے یہ اشعار لکھ کر سلطان کی خدمت میں پیش کیے تو اس پر بہت اثر ہوا۔ لکھا ہے:

"ہر بار می خواند و بر دیدہ می مالید"[3] ۔۔۔ بار بار پڑھتا تھا اور آنکھوں سے ملتا تھا۔

ملک قرابیگ نے عرض کیا کہ جب حضور کو شیخ سے اس قدر عقیدت ہے تو پھر ان سے ملاقات کیوں نہیں کرتے۔ سلطان نے جواب دیا:

"اے قرابیگ! ما بادشاہیم، از سر تا قدم آلودۂ دنیا، بدیں آلودگی شرم می داریم کہ آں چناں پاکے را دریابیم فاما خضر خاں وشادی خاں کہ ہر دو فرزند ارجمند من اند ببرو در قدم حضرت شیخ بیندراز، و مرید سازو دو لک تنکہ شکرانہ نیز ببر بدرویشانِ خانقاہ ایشاں برساں"[4]

اے قرابیگ! ہم بادشاہ ہیں سر سے پیر تک دنیا میں آلودہ۔ اس آلودگی کے باعث مجھے شرم آتی ہے کہ ایسے مقدس شخص کی خدمت میں حاضر ہوں، لیکن تو میرے دونوں بیٹوں خضر خاں وشادی خاں کو لے جا کر حضرت شیخ کے قدموں میں ڈال دے اور اُن کا مرید کرادے اور دو لاکھ روپے شکرانہ کے درویشان خانقاہ کو پہنچا دے۔

---

[1] طبقات اکبری جلد اول ص ۱۶۷۔ [2] سیر العارفین کے مطبوعہ نسخہ (ص ۴۲) میں یہ نام غلطی سے قنبر بیگ چھپ گیا ہے۔ اردو ترجمہ میں صحیح نام درج ہے۔ (ص ۱۳۵)

[3] سیر العارفین ص ۴۳۔ [4] ایضاً ص ۴۲۔ یہاں بھی دو لاکھ تنکہ کا نذرانہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ اس قدر گرانقدر عطیات و نذرانے سلطان کے عام اصول کے خلاف تھے۔

عہدِ علائی کی بعض احتسابی کارروائیاں | عہدِ علائی کے مذہبی ماحول کا پورا نقشہ اُس وقت تک ذہن میں نہیں آسکتا جب تک اس عہد کی بعض احتسابی کارروائیوں پر بھی ایک نظر نہ ڈال لی جائے۔ ان واقعات سے احکامِ شرع کے احترام، دینی شعور کی پختگی، اور مذہبی رواداری کے جن جذبات کا اظہار ہوتا ہے وہ خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ یہ فضا بعد کو دہلی کے کسی بادشاہ کے عہد میں نہیں پائی گئی۔

خواجہ ضیاء الدین سنامی دیانت و تقویٰ میں مقتدائے وقت تھے۔ غالباً حکومت کی جانب سے احتساب کا کام[1] اُن کے سپرد تھا[2]۔ احتساب کے آداب و دقائق پر انہوں نے ایک کتاب نصاب الاحتساب کے نام سے لکھی تھی۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی محفل سماع پر وہ ہمیشہ اعتراض کیا کرتے تھے۔ جب مرض موت میں مبتلا ہوئے تو شیخ نظام الدین اولیاءؒ اُن کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ مولانا سنامی کو جب اطلاع ہوئی تو اپنی دستار شیخ المشائخ کے لیے راستہ میں بچھوادی۔ شیخ نے دستار زمین سے اُٹھا کر آنکھوں سے لگالی۔ جب شیخ المشائخ اُن کے سامنے پہنچے تو مولانا نے شرم کے مارے آنکھیں نہ ملائیں۔ شیخ اُٹھ کر باہر تشریف لائے ہی تھے کہ اُن کی وفات کا شور مچ گیا۔ شیخ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمانے لگے:

یک ذات بود حامی شریعت حیف | ایک حامی شریعت ذات تھی، افسوس
کہ آں نیز نماند[3] | کہ وہ بھی نہ رہی۔

ایک مرتبہ شیخ شرف الدین بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ کے لب مبارک کے بال بہت بڑھ گئے تھے۔ کسی کو اتنی مجال نہ ہوتی تھی کہ اُن سے کترنے کو کہتا۔ مولانا ضیاء الدین سنامی قینچی لے کر ان کے پاس پہنچے اور لبوں کو تراش دیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا بیان ہے کہ ——

بعد ازاں شیخ ہمیشہ محاسن خود را بوسیدے | اس کے بعد شیخ ہمیشہ اپنی داڑھی کو بوسہ دے کر

---

[1] احکام احتساب کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو احکام السلطانیہ، اردو ترجمہ ص ۳۷۶...۳۸۰۔ [2] انشائے ماہرو سے معلوم ہوتا ہے کہ باربلدا شیخ ضیاء الدین سنامی سے ارادت رکھتا تھا (ص ۳۹) [3] اخبار الاخیار، ص ۱۰۸

وگفتے کہ ایں درراہ شریعت محمدی گرفتہ شدہ است [1]	فرماتے تھے کہ یہ راہ شریعت میں قطع کی گئی ہے۔

میر عبدالواحد بلگرامی نے ایک اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ مولانا سنامی جب پہلی بار احتساب کی نظر سے قلندر صاحب کے پاس گئے تو انھوں نے دو تین بار تیز نگاہ سے ان کی طرف دیکھا لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ جب مولانا سنامی چلے گئے تو لوگوں نے قلندر صاحب سے کہا کہ آج تو شیخ ضیاء نے آپ پر بڑی سختی کی۔ فرمایا:

"دوسہ بار خواستم کہ اورا بزنم۔ او زرۂ شریعت پوشیدہ است، تیر من درو اثر نہ کرد" [2]	دو تین بار میں نے چاہا کہ اس پر حملہ کروں۔ لیکن اس نے شریعت کی زرہ پہن رکھی ہے میرے تیر نے اس پر اثر نہیں کیا۔

علماء و مشائخ میں اختلاف رائے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے احترام کا یہ جذبہ عہد علائی کی وہ خصوصیت ہے جس کی مثال اسلامی ہند کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ عہد تغلق میں فقہاء و مشائخ کے درمیان اختلاف کی جو ناخوشگوار صورت پیدا ہو گئی تھی اس کا ذکر آئندہ صفحات میں نظر سے گزریگا۔

ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ علاء الدین خلجی کے متعلق زمانۂ حال کے بعض مصنفین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اُس نے ہندوؤں کے ساتھ نہایت ظلم و ستم کا برتاؤ کیا اور ان کو انتہائی ذلت میں رکھا۔[3] اس دعوے کے ثبوت میں برنی کی تاریخ کے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں لیکن جیسا کہ مورلینڈ (Moreland) اور پروفیسر حبیب نے لکھا ہے، برنی نے جہاں بھی ہندو کا لفظ استعمال کیا ہے، وہاں اس کی مراد کوئی مذہبی فرقہ نہیں ہے۔ بلکہ ہندو سے اس کا مطلب خوط، مقدم چودھری وغیرہ ہیں جو ملک کے اقتصادی نظام میں بہت طاقتور ہو گئے تھے اور جن پر سختی کا برتاؤ

---

[1] اخبار الاخیار۔ ص ۱۲۷ [2] سبع سنابل ص ۶۲

[3] مثلاً ملاحظہ ہو Ishwari Prasad : Medival India p.208

ایک سیاسی تقاضہ تھا[۱]

سلطان نے ہندوؤں (یعنی خوط، مقدم، چودھری) کو کسی مذہبی تعصب کی بنا پر دولت سے محروم نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر تریپاٹھی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ جب اُس نے مسلمانوں ہی کی دولت کو نہیں چھوڑا تھا تو پھر وہ ہندوؤں کو کس طرح چھوڑ سکتا تھا[۲]۔ حقیقتاً اس کا یہ اقدام سیاسی مصالح کا نتیجہ تھا مذہبی تعصب یا تنگ نظری کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔

اس کے عہد میں ہندو جوتشیوں کی قدر ہوتی تھی[۳]۔ سکوں پر سنسکرت کی عبارت ہوتی تھی[۴] اور جشن کے موقعوں پر ہندو اور مسلمان دونوں محلات میں آتے تھے۔ جیسا کہ یحییٰ سرہندی نے لکھا ہے:

"و اہل طرب از مسلم و ہنود بتہا نغمہ ساز گشتند و فلک را در چرخ آوردند"[۵]

ملک نائک، جس کو علاء الدین نے تیس ہزار سوار دے کر مغلوں کے مقابلہ کے لیے بھیجا تھا، ہندو تھا[۶]۔ سلطان کو اس پر اتنا اعتماد تھا کہ آخر بیک میسرہ جیسے اہم فوجی عہدے پر اس کو فائز کیا تھا۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے مذہبی نقطۂ نظر سے علاء الدین خلجی کی زندگی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس کے افکار و تصورات کا رُخ سمجھنے کی کوشش کی ہے، اس کے اعمال و کردار میں مذہبی محرکات کو تلاش کیا ہے، علماء و مشائخ سے تعلقات کی نوعیت کا پتہ لگایا ہے اور معاشی نظام میں اخلاقی اور مذہبی جذبات کی کارفرمائی دیکھی ہے۔۔۔ اس مطالعہ کے بعد ہم ان

---

۱ ملاحظہ ہو Moreland : Agrarian System during The Muslim Rule in India p 225 f. n.

نیز Habib : An Introduction to The Study of Medieval India IV p 4-5 (Aligarh University Magazine)

۳ R.P. Tripathi : Some Aspects of Muslim Administration in India p 258. ۳ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۴،

۴ Chronicles, p 172 یہ عبارت سکوں پر ملتی ہے: (श्री सुलतां अलावदी ७१०)

۵ تاریخ مبارک شاہی ص ۷۹، ۶ ملاحظہ ہو خزائن الفتوح ص ۱۴۱، دول رانی خضر خاں

نتائج پر پہنچے ہیں کہ :

(۱) مذہب سے اس کی بے اعتنائی کی داستان تاریخی شواہد کے خلاف ہے۔ انسان کے عقائد کو اگر کسی پیمانہ سے ناپنا ممکن ہوتا تو یہ دکھایا جا سکتا تھا کہ جہاں تک عقیدہ کی پختگی کا تعلق ہے علاء الدین خلجی دہلی کے کسی سلطان سے فروتر نہ تھا۔ اسلام میں اس کا اعتقاد تقلیدی تھا، لیکن اس اعتقاد کی جڑیں کافی مضبوط تھیں اور اس کی روح کی گہرائی تک پہنچی ہوئی تھیں۔ صحیح ہے کہ مذہبی شعور کے نشوونما میں تقلیدی اعتقاد کا درجہ کچھ زیادہ بلند نہیں ہے لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اسی کے ذریعہ وہ ایجابی تسکین اور جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے جس پر فرد کی زندگی کا ٹھراؤ، اور اجتماعی زندگی کی کامیاب تنظیم کا انحصار ہے۔

(۲) علاء الدین کے ذہن میں ماوراء ہستی کا ایک واضح تصور تھا۔ اس تصور کو اس نے اپنی اخلاقی زندگی کا مرکز و محور بنایا تھا اور اسی تصور سے اپنی اخلاقی اقدار کو اخذ کیا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ اپنے اعمال کے لیے اُسے حق تعالیٰ کے سامنے قیامت کے دن جواب دہ ہونا ہے۔ "مجھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر حاکم کیا ہے"۔ "میں یہ بات خدائے تعالیٰ سے مناجات میں کہا کرتا ہوں" ان جملوں سے اس کے رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۳) قاضی مغیث الدین سے گفتگو کے دوران میں علاء الدین نے جن مذہبی احکام و قوانین پر عمل کرنے سے معذوری ظاہر کی ہے، وہ مسلمانوں کی سیاست اور مذہب کے اُس تضاد کے آئینہ دار ہیں جو خلافت راشدہ کے بعد پیدا ہو گیا تھا اور باوجودیکہ اس نے مسلمانوں کے دینی شعور میں ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔ اس کا کوئی حل نہ مل سکا تھا۔ سیاسی نظام کی بنیاد کچھ ایسے اصولوں پر قائم ہو گئی تھیں کہ یہ تو ممکن تھا کہ تخت سے دست برداری حاصل کر لی جائے لیکن بقول برنی یہ ممکن نہ تھا کہ "جہانداری" کا کام بغیر کچھ غیر اسلامی ضوابط پر عمل کیے انجام دیا جا سکے۔ اس معاملہ میں دہلی کے ہر سلطان کا رویہ بالکل وہی تھا جو علاء الدین کا تھا۔ التتمش نے درباری رسوم کے متعلق سید نور الدین مبارک غزنوی رح کی تنقید سُنی لیکن

دربار کا ماحول نہ بدل سکا۔ بلبن نے جید علماء کے وعظ سُنے لیکن کہتا یہی رہا کہ "حقوقِ نعمت بادشاہی" عمر خطابؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرح ادا نہیں کیے جا سکتے۔ امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد محمد بن تغلق کے دربار میں آئے لیکن اس سے نظام حکومت کی بنیادیں تبدیل نہ کرا سکے ــــ اگر فقہ اسلامی پر جمود کا عالم طاری نہ ہو گیا ہوتا اور اس نے سماج اور سیاست کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیا ہوتا تو معاملہ کی نوعیت بالکل مختلف ہوتی لیکن ان حالات میں علاء الدین نے جس رائے کا اظہار کیا وہ بالکل صحیح تھی۔ دہلی کے سب سلطان اُس کی صداقت کو محسوس کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ علاء الدین اس حقیقت کا اظہار زبان سے کرتا تھا اور دوسرے سلاطین جنہیں اتنی ہمت نہ تھی، وہ صرف زبان حال سے ہی کہتے تھے۔

(۴) علماء کے ساتھ اُس کے برتاؤ کے سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ گو اس نے علماء کے سیاسی اقتدار کو ختم کر دیا لیکن ان کے دینی اقتدار اور علمی وقار کو تقویت پہنچائی۔ اس نے خوشامد اور درباداری کی ذہنیت کو سہارا دینے کے بجائے ان میں حق گوئی کے جذبے کو بیدار کیا۔ وہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ علماء بساط سیاست کے مہرے بن جائیں اور اپنے اصلی کام کو فراموش کر کے مذہب اور مذہبی اقتدار کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیں۔ اس نے نہ خود مذہب سے ناجائز فائدہ اُٹھایا تھا نہ دوسروں کو اس کا موقع دینا چاہتا تھا۔ وہ علماء کی دینی عظمت کا قائل تھا اور اُن کو مذہبی، علمی اور اصلاحی کاموں میں منہمک دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اس رویہ نے علماء عصر کا فکری مزاج بدل دیا۔ اس کے زمانہ میں منہاج السراج، نجم الدین صغری، حسام درویش کے بجائے قاضی مغیث الدین اور مولانا ضیاء الدین سنامی جیسی شخصیتیں نظر آتی ہیں۔

(۵) علاء الدین کا ذہن مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ تنگ نظری سے بالکل پاک تھا۔ اپنی بخششوں کا دائرہ کسی ایک طبقہ کے لیے مخصوص یا محدود کرنا اُس کی نظر میں شاہانہ منصب کی توہین تھی۔ جب معاشی اصلاحات کا خیال دل میں آتا ہے تو "مسلمانوں" "فوجیوں"

یا "شہریوں" تک اس کی نظر محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے سایہ میں بسنے والے سب انسانوں کی خوشحالی کی تدابیر سوچتا ہے اور وہ "تمام خلقت" کو فائدہ پہچانا چاہتا ہے۔

(۶) علاء الدین نے اپنی احتسابی کارروائیوں، معاشی اصلاحات اور امن عامہ کے قیام کے لیے مسلسل کوشش سے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے جن میں اسلامی تمدن کا پودا ہندوستان میں پروان چڑھ سکا۔ حقیقت میں عہد علائی، اسلامی ہند کی تاریخ کا عہدِ شباب تھا۔ اس دور میں زندگی کے جس شعبہ پر نظر ڈالیے، خواہ وہ مذہب سے متعلق ہو، ادب سے ہو یا سیاست سے، شگفتگی، اُمید اور اُمنگ کا ایک عجیب عالم نظر آئیگا۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام اسلامی دنیا کی آرزوئیں اور تمنائیں دلی کے قلب میں سمو دی گئی ہیں۔ یہاں کے علماء غزالیؒ اور رازیؒ کے ہم پایہ، یہاں کے مشائخ جنیدؒ اور شبلیؒ کی نظیر، اور یہاں کا دارالسلطنت قرطبہ و بغداد کا ہمسر نظر آئیگا۔ اس ماحول کے پیدا کرنے میں علاء الدین کے عزم بلند اور سماجی اصلاح کے لیے جد و جہد کو جو دخل تھا اس سے تاریخ کا کوئی طالب علم انکار نہیں کر سکتا۔

بابِ ہشتم

سُلطان قطبُ الدین مُبارک خلجی

علاء الدین خلجی کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین مبارک خلجی تخت پر بیٹھا۔ اُس نے ہندوستان کے انتہائی عظیم المرتبت اور ذی اقتدار بادشاہ کے حرم میں آنکھ کھولی تھی اس لیے اُس کے کردار میں وہ خوبیاں تلاش کرنا بے سود ہے جو نامساعد حالات سے جنگ کرنے اور زندگی کے گرم و سرد چکھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ باپ نے تعلیم و تربیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی اس لیے فکر و نظر کی اس بلندی سے بھی وہ محروم رہا تھا جو ذہنی تربیت کا حقیقی فیضان ہے۔ ایسی صورت میں تخت پر قدم رکھنے کے بعد "تعیش پسندی" اور "سہل گیری" کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ علاء الدین خلجی نے جو معاشی نظام قائم کیا تھا اور جس طرح سماج کے مفسد عناصر کو دبایا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ عنانِ حکومت مضبوط اور پرہیبت ہاتھوں میں رہے۔ لیکن مبارک خلجی کا حال یہ تھا کہ

"در مدت چہار سال و چہار ماہ کار نبود	اپنے چار سال اور چار ماہ کے دورِ حکومت میں
مگر شراب خوردن و سماع شنیدن و	اُسے شراب پینے، گانا سننے، دادِ عیش دینے،
عیش و عشرت راندن و بخشش کردن	انعام و اکرام اور ہوا پرستی کے سوا کوئی کام
و دادِ ہوا پرستی دادن" [۱]	ہی نہ تھا۔

برنی نے اُس کے عہد کا جائزہ لینے میں دو متضاد اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ ایک طرف تو اُس نے شکایت کی ہے کہ احکامِ علائی مٹ گئے [۲]، جہاں بکام ہوا پرستاں شد [۳]، شاہی

[۱-۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۸۷۔

رعب دلوں سے نکل گیا،[1] فسق و فجور کا بازار گرم ہو گیا۔[2] غلہ کا نرخ بڑھ گیا۔[3] رشوت و اصابت و خیانت کے دروازے کھل گئے۔[4] اور عہد علائی کا "یک میزان و یک ضابطہ" باقی نہ رہا۔[5] نوبت یہاں تک پہنچی کہ ـــــ

"رذائل بر فضائل غلبہ کرد و مسلماناں	رذائل نے فضائل پر غلبہ پالیا اور مسلمانوں
و ہندواں پائے از دائرۂ اطاعت	اور ہندوؤں نے دائرہ اطاعت سے قدم
بیروں نہادند"[6]	باہر نکال لیے۔

اور ـــــ

طاعات کہ در خواص و عوام مردم	خواص و عوام کا عبادت میں جو انہماک تھا وہ کم
مشاہدہ می شد کمی گرفت و در فرائض	ہو گیا۔ فرائض کی ادائگی میں خلل واقع ہونے
خلل افتاد و مساجد بے جماعت ماندند[7]	لگا۔ اور مسجدوں میں نماز با جماعت ختم ہو گئی۔

دوسری طرف برنی نے عہدِ علائی کے خاتمہ اور مبارک خلجی کی تخت نشینی پر عوام و خواص کی خوشی اور اطمینان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ـــــ

"از جلوس سلطان قطب الدین روئے	سلطان قطب الدین کی تخت نشینی کے بعد
بفراہی آوردن گرفت و از خوف جان	ایک خاطر جمعی پیدا ہونے لگی اور لوگوں کے
در بواطن خلق تسکینے پیدا آمد"[8]	دلوں سے جان کا خطرہ نکل گیا

عہدِ علائی[9] میں جو زمینیں اور گاؤں خالصہ میں شامل کر لیے گئے تھے وہ لوگوں کو دیدیے گئے نئے وظائف مقرر کیے گئے،[10] "خراجہائے گراں" اور "طلب ہائے سخت" کو معاف کر دیا گیا، دیوان میں جو سخت سزائیں دی جاتی تھیں وہ ختم کر دی گئیں،[11] لوگوں کے دل سے خوف و ہراس

[1 تا 7] تاریخ فیروز شاہی ص ٣٨٧ - ٣٩٣ -
امیر خسرو کا اس کے متعلق یہ کہنا کہ ع کہ سلطان مرحوم از و زندہ گشت (مثنوی نہ سپہر ص ٣٠) مبالغہ پر مبنی ہے۔
[8 تا 11] تاریخ فیروز شاہی ص ٣٨٢ تا ٣٨٥ ، طبقات اکبری جلد اول ص ١٧٦ -

دور ہو گیا اور "اہالی ملک بیاسود[۱]۔ ملک میں نہ کوئی "فتنہ شگرف" پیدا ہوا نہ غم واندوہ کا نام کسی کی زبان پر آیا[۲] —— اس تضاد میں معنی پیدا کرنے اور بھی مشکل ہو جاتے ہیں جب یہ بات بھی ذہن میں ہو کہ برنی نے قطب الدین مبارک خلجی کے کردار کے متعلق بھی متضاد باتیں کہی ہیں۔ ایک طرف تو سلطان کی ہوا پرستی اور شراب نوشی کی شکایت کی ہے، دوسری طرف یہ اعلان کیا ہے

"ولیکن سلطان قطب الدین صاحب مکارم اخلاق بود"[۳]

پھر ایک جگہ "الناس علی دین ملوکھم"[۴] پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب دربار کا ماحول بگڑا تو عوام کی حالت بھی درست نہ رہ سکی۔ اور ——

"اغلب مرداں توبہ ہا بشکستند و	بہت سے لوگوں نے توبہ توڑ دی اور صلاحیت
صلاحیت وعفت را خیر باد گفتند	وعفت کو خیر باد کہہ دیا۔ نوافل وعبادات میں
واشتغال نوافل وطاعات کہ در	خواص وعوام جس گہرے انہماک کا ثبوت دیتے
خواص وعوام مردم مشاہدہ می شد	تھے اس میں کمی واقع ہو گئی . . . .
کمی گرفت . . . وانچہ بادشاہ لیلاً و	اور جب بادشاہ رات دن کھلم کھلا فسق و

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۸۲ تا ۳۸۵، طبقات اکبری جلد اول ص ۱۷۶۔

[۲] امیر خسروؒ اس عہد کے متعلق لکھتے ہیں ؎

چناں خوش بعہدش زبان و دہن	کہ ہنگام گل بلبل اندر چمن
رعایا ہمہ شاد و فرخندہ فال	بد انساں کہ عاشق بروز وصال (نہ سپہر ص ۳۵)

[۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۸۲،

[۴] اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے: می گفتند کہ بادشاہ قاہر وضابط وکامگار وسخت فرمان ونافذ الامر بود، امید باشد کہ چند گاہے خلق در کار دین ودنیا راست ایستند ورونق امرا اولوا الامرے پید آید اگرچہ خلق را در اطاعت آں مشقت وتعب بسیار روے ہمی نماید واگر بادشاہ عیاش وہوا پرست ونرم مزاج وبیخبر از فتن ملکی وغافل از نیک وبد خلق وخوش طبع وسہل گیر واساں گزار بود بانکہ خواص وعوام مملکت را راحت ہا و ذوقہا وعیشہا وکامرانیہا وآسانیہا روے نماید ولیکن سلامتی ذات وملک بادشاہ دراں نبود ودر امور دین ودنیا، خلق خللہا بسیار افتد" ص ۳۸۸۔

نہارا در فسق و فجور اعلاناً و اجہاراً مستغرق گشت	فجور میں غرق رہنے لگا تو رعایا کے باطن میں
در بواطن رعایا ہم فسق و فجور است" [۱]	بھی فسق و فجور پرورش پانے لگا۔

لیکن پھر دوسری جگہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس کی عیش پرستی کا دوسروں پر کیا اثر پڑتا صرف اتنا ہوا کہ۔

"جان او از نہایت عیش و غایت غفلت	نہایت عیش اور غایت غفلت کے باعث (خود)
او سپرے شد" [۲]	اس کی جان جاتی رہی۔

دربار کا ماحول | مبارک خلجی کا دربار بدمستی و ہوا پرستی کا گھوارہ تھا۔ عورتوں، مسخروں اور بھانڈوں کے ہر وقت جھگٹے لگے رہتے تھے۔ امیر خسروؒ نے دربار کی عورتوں کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچ کر

ہمہ پاک رخسار و پاکیزہ تن	ہمہ مجلس آرائے و محفل شکن
ہمہ آب و ناخوردہ شاں لب ہنوز	ہمہ سادہ و فارغ از خط ہنوز
ہمہ شوخ و رعنا و عیار دست	پری صورت و جام معنی بدست
نمک در نمکداں نہفتہ بسے	وز ایشاں نمک ناچشیدہ کسے [۳]

حقیقت میں اس ماحول پر طنز کیا ہے۔

برنی کا بیان ہے کہ بادشاہ زنانے کپڑے پہن کر دربار میں آتا تھا اور مسخروں اور بھانڈوں سے مذاق کرتا تھا۔ بام ہزار ستون پر کھڑے ہو کر عورتیں عین الملک ملتانی اور ملک قرا بیگ جیسے اعیان ملک کو گالیاں دیتی تھیں۔ اس کے زمانہ میں دہلی کے تخت پر وہ حیاسوز حرکات ہوئیں کہ شائستگی نے کبھی آنکھیں بند کر لیں اور کبھی تہذیب نے کانوں میں انگلیاں دے لیں [۴]

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۸۴ [۲] ایضاً ص ۳۸۲ [۳] نہ سپہر ص ۳۸-۳۹

[۴] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۹۵-۳۹۶-

ترک نماز و روزہ عیش و بدمستی کے اس ماحول میں نماز و روزہ کا ذکر ہی کیا تھا۔ برنی نے لکھا ہے کہ سلطان

روزۂ ماہ رمضان آشکارا و کشادہ می خورد[1] ماہ رمضان کے روزے کھلم کھلا چھوڑتا تھا۔

علماء کے ساتھ برتاؤ برنی کو علاء الدین سے شکایت تھی کہ وہ علماء کا قدردان نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ علماء کو ادرار و وظائف دینے کا قائل نہیں تھا۔ مبارک خلجی کے متعلق برنی نے نہایت خوشی کے ساتھ یہ بات لکھی ہے کہ

در پادشاہی او علماء را ادرارات زیادت کردند"[2] اس کے دور حکومت میں علماء کے وظائف میں زیادتی کردی گئی۔

شیخ ضیاء الدین رومیؒ سے عقیدت جمالی نے لکھا ہے:

"شیخ المشایخ شیخ ضیاء الدین رومی پیر سلطان قطب الدین بود"[3]

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تو سلطان کو اُن کا "خلیفہ" بھی بتایا ہے۔[4]

شیخ ضیاء الدین رومیؒ سہروردیہ سلسلہ کے بزرگ تھے۔ جمالی اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ دونوں نے اُن کو شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلفاء میں شمار کیا ہے۔[5] اگر یہ بیان صحیح ہے تو قطب الدین مبارک خلجی کی تخت نشینی کے وقت اُن کی عمر یقیناً سو سے متجاوز ہوگی۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا وصال ۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء میں ہوا تھا یعنی مبارک خلجی کی تخت نشینی کے وقت اُن کی رحلت کو بیاسی[۸۲] سال سے زیادہ گزر چکے تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ شیخ نے سلطان کی اصلاح و تربیت کے لیے کوئی کوشش کی تھی یا نہیں۔ جہاں تک مبارک خلجی کا تعلق ہے وہ آخر عہد تک عیش و نشاط میں غرق رہا۔ کسی بزرگ کی تعلیم کا اثر اس کے کردار پر قطعاً نظر نہیں آتا۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۹۵ [2] ایضاً ص ۳۸۲ [3] سیر العارفین ص ۶۷

[4] اخبار الاخیار ص ۷۲ [5] سیر العارفین۔ ص ۶۷۔ اخبار الاخیار ص ۷۲

خلافت سے قطع تعلق

اس میں شک نہیں کہ سقوط بغداد کے بعد خلافت عباسیہ سے عقیدت کا اظہار بالکل بے معنی ہو چکا تھا، لیکن اس دور کا سیاسی شعور اس رسمی تعلق کو کافی اہمیت دیتا تھا۔ مبارک خلجی نے خلافت کے اس تصور سے قطع تعلق کر لیا اور اپنے نام کے ساتھ خلیفۃ اللہ کا لقب شامل کر دیا۔ ۷۱۷ھ/۱۳۱۷ء تک سکوں میں اس کو "یمین الخلافت ناصر امیر المومنین" کہا گیا ہے[۱] لیکن بعد کے تمام سکوں میں اس کے لیے "الامام الاعظم خلیفہ رب العالمین" کے القاب استعمال کیے گئے ہیں[۲]۔ اور دہلی کو "بیت الخلافت" اور "دار الخلافت" کہا گیا ہے[۳]۔ نئے قصر کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسروؒ لکھتے ہیں ؎

چو صاحب خلافت شد از عدل و رافت　　نہادش لقب حصن دار الخلافہ[۴]

گو امیر خسروؒ نے یہ سب القاب مبارک خلجی کے لیے استعمال کیے ہیں، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دہلی کو "دار الخلافہ" قرار دینے کے حق میں نہ تھے۔ "نہ سپہر" میں انھوں نے اسلامی دنیا کے ہر بڑے شہر قاہرہ، تبریز، بخارا وغیرہ سے دہلی کا مقابلہ کیا ہے اور دہلی کی برتری ثابت کی ہے لیکن جب بغداد کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں ؎

مگر گفت بغداد با ہر کہ باید　　کہ دار الخلافہ بہ دہلی نشاید[۵]

کیا خسروؒ نے اس انداز سے دہلی کو دار الخلافہ قرار دینے کے خیال کا مذاق اڑایا ہے؟

تعمیر مساجد

قطب الدین مبارک خلجی کے عہد میں دو مسجدوں کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے ابتدائے عہد میں جب اس نے ایک جامع مسجد دہلی میں بنوائی تھی۔ امیر خسرو لکھتے ہیں ؎

بفرمود کہ اول برآرند جامع　　کہ بامش برآید بخورشید لامع[۶]

سلطان نے حکم دیا تھا کہ دہلی کے تمام علماء و مشائخ جمعہ کی نماز اسی میں ادا کریں۔ دوسری مسجد

---

۱ Chronicles, p.180 ۲ Wright p. 96-98, 100-101, 102 etc.!

Chronicles, p. 179, 182 ۳ نہ سپہر ص ۷۹، ۱۴۱، ۱۴۳، نیز Chronicles 180-181

۴ نہ سپہر ص ۷۷　۵ نہ سپہر۔ ص ۱۴۳

۶ نہ سپہر۔ ص ۷۵، ۷۸؛ ۱۴۱۔

دکن کی مہم کے دوران میں دیوگیر میں بنوائی گئی تھی۔ فرشتہ کا بیان ہے:

"در شہر دیوگیر مسجدے کہ بالفعل موجود ست ساختہ"[1]	شہر دیوگیر میں اُس نے ایک مسجد بنائی جو اب تک موجود ہے۔

شیخ نظام الدین اولیاءؒ اور سلطان اس دور کے سب سے مشہور بزرگ شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے قطب الدین مبارک خلجی کے تعلقات انتہائی ناخوشگوار تھے۔ بعض بے بنیاد شبہات کی بناء پر سلطان اُن سے بدظن ہوگیا تھا اور کھلے دربار میں اُن کے متعلق نامناسب الفاظ استعمال کیا کرتا تھا۔ مخالفت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مبارک خلجی کے دو بھائی خضر خاں[2] اور شادی خاں سلطان المشایخؒ کے مرید تھے۔ علاءالدین کے انتقال کے بعد مبارک خلجی کو یہ شبہ پیدا ہوگیا کہ حضرت شیخؒ شاید روحانی نسبت کا خیال کر کے خضر خاں کی تخت نشینی کی حمایت کریں۔ برنی نے لکھا ہے:

"خضر خاں را مرید شیخ میدانست با شیخ بنیاد عداوت نہاد و زبان بہ بدگفتن شیخ بکشاد"[3]	خضر خاں کو شیخ کا مرید سمجھتے ہوئے شیخ سے عداوت کی بنیاد ڈال دی اور ان کے متعلق بدگوئی پر اُتر آیا۔

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ شیخ کو نہ کبھی سیاسی معاملات سے دلچسپی رہی تھی اور نہ اس وقت وہ تخت نشینی کے معاملہ میں کسی طرح کی مداخلت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سلطان کے دل میں یہ بدگمانی ایسی قائم ہوگئی کہ پھر دور نہ ہوسکی۔ جب دکن کی مہم سے واپس آیا تو اُس نے نہایت ہی جابرانہ انداز میں ان سب لوگوں کو تہ تیغ کر دیا جن پر ذرا بھی مخالفت کا شبہ ہوسکتا تھا۔ خضر خاں اور شادی خاں کے قتل کے بعد شیخؒ کے خلاف بھی کارروائی کا خیال دل میں بے چینی پیدا کرنے لگا۔

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۲۵، [2] دول رانی خضر خاں میں امیر خسروؒ شیخ کے متعلق لکھتے ہیں ؎

بعد رِ خضرِ عیسیٰ مسند آرائے ‏ ‏ خضر بوسید دستش خضر خاں پائے (ص ۱۵)

نیز ملاحظہ ہو سیر الاولیاء ص ۱۳۴

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۹۶؛ طبقات اکبری جلد اول ص ۱۷۸-۱۷۹، مآثر رحیمی جلد اول ص ۳۳۲

حکومت و اقتدار کا نشہ، اختیار کو محدود نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن صورت حال یہ تھی کہ شیخؒ کے خلاف کوئی قدم اٹھانا آسان نہ تھا۔ اُن کی خانقاہ جس کی بنیادیں انسانی دلوں میں قائم تھیں اس کے تمام قلعوں سے زیادہ مضبوط تھی اور اس کے تاج و تخت سے کہیں زیادہ محفوظ اور استوار۔ چنانچہ شیخؒ کے خلاف براہِ راست کوئی قدم اُٹھانے کے بجائے، سلطان نے عوام کو اُن سے بدظن کرنے کی کوشش کی، اور یہ تدبیر سوچی کہ دہلی میں کوئی ایسی شاندار خانقاہ تیار کرادی جائے کہ عوام خود بخود اس طرف رجوع ہو جائیں اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی اہمیت اور روحانی اقتدار اس طرح کم ہو جائے[۱]۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس کی نظر شیخ رکن الدین ملتانیؒ کی طرف اٹھی۔ چنانچہ ان کو ملتان سے دہلی بلایا گیا۔

ہر چند کہ شیخ رکن الدین ملتانیؒ سلاطینِ وقت سے گہرے تعلقات رکھتے تھے اور مبارک خلجی کے دربار میں بھی آتے جاتے تھے، لیکن وہ اپنے معاصر چشتی بزرگ کو انتہائی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور کسی صورت میں بھی سلطان کی خاطر اُن سے تعلقات میں بدمزگی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اُنھوں نے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار سلطان کے سامنے اس انداز میں کیا کہ اُس کو اپنے مقصد کے اظہار کی جرأت ہی نہ ہو سکی۔ سلطان نے پوچھا: اس شہر کے بزرگوں میں سے سب سے پہلے کون آپ سے ملا؟ شیخ رکن الدین نے جواب دیا کہ جو اہل شہر میں سب سے بہتر ہے یعنی شیخ المشائخ[۲] اس طرح بقول شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ:

"شیخ رکن الدین بہ ایں کلمہ رفع توہم او کرد و از یں توقع ناامید ساخت"[۳]	شیخ رکن الدین نے اس کلمہ سے اس کا توہم دور کردیا، اور اس کی توقعات کو ختم کردیا۔

جب شیخ رکن الدینؒ سے نا اُمیدی ہوئی تو شیخ زادہ جام کو دہلی بلا کر اُن کی خانقاہ قائم کرادی

[۱] ابوالفضل لکھتا ہے: "شیخ زا از ملتان طلب داشت کہ در ہنگامۂ او شکستے رود" آئین اکبری حصہ دوم ص ۲۰۹

[۲] سیر الاولیاء، ص ۱۳۶ [۳] اخبار الاخیار ص ۶۴

برنی نے لکھا ہے:

"بر نیت آنکہ با شیخ در انداز د شیخ زادہ جام را کہ مخالف شیخ شدہ بود

مقرب درگاہ خود ساختہ" [1]

لیکن یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو سکی۔ اور عوام و خواص بدستور خانقاہ نظامی میں جمع ہوتے رہے مثلاً تبلغ یعذہ سلطان کے خاص امراء میں تھا لیکن شیخ کی خدمت میں حاضری کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا تھا [2]۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی دشمن نے سلطان کو بھڑکایا کہ شیخ رح امراء و ملوک کی فتوح تو قبول کر لیتے ہیں لیکن حضور کے بھیجے ہوئے تحائف قبول نہیں کرتے۔ سلطان کو ذلت کا احساس ہوا اور حکم دیا کہ کوئی امیر شیخ کے یہاں نہ جائے۔

"ببینم کہ کندوری و دعوت از کجا خواہد کرد" پھر دیکھونگا کہ مطبخ اور لنگر کہاں سے چلاینگے۔

لوگوں کو اس پر متعین کیا کہ جو ملک بھی وہاں جائے اس کی رپورٹ سلطان کو کی جائے۔ شیخ کو جب اس کا علم ہوا تو حکم دیا کہ کندوری کا خرچ زیادہ کر دیا جائے۔ کچھ عرصہ بعد جب سلطان نے شیخ کی خانقاہ کا حال معلوم کیا تو لوگوں نے بتایا کہ "یکے بود دو شد"۔ سلطان کو اپنی حرکت پر پشیمانی ہوئی اور کہا "ما بر غلط بودیم" [3]

جمالی نے گو اس واقعہ کو شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح سے نقل کیا ہے لیکن بعض ایسے اضافے کر دیئے ہیں جو خیر المجالس کے کسی نسخے میں نظر سے نہیں گزرے۔ لکھا ہے کہ ایک دن سلطان نے قاضی محمد غزنوی سے جو سلطان کے محرمان خاص میں تھے، یہ دریافت کیا کہ شیخ کے پاس مطبخ اور خیرات کے لیے اس قدر روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ قاضی نے جواب دیا کہ امراء اُن کی خدمت میں فتوح و شکرانہ پیش کرتے ہیں اور اسی سے ان کا خرچ چلتا ہے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۹۶، طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۸۰

[2] خیر المجالس ص ۲۵۷ [3] ایضاً ص ۲۵۲

اُن دنوں شیخ کی خانقاہ میں دوہزار تنکہ یومیہ لنگر پر خرچ ہوتا تھا۔ مسافروں اور متعلقین پر خرچہ اس کے علاوہ تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ جو امیر شیخ کی خدمت میں نذرانہ پیش کرے اُس کی جاگیر ضبط کرلی جائے اور

"دریں معنی تاکید و احتیاط و مبالغہ نمود"

جب شیخ کو اس حکم کی اطلاع ہوئی تو اپنے خادم خواجہ اقبال کو بلا کر حکم دیا کہ مطبخ کا خرچ دوگنا کردیا جائے اور جس قدر روپیہ کی ضرورت ہو وہ ایک طاق میں سے نکال لیا کرے۔ جب سلطان کو اس چیز کا پتہ چلا تو بہت متحیر ہوا[۱]

ایک مرتبہ سلطان نے شیخ المشایخ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ شیخ رکن الدین ابوالفتح تو ملتان سے مجھ سے ملنے کے لیے آتے ہیں، لیکن آپ دہلی میں ہوتے ہوئے بھی کبھی دربار میں حاضر نہیں ہوتے۔ آپ ہر ہفتہ محل میں آیا کیجیے۔ شیخ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ

"من مردے منزوی ہستم، جائے نروم و	میں گوشہ گیر آدمی ہوں۔ کہیں آتا جاتا نہیں
نیز رسم و عادت پیران من نبود کہ دیوان	علاوہ ازیں میرے بزرگوں کی یہ روش نہ تھی
(روند) و با بادشاہاں مصاحب شوند، مرا	کہ دربار جائیں اور بادشاہوں کی مصاحبت
معذور می باید داشت"[۲]	کریں۔ مجھے تو اس سے معاف رکھنا چاہیے۔

میر خورد کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی جگہ شیخ کی سلطان سے ملاقات ہوگئی تھی اور انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنا کر

ما من صاحب یصحب صلاحیۃ و	جو شخص کسی صالح اور نیک آدمی کی صحبت میں
او ساعۃ من لیلٍ و نھارٍ الا یسال اللہ	بیٹھیگا، اگرچہ رات دن کی جملہ ساعات میں ایک
عن صحبتہٖ ھل ادّیت فیھا حق اللہ	ساعت ہی بیٹھا ہوگا تو خدا تعالیٰ اس صالح
ام لا۔	سے سوال کریگا کہ تو نے اپنی صحبت کا حق ادا کیا،

بقیہ

---

[۱] سیر العارفین ص ۷۵۔ [۲] ایضاً ص ۷۵۔

بادشاہ سے کہا تھا۔

"فردا از من و تو برائے ایں صحبت خواہند پرسید کہ بچہ نیت بود و حقوق صحبت رعایت یافت"[۱]	کل (قیامت کے دن) تجھ سے اور مجھ سے اس صحبت کے (حق ادا کرنے کے) متعلق پوچھا جائیگا کہ کس نیت سے تھی اور حقوق صحبت کی کس طرح رعایت کی۔

برنی کا بیان ہے کہ سلطان نے کھلم کھلا شیخ کی مخالفت شروع کردی اور اُن کے متعلق نہ صرف ناشائستہ الفاظ ہی استعمال کرنے لگا بلکہ یہ اعلان کرادیا کہ

"ہر کہ سر نظام الدین را بیارد ہزار تنکہ زر او را بدہم"[۲]	جو کوئی بھی نظام الدین کا سر لائیگا اس کو ہزار تنکہ زر (انعام) دونگا۔

سلطان کی ان حرکتوں سے شیخ کو بے حد ملال ہوا۔ اور اُنھوں نے خواجہ حسن سجزیؒ کو سلطان کے پیر شیخ ضیاء الدین رومیؒ کے پاس یہ پیغام لے کر بھیجا کہ

"سلطان را از رنجانیدن درویشاں باز باید داشت، کہ خیریت دارین اُو در کم آزاری ایں قوم است، و ہر خانوادہ را اختیارے و روشے مخصوص است، چوں از سلاطین ماضی کسے مزاحم حال درویشاں نگشتہ باشد سلطان را منع کنند کہ او نیز مزاحمت درویشاں ندہد"[۳]	سلطان کو درویشوں کو رنج پہنچانے سے باز رکھنا چاہیے، اس لیے کہ اس کی خیریت دارین اس طبقہ کی کم آزاری میں ہے۔ ہر خانوادہ کی ایک مخصوص روش اور طریقہ ہے۔ سلاطین ماضیہ میں سے کبھی کوئی بادشاہ کسی فقیر کے درپے نہ ہوا تھا۔ سلطان کو منع کیجیے کہ وہ درویشوں کا مزاحم نہ ہو۔

خواجہ حسنؒ جب شیخ ضیاء الدین کے مکان پر پہنچے تو اُنھیں بستر علالت پر ایسی حالت میں پایا کہ اُن تک کوئی پیغام پہنچانا ہی ممکن نہ تھا۔ تین دن کے بعد اُن کا انتقال ہوگیا۔ سوئم کے موقع پر اتفاقاً سلطان اور شیخ نظام الدین اولیاء کا آمنا سامنا ہوگیا۔ شیخ نے سلطان کو سلام کیا

[۱] سیر الاولیاء ص ۵۵۸ [۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۹۶ [۳] سیر العارفین ص ۷۶

لیکن اس نے نہایت بے التفاتی برتی اور سلام کا جواب تک نہ دیا۔ برنی نے لکھا ہے:

"شیخ را مراعات نہ کرد و سلام شیخ را جواب نہ داد و عدم التفاتے نمود" [۱]	اس نے شیخ کا کچھ لحاظ نہیں کیا، اور نہ ان کے سلام کا جواب دیا، بلکہ بے توجہی برتی۔

سلطان شیخ کو ایذا پہنچانے کے موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ جب اس کی جامع مسجد بن کر تیار ہوئی تو اس نے تمام علماء و مشائخ کو حکم بھیجا کہ پہلے جمعہ کو اسی مسجد میں نماز ادا کریں۔ یہ حکم جب شیخ نظام الدین اولیاءؒ کو سنایا گیا تو انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ

"ما مسجد نزدیک داریم و این احق است وہیں جا خواہم گزارد" [۲]	ہمارے قریب ہی مسجد ہے، اس کا ہم پر زیادہ حق ہے۔ ہم اسی جگہ نماز پڑھینگے۔

دربار کی ایک پرانی رسم تھی کہ تمام ائمہ و مشائخ اور صدور و اکابر ماہ نو کی مبارک باد کے لیے قصر شاہی میں جمع ہوتے تھے۔ حضرت شیخ اس موقع پر خود نہیں جاتے تھے بلکہ اپنے خادم خاص خواجہ اقبال کو بھیج دیا کرتے تھے۔ سلاطین دہلی نے شیخ کے مرتبہ اور اُن کی روحانی عظمت کے پیش نظر اس چیز پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا، لیکن بعض درباریوں نے مبارک خلجی کو بھڑکایا اور اُسے یہ خیال پیدا کرادیا کہ سلطان کے دربار میں کسی نمائندے کو بھیجنا سلطان کی توہین و تحقیر کے مترادف ہے۔ سلطان نے غصہ میں آکر حکم دیا کہ اگر آئندہ ماہ مبارک باد کے لیے شیخؒ خود نہیں آئینگے تو ہم جس طرح بلوایا کرتے ہیں، بلوا لینگے۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے جب سلطان کی یہ بات سنی تو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی والدہ کے مزار پر تشریف لے گئے اور اُن کی روح سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر اگلے مہینے کی پہلی تاریخ

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۹۶، لیکن بعض تذکروں (مثلاً سیر العارفین ص ۷۶) میں یہ لکھا ہے کہ شیخ نے خود سلطان کو سلام نہیں کیا اور کہہ دیا کہ چونکہ سلطان قرآن پڑھنے میں مصروف ہے اس لیے سلام کی ضرورت نہیں۔ ایسے موقع پر تشویش نہیں دینی چاہیے۔ ہم نے برنی کے بیان کو معاصر کی حیثیت سے زیادہ قابل اعتبار قرار دیا ہے۔

[۲] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۹۶۔ [۳] سیر الاولیاء ص ۱۵۰۔

تک بادشاہ کا کام تمام نہیں ہوا تو میں آپ کے مزار کی زیارت کو نہیں آؤنگا۔[1] ادھر سلطان کے ایماء سے سید قطب الدین غزنوی، شیخ وحید الدین قندزی، مولانا برہان الدین بزدوی اور شیخ عماد الدین طوسی وغیرہ شیخ المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ بادشاہ جوان اور ناعاقبت اندیش ہے، آپ بزرگ ہیں، مصلحت اسی میں ہے کہ آپ تشریف لے چلیں۔ شیخؒ نے کچھ دیر تامل کیا اور فرمایا 'ان شاء اللہ' دیکھیے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اس جواب سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ شیخ دربار میں حاضر ہونے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ بادشاہ کو بھی معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ بالآخر شیخ نے اس کے حکم کے آگے سر جھکا ہی دیا۔ جب روز یہ لوگ بادشاہ کا پیغام لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے شوال کی ۲۷ تاریخ تھی۔ اسی رات کو خواجہ معروف سید الحجاب کے باپ خواجہ وحید قریشی، اور امیر خسروؒ کے بھائی عزیز الدین علی شاہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورت حال کے متعلق دریافت کیا۔ شیخ نے فرمایا کہ میں ہرگز دربار میں نہیں جاؤنگا اور اپنے بزرگوں کی روش کے خلاف کوئی کام نہیں کرونگا۔ دونوں یہ جواب سن کر متحیر اور متعجب ہو گئے۔ دربار میں عام خیال یہی تھا کہ شیخ خود تشریف لائینگے لیکن وہ اپنی بات پر قائم تھے۔ معاملہ کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے دونوں نے شیخ سے گزارش کی کہ وہ حضرت بابا فریدؒ کی روح سے رجوع کریں تاکہ فتنہ وفساد کا اندیشہ ختم ہو جائے۔ شیخ نے جواب دیا:

"مرا شرم می آید کہ از جہت ایں معنی متوجہ ایشاں شوم، مرا بسیار کار دینی در پیش است کہ توجہ ایں کار بر ایشاں نمایم ولیکن شما یقین دانید کہ سلطان قطب الدین بر من بہیچ وجہے ظفر نیابد"[2]

مجھے شرم آتی ہے کہ اس معاملہ میں اُن کی طرف رجوع کروں مجھے بہت سے دینی کام درپیش ہیں (اتنی فرصت کہاں کہ) یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھوں۔ لیکن تم یقین رکھو کہ سلطان قطب الدین کسی طرح مجھ پر کامیابی نہ حاصل کرسکیگا۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۵۱، [2] سیر العارفین ص ۷۷۔

اس کے بعد شیخ نے اپنا ایک خواب بیان کیا کہ میں نے دیکھا کہ قبلہ رو بیٹھا ہوں اور ایک تیز سینگوں والی گائے میری طرف حملہ کرنے اور ضرر پہنچانے کی نیت سے بڑھ رہی ہے ۔ میں اُٹھا اور دونوں سینگ پکڑ کر اس کو زمین پر دے مارا ۔[۱]

جس رات کو چاند دکھائی دینے والا تھا ، اس دن ظہر کے وقت خواجہ اقبال نے شیخ سے عرض کیا کہ اگر آپ بادشاہ سے ملاقات کے لیے تشریف لے جائیں تو سواری کا انتظام کیا جائے ۔ شیخ نے فرمایا " حالیا ساکت باشی و بکار دیگر مشغول شوی "[۲] ۔ غرض اسی طرح وقت گزر گیا اور شیخ کو نہ سلطان کے پاس جانا تھا اور نہ وہ گئے ۔ تذکرہ نویسوں اور مورخوں کا بیان ہے کہ اسی رات کو[۳] سلطان کے محبوب خسرو خاں نے اس کا سر کاٹ کر قصر ہزار ستون کے نیچے ڈال دیا اور بقول برنی :

روحِ سلطان جلال الدین شہید بر بام ہزار	سلطان جلال الدین شہید کی روح (قصر) ہزار
ستون و درون حرم علائی تماشا می کرد	ستون کے بام سے اور حرم علائی کے اندر سے
و جام شراب انصاف از دریائے معادلہ	یہ تماشا دیکھ رہی تھی اور حضرت بے نیاز کے دریائے
حضرت بے نیاز می نوشاند و بزبان وعظ	انصاف سے انصاف کے جام بھر بھر کے پی رہی
در گوش مستمعان بیدار دل می رساند[۴]	تھی ۔ اور نصیحت کے طور پر بیدار دل سننے والوں سے
بد مکن کہ بد افتی	کہہ رہی تھی کہ بُرا مت کر کہ اس کا انجام بُرا ہوتا ہے ، کنواں
چاہ مکن کہ خود افتی[۵]	(دوسرے کو گرانے کے لیے) مت کھود کہ تو خود اس میں گرے

[۱] سیر العارفین ص ۷۷-۸۰ ، [۲] ایضاً ص ۸۷ ، [۳] امیر خسرو نے تغلق نامہ میں نہایت صراحت سے لکھا ہے کہ قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۷۲۰ھ کی عین چاند رات کو واقع ہوا ؂

چو تاریخ عرب شد ہفصد و بیست	ثبات قطب شد کم جانب زیست
جمادی دومیں را شد پدیدار	ہلال تیرہ و تاریک دیدار
شد آں مہ بر ہمہ گیہاں مبارک	مگر بر طالع سلطاں مبارک

سیر الاولیاء میں چاند رات کو قتل ہونا تو لکھا ہے (ص ۱۵۱) لیکن تاریخ درج نہیں ہے ۔

[۴] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۰۸ ۔

تذکرہ نویسوں نے سلطان کے قتل کو شیخ کی بد دعا، کا نتیجہ بتایا ہے۔ پروفیسر محمد حبیب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "میر خورد نے ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ سلطان کا قتل برادو کے جرائم کا نہیں بلکہ شیخ کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ خوش قسمتی سے اس قسم کے مسائل کا فیصلہ ایک مورخ کے احاطۂ فرائض سے باہر ہے"[1]

شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا بیان ہے کہ جس رات کو سلطان کا قتل ہونے والا تھا، اودھ کا ایک مجذوب یہ کہتا ہوا بازاروں میں گھوم رہا تھا:

"آں ملک تو چہ شد؟ وآں چتر تو چہ شد؟ — وہ تیرا ملک کیا ہوا؟ اور وہ تیرا چتر کیا ہوا؟ اور وہ
وآں تخت تو چہ شد؟ بر دست دیگراں افتاد" — تیرا تخت کیا ہوا؟ (بالآخر) دوسروں کے قبضہ میں چلا گیا۔

اودھ کے لوگ اس مجذوب کے معتقد تھے۔ انہوں نے وہ تاریخ لکھ لی۔ بعد کو پتہ چلا کہ سلطان کا قتل اسی شب میں ہوا تھا[2]

مبارک خلجی کی قبر محمد بن تغلق نے مبارک خلجی کی قبر پر جو لنگر قائم کیا تھا، اس کی تفصیل ابن بطوطہ نے اس طرح بیان کی ہے:

"اس کے بعد میں سلطان قطب الدین کے مقبرہ کے انتظام میں مصروف ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ اس پر ایک گنبد بنایا جائے جس کی بلندی سو ہاتھ کی ہو یعنی غازان شاہ عراق کے مقبرہ کے گنبد سے بھی بیس ہاتھ زیادہ ہو اور یہ بھی حکم دیا کہ بیس گاؤں خریدے جائیں اور مقبرہ کے لیے وقف کیے جائیں اور خریدنے کا کام بھی مجھے دیا تھا تاکہ اس کے عُشر کا فائدہ مجھے ہو۔ اہل ہند کا دستور ہے کہ مردوں کی قبر پر کل اشیاء جو ان کی حیات میں ضروری ہوتی ہیں موجود رکھتے ہیں چنانچہ ہاتھی اور گھوڑے بھی قبروں پر باندھتے ہیں۔ اور قبر کی نہایت آرائش کرتے ہیں۔

---

[1] Hazrat Amir Khusrau of Delhi p. 40 [2] خیر المجالس ص ۲۲۷

میں نے بھی اسی طرح کیا۔ اور ڈیڑھ سو قرآن پڑھنے والے جن کو اس ملک میں ختمی کہتے ہیں نوکر رکھے۔ اور اسّی طالب علموں کی خورد و نوش کا انتظام کیا اور آٹھ مکرر رکھے اور ایک مدرس نوکر رکھا۔ اسّی صوفیوں کے کھانے کا انتظام کیا اور ایک امام اور کئی موذن خوش آواز اور قاری اور مدح خواں اور حاضری نویس اور معرّف بھی نوکر رکھے ان سب کو اس ملک میں ارباب کہتے ہیں اور فراش اور طباخ اور ڈوری اور آبدار یعنی سقے اور شربت پلانے والے اور تنبولی اور سلحدار اور نیزہ دار اور چھتر دار اور طشت دار اور حاجب اور نقیب یعنی پردہ دار اور چوب دار بھی نوکر رکھے، ان لوگوں کو "حاشیہ" کہتے ہیں۔ یہ سب تعداد میں چار سو ساٹھ آدمی تھے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ ہر روز بارہ من آٹا اور بارہ من گوشت پکایا جائے، مگر میں نے دیکھا کہ یہ کافی نہ ہوگا اور زمین بہت تھی میں نے حکم دیا کہ پینتیس من آٹا اور پینتیس من گوشت ہر روز پکایا جائے اور اس کے مطابق شکر اور مصری اور گھی اور پان خرچ ہوتے تھے میں کل اہل مقبرہ کو اور مسافروں کو کھانا کھلاتا تھا۔"[1]

امیر خسروؒ اور مبارک خلجی امیر خسروؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے محبوب ترین مرید تھے، اور مبارک خلجی شیخ المشائخؒ کا سخت ترین دشمن۔ عجیب بات ہے کہ انہوں نے نہ شیخ کا دامن چھوڑا اور نہ سلطان کا دربار۔ اور اپنی زندگی کے ان متضاد تقاضوں کو اس طرح پورا کیا کہ نہ کبھی حضرت شیخؒ نے اُن سے درباری زندگی کو ترک کرنے کی خواہش کی اور نہ کبھی سلطان نے شیخؒ سے قطع تعلق کرنے کا مطالبہ کیا۔ اگر ایک طرف یہ بات تعجب خیز ہے کہ جس دربار میں شیخ نظام الدین اولیاءؒ پر دشنام کی بارش ہو رہی تھی، وہاں امیر خسروؒ کے یہ قصیدے گونج رہے تھے ؎

شہا گنج بخشا کرم گسترا | معانی شناسا سخن پرورا
مرا عمر کز شصت بالا گذشت | ہمہ پیش شاہان والا گذشت

---

[1] عجائب الاسفار۔ ص ۲۲۵-۲۲۶۔

بسے بندگی کردم از عون بخت　　کمر بستہ در خدمتِ چار تخت
چنیں بخششے کز تو جم یافتم　　زشاہانِ پیشینہ کم یافتم[1]

تو دوسری طرف یہ بات بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے کہ خسروؒ نے مثنوی نہ سپہر میں اپنے اصول کے مطابق بادشاہ کی تعریف سے پہلے اپنے شیخ کی تعریف کی ہے اور بادشاہ کے سامنے اُن کی شان میں اس طرح قصیدے پڑھے ہیں ؎

خوش آندم کہ من زاعتقاد ضمیر　　گرفتم بحق دست آں دستگیر
من از زے لعاب دہاں یافتم　　کہ زیں گونہ آب دہاں یافتم
بدو جستہ پیران عالم پناہ　　ہمہ بالغاں پیش او طفل راہ
براہے کہ شبلی واد ہم روند　　طفیلی چو ما ناکساں ہم روند[2]

امیر خسروؒ نے جس طرح اپنی زندگی کو خانوں میں بانٹ دیا تھا وہ قرون وسطیٰ کے اس ماحول میں یقیناً حیرت انگیز ہے۔

---

[1] مثنوی نہ سپہر۔ ص ۴۸
[2] مثنوی نہ سپہر۔ ص ۲۳-۲۸

تغلق سلاطین

باب نہم

سلطان غیاث الدین تغلق

خسرو خاں کا عہد خسرو خاں جو مبارک خلجی کو قتل کرنے کے بعد تخت پر بیٹھا تھا، گجرات کا باشندہ تھا۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں عین الملک ماہرو اُسے قید کر کے مالوہ سے لایا تھا۔ برنی نے اُسے "بروار بچہ بداصل[1]" اور امیر خسرو نے "برادو[2]" لکھا ہے۔ معاصر تاریخوں میں اس قبیلہ کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ زمانۂ حال کے مورخین میں اس مسئلہ پر شدید اختلاف رائے ہے۔ برگس[3]، ٹامس[4]، ہیگ[5] وغیرہ نے اس کو بہت ہی نیچی ذات کا ہندو بتایا ہے۔ برڈ[6] اور بیلی[7] نے اس کو راجپوتوں کے قبیلہ "پرمار" میں شمار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ہمارے پاس جو تاریخی مواد ہے وہ اتنا ناکافی ہے کہ اس کی بنا پر خسرو خاں کے نسب کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ امیر خسرو کے بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ بہادری میں شہرت رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

برادو وصف ہندویست سرباز
کہ ہم سرباز باشد و ہم سرانداز[8]

---

۱ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۸۱، ۲ تغلق نامہ ص ۱۹۔

۳ History of the Rise of Muhammedan Power I p. 387

۴ Chronicles of the Pathan Kings p. 184 n.

۵ Cambridge History of India Vol III p. 123.

۶ History of Gujrat p. 167

۷ Local Muhammadan Dynasties of Gujrat p. 41.

۸ تغلق نامہ ص ۱۹۔

بہر حال اسلام قبول کر لینے کے بعد اُس کا نام حسن رکھا گیا اور وہ ملک شادی، نائب خاص حاجب کے ملازمین میں شامل ہو گیا۔ مبارک خلجی جب تخت پر آیا تو اس کا اتنا گرویدہ ہو گیا کہ بقول برنی "یک ساعت بے او نتوانست بود"[۱] ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں ایک جان دو قالب ہیں[۲]۔ حسن نے (جس کا خطاب اب خسرو خاں ہو گیا تھا) اس قربت سے فائدہ اُٹھایا اور نہایت چالاکی سے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو محل کے اندر بُلا کر سلطان کو قتل کرا دیا۔ اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔[۳]

مورخوں کا بیان ہے کہ خسرو خاں نے تخت نشینی کے بعد "اہانتِ اسلام[۴]" پر کمر باندھ لی تھی۔ برنی نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ

باز دہلی ہندوانہ شود و مسلمانی در فع و مضمحل گردد"[۴]	دہلی پھر "ہندوانہ" ہو جائیگی اور "مسلمانی" وہاں سے ختم ہو جائیگی۔

برنی نے خسرو خاں کو ان حرکات کا مرتکب قرار دیا ہے :-

(۱) زنان و کنیزکان مسلماناں تصرف می کردند"[۵]	مسلمانوں کی عورتوں اور کنیزکوں کو (قبیلہ برادو کے لوگ) استعمال میں لاتے تھے۔
(۲) برواران و ہندواں غالب گشتہ مصاحف را کراسی می ساختند و در محراب ہا بتاں می نہادند و می پرستند"[۶]	برواراور ہندو غالب ہو گئے۔ قرآنِ پاک کو کرسی بنا لیا اور محرابوں میں بت رکھ دیے اور اُن کی پوجا کرنے لگے۔

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۸۲ [۲] امیر خسروؒ لکھتے ہیں ؎

زسوئے شاہ یک جاں در دو تن خاص — دز و دو دل بیک دور از اخلاص

[۳] تاریخ مبارک شاہی ص ۸۸ [۴] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۱۲

[۵] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۱۱، یحییٰ سرہندی نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ :

وآں جماعت بر اعتماد قربت ناصر الدین خسرو خاں در میان مسلمانان ظلم و تعدی کردن گرفتند و عورات از دروں حرم می بردند	اور وہ لوگ ناصر الدین خسرو خاں سے رشتہ داری پر گھمنڈ کرتے ہوئے مسلمانوں پر ظلم و ستم کرنے لگے اور عورتوں کو حرم میں سے نکال کر لے جانے لگے۔

تاریخ مبارک شاہی ص ۸۷۔

[۶] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۱۱، زبدۃ التواریخ، ورق ۳۳ الف

ابن بطوطہ جو اس واقعہ کے کافی عرصہ کے بعد ہندوستان آیا تھا لکھتا ہے:

"جب خسرو ملک بادشاہ ہوا تو اس نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دیے اور حکم دیا کہ تمام ملک میں کوئی گائے ذبح نہ کرنے پائے ہندو گائے کا مارنا جائز نہیں رکھتے۔ اگر کوئی گائے ذبح کر لیتا ہے تو اس کو یہ سزا دیتے ہیں کہ اس کو اسی گائے کی کھال میں سلوا کر جلا دیتے ہیں۔ یہ لوگ گائے کی نہایت تعظیم کرتے ہیں اور ثواب کے لیے بھی اور بطور دوا کے بھی اس کے پیشاب کا استعمال کرتے ہیں اور اس کے گوبر سے اپنے گھر اور دیوار لیپتے ہیں۔ خسرو خاں چاہتا تھا کہ مسلمان بھی ایسا ہی کریں۔ اس لیے لوگ اس سے متنفر ہو گئے"[1]

عہد مغلیہ کے مورخین نے خسرو خاں کی ان حرکات کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نظام الدین احمد بخشی نے لکھا ہے کہ:

"چوں اکثر برادراں ہندو بودند، شعار مسلمانی تنزل نمودہ، رسوم ہندوان رونق و رواج تمام پیدا کرد و بت پرستی و تخریب مساجد شائع شد"[2]	چونکہ اکثر براداں ہندو تھے اس لیے مسلمانوں کا شعار زوال پذیر ہونے لگا اور ہندوؤں کی رسمیں جاری ہو گئیں۔ بت پرستی کی جانے لگی اور مسجدوں کی تباہی ہونے لگی۔

اور بالکل ان ہی الفاظ میں عہد عالمگیری کے ایک ہندو مورخ سجن رائے نے خسرو خاں کے عہد کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے[3]

اس سلسلہ میں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خسرو خاں تخت نشینی کے بعد مرتد ہو گیا تھا؟ — کسی معاصر مورخ نے اس بات کی صراحت نہیں کی۔ بلکہ عصامی اور برنی نے یہ بتایا ہے کہ تخت نشینی کے بعد اس نے "ناصر الدین" لقب اختیار کر لیا تھا۔ یہی لقب اس کے سکوں

[1] عجائب الاسفار۔ ص ۸۵۔۸۶
[2] طبقات اکبری ج ا ص ۱۸۷
[3] خلاصۃ التواریخ ص ۲۳۴
[4] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۱۰۔۴۰۹۔

پر بھی ملتا ہے[۱]۔ عصامی اس بات کا مذاق اُڑاتے ہوئے لکھتا ہے کہ ؎

شدہ ناصرِ دیں بہ ضدش لقب کہ بود دست در قلع دیں روز و شب[۲]

لیکن ترک اسلام کی بابت کوئی واضح بات نہیں لکھی۔ حقیقۃً صورتِ حال یہ تھی کہ برادو قوم کے لوگ جو بیشتر ہندو تھے ایک pressure group کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور اپنی بہتر عسکری تنظیم کے باعث درباری ماحول پر چھاگئے۔ پورے نظامِ حکومت کو تو وہ قابو میں نہ لا سکے لیکن دہلی میں بقول عصامی اُن کا حال یہ ہوگیا کہ ؎

بہ ہر جا براو سرافراز گشت جفائے بہ ہر کوچہ می گذشت[۳]

ان حالات میں مسلمانوں کا وہ طبقہ جو دربار میں برسرِ اقتدار تھا سخت مایوس ہوگیا۔ اور برادو قوم کے عروج میں انہیں مسلمانوں کے زوال اور بدبختی کے آثار نظر آنے لگے۔ برنی نے جس صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یقیناً محل شاہی تک محدود رہی ہوگی۔ ورنہ دہلی میں مسلم سماج کے مذہبی جذبات کو اس طرح پر نظر انداز بلکہ مشتعل کرنا نہ ممکن تھا نہ مناسب۔

غازی ملک کی مہم | خسرو خاں کے خلاف سب سے زیادہ موثر قدم غازی ملک نے اُٹھایا اور اپنی مہم کے یہ تین مقصد قرار دیے:

عفا اللہ ملکہ گاہ تیغ و تیرم سہ نیت گشت محکم در ضمیرم
نخست آں کہ اندریں خاک خطرناک زگردِ کفر نورِ دیں شود پاک
بکوشم بہر دینِ مصطفیٰؐ را کہ از سر گردد اسلام آشکارا
دوم آنکہ ایں ہمایوں عرصۂ بوم کشم از دست ہندو زادۂ شوم
کسے گر ماندہ باشد زار جمنداں بلنداں را دہم جائے بلنداں

[۱] اس کے سکوں پر "خسرو شاہ السلطان الواثق بنصر الرحمٰن ولی امیر المومنین" اور "السلطان الاعظم ناصر الدنیا و الدین ابو المظفر" کھدا ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو۔
Nelson Wright p. 103-104; Thomas: Chronicles of the Pathan Kings p. 186

[۲] فتوح السلاطین ص ۳۷۵ ، [۳] ایضاً ص ۳۷۴

سہ دیگر آنکہ کافر نعمتے چند — چو نسل شاہ را بنیاد برکند
چناں شاں سرزنم در کینہ خواہی — کہ خوں گرید برایشاں تیغ شاہی[1]

عین الملک کو اُس نے ایک خط میں اسی بات پر غیرت دلائی کہ کس طرح

مداں راضی شود کز ہندوے چند — کشاید عقدۂ اسلام را بند
لقیطے گبر و گبرے چند خیزد — شہ شہزادہ را خونے بریزد[2]

اس نے بار بار اسی پر زور دیا کہ اس کی مہم کا مقصد "قطع کفر و کفران"[3] ہے اور اسی وجہ سے عوام میں اس کی تحریک کے ساتھ خاص ہمدردی پیدا ہوگئی۔ جن صوبائی گورنروں نے محض اس ڈر سے کہ کہیں اس طرح غازی ملک کو اپنی ذاتی طاقت کے استحکام کا موقع نہ مل جائے اس کا ساتھ دینے سے گریز کیا، اُن کو عوام کی شدید ترین ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا۔ مغلطی حاکم ملتان کو تو اسی بنا پر اس کے ماتحت سردار بہرام سراج نے قتل کر دیا اور یہی حشر سامانہ کے حاکم یک لکھی کا ہوا[4]۔

اس میں شک نہیں کہ غازی ملک نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو اپیل کی تھی[5] اور اس تحریک میں مذہبی عنصر بہت غالب تھا[6] لیکن یہ جنگ فرقہ وارانہ نوعیت کی نہ تھی۔ غازی ملک کی فوج میں ہندو اور خسرو خاں کی فوج میں مسلمان بھی شامل تھے۔

گو غازی ملک نے اپنی مہم کی تیاری بڑے پیمانہ پر کی تھی اور وہ خود سلطنت کے سب سے زیادہ تجربہ کار اور لائق اعیانِ حکومت میں شمار کیا جاتا تھا لیکن دہلی کے خلاف لشکر کشی کرتے

---

[1] تغلق نامہ ص ۱۴۰-۱۴۱ [2] ایضاً ص ۶۶ [3] ایضاً ص ۵۴، ۶۰ - شیخ نور الحق لکھتے ہیں: "از افتادن خاندان علائی و ضعف دین مسلمانی و تفرقہ حال مسلمانان برخود می پیچید" زبدۃ التواریخ ورق ۳۳ الف [4] تغلق نامہ ص ۵۴-۷۰، [5] خسروؒ لکھتے ہیں:-

بہر یک ماجرائے کیں نمودہ — دوائے بہر درد دیں نمودہ (ص ۵۸)

[6] R. P. Tripathi: Some Aspects of Muslim Administration p. 58

[7] تغلق نامہ ص ۹۳-

ہوئے اس کو بڑی فکر اور تشویش تھی[1] اس زمانہ میں اس نے تین خواب دیکھے جن سے اُس کی ہمت بندھی اور اُسے اپنی کامیابی کا یقین ہوا۔ اس مہم کے دوران میں وہ تمام تمام رات بارگاہِ خداوندی میں دعا کرتا تھا، امیر خسروؒ کا بیان ہے ؎

همه شب داشت رُو در حق پرستی　　دلش بر آسمان و تن به پستی
بسجده گریه می کرد سیراب　　که هم در سجده ناگه آمدش خواب[2]

پہلے خواب میں اُس نے ایک خضر صورت بزرگ کو ان الفاظ میں تاج و تخت کی بشارت دیتے ہوئے دیکھا ؎

بشارت می دهم کا نیک هم اکنوں　　شوی بر تاجِ شاهاں دُرِّ مکنوں[3]

دوسرے خواب میں اُس نے تین چاند اس طرح دیکھے کہ

درخشاں سر مه روشن بر آمد　　که هر یک از دگر روشن تر آمد
یکے چوں چتر زر بالائے تارک　　در بر بالائے دو دوش مبارک[4]

تیسرے خواب میں اس نے ایک تروتازہ باغ دیکھا ع "شگفته صد هزاراں گل بهر شاخ" اور اس سے یہ تعبیر لی کہ یہ بادشاہی کا باغ ہے جو آئندہ اس کو نصیب ہوگا[5]

تخت نشینی خسرو خاں کے خلاف غازی ملک کی مہم بالآخر کامیاب ہوئی۔ فتح کے بعد اس نے سجدۂ شکر ادا کیا اور شعبان کی پہلی تاریخ کو پایۂ تخت دہلی کا رخ کیا۔ جب یہ جلوس قصرِ شاہی کے قریب پہنچا تو غازی ملک نے گھوڑے سے اُتر کر وہیں فرشِ زمین پر دوبارہ سجدۂ شکر ادا کیا اور سب امراء و عمائد کو اپنے برابر بٹھا کر قصرِ ہزار ستون میں یہ تقریر کی کہ "میں ایک معمولی

---

[1] غالباً بلبن کی وہ نصیحت جو اس نے بغرا خاں کو کی تھی غازی ملک کے کانوں میں گونج رہی تھی:۔
"... فرمانبردار بادشاه دهلی باشد و با او مکابره نه کند ... خواه بادشاه دهلی خویش و برادر او باشد و خواه بیگانه"
تاریخ فیروز شاہی ص ۹۵۔

[2] تا [5] تغلق نامہ ص ۷۲-۷۵۔

[6] مہم کی تفصیلات کے لیے تغلق نامہ اور تاریخ فیروز شاہی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

آدمی تھا۔ سلطان جلال الدین نے اپنی عنایت سے مجھے مقرب بنایا۔ پھر علاء الدین کی مہربانی سے مجھے یہ مرتبہ ملا۔ مجھ پر اس بادشاہ کے بہت حقوق تھے۔ جب میں نے سُنا کہ کافر نعمت خسرو خاں نے اس کی نسل کو مٹا دیا اور طرح طرح کے مظالم اس کی بیویوں اور بچوں پر ڈھائے تو دنیا میری آنکھوں میں تاریک ہوگئی۔ میں تختِ شاہی کا جویا نہیں ہوں۔ میں نے دین کی خاطر اور کافر نعمت کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے یہ جنگ کی تھی۔ اب اگر نسلِ شاہی میں سے کوئی شخص بھی زندہ ہے تو یہ تخت سلطنت اس کے نام لکھا جائے اور اگر اُن میں سے کوئی باقی نہیں رہا ہے تو یہاں اور بہت سے بڑے بڑے امیر موجود ہیں۔ مجھے اپنا گھوڑا اور دیبال پور کا ویرانہ سب سے زیادہ پسند ہے ؎

من و رخشیکه بیرانه پوید — سر یر شاہی انگه هر که جوید

مرا دیوپال پور من پسند است — دراں بیرانه نور من پسند است[1]

اعیان واکابر نے اس کے قدم چومے اور اصرار کیا کہ کلاہِ بادشاہی اسی کے لیے موزوں ہے۔ شروع میں غازی ملک نے عذر کیا، لیکن طویل رد و کد کے بعد تخت قبول کر لیا۔ غیاث الدین اس کا شاہی خطاب قرار پایا ؎

سریر آراست ماه و آفتابش — غیاثِ دین و دنیا شد خطابش[2]

شیخ نور الحق رحؒ نے لکھا ہے کہ غیاث الدین نے

"مسلمانان را از پریشانیہا و ابتریہا در مواطن امن و آرام جائے داد"[3] — مسلمانوں کو پریشانی اور ابتری سے (نکال کر) امن اور آرام کی جگہ پہنچا دیا۔

---

[1] تغلق نامہ ص ۱۴۱   [2] ایضاً ص ۱۴۴، عصامی نے لکھا ہے ؎

غیاث الدین آں شاہ شد بالیقیں — کہ فریاد رس گشت بر اہل دیں (فتوح السلاطین ۳۸۸)

بہادر خانی کا بیان ہے: "چوں غازی ملک اعانت اہل اسلام بواجبی بجا آورد خطاب او از آسمان سلطان غیاث الدین بر آمد" (تاریخ محمدی ۳۹۴ الف)

[3] زبدۃ التواریخ ۔ ۳۳ ب

تخت نشینی سے پہلے کی زندگی غیاث الدین تغلق[1] ایک عرصہ تک دیبال پور اور ملتان میں رہا تھا۔ اور ان مقامات پر اس نے اپنے حسن انتظام، صلاحیت جہانبانی، اور مذہبی شغف کا بہت اچھا اثر لوگوں کے دلوں پر چھوڑا تھا۔ ملتان میں اُس نے مسجدیں اور عیدگاہیں وغیرہ تعمیر کرائی تھیں۔ امیر خسرو کا بیان ہے ؎

دراں ایام کز درگاہ سلطاں | شد ایں غازی ملک مقطع ملتاں
بسے بنیاد خیر افگند ہر سوئے | بنائے مسجد و حفر بسے جوئے
نماز عیدگہ را مسجدے ساخت | کہ سرتاسر مسجد عیسیٰ برافراخت[2]

ابن بطوطہ نے ملتان کی جامع مسجد پر ایک کتبہ دیکھا تھا جس میں لکھا تھا کہ اُس نے اٹھتیس بار منگولوں سے جنگ کر کے ان کو شکست دی تھی اور اس طرح ملک غازی کا خطاب حاصل کیا تھا۔[3]

ملتان اور دیبال پور قیام کے زمانہ میں غیاث الدین نے گردونواح کے مشائخ اور صوفیہ سے شگفتہ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ ایک مرتبہ وہ شیخ علاء الدین اجودھنی ؒ نبیرہ حضرت بابا فرید گنج شکر ؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے بیٹے جونا (محمد بن تغلق) اور بھتیجے فیروز (فیروز تغلق) کو بھی ساتھ لے گیا۔ یہ دونوں اس وقت کم عمر تھے۔ شیخ نے بغیر سلا ہوا جامۂ کرباس" منگایا اور اس میں سے ۴ ½ گز غازی ملک کو، اور ۲۷ گز جونا کو اور ۴۰ گز فیروز کو عنایت فرمایا اور کہا کہ اس کو اپنے اپنے سروں پر باندھ لو۔ جب تینوں وہاں سے رخصت ہونے لگے تو فرمایا:۔

ایں ہر سہ نفر صاحب تخت و تاج شوند[4] یہ تینوں شخص صاحب تخت و تاج ہونگے۔

---

[1] یہاں خاندان تغلق کی نسبی تحقیق کا موقع نہیں ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔
Rise & Fall of Mohd. b. Tughluq p.45-52 !
History of the Qaraunah Turks pp. 1-8

[2] تغلق نامہ ص ۶۳۔ [3] عجائب الاسفار ص ۸۰۔ [4] تاریخ فیروز شاہی، شمس سراج عفیف ص ۲۷-۲۸

پھر ایک بار ان ہی دونوں کے ساتھ شیخ شرف الدین بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ کی خدمت میں پہنچا۔ انہوں نے کھانا منگا کر سامنے رکھا۔ تینوں نے ایک ہی پیالہ میں کھانا شروع کیا تو قلندر صاحب نے فرمایا۔

"سہ پادشاہ در یک کاسہ طعام می خورند"[1] تین بادشاہ ایک ہی کاسہ میں کھانا کھاتے ہیں۔

شخصیت اور کردار سلطان غیاث الدین تغلق کی عمر کا بیشتر حصہ میدان جنگ میں بسر ہوا تھا، لیکن اس کے پہلو میں ایک درد مند دل تھا۔ وہ رعایا کے ساتھ، ماں باپ کا سا مشفقانہ برتاؤ کرتا تھا[2]۔ حد یہ ہے کہ رعیت پروری میں اس کا نام ہندوستان اور خراسان میں ضرب المثل ہو گیا تھا[3]۔ مورخین نے اُس کی "پاکیٔ نفس"[4] "مناقب حمیدہ"[5] اور "عصمت و پاکی و پاکیزگی"[6] کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ

"ہیچ پادشاہے ہمچو سلطان تغلق شاہ پائے	سلطان تغلق شاہ جیسے (اوصاف رکھنے والا)
برسر سریر سلطنت نہ نہادہ است و شاید	بادشاہ کبھی تخت پر نہیں بیٹھا اور نہ اس کے بعد
کہ بعد از وہم ہمچو او بادشاہے بر تخت گاہ	شاید کبھی ویسا بادشاہ تخت دہلی پر نظر آئے۔
دہلی جلوہ نہ کند"[7]	

سلطان غیاث الدین پر کافی گہرا مذہبی رنگ تھا۔ خسرو خاں کے خلاف اس کی مہم میں مذہبی جذبات بھی کار فرما تھے۔ لیکن اس کی مذہبیت، تعصب اور تنگ نظری سے یکسر آزاد تھی۔ اس نے غیر مسلموں کی مذہبی زندگی میں قطعاً کسی طرح کی مداخلت روا نہیں رکھی[8]۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں میں اس کی شہرت "حامی ملت حجازی"[9] "حامی الاسلام"[10]

---

[1] تاریخ فیروزشاہی، عفیف ص ۲۸   [2] تاریخ فیروزشاہی برنی ص ۴۳۷-۴۳۸۔

[3] تاریخ فیروزشاہی ص ۳۴۲   [4] ایضاً ص ۳۴۴   [5] تاریخ محمدی ورق ۳۹۸ ب

[6] تاریخ مبارک شاہی ص ۹۲   [7] تاریخ فیروزشاہی ص ۴۴۰

[8] Ishwari Prashad: History of the Qaraunah Turks p. 53

[9] منشات ماہرو ص ۳۴   [10] تاریخ فیروزشاہی ص ۴۴۱،

"پشت پناہ اسلام"[1] اور "دین پرور و دیں پناہ"[2] کی رہی، اور شاعر اس بات کا اعلان کرتے رہے کہ

"چراغِ دیں بذیل چتر ایں شہ"[3]

اس کے کردار میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جن کے باعث وہ عوام و خواص سب میں مقبول ہوگیا تھا۔ اس کے پرانے ساتھی اس بات کی قدر کرتے تھے کہ اس میں غرور و تمکنت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ ان سے نہایت خندہ پیشانی اور خلوصِ نیت سے ملتا تھا اور "در پیش خود محل نشستن ارزانی داشت"[4]

حق شناسی کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ برنی نے لکھا ہے کہ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ "استحقاق را از غیر استحقاق فرق می کرد"[5]۔ مزاج میں حد درجہ کا اعتدال تھا[6]۔ اس نے قدیم خاندانوں کو تباہی سے بچانے اور اُن کی عزت کو قائم رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ برنی کا بیان ہے کہ

"خانہائے مستاصل شدہ از سر احیاء کردہ"[7] اس نے تباہ شدہ خاندانوں کو از سر نو زندہ کیا۔

اُس کی "پاکی نفس" کا ذکر کرتے ہوئے برنی نے لکھا ہے کہ

"ہیچ امردے و سادہ رخے را از ابناء ملوک و غلامان خوبرو و خواجہ سرایان صاحب جمال را گرد خود گشتن ندادے و دراں کہ فعل قبیح و لواطت بشنیدے او را ہم دشمن گرفتے و شاید کہ ازاربند سلطان تغلق شاہ بزنا نکشودہ باشد"[8]	اپنے امراء کے بیٹوں، خوبصورت غلاموں اور خواجہ سراؤں میں سے کسی نابالغ لڑکے یا بیہودہ نوجوان کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔ جس کے متعلق سنتا کہ لواطت یا کسی فعل قبیح کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا دشمن ہوجاتا تھا۔ شاید سلطان تغلق شاہ نے کبھی زنا نہیں کیا۔

---

1. منشات ماہرو۔ ص ۳۴
2. تاریخ فیروز شاہی ص ۴۴۰۔
3. تغلق نامہ ص ۱۴
4. تاریخ فیروز شاہی ص ۴۲۷۔
5. ایضاً ص ۴۳۶
6. ایضاً ص ۴۳۶
7. تاریخ فیروز شاہی ص ۴۲۷
8. ایضاً ص ۴۴۳

اس کا دامن ہر طرح کے فسق و فجور سے پاک تھا۔ فلاسفہ اور بد مذہب لوگوں کی صحبت سے وہ کبھی "ملوث" نہیں ہوا تھا[1]۔ اس لیے عقائد میں پختگی تھی اور احکام دین کی بجا آوری میں بھی حتی الامکان کوشاں رہتا تھا۔

عبادت میں انہماک غیاث الدین تغلق عبادت و ریاضت میں کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ برنی نے لکھا ہے:

اوقات فرائض خمسہ را با جماعت مواظبت نمودے و تا نماز خفتن بجماعت نگذاردے دروں حرم نرفتے"[2]	پانچوں وقت کی نماز پابندی کے ساتھ جماعت سے پڑھتا تھا اور جب تک عشاء کی نماز ادا نہ کر لیتا تھا حرم میں داخل نہ ہوتا تھا۔

جمعہ یا عیدین کی نماز بھی کبھی ناغہ نہیں ہوتی تھی۔ ماہ رمضان میں تراویح پڑھتا تھا اور روزہ پابندی سے رکھتا تھا۔ برنی کا بیان ہے کہ

"نعوذ باللہ کہ او روزۂ از روزۂ ماہ رمضان عمداً افطار کردہ باشد"[3]	نعوذ باللہ کہ اس نے رمضان کا روزہ کبھی عمداً چھوڑا ہو۔

اکثر اوقات با وضو رہتا تھا[4] اور رات کا کافی حصہ عبادت میں صرف کرتا تھا۔ نظام الدین نے لکھا ہے:

"بیشتر اوقات او صرف عبادات شدے بقیام شب و مواظبت نفل اشتغال نمودے"[5]	اس کا بیشتر وقت عبادت میں صرف ہوتا تھا۔ قیام شب اور نفل پڑھنے میں پابندی سے مشغول رہتا تھا۔

اوامر و نواہی کا خیال برنی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح، نظام الدین بخشی اور شیخ نور الحق رح نے لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین اوامر و نواہی کا بڑا خیال کرتا تھا۔ برنی کا بیان ہے کہ ——

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۴۴ [2-3] ایضاً ص ۴۴۳ [4] ایضاً ص ۴۴۴
[5] طبقات اکبری ج ۱ ص نیز ملاحظہ ہو زبدۃ التواریخ ورق ۴۴ ب، تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۳۰۔

"اگر از بادشاہ انتشار عدل و انصاف طلبند و جریان احکام شرع و رونق امر معروف و نہی منکر جویند از وفور عدل و فرط انصاف تغلقشاہی مجال نماندہ بود کہ گرگ جانب میش تیز نگرد و در عصر دولت او شیر با آہو در یک شرب آب می خورند و از برکت جریان احکام شریعت قاضیان و مفتیان و داد بک و محتسبان عہد او را آبروئے بس بسیار و آشنائی تمام پیدا آمدہ بود"۔ [1]

اگر بادشاہ سے عدل و انصاف پھیلانے اور احکام شرع کے جاری کرنے اور امر معروف و نہی منکر کی رونق کی توقع کی جاتی ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ عدل تغلقشاہی کی وجہ سے بھیڑیے کی یہ مجال نہ تھی کہ بھیڑ کی طرف تیز نظر سے بھی دیکھ لے۔ اس کے عہد میں شیر ہرن کے ساتھ ایک جگہ پانی پیتے تھے۔ اور احکام شریعت کے جاری کرنے کی وجہ سے قاضیوں مفتیوں، دادبکوں اور محتسبوں کی اس کے عہد میں بڑی عزت اور آبرو ہو گئی تھی۔

سلطان خود مسکرات سے پرہیز کرتا تھا اور اس نے عوام کو بھی شراب نوشی سے روکا تھا۔[2] جن لوگوں نے قطب الدین مبارک خلجی کے قتل کے تیسرے دن اس کی بیوہ کا نکاح خسرو خاں سے پڑھا دیا تھا اُن کو اس "نامشروع" حرکت پر اس نے سخت سزائیں دیں۔[3]

مشائخ سے تعلقات غیاث الدین کو مشائخ و صوفیہ سے بڑی عقیدت تھی۔ شیخ علاء الدین اجودھنیؒ

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۴۴۲۔ [2] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۴۴۳، ۴۴۴۔ تاریخ حقی ۲۹ الف
زبدۃ التواریخ ورق ۴۳ ب۔ مآثر رحیمی ج ۱ ص ۳۴۱، فرشتہ ج ۱ ص ۱۳۰۔ خلاصۃ التواریخ ص ۲۳۷
شیخ نور الحقؒ کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بلبن کی طرح تخت نشینی کے بعد شراب نوشی ترک کی تھی۔ لکھا ہے:-

"بعد از جلوس تخت بادشاہی مجلس شراب نداشت و بہ لہو لعب مشغول نشد"

برنی نے بھی یہ بات لکھی ہے لیکن اس کے بیان سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا۔ وہ لکھتا ہے:

"ہرگز در ایام بادشاہی مجلس شراب نہ ساخت"

اگر شیخ نور الحق نے اپنا مواد برنی کی تاریخ سے اخذ کیا ہے تو یقیناً ان کے جملے سے برنی کا مفہوم بدل گیا ہے!

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۲۶۔

شیخ رکن الدین ملتانیؒ، بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ وغیرہ سے اس کی عقیدت کا ذکر تاریخوں اور تذکروں میں ملتا ہے۔ ایک مرتبہ اُس نے مولانا ظہیر الدین لنگ سے شیخ رکن الدینؒ کی کرامات کے سلسلہ میں معلومات کی تھی[۱]۔ برنی نے لکھا ہے کہ وہ ـــ

در ہر خانقاہے بر مشایخ و گوشہ نشینان واسانہ داراں باندازۂ انفاق ایشاں فتوح فرستادے[۲]	ہر خانقاہ میں مشایخ، گوشہ نشینوں اور اسانہ داروں کو ان کی ضرورت اور خرچ کے مطابق فتوح بھیجتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گو مشایخ سے وہ عقیدتمندانہ پیش آتا رہا لیکن اس کی طبیعت نے تصوف کا رنگ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے مذہبی جذبات و افکار پر فقہاء کا اثر غالب رہا۔

علماء و اکابر دین سے تعلقات۔ برنی نے لکھا ہے کہ سلطان نے دہلی میں ایک ایسی رسم کی بنا ڈالی تھی جو پہلے کبھی نہ تھی۔ وہ ہر خوشی کے موقع پر (خواہ کسی علاقہ کی فتح کے سلسلہ میں ہو یا کسی شہزادہ کی پیدائش کے سلسلہ میں) "جملہ صدور و اکابر و علماء و مفتیان و استادان و مدرسان و مذکران و متعلمان شہر" کو بلاتا تھا اور ہر ایک کو اپنے سامنے اُس کے مرتبہ کے مطابق انعام دیتا تھا[۳]۔

شیخ نظام الدین اولیاء سے خلاف اور اس کے اسباب تعجب کی بات ہے کہ سلطان غیاث الدین جس کی 'پاکیِ نفس' 'دین داری' اور 'میانہ روی' کی مورخین نے اس قدر تعریف کی ہے اپنے عہد کے سب سے زیادہ مشہور بزرگ شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے اچھے تعلقات نہ رکھ سکا۔ کشیدگیِ تعلقات کے یہ اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔

(۱) خسرو خاں نے علماء و مشایخ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں گراں قدر نذرانے پیش کیے۔ جمالی کا بیان ہے کہ یہ نذرانے دو دو تین تین لاکھ تنکے پر مشتمل تھے۔ دہلی کے بیشتر مشایخ نے یہ رقمیں قبول کر لیں۔ صرف تین درویش ایسے تھے جنھوں نے اس روپیے

---

[۱] اخبار الاخیار۔ ص ۶۳-۶۴

[۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۳۵، زبدۃ التواریخ ورق ۴۳ ب

[۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۳۵۔

کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا[1]۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ دہلی کے سب سے زیادہ مقتدر اور مرتاض بزرگ تھے۔ ان کی خدمت میں پانچ لاکھ تنکے پیش کیے گئے۔ اُنھوں نے قبول کر لیے اور فوراً فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیے۔ دہلی کے بعض مشائخ نے اس رقم کو خرچ نہیں کیا بلکہ امانت کے طور پر رکھ لیا۔ جب غیاث الدین تغلق تخت پر آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ دہلی کا خزانہ داد و دہش میں لٹایا جا چکا ہے، چنانچہ اس نے حکم دیا کہ روپیہ واپس لیا جائے۔ جب شیخ نظام الدین اولیاء سے مطالبہ کیا گیا تو اُنھوں نے جواب دیا:

"ایں بیت المال بود، باہل استحقاق رسید، من ازاں مبلغ درمے و دینارے بحق خود خرچ نکردہ ام"[2]	یہ بیت المال (کا روپیہ تھا)۔ جن لوگوں کا حق تھا اُن کو پہنچ گیا۔ میں اس رقم میں سے کوئی درم یا دینار اپنے خرچ میں نہیں لایا۔

جمالی نے لکھا ہے کہ سلطان یہ جواب سُن کر خاموش تو ہو گیا لیکن اس کے دل میں شیخ کی طرف سے بغض پیدا ہو گیا[3]۔ محض اس بنیاد پر غیاث الدین کا شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے خلاف ہو جانا بعید از قیاس نظر آتا ہے۔ اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شیخ کے خانقہی نظام، اُن کے اصولِ زندگی اور اُن کی دینی سرگرمیوں سے ناواقف تھا۔ فتوح کے سلسلہ میں شیخ کا ہمیشہ یہ اصول رہا تھا کہ وہ کبھی اس کو جمع کر کے نہیں رکھتے تھے۔ جتنی رقم جس وقت بھی آتی تھی فوراً مستحقین میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ ایسی صورت میں سلطان کے لیے کسی شکایت کا موقع نہ تھا۔

(۲) قرونِ وسطیٰ میں سماع کا مسئلہ علماء اور صوفیہ کے درمیان زبردست اختلافی مسئلہ تھا۔ غیاث الدین تغلق پر چونکہ علماء و فقہاء کا اثر تھا، اس لیے اُنھوں نے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے خلاف محضر طلب کرنے پر اُسے آمادہ کر لیا۔ سیر الاولیاء کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے یہ فیصلہ شیخ سے کسی ذاتی مخاصمت یا مخالفت کی بناء پر نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس مسئلہ کی صحیح

---

[1] سید علاء الدینؒ، شیخ وحید الدینؒ خلیفہ بابا فریدؒ، اور شیخ عثمان سیاحؒ خلیفہ شیخ رکن الدینؒ نے یہ نذرانے قبول نہیں کیے تھے۔ سیر العارفین۔ ص ۸۸۔

[2]، [3] سیر العارفین ص ۸۸۔

نوعیت کو سمجھنا چاہتا تھا۔[1] لیکن بعض حالات نے فضا کو ناخوشگوار بنا دیا تھا۔ شیخ کے آخری تین سال کے ملفوظات میں کئی جگہ اباحتِ سماع کے متعلق جو گفتگو ملتی ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں خانقاہ کے باہر مخالفت کا ایک طوفان برپا تھا۔ دوسری اہم بات جو اس سلسلہ میں نظر انداز نہیں کی جا سکتی یہ ہے کہ بعض علماء (مثلاً شیخ زادہ حسام الدین فرجام اور قاضی جلال الدین لوالجی) جنہوں نے سلطان کو محضر طلب کرنے پر تیار کیا تھا شیخ سے ذاتی عناد رکھتے تھے۔

اس محضر میں دہلی کے بیشتر علماء و اکابر کو مدعو کیا گیا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ مریدین میں گو بہت سے جید عالم اور ماہرینِ فقہ شامل تھے لیکن اُنہوں نے کسی کو اپنے ساتھ محضر میں لے جانا پسند نہیں کیا۔ قاضی محیی الدین کاشانیؒ اور مولانا فخر الدین زرادیؒ شیخ کی بغیر اجازت محضر میں شریک ہو گئے تھے۔ بحث شروع ہونے سے قبل قاضی جلال الدین نائب حاکم نے شیخ کو دھمکایا کہ اگر انہوں نے آئندہ سماع کی مجلس منعقد کی تو اُن کو سزا دی جائیگی۔ یہ گفتگو شیخ کو ناگوار ہوئی۔ پھر شیخ زادہ حسام الدین نے سماع کی مخالفت میں پُرجوش تقریر کی شیخ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: زیادہ جوش و خروش مت کرو۔ پہلے یہ تو بتاؤ کہ سماع کے معنی کیا ہیں؟ شیخ زادہ جب معنی بتلانے سے قاصر رہے تو شیخ نے اُن سے اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی اثناء میں مولانا علم الدین نبیرہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ تشریف لائے اور انہوں نے سلطان کی فرمائش پر اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اہل حال کے لیے سماع حلال ہے اور انہوں نے اس مسئلہ پر اپنے ایک رسالہ مسئلہ مقصدہ میں بحث کی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ بغداد، شام، روم میں مشائخ کو سماع سے کوئی منع نہیں کرتا۔[1]

صاحب سیر الاولیاء کے زمانہ میں اس مباحثہ اور محضر کے نتیجہ پر لوگوں میں اختلافِ رائے تھا۔ بعض کی رائے تھی کہ سلطان نے سماع کے متعلق کوئی حکم صادر کرنے سے انکار کر دیا تھا، کچھ

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۵۲۸-۵۳۰-

کا خیال تھا کہ سلطان نے شیخ کو تو اجازت دے دی تھی لیکن حیدریوں اور قلندروں کو سماع سننے سے منع کر دیا تھا۔

ضیاء الدین برنی نے اپنی ایک کتاب حسرت نامہ میں اس محضر کا پورا حال درج کیا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ کتاب اب دستیاب نہیں۔ میر خورد صاحب سیر الاولیاء نے اس کتاب سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"جب سلطان المشائخ مناظرہ سے فارغ ہو کر مکان پر تشریف لائے تو ظہر کی نماز کے وقت مجھے اور مولانا محیی الدین کاشانی اور امیر خسرو شاعر کو طلب کیا۔ ہم لوگوں کو جب سعادتِ قدم بوسی حاصل ہوئی تو فرمایا: دہلی کے علماء میری دشمنی اور عداوت سے پُر تھے۔ انھوں نے میدان فراخ پایا اور عداوت سے بھری ہوئی بہت سی باتیں کہنی شروع کیں۔ اور ایک نہایت تعجب اور حیرت کی بات آج یہ دیکھی گئی کہ محل حجت میں جناب نبی کریم کی صحیح حدیثیں سُننے سے اُنھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور وہ لوگ بڑی جرأت اور بیباکی سے کہتے تھے کہ ہمارے شہر میں روایت فقہ حدیث پر مقدم ہے۔ . . اور کہتے تھے کہ یہ حدیث شافعی کی متمسک ہے اور وہ ہمارے علماء کا دشمن ہے، ہم ایسی حدیثیں ہرگز نہیں سنتے . . . میں نے کسی ایسے عالم کو دیکھا یا سُنا نہیں کہ اس کے سامنے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثیں روایت کی جائیں، اور کھلم کھلا کہے کہ میں نہیں سنتا، اور نہیں جانتا۔ یہ کیسا زمانہ ہے۔ تعجب ہے کہ جس شہر میں اس درجہ مکابرہ کیا جائے اور اس درجہ عناد و حسد برتا جائے اور وہ پھر آباد و معمور رہے۔ یہ شہر تو اس قابل ہے کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے اور بالکل تباہ و برباد کر ڈالا جائے۔ جب بادشاہ اور امراء اور خلق، شہر کے قاضی اور نامور علماء سے یہ سنیں کہ اس شہر میں حدیث پر عمل نہیں ہے تو اُن کا اعتقاد احادیث پیغمبر علیہ السلام پر کیونکر راسخ و ثابت ہو سکتا ہے۔"

۵ (بر صفحہ ۳۱۸)

برنی کی اس روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاؒ اس محضر سے سخت دل برداشتہ اور کبیدہ خاطر واپس آئے تھے۔ اور وہ علماء دہلی کی طرف سے سخت شاکی تھے لیکن برنی یا میر خورد کسی کے بیان سے یہ شبہ نہیں ہوتا کہ وہ سلطان غیاث الدین کے طرز عمل سے بھی کسی طرح ناخوش تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی معاصر مورخ یا تذکرہ نویس نے یہ نہیں لکھا کہ شیخ اور سلطان غیاث الدین تغلق کے درمیان تعلقات میں کسی طرح کی کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔

(۳) یحییٰ سرہندی (جس نے شیخ کے وصال کے تقریباً سوا سو سال بعد اپنی کتاب تاریخ مبارک شاہی مرتب کی تھی) نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس وقت سلطان لکھنوتی کی طرف روانہ ہو رہا تھا تو شیخ نے فرمایا تھا: دہلی از تو دور است۔ جب سلطان اپنی مہم سے کامیاب واپس آیا اور افغان پور (دہلی سے چند میل کے فاصلہ پر) پہنچا تو اس نے کہا کہ

"بر سینۂ دشمن پائے دادہ بسلامت آمدم"

کسی نے شیخ کو بھی یہ خبر پہنچا دی۔ اُنہوں نے پھر فرمایا: "دہلی از تو دور است"[۱]

یحییٰ سرہندی نے اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا لیکن بعد کے مورخوں نے اس جملہ کے گرد پوری پوری داستانیں بنا ڈالی ہیں۔ عہد مغلیہ کے مورخین نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ بنگال سے واپسی پر سلطان نے حکم بھیجا تھا کہ جب میں دہلی پہنچوں تو شیخ وہاں نہ ہوں۔ شیخ نے جواب دیا کہ دہلی تو ابھی دور ہے اور جب سلطان افغان پور پہنچا تو جو کوشک اس کے استقبال کے لیے بنائی گئی تھی وہ گر گئی اور وہ ہلاک ہوگیا۔

(نوٹ صفحہ ۳۱۹) [۱] سیر الاولیاء (اُردو ترجمہ) ص ۵۲۴-۵۲۸ - جمالی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء دہلی نے اجتہاد شخصی پر اعتراض کیا تھا اور شیخ سے کہا تھا "تو مجتہد نیستی کہ تمسک بحدیث نمائی۔ مرد مقلد روایتے از ابوحنیفہ بیار" (سیر العارفین ص ۸۹) مولانا فخر الدین زرادیؒ نے اپنے رسالہ "اصول السماع" میں جس طرح اس بحث کو اُٹھایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد و تقلید کے بنیادی اصولوں پر اختلاف رائے تھا
(اصول السماع ص ۶-۸)

[۱] تاریخ مبارک شاہی ص ۹۷۔

فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ خود شیخ سلطان کے حادثہ سے پہلے رحلت فرما گئے تھے[۱]

"ہنوز دلی دور است" کی حیثیت اب ایک ایسی ضرب المثل کی ہے جو صدیوں سے زبان زد خاص و عام ہے۔ ممکن ہے کہ یہ الفاظ شیخ کی زبان سے نکلے ہوں، لیکن اس سلسلہ میں مندرجۂ ذیل باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں:

(۱) سلطان غیاث الدین تغلق کا حادثہ ربیع الاول ۷۲۵ھ کو پیش آیا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ کو وصال فرمایا۔ فرشتہ کا یہ بیان کہ شیخ سلطان کے انتقال سے قبل رحلت فرما گئے تھے، صحیح نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وصال سے کچھ دنوں قبل اُن پر اتنی نقاہت اور کمزوری طاری تھی کہ وہ بالکل گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اور ایسی صورت میں سلطان کی نقل و حرکت کے متعلق اُن کے سامنے کسی گفتگو کا قطعاً موقع ہی نہیں تھا۔ وہ تندرستی کی حالت میں سلاطین کے متعلق گفتگو کرنے سے گریز کرتے تھے، چہ جائیکہ حالت بیماری میں وہ اُن کے متعلق ناراضگی کے جملے زبان پر لائیں۔

(۲) بعض انگریز مصنفین نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت شیخ نے جونا خاں کے ساتھ مل کر سلطان کے خلاف سازش کی تھی[۲] جس شخص نے بھی شیخ کے افکار و کردار اور ان کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس قسم کے الزامات کو یورپین مصنفین کی جہالت اور مفسدہ پردازی پر محمول کریگا۔

(۳) غیاث الدین تغلق کی موت بالکل ایک حادثہ کا نتیجہ تھی۔ محمد بن تغلق کو اس میں خود

[۱] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۹۸

[۲] مثلاً Sleeman : Rambles & Recollection II p. 145

Cooper : The Hand book of Delhi, p. 97

[۳] مزک نے صحیح لکھا ہے کہ یہ الزام تاریخی شواہد کے خلاف ہے۔ ملاحظہ ہو

Mzik : Die Reise des Arabers Ibn Batuta durch Indien und China p. 103

کرنے کے لیے شواہد کافی نہیں ہیں[1]۔ غیاث الدین اور محمد بن تغلق کے تعلقات میں کشیدگی کی داستان بھی شہادت کی محتاج ہے۔ ابن بطوطہ کا یہ بیان کہ

"جونا خاں ہمیشہ سلطان نظام الدین ولی بدایونی کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور اُن سے دعا کا خواستگار رہتا تھا۔ ایک دن اُس نے اُن کے خادموں سے کہا کہ جس وقت شیخ جذبہ اور وجد کی حالت میں ہوں تو مجھے خبر کیجیو۔ چنانچہ جب ایسا موقع ہوا تو انہوں نے جونا خاں کو خبر کی۔ وہ حاضر ہوا۔ شیخ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ ہم نے تجھ کو سلطنت بخشی۔ اسی عرصہ میں شیخ کا انتقال ہو گیا تو جونا نے اُن کے جنازے کو کندھا دیا۔ یہ خبر بادشاہ کو بھی پہنچی۔ تو بہت ناراض ہوا۔ علاوہ ازیں جونا خاں کی تالیفِ قلوب اور سخاوت اور غلاموں کی زیادہ خریداری اور اسی طرح اور امور کے باعث بادشاہ پہلے بھی ناراض رہتا تھا۔ اب اور بھی زیادہ خفا ہوا اور اس کو یہ خبر پہنچی کہ کسی منجم نے یہ بھی کہا ہے کہ بادشاہ اس سفر سے زندہ واپس نہیں آئیگا"[2]

محض افواہوں پر مبنی ہے۔ برنی نے بالکل صاف لکھا ہے کہ غیاث الدین نے جونا خاں کو الغ خاں کا خطاب دیا تھا اور چتر عطا فرما کر ولی عہد سلطنت بنا دیا تھا[3]۔ ایسی صورت میں کسی بزرگ کے سلطنت بخشنے کا قصہ ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔

(۲) بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ شیخ نے سلطان کے شہر تغلق آباد کے متعلق غصہ میں کہا تھا کہ "یا بسے گوجر، یا رہے اجڑ"[4] کوئی معاصر تاریخی شہادت اس بیان کی تائید نہیں کرتی۔

---

[1] ملاحظہ ہو Mahdi Husain: Rise & Fall of Mohd. b. Tughluq p. 66-74 اور ڈاکٹر سید معین الحق کا مضمون Was Mohammad b. Tughluq a Parricide مطبوعہ مسلم یونیورسٹی جرنل ۱۹۳۹ء

[2] عجائب الاسفار جلد دوم ص ۸۶، [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۲۸

[4] Archaeology of Delhi, Carr Stephen p. 92

اگر شیخ نظام الدین اولیاؒ اور غیاث الدین تغلق کے درمیان اس قدر کشیدگی ہوتی جتنی کہ بعد کے مورخین نے ظاہر کی ہے تو ناممکن تھا کہ برنی یا میر خورد اس کا تفصیلی ذکر نہ کرتے۔ معاملہ صرف اسی حد تک تھا جس قدر میر خورد نے بیان کیا ہے لیکن محضر کے طلب کرنے سے کچھ ایسی فضا بن گئی جس میں اس قسم کی داستانیں آسانی سے گھڑ لی گئیں۔ صاحب سیر الاولیاء نے اس محضر کی جو تفصیل دی ہے اس سے یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ سلطان، شیخ سے کوئی ذاتی عناد یا مخالفت رکھتا تھا۔

باب دہم

سلطان محمد بن تغلق

سلطان محمد بن تغلق تاریخ ہند کے نہایت ہی عظیم المرتبت سلاطین میں شمار کیا جاتا ہے برنی نے لکھا ہے کہ جمشیدی وکیخسروی تو اس کی سرشت میں تھی[1]۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

"جامۂ جہانبانی وقبائے جہانداری برقد و قامت او دوختہ بود، یا اورنگ سلطنت وتخت بادشاہی از برائے جلوس او در آفرینش آمدہ"[2]

جامۂ جہانبانی اور قبائے جہانداری خاص اسی کے جسم کے لیے تیار کیا گیا تھا، یا تاج وتخت بادشاہی صرف اس کے جلوس کے لیے وجود میں آئے تھے

معاصر مورخ کا خیال تھا کہ اُس زمانہ میں اگر ارسطو، نظام الملک طوسی، یا احمد حسن زندہ ہوتے تو اس کی صلاحیت جہانبانی کو دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے[3]۔ علم وفضل، شجاعت وشہامت، فہم وذکاوت، سلیقۂ جہانداری، انصاف پروری وعدل گستری، داد ودہش، بلند ہمتی وعالی حوصلگی، شہسواری وصف شکنی[4] — غرض جس اعتبار سے دیکھیے سلطان ایک ممتاز شخصیت کا حامل نظر آتا تھا۔ اسی طرح مذہبی افکار وعقائد میں بھی اس کی ایک انفرادی شان تھی۔ اس کی مذہبی فکر، فلسفیانہ جستجو اور فقہی تحقیق کی بھٹی میں تپ کر پختہ ہوئی تھی۔ وہ الحاد اور بے دینی کے کوچوں سے بھی گزرا تھا۔ شکوک وشبہات کے کانٹے بھی اس کے دل میں چبھے تھے لیکن بالآخر

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۵۷ [2] ایضاً ص ۴۵۸ [3] ایضاً ص ۴۶۲

[4] ایضاً ص ۴۵۷-۴۵۸، عجائب الاسفار ص ۹۱، ۱۳۰ وغیرہ، تاریخ محمدی ورق ۳۹۸ ب، ۳۹۹ الف

بدر چاچ اس کے متعلق لکھتا ہے

شاہ محمد آں ولی عہد خلیفۂ زماں
کو چوامام چاردیں شہر علوم رادرست (قصائد ص ۱۲)

اسلام میں اس کے اعتقاد کی بنیادیں مضبوطی سے قائم ہوگئی تھیں۔ اس نے دین اور سیاست کے بنیادی مسائل پر کافی بالغ نظری سے غور کیا تھا۔ اور اپنے مخصوص انداز میں اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش بھی کی تھی جو اسلامی سماج کو گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ لیکن ان تمام فضائل ومحاسن کے باوجود وہ ناکام رہا۔ اس ناکامی کی ذمہ داری کچھ تو عام حالات کے ناسازگار ہونے پر تھی اور کچھ اس کی عاجلانہ فطرت اور منتقمانہ طبیعت پر۔ مبدء فیاض نے حکیمانہ بصیرت کے خزانے تو اس پر کھول دیے تھے لیکن طبیبانہ تحمل اور مزاج شناسی سے اس کو یکسر محروم کردیا تھا۔ بقول برنی "نہایت طلبی در نفاذ امر ہائے متصوری" اور "کثرت تحکمات مجدد"[1] نے اس کی ساری اچھائیوں پر پانی پھیر دیا۔ جب لوگ اس کے تخیل کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے تو اس کے احکام کی بجاآوری میں تساہل بھی لازمی تھا۔ سلطان نے اس تساہل کو باغیانہ جذبات پر محمول کیا اور غصہ سے بھڑک اٹھا۔ اور یہ کہتے ہوئے کہ

من از خلق آزردہ شدم۔ ہر چند خلق	میں لوگوں سے پریشان ہوگیا ہوں۔۔ وہ میری
مخالفت بیشتر خواہند کرد، من سیاست	جتنی زیادہ مخالفت کریں، میں اسی قدر زیادہ
بیشتر خواہند کرد"[2]	قتل کرونگا۔

اُن کو سزائیں دینے میں مصروف ہوگیا۔ حالات نے اس کے مزاج کو خراب کیا اور اس کے مزاج نے حالات کو بگاڑا، اور عمل و ردِعمل کے اس چکر میں وہ اس طرح پھنسا کہ پھر کبھی اس سے باہر نہ نکل سکا اور اسی وجہ سے لوگوں نے اُسے غلط سمجھا اور اس سے کہیں زیادہ مورخوں نے مسخ کیا۔ اُس کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کے عہد حکومت کے حالات ایسے متعصب مورخوں کے ہاتھوں لکھے گئے جو اس کے مذہبی افکار و رجحانات سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ چنانچہ اُسے کبھی نمرود سے تشبیہ دی گئی، کبھی یزید کا مثل بتلایا گیا اور کبھی حجاج اور ضحاک

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶۷

[2] ایضاً ص ۵۲۲۔

سے اس کا مقابلہ کیا گیا[1]۔ اس رنگ آمیزی نے اس کے اصلی خد و خال ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیے۔ محاسن، معائب میں بدل گئے، اور مظالم کا شہرہ اس بلند آہنگی سے کیا گیا کہ اُس کا نام سنتے ہی نظروں کے سامنے ایک ایسی تصویر پھرنے لگی جس کے چہرہ کے گرد آگ اور خون کا ہالہ رقص کرتا تھا[2]۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جو لوگ تقلید اور توارث کی زنجیریں توڑ کر حریتِ فکر و ضمیر کے ساتھ مذہب کے مطالعہ کی کوشش کرتے ہیں اُن کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ محمد بن تغلق کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ علماء اُس سے برافروختہ ہو گئے۔ قاضیوں نے اُس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ بعضوں نے اُسے کافر و ملحد کہا۔ عوام ایک طرف تو مذہبی حلقہ کی اس مخالفت سے متاثر ہوئے، دوسرے اس کی نئی اسکیموں کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کے متعلق ایک عام غلط فہمی پھیل گئی۔ لوگ ایک سانس میں اس کے علمی تبحر اور پاکیزہ سیرت کی تعریف کرتے تھے اور دوسرے ہی سانس میں مذہبی طبقہ سے سختی پر اظہارِ غم و ناراضگی۔ ان متضاد کیفیات کے باعث معاصرین سلطان کا صحیح کیرکٹر نہ سمجھ سکے اور وہ ان کی نظروں میں ایک معمہ اور عجوبہ روزگار بن کر رہ گیا۔

معاصر مورخین اور اُن کے تعصبات محمد بن تغلق کے تین معاصر مورخ تھے ــــ برنی، ابن بطوطہ اور عصامی اور یہ تینوں سلطان کے سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریات سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ برنی سترہ سال سے زیادہ محمد بن تغلق کا ندیم رہا تھا[3] لیکن اس کے اور سلطان کے خیالات میں بُعد المشرقین تھا۔ سلطان مذہب میں عقلیت پسند تھا اور سیاست میں انقلابی تصورات کا حامل۔ اس نے حسب و نسب کے سارے امتیاز ختم کر کے سرکاری ملازمتوں کے دروازے ہر اہل شخص کے لیے کھول دیے تھے۔ برنی مذہب میں تقلید اور سیاست

---

[1] فتوح السلاطین ص ۴۶۶، ۴۴۹، ۵۰۴ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶۰۔ عجائب الاسفار ص ۱۳۶ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۱۴-۱۱۵ [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۰۴

میں نسبی امتیاز کا قائل تھا[1]۔ وہ نہایت غم اور غصہ کے ساتھ سلطان کے متعلق لکھتا ہے۔

"نجبہ مطرب بد اصل را چناں برکشید کہ درجۂ او از درجات بسیاراں از ملوک بگذشت ... و ہمچنیں عزیز خمار و برادر او را و فیروز حجام و منکا طباخ و مسعود خمار و لدھا باغبان و چندیں جواہیر لترہ را بزرگ گردانید و شغلہا و اقطاعہا بدیشاں تفویض فرمود و شیخ بابو نایک بچہ جولاہہ را قرب ارزانی داشت و رتبت و مکانت ایچناں لترہ را درمیان مردم بلند گردانید و بدست پیرا مالی کہ سفلہ ترین و رزالہ ترین سفلگان و رزالگان ہند و سند است، دیوان وزارت داد و برسر ملوک و امرا و والیان و مقطعان امرا گردانید و کشن بازران اندری را کہ رزالہ ترین رزالگان بود عرصۂ اودھ داد، و مقبل غلام احمد ایاز را بصورت و معنی ننگ ہمہ غلاماں بود نیابت وزارت گجرات ... حوالت فرمود[2]

نجبہ کو جو گویا تھا اور بد اصل تھا اس طرح بڑھایا کہ اُس کا درجہ بہت سے ملوک کے درجوں سے بڑھ گیا ... اسی طرح عزیز خمار اور اس کے بھائی اور فیروز حجام اور منکا بھٹیارے مسعود خمار اور لدھا باغبان اور بہت سے نیچی ذات کے لوگوں کو بڑھایا، ملازمتیں دیں اور جاگیریں عنایت کیں۔ شیخ بابو نایک بچہ جولاہہ کو قربت بخشی اور ایسے رذیل لوگوں کا مرتبہ بلند کر دیا۔ اور پیرا مالی کو جو ہند و سند میں سب سے رذیل اور سفلہ انسان ہے، دیوان وزارت دے دیا اور ملوک و امراء و والیان و مقطعان پر فوقیت دے دی۔ اور کشن بازراں اندری جو رزالہ ترین شخص تھا اودھ (کی جاگیر) دے دی۔ اور احمد ایاز کے غلام مقبل کو جو ظاہراً و باطناً میں دونوں طرح غلاموں میں ننگ تھا، نیابت وزارت گجرات اس کے سپرد کر دی۔

[1] فتاوائے جہانداری میں اس نے نسب کے متعلق اپنے خیالات نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۰۵۔

ابن بطوطہ دہلی کا قاضی تھا۔ عصامی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کے قاضیوں نے سلطان کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا تھا۔ ممکن نہیں کہ ابن بطوطہ اس عام بے چینی سے متاثر نہ ہوا ہو۔ غالباً وہ اسی بنا پر قید کیا گیا تھا۔ جب قید سے رہا ہوا تو اس نے باوجود اصرار سلطان کی ملازمت نہیں کی۔ سلطان نے اُسے چین سفارت پر بھیجا۔ لیکن سمندر میں طوفان آجانے کے باعث وہ وہاں نہ جا سکا، اور دہلی واپس ہونے کے بجائے معبر چلا گیا اور وہاں کے باغی حکمراں جلال الدین احسن شاہ کی بیوی کی بہن سے شادی کر لی۔

عصامی کی عمر سولہ برس کی تھی جب اس کے بوڑھے دادا عزالدین عصامی کو (جن کی عمر نوّے سے متجاوز تھی) دکن جانے کا حکم ملا۔ نو عمر پوتے کے ساتھ وہ دہلی سے دیوگیر کے لیے روانہ تو ہو گئے، لیکن ابھی سفر کی پہلی منزل بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ سفر آخرت پیش آگیا۔[1] عصامی کو سخت صدمہ ہوا اور ہمیشہ کے لیے سلطان کی طرف سے دل میں ایک نفرت بیٹھ گئی۔ بعد کو جب دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی تو اس کی ہمدردیاں باغی حکومت کے ساتھ ہو گئیں۔ اس نے اپنی کتاب سلطان علاء الدین حسن بانی حکومت بہمنی کے نام معنون کی اور اس کی بغاوت کو جائز ثابت کرنے کے لیے محمد بن تغلق پر طرح طرح کے اتہام لگائے اور اعلان کیا ؎

شہنشاہ دوں دوست بدخواہ دیں　　کہ یکسر سرے تافت از راہ دیں
شد آزردہ از وے صغار و کبار　　برو گشتہ جائز خسروح دیار
شریعت رضا دادہ در خون او　　طبیعت فسردہ ز افسون او [2]

اس نے اور لوگوں کو بھی اس طرح بغاوت کی ترغیب دی ہے ؎

اگر خلق ایں ملک یک جا شوند　　ہمہ یک دل از بہر غوغا شوند
یکایک بر آں فتنۂ دیں زنند　　عجب نے سرش گر بہ خاک افگنند [3]

[1] فتوح السلاطین ص ۴۴۷ - ۴۴۹ - [2] ایضاً ص ۱۵، [3] ایضاً ص ۴۵۱

محمد بن تغلق کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تینوں معاصر مورخین کے زاویہ ہائے نگاہ اور سماجی تعصبات پر نظر رکھی جائے۔

عقلیت پسندی	سلطان محمد بن تغلق عقلیت پسند مسلمان تھا[1]۔ اور بقول شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ:

"نقل را تابع عقل و مسموع را فرع معقول ساختہ بود"[2]

چودھویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں مذہب کا اس تنقیدی انداز سے مطالعہ شدید غلط فہمیوں کا سبب بن گیا۔ برنی اس عقلیت پسندی کی مذمت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"معقولاتِ فلاسفہ کہ مایۂ قساوت و سنگدلی	معقولات فلاسفہ نے جو سیاہ قلبی اور سنگدلی
است تمامی دل او را گرفتہ بود، و منقولات	کی بنیاد ہیں اس کے دل میں جڑ پکڑ لی تھی اور
کتب سماوی و احادیث انبیاء را کہ معدن	منقولات کتب سماوی اور احادیث انبیاء
رقت و مسکنت و مخوف عقاب گوناگوں	کا جو نرمی، مسکینت کی کان ہیں اور طرح طرح
عقوبت است در خاطرش مدخلے نماندہ	کے عذابوں سے ڈرانے والی ہیں اس کی
بود"[3]	طبیعت پر کوئی اثر نہ رہا تھا۔

اس بے راہ روی کی وجہ برنی نے یہ بتائی ہے کہ ابتدائی زمانہ میں محمد بن تغلق کو چند ایسے لوگوں کی صحبت ملی تھی جو "بد اعتقاد" اور "فلسفی" تھے[4]۔ ان کا اثر سلطان نے بہت جلد قبول کر لیا اور اس کے ذہنی محرکات فلسفہ کے تابع ہو گئے۔ اس سلسلہ میں برنی نے خاص طور پر سعد منطقی[5]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶۴۔ مسالک الابصار ص ۳۷۔ طبقات اکبری جلد اول ص ۲۰۰۔
[2] تاریخ حقی (قلمی) ورق ۳۲ الف [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶۵۔
[4] محمد بن تغلق کی موضوع خود نوشت سوانح عمری میں زمانہ ساز علماء کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور لکھا ہے
"علماء روزگار بہ حکم الضرورت تبیح المحظورات بعضے زبان از گفتن حق بستہ بودند و از غایت حرص دستِ شر از آستین بے دینی کشیدہ و بہ طمع مناصب باطل با آں گروہ ہم داستاں گشتہ"
[5] ملک سعدالدین منطقی کا نام سب سے پہلے جلال الدین خلجی کے "حریفان مجلس" کے سلسلہ میں سننے میں آتا ہے (تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۸) علاء الدین خلجی کا بھی وہ مقرب رہا تھا۔ شمس الدین ترک کے رسالہ کا ذکر اسی نے سلطان سے کیا تھا (برنی ص ۲۹۹) ملک سعدالدین اپنے زمانہ کے مشہور فلاسفہ میں تھا۔

عبید[1] شاعر، نجم انتشار[2] اور مولانا علیم الدین[3] کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ غالباً یہی وہ علماء تھے جن کی صحبت اور میل جول کا یہ نتیجہ نکلا کہ

مغالطات بسیار گشت، تا بجدے
که در وجودِ صانع شکوک مزاحم و
معارض شد"[4]

مغالطے (شکوک اور غلط فہمیاں) بڑھ گئے، یہاں
تک کہ خالق کائنات کے وجود کے متعلق بھی شکوک و
شبہات ذہن میں) جھگڑا پیدا کرنے اور رنج پہنچانے لگے۔

اسی زمانہ میں اُس نے ایک دن شیخ شہاب الدین حق گوؒ سے کہا کہ نبوت کے خاتمہ کو عقل تسلیم نہیں کرتی جس پر شیخ کو بیحد غصّہ آیا[5] لیکن "شک کی یہی ایک چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیل راہ بنی" اور پھر ایک زمانہ آیا کہ

"صفات باری جل ذکرہ روشن گشت و
چوں دل بر وحدت واجب الوجود قرار
گشت و تصدیق نبوت کہ واسطہ وصول
بندگاں است الی اللہ تعالیٰ مقرر شد"[6]

باری تعالیٰ کی صفات روشن ہوگئیں۔ اور جب
دل نے واجب الوجود کی وحدت پر محکم اعتقاد
پیدا کرلیا تو نبوت کی صداقت پر جو بندوں کے
اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے یقین ہوگیا۔

---

[1] عبید: برنی نے ایک جگہ اُسے عبید حکیم کے لقب سے پکارا ہے (ص ٣٦٠) وہ ان شاعروں میں تھا جن کو علاء الدین کے عہد میں "مواجب شاعری" دیوان عرض سے ملتی تھی۔ وہ شیخ نظام الدین اولیاؒ کا مرید ہوگیا تھا لیکن اُن کے ایک نومسلم مرید کے ساتھ بدسلوکی کرنے کے باعث غالباً حلقۂ مریدین سے علیحدہ کردیا گیا تھا (تاریخ مبارک شاہی ص ٩٥) غیاث الدین نے اُسے قتل کرادیا تھا۔

[2] نجم انتشار: برنی نے اُن کا شمار عہد علائی کے اُن چھیالیس[46] متبحر علماء میں کیا ہے جو اپنے فن میں یگانہ سمجھے جاتے تھے (ص ٣٥٢۔٣٥٤)

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ٤٦٥۔ ان کے حالات کسی مورخ نے نہیں لکھے۔

[4] روٹوگراف خود نوشت سوانح عمری محمد بن تغلق۔ ص ٣۔ [5] گلزار ابرار (قلمی) محمد غوثی نے لکھا ہے کہ سلطان کی اس بات سے ناراض ہوکر اُنہوں نے جوتہ اپنے پاؤں سے نکال کر اس کے منہ پر مارا تھا اور اس کی سزا میں انہیں قلعہ کے اوپر سے خندق میں ڈال دیا گیا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا بیان یہ ہے کہ سلطان نے اُن سے مطالبہ کیا تھا کہ اس کو "محمد عادل" کہیں، انہوں نے جواب دیا کہ ظالم کو عادل نہیں کہونگا (اخبار الاخیار ص ١٢٩)

[6] خود نوشت سوانح عمری ص ٣، ہمارا خیال ہے کہ یہ سوانح عمری جعلی ہے۔ ملاحظہ ہو *Studies in Medieval India History* p. 76-86.

مذہبی معلومات | محمد بن تغلق نے علوم دینی کا نہایت وسیع مطالعہ کیا تھا۔ احکام شریعت کی فلسفیانہ تحقیق نے اس کے اعتقاد و یقین کی بنیادیں مستحکم کر دی تھیں۔ شہاب الدین دمشقی نے لکھا ہے کہ سلطان کو قرآن مجید حفظ تھا۔ اور ہدایہ کا کامل متن اس کی زبان پر تھا[۱]۔ بعض مرتبہ جب کسی کو نصیحت کرنی ہوتی تھی تو قرآن پاک کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنا ذاتی واقعہ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ قرض خواہوں نے اُسے بہت پریشان کیا۔ سلطان کو خبر ہوئی تو اس کو سمجھایا کہ جس قدر میں دیا کروں اس سے زیادہ خرچ مت کیا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فلا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطھا کل البسط ٥ وکلوا واشربوا ولا تسرفوا ٥ والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما ٥ [۲]

پابندی مذہب | عصامی نے سلطان پر بے دینی اور اصول و فروع سے منحرف ہو جانے کا جو الزام لگایا ہے[۳] وہ تاریخی شواہد کے بالکل خلاف ہے۔ سلطان نماز اور روزہ کا بے حد پابند تھا[۴]۔ برنی کا بیان ہے کہ

"چوں بانگ نماز برآمدے بجستے وایستادہ	جب اذان کی آواز آتی تو کود کر کھڑا ہو جاتا تھا
شدے و تا آنزماں ایستادہ بودے کہ	اور جب تک اذان ختم نہ ہوتی کھڑا رہتا تھا۔
بانگ نماز تمام شود و بعد از ادائے نماز	صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد بہت سے اوراد
بامداد چندیں اوراد خواندے"[۵]	پڑھتا تھا۔

فرشتہ نے نوافل اور مستحبات میں اس کے انہماک کا ذکر کیا ہے[۶]۔ روزہ کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ

---

۱ مسالک الابصار ص ۳۷؛ محمد بن تغلق کے ایک معاصر صوفی بزرگ مولانا حسام الدین ملتانی کے متعلق میر خورد نے لکھا ہے: در فقہ ہر دو جلد ہدایہ یادداشت (سیر الاولیاء ص ۲۵۶)

۲ عجائب الاسفار ص ۲۲۵۔ ۳ فتوح السلاطین ص ۶۰۵

۴ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۰، طبقات اکبری جلد اول ص ، تاریخ حقی (قلمی) ورق ۳۲ الف، زبدۃ التواریخ (روٹوگراف) ۵ تاریخ فیروز شاہی ص ۵۰۶۔

۶ تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ، نیز مآثر رحیمی جلد اول ص ۳۴۵۔

بیماری میں بھی روزہ قضا نہ ہوتا تھا۔ تتہ قیام کے زمانہ میں علالت کے باوجود اُس نے یوم عاشورہ کا روزہ رکھا[1]۔ معمولی معمولی باتوں میں اُسے احکام شریعت کا خیال رہتا تھا۔ اگر کسی جانور کے متعلق یہ شبہ ہو جاتا کہ وہ صحیح طور سے ذبح نہیں ہوا تو اُسے پھنکوا دیتا تھا[2]۔

ذاتِ نبوی سے عقیدت | سلطان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے جو عقیدت تھی اُس کا اندازہ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ لکھا ہے:

"در ابتدائے جلوس بر سریر سلطنت راضی	تخت پر بیٹھنے کے بعد اس بات پر راضی نہ ہوا
نشد کہ خود را بالقاب بادشاہی کہ بادشاہان	کہ اپنے آپ کو کسی القاب بادشاہی سے جیسا
دیگر داشتند مثل غیاث الدین و علاء الدین	کہ دوسرے بادشاہوں نے غیاث الدین و
و قطب الدین ملقب سازد، و باوجود اسم	علاء الدین او قطب الدین وغیرہ القاب اختیار
محمد کہ اعظم اسماء بنی آدم است بلقب	کیے تھے، ملقب کرے۔ اور محمد نام رکھتے ہوئے
دیگر تفاخر کند"[3]	جو بنی آدم میں بڑا نام ہے کسی دوسری لقب پر فخر کرے

ختم رسالت میں اس کے یقین اور احیاء سنت نبوی میں اس کی دلچسپی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک زمانہ میں اس نے سکوں پر اپنا لقب "محیی سنن خاتم النبیین" نقش کرایا تھا[4]۔ جب خلیفہ عباسی کا منشور حاصل ہوا تو اس نے قرآن پاک اور مشارق الانوار سامنے رکھ کر لوگوں

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۲۲ [2] عجائب الاسفار ص ۱۷۶۔

[3] تاریخ حقی (قلمی)، ورق ۳۳ ب، اسی عبارت کے بعد شیخ محدثؒ نے اس کی طبیعت کے تضاد کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "باوجود این چیزہا می کرد و می گفت کہ بوئے انا ربکم الاعلیٰ از آنجا می آمد"۔ یہ آخری جملہ تاریخ فیروز شاہی سے لیا گیا ہے۔ (ص ۵۰۶)

برنی نے ایک جگہ اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: "شخصے را مشاہدہ کنم کہ در ہمہ عصر ملک خود از کمال اعتقاد ایمانی خود را سلطان محمد خوانانیدے و سلطان محمد گویانیدے و با خود اسم محمد کہ اعظم الاسمائے آدم رست از خطابات و القابات سلاطین ماضیہ تنفر نماید و ننگ دارد..." (ص ۴۹۰) شیخ محدث کے بیان سے یہ مبہم عبارت صاف ہو جاتی ہے۔

[4] Nelson Wright p. 120

سے بیعت لی۔[۱]

کعبہ کا ارادہ | برنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں سلطان کا ارادہ تھا کہ مملکت دہلی فیروز، ملک کبیر اور احمد ایاز کے سپرد کر کے خانۂ کعبہ کی زیارت کے لیے چلا جائے، لیکن ملک کی عام حالت نے اُسے باہر قدم نکالنے کی اجازت نہ دی۔[۲]

سلطان کی پرائیوٹ زندگی | محمد بن تغلق کی پرائیویٹ زندگی ان تمام آلودگیوں سے پاک تھی جن میں قرون وسطیٰ کا بیشتر حکمراں طبقہ ملوث نظر آتا ہے۔ برنی نے لکھا ہے:

"ہیچ مسکرے از مسکرات نچشد و از زنا	نشہ پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں چکھتا۔ زنا،
و لواطت و نظر بحرام و خیانت نورزد	لواطت اور حرام اور خیانت پر نظر نہیں ڈالتا
و ہیچ قمارے نباز د و از فسق و فجور	کوئی جوا یا شرط کا کھیل نہیں کھیلتا۔ فسق
معتاد اجتناب و احتراز نماید"[۳]	و فجور سے حتی المقدور پرہیز کرتا تھا۔

جب حرم میں داخل ہوتا تھا تو خواجہ سرا آگے بڑھ کر سب نامحرم عورتوں کو پردہ میں کر دیتے تھے، اس لیے کہ نامحرم پر نظر ڈالنا وہ انتہائی معیوب سمجھتا تھا۔[۴]

سلطان اپنی ماں کا اتنا تابعدار تھا کہ کبھی اس کے فرمان کی خلاف ورزی نہیں کرتا تھا۔[۵] قتلغ خاں سے بچپن میں کچھ پڑھا تھا، تو اُستاد کی حیثیت سے اس کی اتنی عزت کرتا تھا کہ بقول برنی "ہیچ شاگردے را از ہیچ استادے میسر نہ شود"۔[۶]

تعجب کی بات ہے کہ سلطان کو ناچ اور گانے سے بڑی دلچسپی تھی۔ شہاب الدین العمری کا بیان ہے کہ بارہ سو گویے اس کے یہاں ملازم تھے۔ ایک ہزار غلام گویے ان کے علاوہ تھے۔[۷] سلطان کبھی کبھی خلوت میں اُن کا گانا سنتا تھا، لیکن جیسا کہ شہاب الدین نے خود ہی لکھا ہے

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۹۵، تاریخ حقی (قلمی) ورق ۳۲ الف۔
[۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۲۲ [۳] ایضاً ص ۴۶۰، نیز تاریخ حقی (قلمی) ورق ۳۲ الف
[۴] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۰۶ [۵] ایضاً ص ۵۰۶ - [۶] ایضاً ص ۵۰۶
[۷] مسالک الابصار، ص ۳۲

سلطان کی یہ مجلسیں ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک ہوتی تھیں[1]۔ ابن بطوطہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر دربار میں گویے اور ناچنے والی عورتیں بھی موجود ہوتی تھیں[2]۔ غالباً سلطان کی اسی دلچسپی کے باعث حوض خاص کے کنارے گویوں کی ایک آبادی وجود میں آگئی تھی اور وہ علاقہ "طرب آباد" کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ ابن بطوطہ ہی کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت آباد میں بھی طرب آباد قائم ہوگئے تھے[3]۔

شراب پر پابندی سلطان محمد نہ خود شراب پیتا تھا، نہ یہ پسند کرتا تھا کہ اس کے امراء و حکام شراب کے عادی ہوں۔ شہاب الدین العمری اور قلقشندی دونوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں سلطان نے خاصی سختی سے کام لیا تھا۔ دہلی میں شراب نہ علانیہ پی جا سکتی تھی نہ چھپ کر[4]۔ سلطان نے ایک امیر کی ساری جائداد محض اس وجہ سے ضبط کر لی تھی کہ وہ شراب پیا کرتا تھا[5]۔ شہاب الدین العمری کو شبلی نے بتایا تھا کہ دہلی میں شراب بالکل نہیں ملتی اور وہاں کا بادشاہ شرابیوں سے سخت نفرت کرتا ہے[6]۔

نماز کی تاکید سلطان محمد نماز با جماعت پر بہت زور دیتا تھا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے:-

"یہ بادشاہ نماز کے معاملہ میں بہت تاکید کرتا تھا اور اس کا حکم تھا کہ جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے اس کو سزا دی جائے۔ ایک روز اُس نے نو آدمی اس بات پر قتل کر ڈالے۔ اُن میں سے ایک آدمی مطرب تھا۔ اس کام پر بہت سے آدمی لگائے ہوئے تھے کہ جماعت کے وقت جو شخص مل جائے اُس کو پکڑ لاؤ۔ یہاں تک کہ سائیس جو دیوان خانے کے دروازہ پر گھوڑے لیے رہتے تھے اُن کو بھی پکڑنا شروع کیا۔ حکم تھا کہ ہر شخص نماز و شرائط اسلام کو سیکھے تمام لوگ بازاروں میں نماز یاد کرتے پھرتے تھے اور کاغذوں پر لکھوا لیتے تھے۔"[7]

---

[1] مسالک الابصار۔ ص ۵۲ [2] عجائب الاسفار۔ ص ۵۲ [3] ایضاً ص ۱۰۲

[4] مسالک الابصار۔ ص ۵۲ [5] صبح الاعشیٰ ص ۶۴ [6] مسالک الابصار۔ ص ۵۲۔

[7] عجائب الاسفار۔ ص ۱۳۰-۱۳۱۔

ہندوستان میں غالباً یہ پہلا موقع تھا جب حکومت کی طرف سے نماز کے سلسلہ میں احتسابی کارروائی کا انتظام کیا گیا تھا[1]۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان شاہی احکام کا عوام پر بہت اثر ہوا۔ حد یہ ہے کہ ناچنے گانے والی عورتیں تک نماز کی پابند ہو گئی تھیں۔

سلطان کے بنیادی دینی اور سیاسی معتقدات

محمد بن تغلق کے مذہبی افکار و رجحانات میں بعض اہم مذہبی تحریکوں کا عمل اور ردعمل نظر آتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عصری میلانات کی روشنی میں اس کے بنیادی سیاسی اور دینی تصورات کو سمجھ لیا جائے۔

(۱) چودہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں فقہی علوم کا بہت چرچا تھا۔ اس دور میں جتنا لٹریچر فقہ اور علوم فقہ پر وجود میں آیا اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔[2] فقہ کی مشہور کتابوں ہدایہ، بزودی، تلویح، حسامی، کنز الدقائق، منار وغیرہ پر بے شمار حاشیے اور شرحیں تیار کی گئی تھیں[3]۔ حد یہ ہے کہ صوفیہ میں بھی ایک بڑا طبقہ علوم فقہ کا ماہر تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے خلفاء و مریدین میں بہت سے افراد نہ صرف فقہ کے ماہر تھے بلکہ ہدایہ اُن کو ازبر تھی۔

محمد بن تغلق اپنے عہد کے اس رجحان سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ فقہ میں اس کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ ہدایہ اس کی نوک زبان پر تھی۔ فقہاء کی بڑی تعداد اس کے گرد موجود رہتی تھی۔ اور وہ دیگر اسلامی ممالک سے فقہ کی کتابیں حاصل کرنے کی جستجو میں رہتا تھا۔

---

[1] قرآن نے نماز کا قائم کرنا مسلمان فرمانروا کا فرض قرار دیا ہے۔ ۲۲ : ۴۱

[2] ملاحظہ ہو K.A. Nizami: Studies in Medieval Indian History p. 67-68

[3] مولانا معین الدین عمرانی نے تلویح، حسامی، کنز الدقائق اور منار کی شرحیں لکھی تھیں۔ صرف حاشیہ علی التلویح کا ایک نسخہ ندوہ کے کتب خانہ میں ملتا ہے۔ قاضی حمید الدین نے شرح الہدایہ مرتب کی تھی۔ مولانا سراج الدین عمر نے تقریباً ایک درجن کتابیں فقہ اور اصول فقہ پر لکھی تھیں۔ ان کی فتاوائے قاری الہدایہ (قلمی نسخہ رام پور کتب خانہ) زبدۃ الاحکام فی اختلاف الئمہ اعلام (قلمی نسخہ کتب خانہ برلن)، الغرۃ المنیفہ فی ترجیح مذہب ابی حنیفہ (قلمی نسخہ آصفیہ کتب خانہ حیدرآباد) الفتاوائے السراجیہ (قلمی نسخہ کتب خانہ بانکی پور) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

[4] محمد بن تغلق کے سب سے زیادہ مشہور معاصر چشتی بزرگ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ ابوحنیفہ ثانی سمجھے جاتے تھے۔ (خیر المجالس ص ۱۲، ۲۴۳)

لیکن فقہ میں اس گہری دلچسپی کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلطان اپنے آپ کو اجتہاد شخصی کا مجاز سمجھتا تھا۔ اس قسم کا دعویٰ اس نے صریحاً کسی جگہ نہیں کیا لیکن اس کے اعمال و کردار میں یہ جذبہ پوری طرح متحرک نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین اور سیاست کے متعلق اس کے بنیادی تصورات اجتہادی فکر کا سہارا لیے بغیر بروئے کار لائے ہی نہیں جا سکتے تھے۔ برنی نے جس چیز کو "حکمات مجددانہ"[۱] سے تعبیر کیا ہے وہ اس کے مجتہدانہ فکر کی پیداوار تھی۔

(۲) محمد بن تغلق "الدین والملک توامان" کا قائل تھا۔ عملی حیثیت سے اس اعتقاد کے معنی یہ تھے کہ عوام کی مذہبی زندگی پر بھی اس کو وہ اقتدار حاصل ہو جو سیاسی زندگی پر اس کو حاصل تھا۔ ممکن ہے کہ اس کوشش کا ایک مقصد اپنے ذاتی اقتدار کا دائرہ وسیع کرنا بھی ہو، لیکن حالات پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ دین اور سیاست کی اس خلیج کو پُر کرنا چاہتا تھا جو خلافت راشدہ کے بعد پیدا ہو گئی تھی اور جس نے ملّی زندگی کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے اس میں انتشار و اشتات کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے عہد کے وہ سکّے جن پر اس کا لقب "محیی سنن خاتم النبیین" یا صرف خلفاء راشدین کے نام کندہ ہیں اس کے افکار کا رُخ متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ جب مسلم سماج کے بعض طبقات بالخصوص صوفیہ نے اپنی صلاحیتوں کو اس کی چاکری میں دینے سے انکار کیا تو اس نے خلفاء راشدین ہی کی روایات کا ذکر کر کے سرکاری ملازمتیں قبول کرنے پر مجبور کیا۔[۲]

مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے سلطان کی اس بنیادی فکر کو غلط سمجھا اور کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ اس کے متعلق صدہا اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ مثلاً برنی لکھتا ہے کہ محمد بن تغلق کی خواہش یہ تھی کہ

"بمرتبۂ سکندری کفایت ننماید و بر تبت سلیمانی متعالی گردد و امر او بر جن و | (صرف) مرتبۂ سکندری پر ہی بس نہ کرے (بلکہ) مرتبۂ سلیمانی کی بلندی پر پہنچے اور اس کا حکم جن و

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶۷ [۲] سیر الاولیاء ص ۱۹۶

انس نفاذ یا بد و احکام نبوت و سلطنت	اس پر نافذ ہو اور نبوت اور سلطنت کے احکام
از دار السلطنت او صادر شود و بادشاہی	اس کے دار السلطنت سے جاری ہوں اور وہ
را با پیغمبری جمع کند"[1]	بادشاہی کو پیغمبری کے ساتھ ملائے۔

بعد کے مورخین مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، شیخ نورالحق ؒ یحییٰ سرہندی، نظام الدین بخشی، فرشتہ نہاوندی وغیرہ نے کچھ اس طرح سے اس چیز کو پیش کیا ہے کہ ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید سلطان کسی نئے مذہب کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا، حالانکہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔

جوامع الکلم میں سید محمد گیسو درازؒ سے ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے جس میں سلطان کے افکار کے متعلق یہی غلط فہمی کارفرما نظر آتی ہے۔ لکھا ہے کہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے بھانجے مولانا کمال الدین (جو بعد کو علامہ کے لقب سے مشہور ہوئے) قاضی شمس الدین برادر قتلغ خاں سے بزودی کا سبق لے رہے تھے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ یک لخت قتلغ خاں کا بلاوا آیا۔ انہوں نے ہمیں بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور خود روانہ ہو گئے۔ واپس آئے تو کہنے لگے کہ اس وقت خلاف توقع بادشاہ نے طلب کیا تھا۔ دربار میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بادشاہ تاریکی میں بیٹھا ہے، میں ڈر گیا کہ نہ معلوم اس کا کیا سبب ہے۔ کہیں میرے بھائی یا کسی عزیز کو تو مارنے والا نہیں ہے۔ پھر میری طرف مخاطب ہوا اور کہا:

"اگر امروز کسے پیدا شود (د) گوید محمد ﷺ	اگر آج کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو یہ کہے کہ
پیغامبر نبود است ہنم۔ شما او را بکدام	محمد ﷺ پیغمبر نہیں تھے، بلکہ میں پیغمبر ہوں، تو تم اس
حجت ملزم کنید"	کو کس دلیل سے ملزم ٹھہراؤ گے۔

قاضی شمس الدین نے دل میں سوچا کہ دلیل سے اس کے سامنے جیتنا آسان نہیں۔ بات طول پکڑ جائیگی اور کوئی مقصد بھی حل نہ ہو سکیگا۔ چنانچہ جواب دیا:

برائے آں حرام زادہ دیوانہ احمق بدبخت،	ایسے حرام زادہ، دیوانہ، احمق، بدبخت اور
بے دولت را حجت چہ حاجت باشد	بے دولت کے لیے دلیل کی کیا ضرورت ہے

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۵۹۔

اقبال خوند عالم اسلام درشہر چناں قوت	حضور کے اقبال سے اسلام نے شہر میں ایسی
گرفتہ است کہ غلاماں طباخاں شہر	قوت پکڑلی ہے کہ شہر کے بھٹیاروں کے غلام
خوند عالم بزخم پاپچہ بکشند"	پاپچہ (؟) مار مار کر اس کو ختم کردینگے

سلطان نے یہ سن کر سر جھکالیا اور خاموش ہوگیا۔ اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ سلطان کہا کرتا تھا۔

"ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ چہ کردہ اند کہ	ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ نے کیا کیا ہے جو
ما نتوانیم کرد"[1]	ہم نہیں کرسکتے۔

(۳) ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ امام ابن تیمیہؒ کے ایک شاگرد رشید امام عبدالعزیز اردبیلی دہلی تشریف لائے تھے اور ایک موقع پر سلطان نے فرط مسرت سے اُن کے قدم چوم لیے تھے[2] سلطان کے بعض افکار و اعمال کا بغور مطالعہ کیا جائے تو امام صاحبؒ کی تحریک کے اثرات واضح طور پر نظر آئینگے۔

امام ابن تیمیہؒ (المتوفی ۷۲۸ھ / ۱۳۲۸ء) کی تحریک بہت ہمہ گیر تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کی سماج، دین اور سیاست کے ایک ایک گوشہ کو قرآن اور سنت کی روشنی میں پرکھا تھا اور اس کی اصلاح کی کوشش کی تھی۔ ان کی کتابوں "منہاج السنۃ" اور "سیاست الشریعۃ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے امور سیاسی کا نہایت بالغ نظری سے مطالعہ کیا تھا اور وہ اپنے معاصرین کے دینی شعور میں خلافت و امامت کا صحیح تصور بیدار کرنے کے لیے بیچین تھے۔ ان کی زندگی میں ان کی تصنیفات مصر سے چین تک پھیل گئی تھیں[4]۔ ممکن نہیں کہ محمد بن تغلق جو ممالک اسلامی کی علمی اور دینی تحریکوں سے باخبر رہتا

---

[1] جوامع الکلم ص ۱۷۵-۱۷۶۔ [2] عجائب الاسفار۔ ص ۱۱۳

[3] امام صاحبؒ کے سیاسی افکار و نظریات پر ایک فرانسیسی مستشرق M.H. Laoust نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب ۷۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور "Institute francais d'Archeologie oriental" کی جانب سے شائع کی گئی ہے۔

[4] امام ابن تیمیہؒ اور ان کی تحریک کے اثرات پر مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ (ص ۱۵۳-۱۹۲) میں فاضلانہ بحث کی ہے

تھا، ان کتابوں سے نابلد رہا ہو۔

تصوف کے معاملہ میں امام صاحبؒ کے خیالات کچھ "متشددانہ" تھے۔ جہاں تک "صوفیۂ خام" کی بعض بدعات اور گمراہیوں کا تعلق تھا اُن کی مذمت بالکل حق بجانب تھی، لیکن انھوں نے تصوف اور اس کے تمام اداروں اور روایتوں پر جس طرح تنقید کی تھی اس سے اُن کی تحریک میں تشدد پیدا ہوگیا تھا۔ زیارتِ قبور، سماع، تصورِ ولایت، خانقھی نظام وغیرہ پر اُن کے خیالات "مجموعۃ الرسائل" میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ محمد بن تغلق غالباً ان خیالات سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے صوفیہ کے تصور ولایت کے خاتمہ اور خانقھی نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے اپنے دور حکومت میں جو کوششیں کیں وہ امام ابن تیمیہؒ کی تحریک اور تصورات سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ مثلاً جب قطب الدین دبیر نے شیخ فخرالدین زرادی کی بیجد تعظیم کی تو سلطان نے اُسے ڈانٹا کہ

"ایں اعتقادہائے کفرآمیز بگذار"[1]

میر خورد کا بیان ہے کہ سلطان صوفیانہ لباس کا بہت مخالف تھا اور اہلِ سیادت و اہل تصوف کا لباس بدل دیتا تھا۔ خانقھی نظام کو جس طرح اُس نے ضرب لگائی اس کی تفصیل آگے آئیگی۔

(۴) محمد بن تغلق کی سیاسی فکر میں تصورِ خلافت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ خلافت سے رابطہ قائم کیے بغیر دینی اور سیاسی زندگی کی تنظیم نہیں کی جا سکتی۔ تمام وہ سلاطین جنھوں نے اس معاملہ میں خلافت کو نظر انداز کیا تھا اس کی نظر میں غاصب کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب تک اُسے منشورِ خلافت حاصل نہ ہوا اُس نے جمعہ اور عیدین کی نماز تمام مملکت میں بند کرادی۔ عصامی نے اس چیز کو مسخ کر کے اس طرح پیش کیا ہے ؎

از آئین اسلام سر تافتہ | ابا زمرۂ کفر در بافتہ

[1] سیر الاولیاء ص ۲۷۳۔

برانداختہ رسم بانگِ نماز　　شب و روز از دو اہل دیں درگذار
جماعت بہ جمعہ در انداختہ　　ابا ہندواں ہولیے باختہ[۱]

(۵) محمد بن تغلق چاہتا تھا کہ ہندوستان کو سیاسی وحدت حاصل ہو چنانچہ اس نے سیاسی اور تمدنی اختلافات کی وہ دیواریں جو شمال اور جنوب کے درمیان حائل تھیں منہدم کر کے سیاسی تصور کو وسعت دی اور محدود مقامی تعصبات کے خلاف جنگ کر کے سیاسی مطمح نظر کو ایک توانائی اور تابندگی بخشی۔ پھر اس نے بین الاقوامی رابطے قائم کیے اور چین، مصر، خوارزم، شام، عراق، ماوراء النہر وغیرہ سے ثقافتی اور سیاسی رشتوں کو استوار کیا[۲]۔ غالباً عہد اشوک کے بعد ہندوستان میں کبھی اس پیمانے پر بین الاقوامی تعلقات اور روابط قائم نہیں ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی تذکروں بالخصوص الدرر الکامنہ[۳]، صبح الاعشیٰ[۴]، مسالک الابصار[۵] اور العیان العصر[۶] میں سلطان کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا کے علمی حلقوں میں محمد بن تغلق بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اشاعت اسلام کا جذبہ　محمد بن تغلق کے قلب میں ایک خاموش تبلیغی جذبہ متحرک نظر آتا ہے۔ وہ اسلامی تمدن کو ہندوستان میں ترقی پذیر دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر اس نے علماء و مشائخ کو نہایت کوشش سے اُن دور و دراز علاقوں میں بھیجا جہاں مسلمانوں کی آبادی نسبتاً کم تھی۔ اس کی سیاسی بصیرت کا یہ فیصلہ تھا کہ جس جگہ مسلمانوں

۱؎ فتوح السلاطین ص ۵۱۵　۲؎ ملاحظہ ہو Nizami : Studies in Medieval India History
۳؎ تالیف شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی مطبوعہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۳۴۸ھ
۴؎ تالیف قلقشندی، چودہ جلدوں میں ۱۳۳۱-۱۳۳۸ھ میں دار الکتب الخدیویہ سے شائع ہوئی۔ ہندوستان سے متعلق باب کا انگریزی ترجمہ Dr. O. Spies نے علی گڈھ سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کی تیاری میں اسی ترجمہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔
۵؎ تالیف شہاب الدین العمری۔ ۲۲ یا ۲۷ جلدوں پر مشتمل تھی۔ چند حصے پیرس اور لیپزگ سے شائع ہو گئے ہیں۔ ہندوستان سے متعلق حصہ کا انگریزی ترجمہ Dr. O. Spies نے علی گڈھ سے شائع کیا تھا۔
۶؎ صلاح الدین صفدی کی تصنیف ہے اور چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک نادر مخطوطہ دار الکتب مصریہ میں موجود ہے۔

کی آبادی نہ ہوگی وہاں مسلمانوں کے سیاسی نظام کی بنیادیں استوار کرنے کی ہر کوشش کوہ کندن وکاہ برآوردن کی مصداق ہوگی۔ چنانچہ دکن کے مسئلہ پر جب اُس نے غور کیا تو اس کی نظر اسی پہلو کی طرف گئی۔ اس کے پیشرو باوجود بے پناہ طاقت اور قوت رکھنے کے دکن پر صرف اس وجہ سے براہ راست حکومت نہ کرسکے تھے کہ وہاں مسلمانوں کی کوئی آبادی نہ تھی، حد یہ ہے کہ علاؤالدین خلجی جیسے بادشاہ نے صرف خراج وصول کرنے پر اکتفا کرلیا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر اس نے فیصلہ کیا کہ علماء و مشائخ کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دکن بھیجا جائے تاکہ وہاں رہ کر تبلیغ اسلام کریں اور اسلامی آبادی کو فروغ دیں۔ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی ثقافتی زندگی کی جڑیں کافی مضبوط ہوچکی تھیں۔ چنانچہ اس نے یہ سوچا کہ اگر یہاں کے ایک مضبوط تمدنی مرکز کو جنوبی ہند کی سرزمین میں منتقل کردیا جائے تو شمالی ہندوستان کی تمدنی زندگی میں تو کوئی خاص کمی واقع نہ ہوگی لیکن دکن میں اسلامی روایات اور طرز زندگی کو پھیلانے کا کام اچھی طرح انجام پاجائیگا۔ جس منصوبہ کو تبدیلیٔ دارالسلطنت کے نام سے مورخوں نے مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا ہے وہ حقیقت میں اسلامی تہذیب و تمدن کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک نہایت ہی منظم کوشش تھی۔

محمد بن تغلق نے اپنا دارالسلطنت دہلی سے تبدیل نہیں کیا تھا، اس نے صرف یہاں کی مسلمان آبادی بالخصوص علماء و مشائخ کو دیوگیر بھیجا تھا۔ اس کی فوج، خزانے اور دفاتر سب پہلے کی طرح دہلی ہی میں رہے۔ ہماری نظروں میں دارالسلطنت کی تبدیلی کی جو تصویر کھنچتی ہے وہ زیادہ تر مورخوں کے زور قلم کی رہینِ منت ہے۔ سلطان نے جس مقصد کے لیے "بزرگان دہلی" کو دیوگیر بھیجا تھا، اس کا اندازہ صاحب سیرالاولیاء کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے:

درآں ایام کہ سلطان محمد تغلق خلق شہر دہلی را در دیوگیر رواں کردو می خواست	جس زمانہ میں سلطان محمد بن تغلق نے شہر دہلی کی مخلوق کو دیوگیر روانہ کیا اور انہی ایام

درآں ایام ملک ترکستان وخراسان ضبط	میں ترکستان اور خراسان پر تسلط قائم کرنا اور چنگیز خاں
کند وآل چنگیز خاں را در انداز دو تمامی	کی اولاد کو برباد کرنا چاہا تو دہلی اور اس کے اطراف
صدور واکابر شہر دہلی واطراف کہ در	کے تمام صدور واکابر کو طلب کیا۔ حکم دیا کہ ایک
شہر جمع شدہ بودند فرمود تا حاضر آیند	بڑا خیمہ نصب کریں، اس کے نیچے ایک منبر
وبارگاہ ہائے بزرگ نصب کنند و در	رکھیں تاکہ وہ خود اس پر چڑھ کر خلق کو کفار
زیر آں منبر بنہند تا بر آں منبر خود برآید	سے جہاد کرنے کی ترغیب دلائے۔
وخلق را در جہاد کفار تحریص کند"[1]	

برنی، میر خورد، عصامی اور دیگر مورخین کے بیانات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ صرف مسلمان ہی دیوگیر بھیجے گئے تھے۔

(۱) عصامی اور برنی دونوں دہلی کی اس آبادی کی بربادی پر افسوس کرتے ہیں جو ۱۶۰ یا ۱۷۰ سال سے وہاں سکونت پذیر تھی[2]۔ عصامی لکھتا ہے ؎

صد و شصت سالہ عمارات   چو امروزہ یابی گرہ جست وجو

... ...

یکایک چنیں شہر را شہر یار   بکردہ تہی از صغار و کبار[3]

برنی کا بیان ہے کہ

"دار الملک دہلی را کہ مدت صد و شصت و ہفتاد سال آبادانی آں دست دادہ بود و مصر جامع شدہ و موازی بغداد گشتہ با جملہ سرا ہیا و قصبات حوالی چہار کردہی و تنج کردہی خراب کردند"[4]

(۲) برنی نے لکھا ہے کہ لوگوں کے دہلی سے دیوگیر منتقل ہو جانے کے بعد

---

[1] سیر الاولیاء ص ۲۷۱   [2] اسی بنا پر برنی نے مسلمانوں کے لیے "متوطنان" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ص ۴۷۴   [3] فتوح السلاطین ص ۴۵۲   [4] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۷۳۔

"سلطان محمد علما، واکابر و معارف خطط و قصبات معروف بلاد ممالک را در شہر آوردہ و متوطن گردانیدہ بود"[1]

سلطان محمد نے علما، واکابر و معارف کو ملک کے مشہور شہروں اور قصبات سے شہر (دہلی) میں لاکر آباد کر دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ جس طبقہ کے لوگ دیار و امصار سے لاکر دہلی میں بسائے گئے تھے، وہی تھا جس کے دیوگیر چلے جانے سے دہلی کی سماجی زندگی میں خلا پیدا ہو گیا تھا۔

(۳) عصامی نے "مبتدعان شہر دہلی" کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے ؎

خدا ظالمے بر ایشاں گماشت || کہ تخمے ہم از آل شاں کم گذاشت[2]

اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "تبدیلی دار السلطنت" کا اثر صرف مسلمانوں تک محدود رہا تھا۔

(۴) سیر الاولیاء میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء جب سلطان غیاث الدین کے محضر سے واپس آئے تو فرمانے لگے:

"عجبے امروز معائنہ شد کہ در معرض بحث احادیث صحیح حضرت مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم نمی شنوند.... در آں شہرے کہ ایں چنیں مکابرہ کنند چگونہ آباد ماند"[3]

آج عجب بات دیکھنے میں آئی۔ (علما،) دوران مباحثہ میں صحیح احادیث نبوی نہیں سنتے۔ .... جہاں اس طرح مکابرہ کرتے ہوں وہ شہر کس طرح آباد رہ سکتا ہے۔

میر خورد نے لکھا ہے کہ اس محضر کے چوتھے سال تمام علما، جو اس مکابرہ و مناظرہ میں شریک تھے دیوگیر جلاوطن کر دیے گئے[4]۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ کن لوگوں پر اس کا اثر پڑا تھا۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۷، ۴۸، نیز ملاحظہ ہو تاریخ محمدی ورق ۴۰۰ الف۔ لیکن عصامی نے اعتراض کیا ہے کہ سلطان نے حوروں کی جگہ اہرمنوں کو دیدی تھی۔ اور گاؤں والوں کو لاکر دہلی میں آباد کر دیا تھا۔
فتوح السلاطین ص ۴۵۳۔ [2] فتوح السلاطین ص ۴۵۴-۴۵۸۔ [3] سیر الاولیاء ص ۵۳۱
[4] سیر الاولیاء ص ۵۳۲۔ لیکن اس بربادی اور جلاوطنی کی زد میں شیخ نظام الدین اولیاء کے بہت سے مرید اور خلفاء بھی آگئے تھے۔ عصامی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے ؎

طفیل معاصی آں قوم زشت || بسے گشت آزردہ اہل بہشت (ص ۴۵۵)

(۵) سیر الاولیار میں لکھا ہے کہ مولانا فخر الدین زرادیؒ جب دیوگیر پہنچے تو خانہ کعبہ کی زیارت کے شوق نے غلبہ کیا۔ ایک دن قاضی کمال الدین صدر جہاں سے اس بارہ میں مشورہ کیا تو انہوں نے جواب دیا:

مصلحت نیست کہ بے فرمان سلطان	بلا سلطان کی اجازت کے ارادہ کرنا خلاف
عزیمت کردن کہ او را مقصود آبادانی	مصلحت ہے۔ اس کا مقصد اس شہر کو آباد کرنا
ایں شہر است، زیرا چہ سلطان را مطلوب	ہے۔ سلطان کی خواہش یہ ہے کہ اس شہر کو علما
است کہ ایں شہر بوجود علمار و مشایخ	و مشایخ و صدور سے اس طرح (رونق دے) کہ
و صدور در اقصائے عالم مشہور شود"[1]	یہ تمام عالم میں مشہور ہو جائے۔

(۶) محمد بن تغلق دیوگیر میں اسلامی تمدن کا ایسا مرکز قائم کرنا چاہتا تھا جہاں سے اسلام کی شعاعیں دکن کے گوشہ گوشہ میں پہنچ سکیں۔ دیوگیر کے سکوں پر "قبۂ دین اسلام" کھدا ہوا ہے[2]۔ بدر الاسلام، دار الاسلام وغیرہ الفاظ تو عموماً سکوں پر ملتے ہیں۔ اس سکہ میں "دین" کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ اس کی اہمیت اس صورت میں اور بڑھ جاتی ہے جب یہ بھی پیش نظر رہے کہ سلطان محمد بن تغلق نے سکوں کے ذریعہ اپنا پیغام عوام تک پہنچانے کی کوشش کی تھی[3]۔

معاصرین نے محمد بن تغلق کے مقاصد کو غلط سمجھا اور اس کے خلاف ہر طرف غم و غصہ کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اور دکن کا یہ منصوبہ اس کی فرد جرم کا ایک اہم جزو بن گیا۔ عصامی نے لکھا ہے کہ

مشایخ از و روئے بر تافتہ　　وز و اہل دستار سر تافتہ[4]

---

۱ سیر الاولیار ص ۲۷۴؛ ۲ E. Thomas: Chronicles of the Pathan Kings of Delhi p. 209.

۳ R. P. Tripathi: Some Aspects of Muslim Administration p. 61

۴ فتوح السلاطین ص ۵۳۶

دہلی چھٹنے کا لوگوں کے دلوں پر ایسا صدمہ ہوا کہ اُن کی زندگیاں حسرت اور مایوسی کی تصویریں بن کر رہ گئیں۔ امیر حسن سجزی نے درد بھری آواز میں پکارا ؎

کجاست حضرت دہلی و خوب رویانش یکے بہشت درون و برون او پر حور[1]

عصامی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی اس پریشان حالی کو دیکھ کر ایک رات کو عشاء کے وقت محمد بن تغلق کا دل بھی تڑپ اُٹھا تھا[2] عوام کی یہ بے چینی، اضطراب اور پریشانی اپنی جگہ پر صحیح تھی لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ دکن میں اسلامی تمدن کی داغ بیل محمد بن تغلق کے اس منصوبہ ہی کی رہین منت تھی۔ بہمنی حکومت جو ڈیڑھ سو سال سے زیادہ جنوبی ہند کی سیاسی اور سماجی زندگی کا مرکز و محور رہی ہے کبھی وجود میں آہی نہیں سکتی تھی اگر محمد بن تغلق نے یہ انقلابی قدم نہ اُٹھایا ہوتا! برنی اس منصوبہ کے نتائج سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"در چہار طرف دیوگیر کہ کفرستان قدیم بود،	(اس) دیوگیر کے چاروں طرف جو پرانا کفرستان
است گورستانہائے مسلمانان پیدا آمد"[3]	رہا ہے مسلمانوں کے قبرستان وجود میں آگئے۔

حقیقت میں یہ قبریں جنوبی ہندوستان میں اسلامی تمدن کی خشت اول تھیں۔ انہوں نے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے دل سرزمین دکن سے جوڑ دیئے۔ عصامی کو جب محمد بن تغلق کی مذمت سے فرصت ملتی ہے اور "آبادانی دیوگیر" پر نظر ڈالتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان سے نکل جاتا ہے ؎

سعادت رُخ آورد در دیوگیر شقاوت ازیں ملک شد گوشہ گیر

ہم از خلق دہلی کہ عشرے رسید دریں بوم و بر رونقے شد پدید

ز دہلی گروہے کہ ابتر شدند فراہم دریں ملک و کشور شدند

ہم از شہر و کشور، چہ کوہ و چہ دشت چمن در چمن کاخ در کاخ گشت

ز کوہش بسے گوہر آمد پدید کہ ہر یک بہ دیہیم شاہی رسید

---

[1] دیوان حسن ص ۱۹۱ [2] فتوح السلاطین ص ۴۳۶، [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۷۴

همه خاک او گشته عنبر سرشت | هوایش شده چوں هوائے بهشت
ز هر جنس خلق از نواحی هند | دراں شهر گشته سکونت پسند[1]

خود محمد بن تغلق کو اس تجربہ کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی لیکن آنے والی نسلوں کے لیے اس نے راستہ ہموار کر دیا۔

دکن کے علاوہ ہندوستان کے اور حصوں میں بھی سلطان نے علماء و مشائخ کو تبلیغ کے لیے بھیجنے کی کوشش کی تھی۔ مولانا شمس الدین یحییٰؒ کو جو اپنے زمانہ کے جیّد عالم تھے[2] سلطان نے دربار میں بلایا اور کہا:

"همچو تو دانشمندے ایں جا چه کند؛ تو	تجھ جیسا عالم یہاں کیا کر رہا ہے؛ تو کشمیر جا
در کشمیر برو و در بت خانهائے آں دیار	اور اس دیار کے بت خانوں میں بیٹھ
بنشیں و خلق خدائے را با سلام دعوت	اور خلق خدا کو اسلام کی دعوت دے۔
کن"[3]	

خواجہ علاء الدین اجودھنیؒ کے بیٹے شیخ معزالدین کو گجرات بھیجنے کا مقصد بھی غالباً یہی تھا لیکن اُن کے سپرد انتظامی کام بھی کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب طغی نے علم بغاوت اُٹھایا تو وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہید ہو گئے[4]۔

تعصب کی اس سے بڑھ کر اور مثال کیا ہوگی کہ عصامی نے سلطان کی ان تمام تبلیغی

---

[1] فتوح السلاطین ص ۴۵۴۔ [2] شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے اُستاد تھے۔ میر خورد نے ان کو "دریائے علم" اور "گنج زہادت" بتایا ہے اور لکھا ہے کہ "بیشتر علمائے شہر منسوب بشاگردی ایں بزرگ اند" (ص ۲۲۶) چراغ دہلویؒ نے ان کے تبحر علمی کو اس طرح خراج پیش کیا ہے ؎

سالت العلم من احیاک حقاً | فقال العلم شمس الدین یحییٰ

[3] سیر الاولیاء ص ۲۸۸۔ مولانا کشمیر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ اُن کے سینے پر ایک پھوڑا نکل آیا۔ سلطان نے یہ سمجھا کہ یہ نہ جانے کا بہانہ ہے۔ اسی تکلیف کے عالم میں انہیں دربار بلایا اور جب مرض کی تحقیق ہو گئی تو گھر واپس بھیج دیا۔ چند ہی دن کے بعد مولانا وصال فرما گئے۔

[4] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۰۸، ۵۱۸، سیرت فیروز شاہی (روٹوگراف قلمی نسخہ بانکی پور) ورق ۹، ۱۱۔

مساعی سے صرف نظر کر کے یہ لکھ دیا کہ محمد بن تغلق کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں "کفر فزوں" اور "اسلام کم" کی صورت پیدا ہو گئی[1]۔ حالانکہ ہند اور بیرون ہند کے مورخین اور تذکرہ نویس یہ بات صراحت سے لکھتے ہیں کہ محمد بن تغلق نے اسلام کی اشاعت کے لیے بڑی جدوجہد کی تھی اور اس کی کوشش سے اسلام کی تعلیم ملک کے دور دراز حصوں میں پھیل گئی تھی[2]۔

غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ

محمد بن تغلق کی تبلیغی جدوجہد کے ذکر سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نے دوسرے مذاہب کے ساتھ تعصب یا ناانصافی کا برتاؤ کیا ہوگا[3]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ اس کا طرز عمل مثالی تھا۔ عصامی اور ابن بطوطہ دونوں نے لکھا ہے کہ وہ جوگیوں سے بہت میل جول رکھتا تھا[4] بلکہ عصامی نے تو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جوگیوں کی صحبت سے اس میں گمراہی پیدا ہو گئی تھی ۔

ابا جوگیاں گشتہ خلوت گرائے ۔۔۔ بہ دل راہ کفار را دادہ جائے[5]

---

[1] فتوح السلاطین ص ۶۰۶۔ مندرجہ ذیل اشعار خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔

ہمہ مالوہ شد تمرد گرائے ۔۔۔ گرفتہ ز سر کفر جز چند جائے

شدہ ضبط ہندو سراسر دیار ۔۔۔ مسلماں چو ہندو خزاں در حصار

بگشتہ ہمہ ملک گجرات ہم ۔۔۔ دروں کفر افزون و اسلام کم

[2] مسالک الابصار ص ۴۴-۴۵۔ [3] تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ اس نے لالچ دے کر یا زبردستی کسی کو مسلمان کیا ہو۔ برنی نے اپنی کتاب میں (ص ۴۸۳-۴۸۴) کچھ ہندوؤں کے مسلمان ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن وہ حکومت کی کسی ترغیب و تحریص یا جبر و اکراہ سے مجبور ہو کر مسلمان نہیں ہوئے تھے [4] فتوح السلاطین ص ۵۱۵۔ عجائب الاسفار ص ۲۵۸، ۲۶۳۔ ابن بطوطہ نے خود سلطان کو ان جوگیوں سے خلوت میں رازدارانہ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ سلطان نے ان جوگیوں سے کچھ محیر العقول کرتب بھی ابن بطوطہ کو دکھوائے تھے اور کہا تھا کہ اگر تیری عقل سلب ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم تجھ کو اس سے زیادہ تماشہ دکھاتے" (ص ۲۶۰) اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے مسلمان ان جوگیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے تاکہ اُن سے یہ فن سیکھیں (ص ۲۶۳) سلطان نے اس پر کوئی گرفت نہیں کی۔ [5] فتوح السلاطین ص ۵۱۵۔

عصامی کے اس مصرعہ "ابا ہنداں ہولیے باختہ"[۱] سے خیال ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے تہواروں میں بھی دلچسپی لیتا تھا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ دولت آباد میں بادشاہ کے لیے دریائے گنگ کا پانی "جو ہندوؤں کے حج یعنی جاترا کی جگہ ہے ڈاک میں لیجایا کرتے تھے"[۲]۔ سلطان محمد کو سنسکرت زبان سے بھی دلچسپی تھی[۳]۔ اودھ میں جو بستی اس نے آباد کی تھی اس کا نام سرگ دواری رکھا تھا۔ سنسکرت میں اس کے معنے ہیں "جنت کا دروازہ"[۴] شہاب الدین العمری نے لکھا ہے کہ اس کے دربار میں عربی، فارسی اور ہندی کے ایک ہزار شاعر موجود رہتے تھے[۵]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندی شاعری میں کافی دلچسپی رکھتا تھا۔

غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے معاملہ میں بھی سلطان نے بڑی وسیع النظری کا ثبوت دیا۔ نگرکوٹ کی مہم کے دوران میں اس نے مندروں کے انہدام سے خاص طور پر گریز کیا۔ سیرت فیروز شاہی میں لکھا ہے:

سلطان مغفور مرحوم محمد شاہ انار اللہ	سلطان مغفور مرحوم محمد شاہ انار اللہ برہانہ
برہانہ کہ در نگرکوٹ سایہ افگندہ بود	جب نگرکوٹ پر سایہ افگن ہوئے تھے تو انہوں
بالتماس رائے نگرکوٹ بت خانہ جوالا	نے رائے نگرکوٹ کے التماس پر جوالا مکھی
مکھی را گذاشتہ"[۶]	کے مندر کو چھوڑ دیا تھا۔

پندرھویں صدی کے ایک پرتگالی مصنف نونیز (Nuniz) نے لکھا ہے کہ سلطان نے گجرات کی مہم کے زمانہ میں ایک شوالا بنوایا تھا[۷]۔

۱؎ فتوح السلاطین ص ۵۱۵ ۲؎ عجائب الاسفار ص ۳

۳؎ Bibliotheque Nationale M.S. 909 F. 140 بحوالہ مہدی حسین ص ۱۹۸۔

۴؎ Cambridge History of India III p. 154.

۵؎ مسالک الابصار ص ۳۲ ۶؎ سیرت فیروز شاہی (قلمی) ورق ۴۰۔

۷؎ Sewell: A Forgotten Empire p. 9

ہندو مصنفین کی کتابوں اور اس عہد کے ہندو کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اس کے متعلق نہایت اچھی رائے رکھتے تھے۔ ودیاپتی ٹھاکر کی مشہور کتاب پرس پرشکا میں جو چودھویں صدی کے آخر میں لکھی گئی تھی، سلطان محمد کا ذکر تعریفاً کیا گیا ہے[1]۔ محکمۂ آثار قدیمہ میں ۱۳۸۴ سنہ وکرمی مطابق ۱۳۲۷ء کا ایک سنسکرت کتبہ موجود ہے۔ یہ کتبہ سریدھارا نامی برہمن نے دہلی کے قریب ایک کنوئیں پر کندہ کرایا تھا۔ اس میں محمد بن تغلق کو شاہان عالم میں ہیرہ کی مانند بتایا گیا ہے، اور اُسے ساکا سے تشبیہ دی گئی ہے[2]۔

محمد بن تغلق نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ ہندوؤں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا۔ سندھ کا صوبہ اُس نے ایک ہندو رتن کے سپرد کیا تھا اور علم اور نوبت رکھنے کی اجازت جو بقول ابن بطوطہ صرف بڑے بڑے امیروں کو دی جاتی تھی اس کو بھی دی تھی[3]۔ گلبرگہ کا قلعہ بھبرن رائے کی نگرانی میں دیا گیا تھا۔ دیوگیر کا نائب وزیر اور دیوان اسلوب کا نگراں ایک ہندو دھارادھر کو مقرر کیا تھا[4]۔ غرض حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں، اور نازک ترین فوجی مہمات پر اس نے پورے اعتماد کے ساتھ ہندوؤں کا تقرر کیا۔

اسی طرح عدل وانصاف کے معاملہ میں بھی سلطان نے غیر مسلموں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جس کی مثال قرون وسطیٰ کی تاریخ میں مشکل سے ملیگی۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہندو امیر نے بادشاہ پر دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے اس کے بھائی کو بلا سبب مار ڈالا۔ بادشاہ بغیر کسی ہتھیار کے "پیشِ قاضی چوں خطاکاراں رسید" وہاں جاکر سلام کیا۔ قاضی

۱؎ Vidayapati Thakkur: Purusa Pariska (Allahabad 1912) pp 20-24, 4-44

ودیاپتی بہار کا مشہور شاعر تھا۔ حالات کے لیے ملاحظہ ہو Grierson کا مضمون مطبوعہ Indian Antiquary Vol XIV July 1885

۲؎ Catalogue of the Delhi Museum of Archaeology —J.P. Vogel (Calcutta 1908) p. 29.

۳؎ عجائب الاسفار ص ۹ ۴؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۵۰۱، ظفر الوالہ جلد سوم ص ۸۷۳

کو پہلے سے حکم تھا کہ جب بادشاہ آئے تو کھڑا نہ ہو۔ قاضی نے حکم دیا کہ بادشاہ امیر کو راضی کرے۔ ورنہ قصاص کا حکم ہوگا۔ بادشاہ نے جب ہندو امیر کو راضی کر لیا تو قاضی نے اس کو بری کر دیا[۱]

یافت مورے بر سلیمانے ظفر — سطوت آئین پیغمبر نگر
پیش قرآں بندہ و مولا یکی است — بوریا و مسند و دیبا یکے است

شیخ علاء الدین اجودھنیؒ سے ارادت سلطان محمد بابا فرید گنج شکرؒ کے پوتے شیخ علاء الدین اجودھنیؒ کا مرید تھا[۲]۔ شیخ علاء الدینؒ عبادت و ریاضت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ برنی نے ان کے متعلق لکھا ہے:

باری تعالیٰ شیخ علاء الدین نبیرۂ شیخ فرید الدین را صلاح مشخص و تعبد مجسم آفریدہ بود۔ در تفسیر نوشتہ اند کہ بعضے ملائکہ مقدس بہ محض عبادت خدائے جل و علا مجبول اند و از آفرینش جز تعبد ہیچ مشغولی ندارند۔ شیخ علاء الدین نیز ازاں قبیل آفریدہ شدہ بود"[۳]	اللہ تعالیٰ نے شیخ فرید الدین (گنج شکر) کے پوتے شیخ علاء الدین کو صلاح مشخص اور تعبد مجسم پیدا کیا تھا۔ تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض ملائکہ مقدس صرف خدا کی عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور آفرینش سے سوائے عبادت کے کسی دوسری چیز میں مشغولی نہیں رکھتے۔ شیخ علاء الدین کو بھی اسی قبیل میں پیدا کیا گیا تھا۔

---

[۱] عجائب الاسفار، ص ۱۳۰ [۲] سیر الاولیاء، ص ۱۹۶، عجائب الاسفار، ص ۱۳۱، ابن بطوطہ نے اُن کا نام غلطی سے فرید الدینؒ لکھ دیا ہے، سیرت فیروز شاہی میں شیخ معز الدین فرزند شیخ علاء الدینؒ کے سلسلہ میں لکھا ہے: "برحسب اعتقادے و ارادتے کہ حضرت سلطنت سلطان مغفور مرحوم را دراں خاندان بود (ورق ۱۰) معارج الولایت (قلمی نسخہ جلد اول ص ۲۷۴) میں لکھا ہے کہ غیاث الدین دیبالپور قیام کے زمانہ میں مرید ہو گیا تھا۔

[۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۷، امیر خسرو اُن کے متعلق لکھتے ہیں ؎

علائے دنیا و دیں شیخ و شیخزادۂ عصر — کہ شد بمرتبہ قائم مقام شیخ فرید
ز تاب نور تجلی چو کرد درویش عرق — ہزار چشمۂ خورشید از جبیں بچکید

(باقی برصفحہ ۳۴۹)

اُن کے رعب کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص اُن کے جماعت خانہ میں پناہ لے لیتا تھا تو پھر کسی شخص کی مجال نہ ہوتی تھی کہ اس کو زور و تعدی کے ساتھ وہاں سے لے جائے خواہ وہ بادشاہِ وقت ہی کیوں نہ ہو۔

شیخ علاء الدین ؒ نے اپنی زندگی کے چون سال بابا فریدؒ کے سجادہ پر اس طرح گذارے تھے کہ صرف نماز جمعہ کے لیے جماعت خانہ سے قدم باہر نکالتے تھے۔ درباری زندگی سے اُن کو نفرت تھی۔ معلوم نہیں کہ محمد بن تغلق کی اُن سے عقیدت رسمی تھی یا وہ اُن کے افکار و کردار سے کسی حد تک متاثر بھی ہوا تھا۔

علماء سے تعلقات محمد بن تغلق کے عہد میں علماء کے چار مختلف گروہ ملتے ہیں۔ ہر گروہ سے اس کے تعلقات کی نوعیت جداگانہ تھی۔

(۱) علماء کا ایک گروہ وہ تھا جو ملک کی سیاست سے بالکل علیحدہ خاموشی کے ساتھ[1] اپنے تعلیمی اور تصنیفی کاموں میں مصروف تھا۔ محمد بن تغلق نے، جو خود عالم اور عالم نواز تھا ان علماء کی زندگی میں مداخلت علم و ادب کے حق میں مضر سمجھی۔ چنانچہ اس طبقہ سے اس کے کسی تصادم کی اطلاع نہیں ملتی۔ مولانا ضیاء الدین نخشبی، مولانا معین الدین عمرانی وغیرہ کو اسی طبقہ میں شمار کرنا چاہیے۔

(۲) علماء کا ایک طبقہ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ ان "مفتیانِ ناخداترس و حیلہ اندوز"[2]

بقیہ نوٹ صفحہ ۳۴۸ -

مگر کہ دید ثریا بلندی قدرش — تا قیامت خواہد بر آسماں خندید
خجے بروشنی از بدر زادہ خورشید ے — ز بدر زادن خورشید تابدار کہ دید
چو ساکناں سپہر از حوادث ایمن گشت — کسیکہ در پنہ ذیل عصمت تو خزید
ز بہر سبحۂ تو چرخ مہرہ ز انجم کرد — ز مشتری رگ جانش برائے رشتہ کشید
زہی نخفتم شب در سواد مدحت تو — چو پیر در شب قدر و چو طفل در شب عید
حیات بخش جہانے دم مسیحی تست — چہ حد گفتن خسرو کہ عمر تو بمزید

نوٹ صفحہ ہذا: [1] سیر الاولیاء ص ۱۹۶ [2] تاریخ حقی (قلمی)

پر مشتمل تھا جنہوں نے ہر نیک و بد میں سلطان کی تائید کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ برنی نے ان علماء کو "مرتد صفتاں کافر خو" بتایا ہے اور نہایت صفائی کے ساتھ یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ خود ان گناہوں کا مرتکب ہوا تھا۔ لکھتا ہے کہ مجھ "قوادہ بے دیانت و بے دین"[1] نے برسوں سلطان کی ہاں میں ہاں ملائی ہے اور "طمع و حرص دنیا" سے مجبور ہو کر

"... برخلاف احکام دین مددمی کردیم و روایتہائے مجہول می خواندیم"[2]

ہم احکام دین کے خلاف اس کی مدد کرتے تھے اور روایتہائے مجہول بیان کرتے تھے۔

سلطان اس وقت تک کسی شخص کو سزا نہیں دیتا تھا جب تک مفتیوں[3] سے فتویٰ حاصل نہ کر لے لیکن یہ فتویٰ جس طرح لیا جاتا تھا اس کے متعلق یحیٰی سرہندی کا یہ بیان قابلِ غور ہے:

ہر کرا کہ بہ تہمتے میگرفت اول از جہت سیاست او با مفتیاں مذکور گفتار میکرد۔ و ایشاں را گفتہ بود اگر کسے بناحق کشتہ شود و شما در گفتن حق از جانب او تقصیر کنید خون آں کس در گردن شما باشد مفتیاں مذکور در گفتن حجت فروگذاشت نمی کردند۔ اگر ایشاں مجوج می شدند آں متہم را فی الحال اگرچہ نیم شب می بود میکشت۔ فاما اگر سلطان مجوج می شد یک مجلس مفتیان مذکور را بازمی گردانید۔ برائے دفع حجت ایشاں

جس کسی کو کسی الزام میں پکڑتا تھا تو پہلے اس کے قتل کے لیے مفتیان مذکور سے گفتگو کرتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ اگر کوئی ناحق مارا گیا اور تم نے اس کی جانب سے حق بات کہنے میں کوتاہی کی تو اس شخص کا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔ (چنانچہ) مفتیان مذکور حجت بازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ اگر وہ بحث میں ہار جاتے تو ملزم کو فوراً خواہ آدھی رات ہی کیوں نہ ہوتی مار دیا جاتا تھا لیکن اگر بادشاہ کو قائل ہونا پڑتا تو ان مفتیوں کی ایک مجلس اور منعقد کی جاتی تھی۔ وہ اُن کے دلائل کا جواب سوچتا تھا۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۷ [2] ایضاً ص ۴۶۶۔
[3] یحیٰی سرہندی نے لکھا ہے کہ اس نے چار مفتیوں کو "درون کوشک" جگہ دے دی تھی اور وہ ہر وقت موجود رہتے تھے۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۱۵۔ نیز منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۳۹۔

جوابے می اندیشید۔ اگر ایشاں را مجال حجت	اگر اُن کو حجت کی ہمت نہ رہتی تو فوراً ملزم کو
نماندے ہماں وقت او را سیاست می کرد	قتل کر دیتا تھا اور اگر خود قائل ہو جاتا تو
واگر سلطان محجوج می شد ہمدراں ساعت	اسی لمحہ (ملزم کو) آزاد کر دیتا تھا۔
خلاص می داد" [1]	

(۳) علمائے عصر کا ایک گروہ وہ تھا جس نے سلطان کے خلاف اعلان بغاوت کیا تھا اور اس کے مختلف منصوبوں اور کارروائیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ یہی وہ "اصحاب دین" تھے جن کی ناراضگی کا ذکر عصامی نے کیا ہے۔ کسی معاصر مورخ نے تفصیل سے یہ نہیں بتایا کہ ان علماء کی مخالفت کے عام اسباب کیا تھے لیکن ابن بطوطہ نے چند عالموں کے قتل کی جو تفصیل دی ہے اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سلطان کن حالات میں اس طبقہ کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ صرف دو واقعات پر نظر ڈالیے:

ا۔ سلطان نے قحط کے دنوں میں دہلی کے باہر کنویں کھودنے اور کھیتی کرنے کا حکم دیا تھا اور زراعت کے لیے جو چیزیں ضروری تھیں وہ سب مہیا کی تھیں۔ مولانا عفیف الدین کاشانی نے جو ایک مشہور فقیہ تھے، سلطان کی اس کارروائی کی مخالفت کی کیونکہ "یہ زراعت زبردستی بادشاہی گودام کے لیے کرائی جا رہی تھی"۔ سلطان نے اُن کو قید کرا لیا لیکن بعد کو رہا کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان کو اطلاع ملی کہ اُنھوں نے اپنے دو اور فقیہ دوستوں سے سلطان کی بُرائی کی ہے۔ سلطان نے تینوں کو قتل کرا دیا۔ [2] (ب) دو سندھی مولویوں کو سلطان نے ایک حاکم علاقہ کے ہمراہ اس ہدایت کے ساتھ روانہ کرنا چاہا کہ "میں نے اس ملک کی رعیت تمہارے سپرد کی ہے اور یہ امیر جو کچھ تم کہو گے اس پر عمل کریگا" مولویوں نے اس کا جو جواب دیا اس سے سلطان کو اُن کے خلوص نیت کے متعلق شبہ پیدا ہو گیا۔ ان دونوں کو قتل کرا دیا

[1] تاریخ مبارک شاہی ص ۱۱۵-۱۱۶، نیز ملاحظہ ہو۔ منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۳۹

[2] عجائب الاسفار ص ۱۴۲۔

گیا، لیکن اعتراف جرم کرانے کے لیے جو بہیمانہ سزائیں دی گئیں وہ سلطان کے کردار کا سب سے تاریک پہلو ہیں[1]

(۴) پھر ایک گروہ ان غیر ملکی علماء کا تھا جن کو سلطان کی فیاضی اور دریا دلی نے دور و دراز علاقوں سے کھینچ بلایا تھا۔ ان علماء کے ساتھ عموماً سلطان کے تعلقات بہت شگفتہ رہے اور ان ہی کے ذریعہ اس کی سخاوت اور علم پرستی کا شہرہ مصر، عراق، خراسان، شام وغیرہ ممالک میں پھیلا۔ دمشق میں شہاب الدین العمری کو ایک فقیہ مولانا ابوالفضیل عمر بن اسحاق نے یہ اطلاع دی تھی کہ سلطان محمد سفر و حضر کسی حالت میں علماء سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ "ایک بار ہم ایک مہم کے دوران میں اس کے ساتھ تھے۔ جب سلطان کو اپنی مہم میں کامیابی ہوئی تو اس کو علماء کی موجودگی کی برکت پر محمول کیا۔ اور حکم دیا کہ خزانہ میں داخل ہو کر جس قدر دولت لے جاسکیں لے جائیں[2]۔ غیر ملکی علماء میں مولانا ناصر الدین واعظ ترمذی، مولانا عبدالعزیز اردبیلی، وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں سلطان نے اُن کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی تفصیل ابن بطوطہ کے سفر نامہ میں پڑھی جاسکتی ہے[3]۔

محمد بن تغلق نے اپنی علمی دلچسپیوں کے باعث بعض علماء کو نہایت اہتمام کے ساتھ ہندوستان بلانے کی کوشش کی تھی۔ شیخ ابوبکر بن خلال کو معہ چند اور علماء کے سمرقند بھیجا تاکہ شیخ برہان الدین ساغرجی کو ہندوستان آنے پر آمادہ کریں۔ سلطان نے چالیس ہزار تنکے اُن کے سفر خرچ کے لیے بھیجے تھے[4]۔ مولانا معین الدین عمرانی کو قاضی عضد کے پاس بھیج کر درخواست کی کہ وہ اپنی کتاب متن مواقف اس کے نام معنون کردیں[5]۔ شیراز کے مشہور قاضی مولنا

---

[1] عجائب الاسفار ص ۱۴۳، ۱۴۴ [2] مسالک الابصار۔ ص ۴۳۔ ۴۴۔

[3] عجائب الاسفار۔ ص ۱۱۳-۱۱۵ [4] مسالک الابصار۔ ص ۴۲۔ ۴۳، عجائب الاسفار ص ۱۱۴ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ اُنہوں نے یہ روپیہ تو قبول کرلیے لیکن یہ کہہ کر آنے سے انکار کردیا کہ بادشاہ ہند عالموں کو اپنے رو برو کھڑا رکھتا ہے، ہم ایسے شخص کی ملازمت کرنا نہیں چاہتا لیکن شہاب الدین دمشقی کو اطلاع یہ ملی تھی کہ شیخ برہان الدین سمرقند میں موجود نہ تھے، چین گئے ہوئے تھے، سلطان کے نمایندوں نے یہ روپیہ ان کی کنیز کے حوالہ کیا اور اس سے سلطان کے اشتیاق ملاقات کا ذکر کرکے واپس آگئے۔ [5] اخبار الاخیار ص ۱۴۲۔

مجد الدین کو جن کے متعلق حافظ شیراز نے کہا تھا ؎

دگر مربیِ اسلام شیخ مجد الدین　　　　که قاضیِ به ازو آسمان ندارد یاد

سلطان نے شہزادہ دمشقی کے ہاتھ دس ہزار تنکے بھیجے تھے[1] ممکن ہے کہ اس داد و دہش سے اس کا ایک مقصد ممالک اسلامی میں اپنی فیاضی کا سکہ بٹھانا بھی ہو، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی معارف پروری کو اس میں بڑا دخل تھا۔

قلقشندی نے لکھا ہے کہ دو سو فقیہ سلطان کے دسترخوان پر موجود ہوتے تھے، دورانِ طعام میں وہ اُن سے تبادلۂ خیالات کرتا رہتا تھا[2]۔ ماہِ رمضان میں علماء اس کی مجلس میں حاضر رہتے تھے اور اسی کے ساتھ افطار کرتے تھے[3]۔ جب سلطان کسی مہم پر جاتا تھا تو امام اور علماء اس کے گرد حلقہ بنائے رہتے تھے[4]۔

سلطان نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں بھی علمی گھرانوں میں کی تھیں۔ اس کے داماد ملک العلماء یا شیخ الاسلام، یا صدر جہاں کے بیٹے تھے[5]۔ سرور الصدور سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک لڑکی کی شادی شیخ حمید الدین صوفی سوالی ناگوریؒ کے خاندان میں بھی ہوئی تھی[6]۔

عوام کی مذہبی تعلیم کا انتظام سلطان محمد نے عام مسلمانوں کی دینی تعلیم میں خاصی دلچسپی لی۔ شہاب الدین دمشقی کا بیان ہے کہ سلطان نے مکتبوں میں ہزاروں فقہا درس و تدریس کے لیے مقرر کیے تھے، وہ بچوں کو قرأت اور لکھنا سکھاتے تھے، اور اُن کو شاہی خزانے سے تنخواہیں ملتی تھیں[7]۔

اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں بھی ملک میں کافی تعداد میں تھیں۔ قلقشندی کی اطلاع ہے کہ صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ ان میں سے ایک شافعی مذہب کا تھا۔ باقی سب حنفیوں کے تھے[8]۔

---

[1] عجائب الاسفار۔ ص ۱۴۳　[2] صبح الاعشیٰ ص ۲۷　[3] مسالک الابصار۔ ص ۳۸
[4] صبح الاعشیٰ ص ۶۷　[5] عجائب الاسفار۔ ص ۱۲۵　[6] سرور الصدور (قلمی) ص ۲۷
[7] مسالک الابصار ص ۳۹　[8] صبح الاعشیٰ ص ۲۹

یہ ایک عجیب بات ہے کہ محمد بن تغلق کی علم و ادب میں اس قدر دلچسپی کے باوجود اس عہد کی علمی فضا میں ایک افسردگی سی طاری رہی۔ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ جنہوں نے اسلامی ہند کے علمی اور مذہبی سرمایہ کا نہایت بالغ نظری سے جائزہ لیا تھا، نہایت حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ گو محمد بن تغلق نے ہر قسم کے علم کی قدردانی کی تھی لیکن اس دور میں معیارِ علم کچھ پستی کی طرف مائل تھا اور عہد علائی کے سے متبحر علماء اس وقت موجود نہ تھے[1]

صوفیہ اور محمد بن تغلق اس زمانہ میں ہندوستان میں تین روحانی سلسلے کام کر رہے تھے۔ چشتیہ، سہروردیہ اور فردوسیہ۔ دہلی، بدایوں، ناگور، اجودھن، ہانسی وغیرہ میں چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں قائم تھیں۔ اوچہ اور ملتان سہروردی مشایخ کے زیر اثر تھے۔ بہار میں فردوسیہ سلسلہ کے چند مرکز اصلاحِ باطن کے کام میں مصروف تھے۔ سلاطین وقت سے تعلقات کے معاملہ میں ان سلسلوں کے مسلک مختلف تھے۔ چشتی بزرگوں نے سلاطین اور سیاست سے کلّی طور پر قطع تعلق کر لیا تھا، چنانچہ وہ سرکاری عہدوں یا جاگیروں کو قبول کرنا روحانی سعادت کے منافی سمجھتے تھے۔ سہروردی مشایخ حکومت سے تعلقات رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت ملک کی سیاست میں بھی حصّہ لے لیتے تھے۔ فردوسیوں کے اس معاملہ میں کوئی واضح اصول نہ تھے لیکن عموماً وہ شغل و جاگیرداری سے پرہیز کرتے تھے۔ محمد بن تغلق کے سیاسی اور دینی افکار کی بنیاد اس اعتقاد پر قائم تھی کہ مسلمانوں کی ملّی زندگی کی اس اجتماعیت کو واپس لایا جائے جو خلفائے راشدین کے عہد کی خصوصیت تھی۔ چنانچہ اس نے مشایخ وقت سے بھی یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ایک مرکزی اجتماعی تنظیم کے سپرد کر دیں، اور یہ مرکزی اجتماعی تنظیم سلطان کی ذات ہو۔ سلطان کا یہ مطالبہ سہروردیوں کے مسلک سے متصادم نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے اس کی مرضی کے مطابق حکومت کے مختلف کاموں اور منصوبوں میں شرکت کر لی۔ لیکن چشتیوں کو اس مطالبہ میں اپنی روحانی آزادی کا خاتمہ اور

[1] تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف (قلمی)

تصور ولایت پر شدید ضرب لگتی ہوئی نظر آئی۔ چنانچہ اُنھوں نے سلطان کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور باہمی کشمکش کا ایک ایسا دور شروع ہوا جس نے مذہب اور سیاست دونوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ دہلی چشتیہ سلسلہ کا قلب و جگر تھی۔ محمد بن تغلق کی پہلی ضرب اسی پر پڑی اور اس کا نتیجہ بقول سید محمد گیسو دراز یہ ہوا کہ ــــ

"در دہلی زیارت گاہ بسیار بود۔ بعد خرابی دہلی کہ سلطان محمد بن تغلق کرد آں زیارتہا بکلی مضمحل شد"[1]

خانقہی نظام ڈھیلا پڑ گیا اور مشائخ متقدمین کی روایات داستان پارینہ بن کر رہ گئیں۔ اس دور میں مشائخ کے مستند اور غیر مستند ملفوظات کو ترتیب دینے کی جو کوشش کی گئی وہ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے کے مترادف تھی۔ معاصرین میں یہ احساس بڑھتا جاتا تھا کہ خانقہی نظام کا دمِ واپسیں شروع ہو گیا ہے۔ اور مشائخ نہایت درد بھرے انداز میں یہ اعلان کرنے لگے تھے ــــ

"امروز خود ایں کار (شیخی) بازی بچگاں شد"[2]

اگر چشتیہ سلسلہ حکومت کی مخالفت کے باعث منتشر ہوا تو سہروردیہ سلسلہ کو حکومت سے تعاون نے برباد کر دیا!

سہروردیہ سلسلہ اور سلطان ملتان جہاں سہروردیہ سلسلہ کی سب سے بڑی خانقاہ قائم تھی، اپنی جغرافیائی، تمدنی اور سیاسی اہمیت کی بنا پر ہمیشہ سلاطین کی توجہ کا مرکز رہتا تھا۔ محمد بن تغلق نے کوشش کر کے یہاں کی خانقہی زندگی پر اپنا اثر قائم کر لیا اور سہروردی خانقاہ کو حکومت کے ایک شعبہ میں تبدیل کر دیا۔ اس کی ابتدا شیخ رکن الدین ابو الفتحؒ کے زمانہ سے ہوئی۔ سلطان نے اُن کو سَو گاؤں جاگیر کے طور پر دیے تھے[3]۔ جب بہرام ایبہ کشلو خاں نے بغاوت کی تو انھوں نے اور اُن کے بھائی شیخ عماد الدین نے سلطان کا ساتھ دیا بلکہ شیخ عماد الدین کی تو شہادت بھی

---

[1] جوامع الکلم ص ۱۴۳۔ [2] اخبار الاخیار ص ۸۲ [3] عجائب الاسفار ص ۱۵۷۔

اسی ہنگامہ میں ہوئی[1]۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ شیخ رکن الدینؒ کسی شخص کو اپنی خانقاہ میں نہ ٹھہراتے تھے جب تک کہ وہ والی ملتان سے اجازت حاصل نہ کرلیں[2]۔ معلوم نہیں کہ یہ پابندی خود انہوں نے اپنے اوپر عاید کی تھی یا سلطان نے اس چیز پر مجبور کیا تھا۔ بہرحال اس پابندی کے بعد روحانی آزادی کا تصور بے معنی ہوگیا۔ لیکن شیخ رکن الدینؒ بڑی روحانی صلاحیتوں اور زبردست روحانی اقتدار کے مالک تھے۔ انہوں نے سلسلہ کے نظام کو بڑی خوبی سے چلایا۔ لیکن اُن کے وصال کے بعد حالات بدل گئے۔ اُن کے ورثا نے جانشینی کے مسئلہ پر جھگڑے شروع کردیے اور اختلافات نے ایسی بدنما صورت اختیار کرلی کہ یہ مقدمہ محمد بن تغلق کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان نے شیخ ہود کے حق میں فیصلہ دیا۔ شیخ ہود جب دیوگیر سے وطن آنے لگے تو

"بادشاہ نے حکم دیا کہ شیخ ہود کی نہایت تعظیم و تکریم کی جائے۔ اور جس منزل میں ٹھہرے بادشاہ کی طرف سے دعوت کی جاوے۔ شہر کے مشایخ اور حکام کو حکم دیا کہ اس کا استقبال کرنے جائیں۔ جب وہ دارالخلافہ میں پہنچا تو شہر کے کل مولوی اور مشایخ اس کے استقبال کے لیے باہر آئے اور میں (ابن بطوطہ) بھی اُن میں شامل ہوا۔ شیخ پالکی میں سوار تھا . . . . جب دارالخلافہ میں پہنچے تو بادشاہ کی طرف سے دعوت دی گئی اور اس میں قاضی اور مولوی اور پردیسی سب بلائے گئے۔ جب کھانا کھا چکے تو ہر ایک کو علیٰ قدر استحقاق نذر بھی دی گئی . . . . پھر یہ شیخ ہود ملتان کی طرف رخصت ہوئے اور بادشاہ نے ان کے ساتھ شیخ نورالدین شیرازی کو بھیجا کہ وہ ملتان جاکر اُن کو اُن کے دادا کا سجادہ نشین کرے اور بادشاہ کے خرچ سے وہاں بھی ایک بڑی دعوت کی گئی[3]۔"

محمد بن تغلق کی ناکام زندگی میں یہ واقعہ نہایت اہم تھا۔ وہ روحانی سلسلوں کو اپنے زیرِ اثر لانے

---

[1] عجائب الاسفار۔ ص ۱۵۷۔ [2] ایضاً ص ۲۰ [3] ایضاً ص ۱۴۴-۱۴۶

کی مسلسل جد وجہد کر رہا تھا لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس وقت امید کی ایک کرن نظر آئی اور کم از کم ایک سلسلہ کا پورا نظام اس کے قابو میں آ گیا۔ اور خود اس کا نمائندہ مسند سجادگی پر بٹھا دیا گیا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ محمد بن تغلق نے جن مقاصد کے پیش نظر سہروردی سلسلہ پر اپنا اثر قائم کیا تھا وہ پورے بھی ہوئے یا نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس طرح سلسلہ کا پورا نظام درہم برہم ہو گیا اور مشایخ کی توجہ روحانی اصلاح و تربیت سے ہٹ کر مادی جاہ و عظمت کی طرف مرکوز ہو گئی۔ اس زمانہ میں ایک بزرگ نے نہایت حسرت کے ساتھ کہا تھا ؎

"ایں ساعت شیخاں و عالماں بر در ملوکاں و بادشاہاں می روند و خوار می شوند" [1]	آج کل علماء و مشایخ بادشاہوں اور امراء کے دروں پر جاتے ہیں اور ذلیل ہوتے ہیں۔

شیخ رکن الدین ملتانیؒ اور سلطان محمد بن تغلق شیخ رکن الدینؒ کی بہت عزت کرتا تھا۔ جب بہرام ایبہ نے بغاوت کی اور سلطان لشکر لے کر بڑھا تو شیخ رکن الدینؒ نے ملتان سے چند منزل باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ عصامی نے لکھا ہے:

ابو الفتح شیخ زماں رکن دیں — بہ تعظیم آں شاہِ روے زمیں
بر آہنگ نصرت در اثنائے راہ — بہ یک منزلے شد ملاقی بہ شاہ
شہش کرد تعظیم و بوسید پائے — مدد خواست از شیخ نصرت نمائے [2]

اس مہم میں کامیابی کے بعد سلطان نے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ چنانچہ ایک ہفتہ تک ملتان میں خوں کی ندیاں بہتی رہیں۔ شیخ رکن الدینؒ اس ہفتہ میں "عزلت گزیں" تھے، جب انہیں اس غارتگری کا علم ہوا تو ننگے پیر اور ننگے سر نکل کر سلطان کے پاس پہنچے اور کہا:

بسے خوں فشاندی دریں بوم و بر — ز تیغت گرفتہ جہاں خونِ تر

---

[1] سرور الصدور (قلمی) [2] فتوح السلاطین ص ۴۳۹

برا ہل گنہ نزد اہل صفا پسندیدہ تر ہست عفو از جزا

کنوں دست دار از سیاست گری چو شد نوبتِ عفو و رحم آوری[1]

سلطان نے اُن کی سفارش پر قتل وخونریزی کا یہ ہنگامہ فوراً بند کر دیا اور قیدیوں کو بھی رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

شیخ ہود اور سلطان محمد بن تغلق کے حکم کے ماتحت شیخ ہود کو مسند سجادگی پر بٹھایا گیا تھا اور شیخ رکن الدین کی جاگیر بھی اُن کے نام بحال رکھی گئی تھی لیکن سلطان سے اُن کے تعلقات اچھے نہ رہ سکے۔ تفصیل ابن بطوطہ کی زبانی سنیے۔ لکھتا ہے:

"ایک دفعہ عماد الملک حاکم سندھ نے بادشاہ کو لکھا کہ شیخ ہود اور اس کے رشتہ دار مال جمع کرتے ہیں اور بیجا کاموں میں صرف کرتے ہیں، اور خانقاہ میں کسی کو روٹی نہیں دیتے۔ بادشاہ کا حکم صادر ہوا کہ اُن کا کل مال ضبط کر لیا جائے۔ عماد الملک نے اُن کو طلب کیا بعضوں کو قتل کیا اور بعضوں کو مار پیٹ کی اور کچھ دنوں تک ہر روز اُن سے بیس ہزار دینار وصول کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اُن کے پاس کچھ نہ رہا ان کے گھروں سے بہت دولت اور اسباب نکلا۔ چنانچہ ایک جوتوں کا جوڑا تھا جس پر جواہر اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ اس کی قیمت سات ہزار دینار تھی۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ جوتوں کا جوڑا شیخ ہود کی بیٹی کا تھا، کوئی کہتا تھا کہ اس کی لونڈی کا۔ جب شیخ پر بہت سختی ہوئی تو اس نے ترکستان بھاگ جانے کا ارادہ کیا لیکن ایک شخص نے اس کو پکڑ لیا۔ عماد الملک نے بادشاہ کو لکھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ شیخ ہود کو اور اس شخص کو جس نے اُسے پکڑا ہے ایک جگہ باندھ کر بھیج دیوے۔ جب وہ دونوں دار الخلافہ میں پہنچے تو جس شخص نے شیخ ہود کو پکڑا تھا، اس کو رہا کر دیا اور اس سے پوچھا کہ تو نے کہاں بھاگنے کا ارادہ کیا تھا۔ شیخ نے عذر

[1] فتوح السلاطین ص ۴۴۳، نیز تاریخ فیروز شاہی ص ۴۷۹، تاریخ مبارک شاہی ص ۱۰۰

کیا۔ بادشاہ نے کہا کہ تیرا ارادہ تھا کہ تو ترکستان جائے اور وہاں جا کر کہے کہ میں بہاء الدین زکریا ملتانی کا بیٹا ہوں اور بادشاہ نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے اور ترکوں کو مدد پر لاوے۔ بادشاہ نے اس کی گردن مارنے کا حکم دیا[1]"

ہندوستان میں سجادہ نشین شیخ کا یہ پہلا قتل تھا!

مخدوم جہانیاںؒ اور سلطان سید جلال الدین بخاری المعروف بہ مخدوم جہانیاںؒ[2] اوچہ کے سہروردی سلسلہ کے سب سے مشہور بزرگ تھے۔ سندھ میں اُن کا بڑا اثر تھا اور وہاں کے قبائلی سردار اور امراء اُن کے دامن تربیت سے وابستہ تھے۔ محمد بن تغلق نے اُن کو شیخ الاسلام کا خطاب دیا اور سیوستان میں ایک جاگیر اِن کے حوالہ کر دی۔ ایک دن اپنے مریدوں سے کہنے لگے:

سلطان محمد نے دعاگو کو شیخ الاسلام کیا اور چالیس خانقاہیں میرے تصرف میں کر دیں۔ شیخ قطب عالم رکن الحق والدین نے مجھ سے کہا کہ تو چھوڑ دے، حج کو چلا جا۔ مجھ کو کیچ سے نکالا۔ میں نے چھوڑ دیا۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ کتنا تکبر حاصل ہوتا[3]"

غالباً شیخ رکن الدینؒ کی دوربین نظر نے حکومت وقت سے تعلقات کے مہلک اثرات کو محسوس کر لیا تھا۔ مخدوم جہانیاںؒ کا ہندوستان سے چلا جانا سلسلہ کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ جب وہ فیروزشاہ کے عہد میں بلاد اسلامی کی سیاحت سے واپس آئے تو ملتان کا روحانی مرکز ختم ہو چکا تھا۔ اُنہوں نے اوچہ میں سہروردیہ سلسلہ کے نظام کو نئی رونق اور تقویت بخشی

چشتیہ سلسلہ اور سلطان جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے ہیں چشتیہ سلسلہ کے بنیادی اصول محمد بن تغلق کے بنیادی تصورات سے ٹکرا گئے تھے، اور اس ٹکراؤ نے ساری فضا کو مکدر کر دیا تھا۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، مولانا فخر الدین زرادیؒ اور شیخ قطب الدین منورؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے

---

[1] عجائب الاسفار ص ۱۴۵-۱۴۶۔ [2] حالات کے لیے ملاحظہ ہو: سیر العارفین ص ۱۵۵-۱۶۴۔ اخبار الاخیار ص ۱۳۹-۱۴۰۔ تاریخ فیروزشاہی، عفیف ص ۵۱۴-۵۱۶، گلزار ابرار (قلمی)، معارج الولایت (قلمی)

[3] الدر المنظوم فی ترجمہ ملفوظ المخدوم ص ۲۴۵۔

اُن خلفا میں تھے جو مضبوطی کے ساتھ اپنے شیخ کے مسلک پر قائم رہے اور استبداد و آمریت کے تیز و تند جھونکے انہیں اپنے مقام سے نہ ہلا سکے لیکن وہ منسلکین سلسلہ جو ابھی عمر کی اس پختگی کو نہیں پہنچے تھے اور جن میں مقابلہ اور مخالفت کی طاقت بھی کم تھی، رفتہ رفتہ حکومت کے کل پرزے بن گئے محمد بن تغلق کی اس پالیسی نے چشتیہ سلسلہ کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ جو مشایخ سلطان کے ہم خیال نہ بن سکے اُن کی ساری عمر حکومت کی جارحانہ کارروائیوں کا مقابلہ کرنے میں بسر ہوگئی، اور ان کا جو وقت دینی اور اصلاحی کاموں میں صرف ہونا چاہیے تھا وہ حکومت کی نذر ہو گیا۔ جن مشایخ نے سلطان سے تعاون کر لیا وہ سلسلہ کے دینی اور اصلاحی پروگرام سے کٹ گئے اور ان کی صلاحیتیں حکومت کے کاموں میں لگ کر ضائع ہو گئیں۔ خانقہی فضا میں آنکھیں کھولنے والوں سے کسی نظام حکومت کو حسن و خوبی کے ساتھ چلانے کی توقع کرنا عبث تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلہ تو ایسے لوگوں کی خدمات سے محروم ہو گیا جو اس کے نظام تعلیم و تربیت کو آگے بڑھا سکتے تھے لیکن حکومت اُن کی صلاحیتوں سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکی شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے خاندان کے بیشتر افراد اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مریدین کے اکثر گھرانے خانقاہوں سے نکل کر سیاست کے میدان میں داخل ہو گئے۔ اس سلسلہ میں خواجہ کریم الدین سمرقندی، سید قطب الدین حسین کرمانیؒ، سید کمال الدینؒ شیخ مظہر الدینؒ شیخ معز الدینؒ، اور شیخ علم الدینؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگر محمد بن تغلق نے ان مشایخ اور مشایخ زادوں کو خانقاہوں سے نہ نکالا ہوتا تو چشتیہ سلسلہ کی تاریخ کے دورِ اول کا خاتمہ شاید اس قدر جلد نہ ہوتا۔

خواجہ کریم الدین سمرقندیؒ بیانہ میں رہتے تھے۔ علم و فضل، فراست و کیاست میں دور دور شہرت تھی۔ بابا فرید گنج شکرؒ کی ایک نواسی اُن کے حبالۂ نکاح میں تھیں۔ محمد بن تغلق نے اُن کو شیخ الاسلام کا خطاب دے کر سنگاؤں بھیج دیا۔ میر خورد نے لکھا ہے:

در آں دیار رفت و امور و مہمات مسلمانان — اس دیار میں تشریف لے گئے اور اپنی

آں دیار را بعقل کامل خود بر جادۂ معدلت باز آورد" ۱؎ — عقل کامل کے زور سے مسلمانوں کی تمام مہمیں اور امور عدل و انصاف کے طریقہ پر واپس لے آئے۔

سید قطب الدین حسین کرمانیؒ، صاحب سیر الاولیاء کے چچا تھے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے ظلِ عاطفت میں پرورش پائی تھی۔ وہ خواجہ جہاں احمد ایاز کے ہمراہ دیوگیر چلے گئے اور گو انہوں نے واضح طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ

"بدو شرط در صحبت شما باشم۔ اول آنکہ لباس سیادت و اہل تصوف بر من مقرر باشد و دوم آنکہ بہ ہیچ مشغلے معین مشغول نگرداند" ۲؎ — میں دو شرطوں کے ساتھ تمہاری صحبت میں رہ سکتا ہوں۔ ایک یہ کہ سیادت و اہل تصوف کا جو لباس اب پہنتا ہوں وہی پہنا کرونگا، اور دوسرے یہ کہ مجھے کسی معین شغل میں مشغول نہ کیا جائے۔

اوران پر وہ قائم بھی رہے، لیکن سلسلہ کے نظام سے اُن کا تعلق منقطع ہوگیا۔ اس طرح صاحب سیر الاولیاء کے دوسرے چچا سید کمال الدین کرمانیؒ بھی "طبل و علم برداری" اور "گاؤں" اور "زمین" کے جھگڑوں میں پھنس گئے۔ محمد بن تغلق نے کچھ عرصہ انہیں بھاکسی ("کہ نزدیک دیوگیر است") کے قید خانے میں بند رکھا، پھر انہیں دربار میں طلب کیا۔ وہ صوفیانہ خرقہ پہن کر اور برابر کی دو زلفیں شانوں پر ڈال کر سلطان کے سامنے پہنچے تو اُس نے کہا:

تو از ما بدیں بہانہ می خواہی گریز کنی، و ما می خواہیم کہ پرداخت امورِ مملکت بمشورت شما کنیم" ۳؎ — تم چاہتے ہو کہ اس بہانہ سے ہم سے بھاگ جاؤ اور ہم چاہتے ہیں کہ امور مملکت تمہارے مشورے سے طے کریں۔

اس کے بعد ان کو "ملک معظم" بنا دیا گیا۔

شیخ معز الدین اور شیخ علم الدین شیخ علاء الدین اجودھنیؒ کے صاحبزادگان تھے سلطان نے ان دونوں کو بھی سیاسی کاموں میں لگا لیا۔ شیخ معز الدینؒ کو گجرات کا انتظامی کام ایسے نازک

۱؎ سیر الاولیاء ص ۳۰۷ ۲؎ ایضاً ص ۲۱۸ ۳؎ ایضاً ص ۲۰۵

وقت میں سپرد کیا گیا تھا جب وہ صوبہ باغیانہ تحریکوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ "از دستِ ظالمان و باغیان بدرجۂ شہادت رسید" شیخ علم الدین کو مملکت ہندوستان کا شیخ الاسلام بنایا گیا تھا اور اس طرح بقول میر خورد "جمیع مشایخ روزگار معتقد و محکوم او گشتند" لیکن یہ سیاسی اقتدار اس روحانی عظمت کا بدل نہ بن سکا جو حکومت سے متعلق ہو جانے کے باعث وہ کھو بیٹھے تھے!

شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ اور سلطان | شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ دہلی میں شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ راستین تھے۔ عمر کا بڑا حصہ ریاضت اور مجاہدہ میں صرف کیا تھا۔ ایک زمانہ میں اُن کی خواہش تھی کہ کسی گوشہ میں بیٹھ کر اپنی پوری زندگی عبادت میں گزار دیں لیکن پیر و مرشد سے جب اس کی اجازت چاہی تو اُنہوں نے امیر خسرو کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ

"او را بگو ترا در میان خلق می باید بود و جفا — اُن سے کہہ دو کہ تمہیں خلق میں رہنا چاہیے اور
و قفائے خلق می باید کشید و مکافات آں — لوگوں کے جور و ظلم سہنے چاہئیں۔ اور ان کے
ببذل و ایثار و عطا می باید کرد"[۱] — عوض میں بذل و ایثار اور سخاوت و بخشش کرنا چاہیے

محمد بن تغلق کے عہد میں اُن پر حوادث کا ایک طوفان گزر گیا لیکن اُنہوں نے فرمان شیخ کی بجا آوری سے سرمو گریز نہیں کیا۔ محمد بن تغلق سے ان کے تعلقات کی کشیدگی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ کسی قیمت پر اپنے پیر و مرشد کے مسلک سے ہٹ کر حکومتِ وقت سے رابطہ قائم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

دیوگیر روانگی سے قبل سلطان نے جن علماء و مشایخ کو دربار میں طلب کیا تھا، ان میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ بھی تھے۔ اس موقع پر شیخ شمس الدین یحییٰؒ اور مولانا فخر الدین زرادیؒ بھی بلائے گئے تھے اور موخر الذکر سے سلطان کی سخت گفتگو بھی ہو گئی تھی جس کا ذکر آگے آئیگا لیکن شیخ نصیر الدینؒ سے اس وقت کوئی بدمزگی نہیں ہوئی تھی لیکن بعد کو کسی

---

[۱] سیر الاولیاء، ص ۱۹۶۔ [۲] ایضاً ص ۲۳۷

سبب سے تعلقات میں انتہائی کشیدگی پیدا ہو گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سلطان نے علماء و مشائخ سے دہلی چھوڑ کر دیوگیر جانے کا مطالبہ کیا تو شیخ کا طرز عمل کیا رہا؟ تذکروں میں اس کی بابت کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ غالباً شیخ نصیر الدینؒ نے دہلی چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا اور یہی بات ان کے اور سلطان کے درمیان تعلقات کی خرابی کا سبب بن گئی[1] اور سلطان نے اُن کو ایذائیں پہنچانا شروع کر دیں۔ ان ایذاؤں کی تفصیل معاصر مورخوں یا تذکرہ نویسوں نے نہیں دی۔ سید محمد گیسو درازؒ نے ایک بار اپنی مجلس میں اس کا ذکر کرنا چاہا تھا لیکن اُن کے دل کو اتنی تکلیف ہوئی کہ بیان کرنے کی ہمت نہ ہوئی[2]۔ تاریخ محمدی میں صرف اتنا لکھا ہے:

"محمد بن تغلق شاہ بادشاہ جبار و شہر یار قہار بود باآں بزرگوار بگفتار و کردار انواع آزار ظاہر گردانید۔ آں پیر دین دار ہیچ گاہے از صمیم سینہ آہے درد آلودہ نیاوردے و دعائے کہ موجب انہدام بنا دولت او بودے نکردے، مدت مدید بداں جفاء شدید مبتلا ماند"[3]

محمد بن تغلق بڑا جابر اور قاہر بادشاہ تھا، اس نے ان بزرگوار کو زبان اور عمل سے بہت سی تکلیفیں پہنچائیں۔ (لیکن) وہ پیر دین دار کبھی اپنے سینہ سے درد بھری آہ تک نہ کھینچتے تھے نہ کبھی ایسی دعا کرتے تھے کہ اس کی سلطنت کی بنیادوں کے انہدام کا سبب بن جائے۔ طویل مدت تک اس شدید تکلیف میں مبتلا رہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ وہ زبردستی شیخ کو اپنے ساتھ سفر پر لے جایا کرتا تھا ایک بار اس نے شیخ کو تکلیف پہنچانے کے لیے یہ ترکیب کی کہ اُن کے سامنے سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا رکھ دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کھانا کھا لینگے تو شریعت کے خلاف عمل کرتے

---

[1] محمد ہادی کامور خاں نے لکھا ہے کہ سلطان نے دیوگیر کو روانگی کے موقع پر شیخ کے سپرد کپڑے پہنانے کی خدمت کی تھی۔ (ہفت گلشن محمد شاہی، روٹوگراف قلمی نسخہ برٹش میوزیم ورق ۲۴۸ الف ب) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کی ابتدا بھی اسی وقت سے ہوئی تھی۔

[2] جوامع الکلم ص ۱۰۲

[3] تاریخ محمدی (روٹوگراف) ۱۴۹ ب

پر اُن سے جواب طلب کریگا، اگر کھانے سے انکار کرینگے تو حکم عدولی پر سزا دیگا۔ شیخ نے برتنوں سے سالن نکال کر ہاتھ پر رکھ لیا اور پھر کھایا۔ اس سے سلطان کو بڑی نا اُمیدی ہوئی۔[1] شیخ عبد الحق رح نے آگے چل کر لکھا ہے کہ سلطان نے اُن کو اپنا جامہ دار بنا دیا تھا اور انہوں نے یہ ساری تکلیفیں اپنے شیخ کے فرمان کی تعمیل میں برداشت کی تھیں۔[2]

مولانا عبد الواحد کا بیان ہے کہ سلطان نے بہت سے مشایخ کو "خدمات" سپرد کی تھیں شیخ نصیر الدین چراغ رح کے سپرد بھی ایک کام کیا گیا۔ شیخ نے قبول کرنے سے انکار کیا تو سلطان نے

زیر استخوانہائے گلو سوراخہا کنانید وآں	اُن کے گلے کی ہڈیوں میں سوراخ کرا دیے
استخوانہا را بر سنہا محکم بستن فرمود وگفت	تھے اور ان ہڈیوں کو رسیوں سے مضبوط
کہ آں رسنہا را بر بلندی بندید وایشاں	باندھنے کا حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ ان رسیوں
را آویزاں دارید"[3]	کو بلندی پر باندھا جائے اور اُن کو لٹکا رکھا جائے

بالآخر شیخ نے مجبور ہو کر کپڑے پہنانے کی خدمت قبول کر لی۔ اور اس طرح اس اذیت سے نجات پائی۔ فرشتہ نے بھی اسی طرح کی بات لکھی ہے۔ کہتا ہے:-

"محمد تغلق شاہ کہ بواسطہ بسیاری قتل و	محمد تغلق شاہ جو قتل و خونریزی کی زیادتی کی بنا
سیاست اورا خونی می گفتند با درویشان	"پُرخونی" کہا جاتا تھا، درویشوں سے ناخوش ہو کر
سوئے مزاج بہم رسانیدہ حکم کرد کہ درویشان	اس نے حکم دے دیا کہ درویش خدمتگاروں
بطریق خدمت گاران خدمتم نمایند پس	کی طرح میری خدمت کریں۔ کوئی مجھے پان کا
یکے مرا تنبول خوراند ودیگرے دستار بہ بندد	بیڑا کھلائے، کوئی دستار باندھے۔ الغرض بہت
الغرض بسے مشایخ را خدمتے مقرر کردہ	سے مشایخ کو اس نے خدمتیں سپرد کر دی تھیں
بشیخ نصیر الدین اودہی المشہور بچراغ	شیخ نصیر الدین اودہی چراغ دہلوی کو کپڑے پہنانے
دہلی تکلیف بجامہ پوشانیدن نمود شیخ	کی تکلیف دی۔ شیخ نے قبول نہ کی۔ چنانچہ شیخ

[1-2] اخبار الاخیار ص ۸۱ [3] سبع سنابل ص ۶۴-۶۵

قبول نکردہ کار بخشونت کشید چنانچہ شیخ را قفادادہ   کی گردن پر گھونسا مار کر قید کر دیا۔

محبوس ساخت [1]

کسی معاصر تاریخ یا تذکرہ میں ان چیزوں کا ذکر نہیں ملتا۔ غالباً یہ سب بعد کی گھڑی ہوئی داستانیں ہیں۔ مولانا عبدالرحمن چشتی[2] اور محمد بولاق چشتی[3] نے ان تمام قصوں کو "کذب عوام الناس" میں شمار کیا ہے۔ مولانا عبدالواحد اور فرشتہ کے بیانات تو بے شبہ بے سر و پا افواہوں پر مبنی ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شیخ نصیر الدینؒ کو جو بھی ایذائیں پہنچائی گئی تھیں وہ ایسی تھیں جن سے اُن کے معاصرین، متعلقین اور معتقدین کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ شیخ برہان الدین غریبؒ کو دیوگیر میں جب اس کا علم ہوا تو بہت روئے اور کہا:

"چکنم، خوند مولانا محمود حلیم و کریم است   کیا کروں کہ خوند مولانا محمود حلیم و کریم ہیں اگر
واگر او بخواہد این زمین او را وجملہ لشکرو   وہ چاہیں تو زمین سلطان کو اور اس کے پورے
خلق و اسپاں و پیلاں او فرو بردو   لشکر و رآدمیوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو
آروغے بر نیارد" [4]   اس طرح نگل جائے کہ ڈکار تک نہ لے۔

انھوں نے ہمدردی کا ایک خط بھی لکھا تھا جس کی پیشانی پر یہ رباعی تھی [5]

تا بر سر عاشقاں بلائے نرسد   آوازۂ عشق شاں بجائے نرسد
رو بر سر کنگرہ سر مرداں بیں   نامرداں را خار بپائے نرسد

کہا جاتا ہے کہ جب اُن کے متعلقین نے اُن سے کہا کہ سلطان کے لیے بد دعا کریں تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ دوسروں کے لیے بد دعا کرنے سے خود تکلیف اُٹھانی آسان ہے۔[6]

کیا واقعی محمد بن تغلق مشائخ اور علماء سے ذاتی خدمت لیتا تھا؟ عہد مغلیہ کے مورخین

[1] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۹۹   [2] مراۃ الاسرار (قلمی)   [3] مطلوب الطالبین (قلمی)
[4] [5] جوامع الکلم ص ۲۴۰   [6] تاریخ محمدی (روٹو گراف) ورق ۱۴۹ ب
صاحب سبع سنابل نے لکھا ہے کہ شیخ نے جواب میں صرف یہ شعر لکھا تھا:
چوں حوالتہائے این ضربت زجائے دیگر است   ننگم آید گر بگویم کز فلاں رنجیدہ ام

اور تذکرہ نویسوں نے ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ صورت حال یہی تھی اور اسی بنا پر مذہبی طبقوں میں اس کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لیکن جب مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک زبردست غلط فہمی ہے جو سلطان کے متعلق عام ہو گئی ہے۔ غالباً یہ بدگمانی ابن بطوطہ کے ایک جملہ کا مفہوم صحیح نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے:

"فلما ولی السلطان محمد أراد ان یخدم الشیخ فی بعض خدمته فان عادته أن یخدم الفقہا والمشایخ والصلحاء متجا ان الصدر الاول رضی اللہ عنہم لم یکونوا یستعملون الا اھل العلم والصلاح" [۱]

سلطان محمد شاہ بادشاہ ہوا تو اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مشائخ اور عالموں کو اپنی نج کی خدمتیں سپرد کیا کرتا تھا اور یہ دلیل لاتا تھا کہ خلفائے راشدین سوا اہل علم اور اہل صلاح کے کسی کو کوئی خدمت سپرد نہیں کرتے تھے۔" [۲]

ظاہر ہے کہ محمد بن تغلق ان علماء و مشایخ سے وہی خدمت لینا چاہتا تھا جو خلفاء راشدین اہل علم اور اہل صلاح سے لیتے تھے [۳]۔ اور یہ خدمت حکومت کی ملازمت تھی۔ بعد کے مورخوں نے اس کو

---

[۱] رحلہ جلد دوم ص ۵۴ [۲] عجائب الاسفار ص ۱۳۷، مولوی محمد حسین نے خدمت کا ترجمہ "نج کی خدمت" کیا ہے جس سے مفہوم بدل گیا ہے۔ حالانکہ اس سے مراد حکومت کی ملازمت ہے۔

[۳] قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے: "حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ جب اُن کے پاس کوئی فوج مہیا ہوتی تھی تو اس پر ایسا افسر مقرر کرتے تھے جو صاحب علم اور صاحب فقہ ہوتا تھا"۔ کتاب الخراج ص ۱۲۰،

حضرت چراغ دہلویؒ نے خود ایک بار اپنی مجلس میں بیان فرمایا تھا کہ: "ایک شخص امیر المومنین عمر بن خطابؓ کی خدمت میں آیا اور بولا: اے خلیفہ مجھے کہیں کی حکومت دیجیے۔ آپ نے پوچھا تو نے قرآن پڑھا ہے؟ کہا: نہیں۔ فرمایا: اول قرآن پڑھ" ملاحظہ ہو خیر المجالس ص ۱۳۳۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی صدر اول کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فکان لا یتولی القضاء ولا الافتاء الا مجتھد ولیس الفقیہ الا مجتھد (حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۴۲) یعنی مجتہد کے علاوہ قضاء اور فتوی کا کام کسی کے سپرد نہیں کیا جاتا تھا اور صرف مجتہد کو فقیہ کہا جاتا تھا —— محمد بن تغلق کی فکر انہی دائروں میں گھول رہی تھی یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ خلفاء راشدین کی طرح وہ یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب تھا یا نہیں یا اس کے اندر وہ اہلیت بھی تھی یا نہیں جو خلافت راشدہ کے طرز پر مسلمانوں کی زندگی کو ترتیب دینے کے لیے (باقی بر ص ۳٦۷)

جامہ اور پگڑی پہنانے کی خدمت بنا دیا اور سلطان کی خوب تشہیر کی۔

۷۴۹ھ؍۱۳۴۹ء میں سلطان محمد طغی کا پیچھا کرتا ہوا گجرات سے تتہ پہنچا۔ دوران سفر میں وہ گوندل کے مقام پر بیمار پڑ گیا۔ اس زمانہ میں اس نے دہلی سے بعض مشایخ، علماء، اکابر و معارف کو معہ حرم کے گوندل طلب کیا۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی بھی ان لوگوں میں شامل تھے۔ معاصر تذکرہ نگاروں نے اس طلبی کا مقصد نہیں بتایا۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ سلطان ان سے ناراض تھا۔[۱] برنی نے غالباً عمداً اس مسئلہ پر خاموشی اختیار کی ہے۔ لیکن اس کے بیان سے اتنا ضرور ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس وقت سلطان کچھ پریشان تھا۔[۲] بدایونی نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ نصیر الدین چراغ نے سلطان محمد کی غیر موجودگی میں فیروز کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا تھا۔ سلطان کو گوندل قیام کے زمانہ میں اس کی اطلاع ملی، چنانچہ اس نے حکم دیا کہ یہ سب لوگ دہلی سے قید کر کے لائے جائیں۔ یہ قیدی ابھی تتہ کے نواح ہی میں تھے کہ سلطان نے اُن کے قتل کا حکم دے دیا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۶۶) ضروری تھی۔ یہاں صرف اس کے انداز فکر سے بحث ہے۔ اس نے جس بنیاد پر یہ مطالبہ کیا تھا اس سے اس کی فکر کی توانائی اور خیالات کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ خلافت راشدہ واپس نہیں لائی جا سکتی تھی اس لیے کہ جن تاریخی قوتوں کی وہ پیداوار تھی وہ اب موجود نہیں تھیں لیکن اسلامی اصولوں کی آفاقیت اور ہمہ گیری میں اس کا اعتقاد اتنا گہرا تھا کہ خلافت راشدہ کے اصولوں کو نئے حالات میں بروئے کار لانے کی تمنا کر رہا تھا۔

(نوٹ صفحہ ہذا) [۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۲۳۔ [۲] میر خورد نے لکھا ہے: از آنجا شیخ نصیر الدین محمود را با علماء و بزرگان حضور خود طلبید (سیر الاولیاء ص ۲۴۶)۔ میر حسینی کا بیان ہے کہ "محمد بن تغلق تکلیف ایشاں را بردہ بود" (بحر المعانی ص ۱۱۷) اور یہی عفیف کا بیان ہے کہ شیخ نصیر الدین محمود را سلطان محمد در تھتہ برابر خود بردہ بود (تاریخ فیروز شاہی ص ۸۲) بظاہر یہ بیانات بالکل متضاد معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ بات اگر ذہن میں رہے کہ سلطان نے شیخ کو گوندل طلب کیا تھا اور وہاں سے اُن کو تتہ ساتھ لے گیا تھا، تو یہ تضاد دور ہو جائیگا۔ جوامع العلوم کا یہ بیان کہ شیخ "اثنائے راہ میں لوٹ آئے، سلطان محمد مر گیا" (اردو ترجمہ ص ۳۸۰) غلط ہے۔

[۳] جوامع العلوم ص ۳۸۰، گلزار ابرار (قلمی)، تتہ جاتے ہوئے شیخ نصیر الدین نارنول ٹھہرے تھے اور شیخ محمد ترک نارنولی کے مزار پر بہت دیر تک مراقبہ میں مستغرق رہتے تھے اور کشائش مشکل کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اخبار الاخیار، ص ۷۴، سید محمد گیسو دراز کا بیان ہے کہ تتہ روانگی کے وقت شیخ نے انہیں ہدایت کی تھی کہ روزانہ قطب صاحب کی مزار پر جایا کریں۔ جوامع الکلم ص ۱۸۲

[۴] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۲۳، لکھا ہے کہ سلطان کو ملک کبیر کے انتقال کی خبر ملی تھی اور اس سے "سلطان منقسم دل گشت"

اس حکم کی تعمیل ہونے سے پہلے سلطان کا انتقال ہوگیا اور یہ سب قیدی سزا سے بچ گئے۔[1] بدایونی کے اس بیان کی تصدیق کسی معاصر مورخ کے بیان سے نہیں ہوتی۔[2]

بہرحال سلطان کے انتقال کے بعد لوگوں نے شیخ نصیر الدینؒ سے دریافت کیا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ سلطان ان کو اس قدر پریشان کرتا تھا؟ فرمایا۔

"میان من وحق جل وعلیٰ معاملہ بود آں را بدیں برداشتند"[3]

میرے اور حق جل وعلیٰ کے درمیان ایک معاملہ تھا۔ اس کو اس طرح طے کیا گیا۔

اور تفصیل میں جانے سے انکار کر دیا![4]

شیخ فخر الدین زرادیؒ اور سلطان

شیخ فخر الدین زرادیؒ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے خلفاء میں خاص مقام رکھتے تھے۔ علم وفضل، زہد وورع، ترک وتجرید میں اپنی مثال آپ تھے۔ محمد بن تغلق نے دیوگیر جانے سے قبل اُنہیں معہ دیگر علماء ومشائخ کے دربار میں طلب کیا تھا۔ وہ سلطان سے ملاقات کرنے پر آمادہ نہ تھے اور کہتے تھے:

"من سر خود پیش ایں در سرائے ایں مرد غلطیدہ می بینم، یعنی با وے مسامحت نخواہم کرد و او زندہ نخواہد گذاشت"[5]

میں اپنے سر کو اس مرد کے گھر کے دروازہ پر (خون میں غلطاں) دیکھتا ہوں۔ میں (اس کی باتوں پر) چشم پوشی نہ کرونگا اور وہ مجھے زندہ نہ چھوڑیگا

---

[1] منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۴۲، [2] برنی نے صاف لکھا ہے کہ محمد بن تغلق نے فیروز کو "مستخلف خود" اور "ولی عہد خود" (ص ۵۳۲) بنادیا تھا۔ ایسی صورت میں بغاوت کا کوئی امکان نہ تھا۔ پھر شیخ نصیر الدینؒ جن کی سلطان محمد سے مخالفت صرف اس بناء پر تھی کہ وہ حکومت کے کاموں میں حصہ لینے پر آمادہ نہ ہوتے تھے، اپنے مسلک سے ہٹ کر کس طرح دخل دے سکتے تھے!

[3] سیر الاولیاء ص ۲۴۶۔ [4] اس عہد کے مورخوں نے سلطان کی موت کو شیخ نصیر الدینؒ کو تکلیف پہنچانے کی سزا قرار دیا ہے۔ میر خورد نے لکھا کہ چونکہ اس نے احترام ایشاں کما ہو حقہ بجا نیاورد آں احتمال ایشاں بادشاہ مذکور را از تخت سلطنت در تختۂ تابوت کردہ در شہر آوردند" (سیر الاولیاء ص ۲۴۶) اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محمد بن تغلق کے سندھ میں مدفون ہونے کا خیال صحیح نہیں۔ ملاحظہ ہو اسلامک کلچر جنوری ۱۹۳۸ء ص ۷۱-۷۴۔ [5] حالات کے لیے ملاحظہ ہو سیر الاولیاء ص ۲۶۲-۲۷۵، اخبار الاخیار ص ۹۰-۹۲۔ معارج الولایت ج ۱ ص ۳۰۷-۳۱۰۔ [6] سیر الاولیاء ص ۲۷۱۔

مجبوراً دربار میں گئے۔ قطب الدین دبیر اُن کا شاگرد خاص تھا۔ اُن کی جوتیاں بغل میں لے کر غلاموں کی طرح پیچھے کھڑا ہو گیا۔ سلطان نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا: "میں چنگیز خاں کے خاندان کو تباہ کرنا چاہتا ہوں تم اس کام میں میرا ساتھ دو گے؟" مولانا نے فرمایا: "ان شاء اللہ" سلطان نے کہا: یہ شک کا کلمہ ہے۔ مولانا نے جواب دیا: مستقبل کے لیے یہی استعمال ہوتا ہے۔ یہ سُن کر سلطان کو غصہ آ گیا لیکن اس نے غصہ پر قابو پاتے ہوئے کہا: ہمیں کچھ نصیحت کیجیے۔ مولانا نے فرمایا: غصہ کو نگل جاؤ۔ سلطان نے پوچھا کس غصہ کو؟ مولانا نے جواب دیا: غضب سبعی (یعنی جانوروں کے غصہ کو) سلطان کے چہرے سے غصے کے آثار ظاہر ہونے لگے، لیکن اُس نے مولانا کی شان میں گستاخی کی جرأت نہ کی۔ اس کے بعد کھانا منگوایا گیا اور سلطان نے ایک ہی طباق میں مولانا کے ساتھ اس طرح کھانا کھایا کہ ہڈیوں سے گوشت چھٹا کر اُن کے سامنے رکھتا رہا۔ مولانا نے نہایت ناخوشی اور کراہت سے تھوڑا کھانا کھا کر ہاتھ دستر خوان سے اُٹھا لیا۔ رخصت کرتے وقت سلطان نے ایک صوف کا جامہ اور ایک تھیلی پیش کی۔ شیخ اس کو قبول کرنا نہیں چاہتے تھے اور غالباً یہی انکار ان کی سزا کا سبب بن جاتا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ منع کریں، قطب الدین دبیر نے خلعت اور تھیلی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ محمد بن تغلق نے بعد کو قطب الدین دبیر کو اس حرکت پر نہایت سختی سے ڈانٹا اور کہا:

"اے مزوّرِ روشکال این چہ حرکتہا بود کہ کردی، اول کفشہائے فخر الدین را زیر بغل گرفتی بعدہٗ جامہ و سیم او خود بستدی و او را از تیغ من خلاص دہانیدی و بلائے او بر خود گرفتی"[1]	اے مکار اور حیلہ باز! یہ کیسی حرکتیں تو نے کی تھیں اول تو تو نے فخر الدین کے جوتے بغل میں مار لیے بعدہٗ اُن کی خلعت اور چاندی اپنے ہاتھ میں لے لی اور میری تلوار سے اُنہیں بچا دیا اور اپنے اوپر اُن کی بلا لے لی۔

[1] سیر الاولیاء ص ۲۷۳۔ مولانا جمالی نے شیخ فخر الدین زرادیؒ کی جگہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا نام لکھا ہے۔ (نظامی۔ ابن الفضل ص ۹۵-۹۶)

قطب الدین دبیر نے جواب دیا: وہ میرے اُستاد اور میرے مخدوم کے خلیفہ ہیں، میرا فرض ہے کہ ان کی جوتیاں سر پر رکھوں۔ سلطان کو غصہ آگیا اور کہنے لگا:

"ایں اعتقاد ہائے کفر آمیز را بگذار والا ترا خواہم کشت" [۱]	ان کفر آمیز اعتقادوں کو چھوڑ دے ورنہ تجھے مار ڈالونگا۔

جب سلطان نے علما و مشایخ کو دیوگیر بھیجنا شروع کیا، تو مولانا فخر الدین زرادیؒ کو بھی یہ سفر اختیار کرنا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے ان صوفیہ کو مکمل آزادی دی تھی کہ وہ دیوگیر میں اپنی مخصوص رسوم کو جس طرح چاہیں ادا کریں۔ سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ ایک رات دولت آباد میں "حوض سلطان" کے کنارے مولانا فخر الدین زرادیؒ نے محفل سماع مرتب کی۔ مسعود سحر خواں نے خسروؒ کے اشعار ایسی خوش الحانی سے پڑھے کہ مولانا پر وجد و گریہ کی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ ہلاکت کے قریب پہنچ گئے۔ لیکن دولت آباد کی فضا میں اُن کا دل نہ لگا، اور وہاں سے خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوگئے، واپسی میں اُن کا جہاز غرق ہوگیا اور وہ واپس ہندوستان نہ آسکے [۲]۔

شیخ قطب الدین منورؒ اور سلطان

شیخ قطب الدین منور، شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے پوتے اور شیخ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ تھے۔ ہانسی میں ان کی خانقاہ مرجعِ خلائق تھی۔ محمد بن تغلق نے ایک مرتبہ دو گاؤں کا فرمان قاضی کمال الدین صدر جہاں کی معرفت اُن کی خدمت میں بھیجا تھا لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا [۳]۔ جب سلطان ہانسی کی طرف گیا تو شیخ حسن برہنہ کو بھیجا کہ شیخ کو دربار میں لے کر آئیں۔ شیخ قطب الدین منورؒ نے ان سے پوچھا کہ اس معاملہ میں مجھے اختیار دیا گیا ہے یا نہیں۔ حسن برہنہ نے بتایا کہ حکم شاہی ہے کہ آپ کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ شیخ نے فرمایا: "الحمد للہ کہ میں اپنے اختیار سے بادشاہ کے پاس نہیں جاتا" اہل خانہ کو خدا کے سپرد کیا اور کندھے پر مصلّی ڈال، ہاتھ میں لکڑی لے پیادہ پا روانہ ہوگئے۔ جب اپنے والد

---

[۱] سیر الاولیا، ص ۲۷۳ [۲] ایضاً ص ۲۷۵ [۳] ایضاً ص ۲۵۰-۲۵۱

اور دادا کے مزارات سے گزرے تو کہنے لگے: میں آپ کے بتلائے ہوئے گوشہ اور اپنے گھر سے خود اپنی مرضی سے نہیں نکلا ہوں بلکہ بادشاہ کے بھیجے ہوئے آدمی مجھے کشاں کشاں لیے جاتے ہیں۔ مجھے سوائے اس کے کسی بات کا افسوس نہیں کہ چند بندگانِ خدا کو بے خرچ اور بغیر کسی بھروسہ کے چھوڑے جاتا ہوں" روضہ سے باہر آئے تو ایک شخص نے کچھ فتوح پیش کی۔ آپ نے قبول کر کے فرمایا: "میرے گھر والے بے خرچ ہیں اُن کو پہنچا دو" جب شاہی خیمے کے قریب پہنچے تو سلطان اُنہیں اپنے سامنے طلب کر کے دہلی روانہ ہو گیا۔ دہلی میں شیخ نے فیروز سے ملاقات کی اور کہا کہ ہم درویش لوگ ہیں بادشاہوں کی مجلس میں جانے کے آداب نہیں جانتے۔ تم جو بتاؤ وہ کیا جائے۔ فیروز نے مشورہ دیا کہ بادشاہ کی خدمت میں تواضع اور نرمی سے پیش آئیں۔ شیخ اپنے بیٹے شہزادہ نورالدین کے ساتھ دربار میں پہنچے۔ شہزادہ پر درباری کروفر کا ایسا اثر ہوا کہ جسم میں لرزہ طاری ہو گیا۔ شیخ نے اُن کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: بابا نورالدین! العظمۃ والکبریاء للہ۔ جب محمد بن تغلق سے ملاقات ہوئی اور اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو آپ نے اس طرح سے اس کا ہاتھ دبایا کہ وہ آپ کی روحانی عظمت کا قائل ہو گیا۔ سلطان نے شکایت کی کہ ہانسی میں وہ اس سے ملاقات کے لیے کیوں نہیں آئے۔ شیخ نے کہا کہ یہ درویش اس قدر وقعت نہیں رکھتا کہ بادشاہوں کی ملاقات کو جائے لیکن

درگوشہ بدعاگوئی بادشاہ و کافہ اہل اسلام مشغول می باشد معذور می باید داشت"	ایک گوشہ میں بادشاہ اور مسلمانوں کے لیے دعاگوئی میں مصروف رہتا ہے۔ اُسے حاضری سے معذور رکھنا چاہیے۔

سلطان کا دل اُن کی طرف سے صاف ہو گیا۔ اور اس نے فیروز اور ضیاء الدین برنی کو ایک لاکھ تنکے دے کر اُن کی خدمت میں بھیجا۔ بڑے اصرار کے بعد شیخ نے دو ہزار تنکہ قبول کیے اور فرمایا

سبحان اللہ درویش را دو سیر کھچڑی دانگی سیر	سبحان اللہ! درویش کو صرف دو سیر کھچڑی اور

روغن کفاف باشد او ہزار ہا چہ کند[1] ایک دانگ گھی کفایت کرتا ہے، وہ ہزاروں لے کر کیا کرے گا۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور سلطان شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ[2] فردوسیہ سلسلہ کے سب سے زیادہ معروف بزرگ تھے۔ 'آداب طریقت' اور 'اسرار حقیقت' کو جس انداز سے اُنھوں نے اپنے مکتوبات میں سمجھایا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ محمد بن تغلق کو اُن سے بڑی عقیدت تھی۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ سلطان نے ایک جاگیر بھی پیش کی تھی، جو اس وقت تو شیخ نے قبول کر لی، لیکن بعد کو فیروز شاہ کو واپس کر دی۔ معدن المعانی سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے ایک بار دہلی سے اُن کے لیے ایک مصلائے بلغار بھیجا تھا[3]۔ عبد الرحمان چشتی نے لکھا ہے کہ

"سلطان محمد (ابن) تغلق شاہ فرمان باسم	سلطان محمد بن تغلق نے حاکم بہار مجد الملک کے نام
مجد الملک حاکم بہار فرستاد کہ خانقاہ	فرمان بھیجا کہ شیخ شرف الدین کے خدام کے لیے
سنگین برائے خدام شیخ شرف الدین	پتھر کی خانقاہ بنوائی جائے۔ کہتے ہیں کہ ابھی
عمارت کند و گویند کہ تا امروز ہماں	تک خانقاہ کی وہی عمارت ہے۔
عمارت خانقاہ برپا ست[4]"	

شیخ شرف الدین پانی پتیؒ اور سلطان غیاث الدین تغلق کی شیخ سے عقیدت کا ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن تغلق کو بھی اُن سے عقیدت تھی۔ ایک بار سلطان نے ان کو یہ رباعی لکھ کر بھیجی تھی ؎

گہ راست کند صورت مردمی زنی ۔۔۔ گہ بشکند ایں طلسم جادو وطنی

کس نیست کہ استاد قضا را پرسد ۔۔۔ کز بہر چہ سازی و چرا می شکنی

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۲۵۵

[2] حالات کے لیے ملاحظہ ہو: اخبار الاخیار، ص ۱۱۶-۱۲۱، گلزار ابرار (قلمی)، مراۃ الاسرار (قلمی) ص ۶۹۲-۶۹۹۔

[3] معدن المعانی ص ۷۱، ۳

[4] مراۃ الاسرار (قلمی نسخہ) ص ۶۹۶۔

شیخ شرف الدینؒ نے جواب دیا۔

شرطست کہ درامرِ قضادم تزنی — ایں نوع کہ گفتی نہ تو مردی نزنی

گل راچہ مجال است کہ پرسد زکلال — کزبہرچہ سازی وچرامی شکنی[1]

بعض صوفیہ ومشائخ کے قتل — محمد بن تغلق نے بعض صوفیہ اور مشائخ کو نہایت سخت سزائیں دی تھیں۔ ان سزاؤں کا بڑا سبب حکومت کی پالیسی سے عدم تعاون تھا سلطان ایسی صورت میں غصہ سے بھڑک اٹھتا تھا اور اس کی سزائیں شرعی حدود سے تجاوز کرجاتی تھیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) شیخ شہاب الدین بن شیخ احمد جامؒ[2] اپنے عہد کے مشہور بزرگ تھے۔ چودہ چودہ دن تک برابر روزہ رکھتے تھے۔ سلطان قطب الدین اور غیاث الدین اُن سے ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ محمد بن تغلق نے کوئی خدمت اُن کے سپرد کرنی چاہی تو اُنھوں نے انکار کیا۔ سلطان نے دربار عام میں بالمشافہ اُن سے کہا لیکن انھوں نے پھر بھی انکار کردیا سلطان غصہ سے بھڑک اُٹھا اور شیخ ضیاءالدین سمنانی کو ان کی داڑھی نوچنے کا حکم دیا شیخ سمنانی نے انکار کیا تو اُن کی بھی داڑھی نچوادی۔ پھر شیخ شہاب الدین کو دولت آباد بھیج دیا گیا۔ سات برس کے بعد سلطان نے انہیں واپس بلایا اور اُن کی بڑی تعظیم کی اور عاملوں سے بقایا وصول کرنے کا کام اُن کے سپرد کیا۔ بعد کو اُن کے مراتب میں اور اضافہ کردیا گیا۔ امراء

---

[1] ہفت اقلیم بحوالہ اورینٹل کالج میگزین۔ فروری ۱۹۲۵ء ص ۶۶۔

[2] یحیی سرہندی نے ان کا نام شیخ زادہ جامی لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اُنھوں نے سلطان کا ظلم یہ بتایا تھا، "ہر کہ را سیاست میکنی حق یا ناحق العہدۃ علیک۔ اما ایں کہ زن و فرزندان او را گرفتہ بہ جلادان می سپاری تا ایشاں را بفروشند، ایں چنیں ظلم وستم در کدام مذہب آمدہ است (تاریخ مبارک شاہی ص ۱۱۶) یہ اعتراض صحیح نہیں تھا اور غالباً اسی بناء پر سلطان غصہ سے باہر ہوگیا تھا۔ کسی معاصر مورخ نے یہ نہیں لکھا کہ سلطان نے بچوں اور عورتوں کو بھی سزائیں دی تھیں۔

اُن کے پاس سلام کو جایا کرتے تھے اور "بادشاہ کے گھر میں بھی کوئی شخص اُن سے اعلیٰ عہدے پر نہ تھا" جب سلطان سرگ دواری چلا گیا تو وہ اجازت لے کر دہلی ہی میں رہنے لگے۔ بادشاہ نے شہر سے چھ میل کے فاصلے پر ایک بڑا بنجر رقبہ اُن کو دے دیا۔ اُنھوں نے ایک بڑا غار کھدوایا اور اُس کے اندر گھر، گودام، تنور اور حمام تعمیر کرائے۔ اور دریائے جمنا میں سے ایک نہر کاٹ کر زمین کو آباد کیا۔ اُن کے خادم دن میں زمین کا کام کرتے تھے اور رات کو مع مویشی کے غار کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتے تھے۔ بعد کو جب سلطان نے انھیں طلب کیا تو انھوں نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس ظالم بادشاہ کی خدمت ہرگز نہ کرونگا۔ سلطان نے انھیں پکڑوا کر بلوایا اور ظالم کہنے کا سبب پوچھا۔ شیخ نے اس کے مظالم گنوائے اور خصوصیت کے ساتھ دہلی کے باشندوں کو دیوگیر لے جانے کا ذکر کیا۔ سلطان نے اپنی تلوار نکال کر صدر جہاں کے ہاتھ میں دی اور شیخ سے کہا کہ مجھے ظالم ثابت کرو اور میری گردن اس تلوار سے اُتار دے۔ شیخ نے کہا کہ جو شخص تجھ پر ظالم ہونے کی شہادت دیگا وہ خود قتل کیا جائیگا، لیکن تو خوب جانتا ہے کہ تو ظالم ہے۔ محمد بن تغلق نے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پیروں میں بیڑیاں ڈلوادیں۔ شیخ نے چودہ دن تک کچھ نہ کھایا۔ سلطان نے کھانا بھجوایا تو انھوں نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ میرا رزق تو زمین سے اُٹھ گیا ہے۔ سلطان نے اُن کے مُنہ میں زبردستی گوبر ڈلوایا اور پھر قتل کرا دیا۔[۱]

(۲) شیخ شمس الدین ابن تاج العارفین، کوئل میں رہتے تھے اور بڑے زاہد و عابد تھے سلطان جب کوئل گیا تو اُن کو ملنے کے لیے بُلایا، لیکن وہ نہ آئے۔ سلطان خود گیا تو کہیں چلے گئے۔ بعد کو سلطان کو معلوم ہوا کہ اُنھوں نے ایک باغی امیر کی ان الفاظ میں تعریف کی تھی کہ وہ بادشاہی کے لائق ہے۔ سلطان نے کچھ دنوں اُنھیں قید رکھا۔ پھر اُنھیں، اور اُن کے بیٹوں کو قتل کرادیا۔[۲]

۱؎ عجائب الاسفار ص ۱۳۷-۱۳۹ ۲؎ ایضاً ص ۱۴۶-۱۴۷

ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں اسی طرح کی چند مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ ان بزرگوں کے قتل کا سبب یہی تھا کہ وہ سلطان کے کاموں اور منصوبوں میں نہ صرف اس کی مدد کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے بلکہ جب موقع ملتا تھا تو باغیانہ عناصر کے ساتھ مل کر سلطان کے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہو جاتے تھے[1]

تعمیر مزارات محمد بن تغلق نے اپنے دورِ حکومت میں کئی مشہور بزرگوں کے مزارات تعمیر کرائے۔ بدایوں میں میراں ملہمؒ، دہلی میں شیخ نظام الدین اولیاؒ، ملتان میں شیخ رکن الدین ملتانی اور اجودھن میں شیخ علاء الدین کا مزار اسی نے بنوایا تھا۔ میر ملہم شہید بدایوں کے قدیم ترین بزرگوں میں تھے۔ ان کا شمار سید سالار مسعود غازیؒ کے رفیقوں میں ہوتا تھا[2]۔ سلطان محمد نے ان کا مزار از سرِ نو تعمیر کرایا اور اس پر یہ کتبہ لگایا:

"اتممت عمارۃ جدید فی عھد سلطان الاعظم ابوالمجاھد فی سبیل اللہ محمد بن تغلق شاہ السلطان ناصر امیر المؤمنین خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و اعلیٰ امرہ و شانہ المعمار محمد سلطانی یوم احدی الثامن من ربیع الآخر سنہ ۷۲۸ھ"[3]

ہر چند کہ شیخ نظام الدین اولیاء کی مرضی نہ تھی کہ اُن کو کسی عمارت کے نیچے دفن کیا جائے لیکن محمد بن تغلق نے اُن کے روضہ پر ایک عالی شان گنبد تعمیر کرا دیا[4]۔ شیخ رکن الدین ملتانیؒ کو شیخ بہاء الدین زکریا کی پائنتی کو دفن کیا گیا تھا، لیکن محمد بن تغلق نے قلعہ کے شمالی دروازہ کے پاس اُن کے لیے علیحدہ روضہ تیار کرا دیا۔ شیخ علاء الدینؒ کا جب انتقال ہوا تو لوگوں نے اجودھن سے کشمیر تک

"از غایت محبت و اعتقاد مقامہا ساختہ ۔ ۔ ۔ و قبرہا کردہ"

محمد بن تغلق نے اجودھن میں اُن کے روضہ پر ایک عالی شان گنبد تعمیر کرایا[5]۔ جہاں تک

---

[1] شیخ حیدری کے قتل کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے کھمبایت کی بغاوت میں قاضی جلال افغانی سے سازش کر لی تھی۔ عجائب الاسفار ص ۱۴۷، ۱۴۸۔ [2،3] کنز التاریخ (تاریخ بدایوں) از مولوی رضی الدین بسمل ص ۵۱۔
[4] سیر الاولیاء ص ۱۵۴ [5] ایضاً ص ۱۹۶۔ و نیز ص ۱۹۳

مزارات پر حاضری کا تعلق ہے، تاریخ میں صرف سید سالار مسعود غازیؒ کے مزار پر اس کے حاضر ہونے کا حال ملتا ہے۔ برنی نے لکھا ہے:

"در بہرائچ رفت و سپہ سالار مسعود شہید را کہ از غزاۃ سلطان محمود سبکتگین بود، زیارت کرد و مجاوران روضۂ او را صدقاتِ بسیار داد"[۱]	بہرائچ گیا اور سپہ سالار مسعود شہید کے مزار کی جو سلطان محمود سبکتگین کے غزاۃ میں سے تھے زیارت کی اور مجاوروں کو بہت سے صدقات دیے۔

خلافت سے تعلقات خلافت سے تعلقات کے سلسلہ میں جب ہم سلطان محمد بن تغلق کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو دو مختلف دور نظر آتے ہیں۔ پہلا دور ابتداء عہد سے ۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء تک دوسرا ۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء سے اختتام عہد تک۔ پہلے دور میں سلطان نے خلافت کو تقریباً نظر انداز کر دیا تھا[۲] دوسرے دور میں سلطان نے خلافت سے جس عقیدت کا اظہار کیا وہ سلاطین اسلام کی تاریخ میں یقیناً عدیم النظیر ہے۔

پہلے دور کے سکوں پر خلیفہ کا نام نہیں ملتا۔ اس کی بجائے خلفاء راشدین کے نام، آیات قرآنی اور کلمۂ طیبہ وغیرہ کندہ ہیں۔ بعض سکوں پر "واللہ الغنی وانتم الفقراء"[۳] بعض پر "محیی سنن خاتم النبیین"[۴] بعض پر "الملک والعزۃ للہ"[۵] کھدا ہوا ہے۔ ۷۳۰-۳۱-۳۲ھ میں جو سکے دیوگیر سے جاری ہوئے اُن پر "من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمٰن" (جس نے سلطان کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی)، "اطیعوا اللہ، اطیعوا الرسول واولی الامر منکم"، "لا یولّٰی السلطان کل الناس بعضہم بعضاً" وغیرہ کلمات اور آیات کندہ ہیں[۶]۔ دیوگیر کے سلسلہ میں جو عام مخالفت پیدا ہو گئی تھی اس کو شاید سلطان فرائض مذہبی کی یاد دلا کر

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۹۱، نیز عجائب الاسفار۔ ص ۱۸۲۔ [۲] خلافت سے بالکل قطع تعلق کر لینے کا خیال صحیح نہیں۔ اس زمانہ کے سکوں پر گو خلیفہ کا نام نہیں ملتا لیکن عمارتوں پر "ناصر امیر المومنین" لکھا ہوا ملتا ہے۔ مثلاً ۷۲۸ھ کا کتبہ مزار میر ملہم بدایونیؒ [۳] Nelson Wright p. 122;

N. Wright p. 120 ; Thomas p. 215 [۴] Thomas p. 211-216.

[۵] N. Wright p. 143 ; Thomas p. 249-250, [۶] N. Wright p. 120

ختم کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال اس دور کے کسی سکہ پر عباسی خلیفہ کا نام نہیں ملتا۔

دوسرے دور میں جو ۷۴۱ھ سے شروع ہوتا ہے، سلطان کے خیالات میں بڑی زبردست تبدیلی ہوگئی تھی۔ اس زمانہ کے اکثر سکوں پر صرف خلیفہ کا نام کندہ ہے سلطان کا کہیں ذکر نہیں[۱]۔ سلطان کے خیالات میں اس تبدیلی کا کیا سبب تھا؟ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ جب مسلمانوں کے مذہبی حلقوں، بالخصوص علماء و مشائخ میں سلطان کے خلاف بے چینی پیدا ہوگئی اور عوام بھی اس سے متاثر ہوکر سلطان سے برگشتہ ہونے لگے تو اُس نے خلیفہ سے منشور حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ اس طرح مذہبی حلقہ کی مخالفت کو ختم کرسکے۔ ممکن ہے کہ اس منشور کو وہ سیاسی حربہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہو، لیکن معاصر مورخین اور تذکرہ نویسوں نے خلیفہ سے تعلقات کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے خلوص اور عقیدت ٹپکتی ہے۔

برنی نے لکھا ہے:-

"در خاطر افتاد کہ سلطنت و امارت سلاطین بے امر و اذن خلیفہ درست نیست و ہر بادشاہے کہ بے منشور خلفاء عباسی بادشاہی کردہ است و یا بادشاہی کند، متغلب بودہ است و متغلب بود"[۲]	اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ سلطنت و امارت بغیر خلیفہ کی اجازت کے درست نہیں اور ہر وہ بادشاہ جس نے بغیر خلفاء عباسی کی اجازت کے بادشاہی کی ہے یا بادشاہی کریگا متغلب رہا ہے اور رہوگا۔

سیرت فیروز شاہی کے مصنف کا بیان ہے کہ "بکثرت مطالعہ کتب" کے باعث سلطان کی یہ رائے قائم ہوگئی تھی[۳]۔ تاریخ الفی میں لکھا ہے کہ سلطان کے اُستاد قتلغ خاں نے یہ بات اس کے ذہن نشین کرادی تھی کہ خلیفہ کی اجازت کے بغیر حکومت جائز نہیں۔

---

[۱] N. Wright p.149-152; Thomas.p.259-60

[۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۹۱ [۳] سیرت فیروز شاہی۔ ورق ۱۳۹۔

تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ ہونے کے بعد مصر میں ازسرِنو خلافت کا نظام قائم کیا گیا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ ممالک اسلامیہ سے اتنے تعلقات ہونے کے باوجود محمد بن تغلق کو اس سلسلہ میں کافی تحقیقات کرنی پڑی۔ برنی کا بیان ہے کہ

"از خلفاء عباسی سلطان از مسافران	سلطان خلفاء عباسی کے متعلق مسافروں سے
بسیار تتبع می کرد تا از بسیار مسافران شنید	بہت تحقیق کرتا تھا یہاں تک کہ اُس نے بہت
کہ خلیفہ از آل عباس در مصر بر خلافت	سے مسافروں سے سُنا کہ آل عباس کا خلیفہ
متمکن است"	مصر میں خلافت پر متمکن ہے۔

غالباً سرگ دواری قیام کے دوران میں سلطان کو یہ اطلاع ملی اور اس نے مع اعوان و انصار دولت "خلیفہ مصر سے بیعت کرلی۔ اور ایک عرضداشت اس کی خدمت میں ارسال کی جس میں بقول برنی "از ہر بابت چیزہا دراں می نوشت"۔ دہلی آنے کے بعد سلطان نے نماز جمعہ و عیدین بند کرا دی اور سکوں سے اپنا نام دور کرا دیا۔

۷۴۴ھ / ۱۳۴۳ء میں جب حاجی سعید صرصری کی سرکردگی میں مصر کے دربار خلافت سے خلعت اور فرمان آیا تو سلطان نے شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔ بدر چاچ نے لکھا ہے۔

باستقبال فرمانے کہ از پیشِ امام آمد
برہنہ پا و سر کردہ چوں ایماں شد اسلامش

خلائق پیش و پس پویاں، ملائک ذکرِ حق گویاں
ز جزع شہ شدہ غلطاں گہر بر نقرہ خامش

امیر المومنیں فرمود تا ہر جمعہ بر منبر
بہ ہفت اقلیم می خوانند شاہنشاہ اسلامش[1]

ایک اور قصیدہ میں لکھا ہے۔

جبرئیل از طاق گردوں البشر گویاں رسید
کز خلیفہ سوئے سلطاں خلعت و فرماں رسید

ملک را بازو قوی شد، دیں سرافرازی نمود
شرع را حرمت فزوں شد، رونق ایماں رسید

[1] قصائد بدر چاچ ص ۱۴۱ - بدر چاچ کے کئی اور قصیدے اس سلسلہ میں مطالعہ کے قابل ہیں۔ لکھا ہے کہ مخالفین اس منشور سے بدحواس ہو گئے تھے ؎

حسودِ ملک را دیدم ز روئے غم پس افتادہ
پریشاں حال و شوریدہ چو گیسوئے دلآرامش

دردِ اسلامی کہ در سر داشت شاہنشاہِ عصر   از ولی المسلمین ایں درد را درماں رسید[1]

مصنف سیرت فیروز شاہی کا بیان ہے کہ اس کے بعد

"ہمچنیں متواتر ہر سال مناشیر دار الخلافۃ   اسی طرح ہر سال دار الخلافہ سے منشور
می رسید"[2]   آتے تھے۔

محمد بن تغلق کا یہ عالم تھا کہ خلیفہ کا نام سُن کر ایک نئی جان اس میں پیدا ہو جاتی تھی[3]۔ اور بقول برنی راستہ میں چوروں اور ڈاکوؤں کا ڈر نہ ہوتا تو سلطان نے سارا خزانہ مصر بھیج دیا ہوتا[4]۔

خاندان عباسی سے سلطان کی عقیدت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو ابنِ بطوطہ نے بیان کیا ہے۔ خلیفہ مستنصر باللہ کے سلسلہ کا ایک عباسی خلیفہ زادہ جس کا نام غیاث الدین تھا، کسی سبب سے ترکستان چلا آیا، اور وہاں حضرت قثم بن عباس رضؓ کے مزار پر سالہا سال تک مجاور رہا جب سلطان کی خاندانِ عباسیہ سے عقیدت کا آوازہ پھیلا تو غیاث الدین نے ترکستان سے اپنے دو سفیر سلطان کے پاس بھیجے۔ بغداد کے جو لوگ ہندوستان میں مقیم تھے انہوں نے خلیفہ زادہ کی صحیح النسبی کی شہادت دی۔ سلطان نے بڑی منت سے خلیفہ زادہ کو ہندوستان بلایا۔ جب وہ ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا تو امراء کو استقبال کے لیے بھیجا جب سرستی تک سواری پہنچی تو قاضی القضاۃ صدرِ جہاں کمال الدین غزنوی اور دوسرے علماء استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ جب دہلی سے باہر مسعود آباد میں پہنچا تو سلطان نے خود پیادہ پا ہو کر اس کی رکاب تھامی۔ بڑے تزک و احتشام سے خلیفہ زادہ کی سواری دہلی میں داخل ہوئی سلطان نے مخدوم زادہ خطاب دیا اور شاہی مہمان رکھا۔ جب کبھی غیاث الدین دربار میں آتا تو سلطان تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ ایک مرتبہ سلطان کی کوئی بات غیاث الدین کو ناگوار ہوئی تو سلطان نے

---

[1] قصائد بدر چاچ ص ۱۵۔   [2] سیرت فیروز شاہی ورق ۱۴۰
[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۹۶   [4] ایضاً ص ۴۹۳

اس انداز سے معافی مانگی: "مخدوم زادہ! مجھے اپنی برأت کا اس وقت تک یقین نہ آئیگا جب تک یہ پائے مبارک میری گردن پر نہ ہو" خلیفہ زادہ نے کہا: "مجھ سے تو یہ نہیں ہوسکتا" تو سلطان نے خود اپنا سر زمین میں ڈال کر اس کا قدم اپنی گردن پر رکھا۔ ابن بطوطہ کا خیال ہے کہ یہ ایسا عجیب وغریب واقعہ ہے جو کسی بادشاہ کے متعلق سننے میں نہیں آیا۔[1]

مقامات مقدسہ سے عقیدت

محمد بن تغلق نے بیرون ہند کے بعض اہم مذہبی مرکزوں سے بھی عقیدت کا اظہار کیا اور وہاں کے مذہبی طبقوں سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔ مسالک الابصار میں لکھا ہے کہ اس نے بغدن کے ہاتھ ایک کروڑ تنکے عراق کے مقامات مقدسہ میں تقسیم کرنے کے لیے بھیجے تھے۔[2]

بہبودیٔ خلق اور رفاہ عام کے کام

محمد بن تغلق نے رفاہ عام کے لیے جو کام کیے اُن کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں لیکن ان کوششوں کا ذکر ضروری ہے جو اس نے قحط کے زمانہ میں اور اس کے بعد لوگوں کی وقتی امداد اور زراعتی حالت کو مستقل ٹھیک کرنے کے لیے کی تھیں۔ دہلی میں چھ مہینے تک "کل باشندوں کو بلا تمیز چھوٹے بڑے یا غلام و آزاد کے"[3] اشیاء خوردنی تقسیم کی گئیں۔ فقیہ اور قاضی محلے محلے جا کر حاجتمندوں کی فہرستیں تیار کرتے تھے۔[4] علاوہ ازیں خانقاہوں کے ذریعہ کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ زراعت کو ترقی دینے کے لیے تقریباً ستر لاکھ تنکے سوندھار (تقاوی) کے طور پر تقسیم کیے گئے تھے۔ تیس کروڑ رقبہ کی اس طرح کاشت کا انتظام کیا گیا تھا کہ ایک بالشت زمین تک "بے زراعت" نہ رہے۔ برنی نے لکھا ہے:

وسلطان دراز دیاد زراعت اسلوبہا	اور سلطان زراعت کی ترقی کے لیے "اسلوب" ایجا
اختراع میکرد، ہرچہ دراز دیاد زراعت	کرتا تھا۔ جو کچھ زراعت کی ترقی کے سلسلہ میں

---

[1] عجائب الاسفار ص ۱۲۰-۱۲۱، محمد بن تغلق نے خلیفہ سے جس عقیدت کا اظہار کیا اور اس کے نمائندوں کو جس طرح خوش آمدید کہا اس کی تفصیل درکار ہو تو تاریخ فیروز شاہی (ص ۴۹۱-۴۹۶) قصائد بدر چاچ (ص ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۲۰) اور سیرت فیروز شاہی (ورق ۱۴۰-۱۴۱) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

[2] مسالک الابصار۔ ص ۳۳-۳۴۔ [3][4] عجائب الاسفار۔ ص ۱۳۳۔

درتصور سلطان میگذشته و درقلم می آمد آں را	سلطان کے ذہن میں آتا تھا اور لکھ لیا جاتا تھا،
اُسلوب نام می شد که اگر آں اسالیب	اس کو اسلوب کہتے تھے۔ اگران اسلوب متصورہ
متصوره واقع شدی وخلق را از محالات	پر عمل ہو جاتا اور لوگوں کو وہ ناممکنات میں
لاممکن نمودی از ازدیاد زراعت و	نہ معلوم ہوتے تو زراعت کو بے حد ترقی ہوتی
حیثیت زراعت جہاں پر از نعمتہائے	اور زراعت کی ایسی حالت ہو جاتی کہ دنیا
گوناگوں گشتے" ۱؎	نعمتہائے گوناگوں سے بھر جاتی۔

سلطان نے دہلی میں بھیک مانگنے پر پابندی لگا دی تھی۔ فقیروں کو حکومت کی طرف سے مدد دی جاتی تھی۔ اس طرح حکومت تقریباً چالیس ہزار غربا کی مدد کرتی تھی۲؎۔ دہلی میں ستر شفاخانے مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے قائم تھے۳؎۔

سلطان کا انتقال

تتہ کے قیام کے زمانہ میں سلطان کو بخار آیا۔ بیماری کی حالت میں اُس نے یوم عاشورہ کا روزہ رکھا اور افطار میں مچھلی کھائی جس سے مرض میں اضافہ ہو گیا۔ گیارہ دن کی علالت کے بعد ۲۱ محرم ۷۵۲ھ (مطابق ۲۰۔ مارچ ۱۳۵۱ء) کو دارالسلطنت سے سیکڑوں کروہ دور داعی اجل کو لبیک کہا۴؎۔ حالت نزع میں یہ اشعار موزوں کیے تھے ۵؎

بسیار دریں جہاں چمیدیم	بسیار نعم و ناز دیدیم
اسپانِ بلند بر نشستیم	ترکانِ گرانبہا خریدیم
کردیم بسے نشاط آخر	چوں قامتِ ماہ نو خمیدیم ۵؎

مذہبی حلقوں میں چونکہ اس کے خلاف شدید برگشتگی اور بیزاری تھی، اس لیے اس کی موت کے

۱؎ تاریخ فیروزشاہی ص ۴۹۸۔ اس نے فصلوں کی تبدیلی (Rotation of Crops) کا طریقہ رائج کیا تھا "ہرچہ زراعت شود آں را تبدیل کنند چنانچہ حنطہ بجائے جو کارند و بجائے حنطہ نیشکر کارند..." اور ایک دیوان امیر کوہی کے نام سے قائم کیا تھا جو زراعت کی ترقی کے لیے کوشش کرتا تھا۔

۲؎ مسالک الابصار۔ ص ۳۹۔ ۳؎ ایضاً مسالک الابصار۔ ص ۲۴

۴؎ تاریخ فیروزشاہی ص ۵۲۵ ۵؎ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۴۴

متعلق طرح طرح کے بے سروپا افسانے مشہور ہو گئے۔[1] جو شخص اس کی موت پر خون کے آنسو رویا وہ اس کا ندیم ضیاء الدین برنی تھا جس نے سترہ سال تک اس کے قریب رہتے ہوئے بھی اس سے نفرت کی تھی۔ اس کے لکھے ہوئے مرثیے کے ایک ایک شعر سے سوزِ دل کی بُو آتی ہے ؎

مایۂ زہر است شربِ عالم را　　میوۂ مرگست تخمِ آدم را
اے حریفِ عدم قدم در نہ　　کم زن ایں عالمِ کم از کم را
صبحِ محشر دمید ما در خواب　　بانگ زن خفتگانِ عالم را
ہاں کہ فرشِ فنا بگستردند　　درنوراں بساطِ خرم را
رستخیز است خیز باز شگاف　　سقفِ ایوان طاقِ طارم را
شہ محمد بخفت در دلِ خاک　　نیلگوں کن لباسِ ماتم را
پس بدست خروش بر تنِ دہر　　خاک زن ایں قبائے معلم را[2]

سلطان کو سندھ سے دہلی لاکر دفن کیا گیا۔[3] فیروز شاہ نے تخت نشینی کے بعد تمام ان لوگوں کے ورثاء سے جن کو سلطان نے سزائیں دی تھیں، روپیہ اور جاگیریں دے کر معافی نامے لکھوائے

---

[1] جوامع الکلم ص ۱۷۶، سبع سنابل ص ۶۴-۶۷

[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۲۵-۵۲۶۔ برنی نے سلطان محمد کی وفات پر جو کچھ لکھا ہے اس میں شدید ذاتی نقصان کا احساس بھی شامل ہے حقیقت میں محمد بن تغلق کے ساتھ اس کی خوشی اور فارغ البالی کا دور بھی ختم ہو گیا تھا

[3] پروفیسر محمد شفیع نے سہسوان کے دو کتبوں کی بناء پر (جو آگے فیروز شاہ کے تعمیر مزارات کے سلسلہ میں نظر سے گزرینگے) یہ رائے ظاہر کی ہے کہ محمد بن تغلق "سہسوان میں مدفون ہے نہ کہ دہلی میں" (اورنٹیل کالج میگزین فروری ۱۹۳۵ء ص ۱۵۰) ڈاکٹر داؤد پوتا نے ان کی رائے سے اتفاق کیا ہے (تاریخ معصومی ص ۴۱-۴۲) بلوچ نبی بخش نے اس خیال کی تردید کی ہے اور فتوحات فیروز شاہی کے بیان کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ محمد بن تغلق دہلی میں دفن کیا گیا تھا۔ سہسوان میں اُس کی نعش کچھ دنوں کے لیے امانتاً رکھ دی گئی تھی (اسلامک کلچر جنوری ۱۹۴۸ء ص ۱۷-۴۳) ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ محمد بن تغلق کو دہلی میں دفن کیا گیا تھا۔ اس خیال کی تائید صاحب سیر الاولیاء اور تاریخ مبارک شاہی کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔

اور ان سب کو ایک صندوق میں بند کر کے اس کی قبر کے سرہانے رکھدیا[1]۔ خود فتوحات میں لکھتا ہے:

"از حضرتِ ذوالجلال وقادر پر کمال ایں بندۂ عاصی توفیق یافت کہ اشخاصیکہ در عہد خدایگاں مغفور و مرحوم محمد شاہ السلطان طاب ثراہ کہ خداوندگار و مخدوم و مربی من بود بہ تقدیر اللہ تعالیٰ کشتہ شدہ بودند، وکسانے کہ اعضائے ایشاں از چشم و بینی و دست و پا ناقص گشتہ، ورثۂ ایشاں از قبل بادشاہ مرحوم مغفور استرضا نمودہ وہریکے را بہ اموال راضی نمودہ، خطوط خوشنودی موکد بہ شہود دستند، در صندوق کردہ بہ دارالامان مقبرۂ سلطان مغفور مرحوم نوراللہ مرقدہٗ جانب سر داشتہ تا حق تعالیٰ بہ کرم عمیم خویش آں مخدوم و مربی مارا غریقِ رحمت گرداناد"[2]

اس گناہگار بندہ نے اللہ تعالیٰ سے یہ توفیق پائی کہ سلطان محمد مرحوم ومغفور کے عہد میں جو میرے آقا، مخدوم اور مربی تھے، بہ تقدیر اللہ تعالیٰ جو لوگ قتل ہوئے تھے یا جن کے اعضاء مثلاً آنکھ ناک، ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے تھے، میں نے ان کے وارثوں سے بادشاہ مرحوم ومغفور کے حق میں (فرد) خوشنودی حاصل کی اور ہر ایک کو مال دے کر راضی کیا اور ان سے خوشنودی کے ایسے خطوط حاصل کیے جن پر معتبر گواہوں کی تصدیق تھی۔ ان کو ایک صندوق میں کر کے دارالامان میں جہاں سلطان مرحوم کا مقبرہ ہے، سر کی جانب رکھ دیا۔ تاکہ حق تعالیٰ اپنے عام کرم سے میرے ان مخدوم و مربی کو غریق رحمت کرے۔

---

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس صندوق کو قبر کے سرہانے دفن کردیا گیا تھا۔ اسی خیال کے زیر اثر آثار قدیمہ کے ایک مشہور مسلمان افسر نے ان کاغذات کی تلاش میں قبر کے سرہانے کا کافی حصہ کھدوایا بھی تھا۔ فتوحات میں "جانب سر داشتہ" الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے دفن کرنے کا مفہوم اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ سیرت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط باہر رکھے ہوئے تھے، لکھا ہے: آں خطوط را در صندوق کردہ طرف سر قبر سلطان مغفور... داشتند، ایں معنی ہمہ را مشاہدہ و معلوم وایں خطوط آنجا موجود دلیل ظاہر است بر صحت ایں حال و صدق ایں مقال" (ورق ۷۷)

[2] فتوحات فیروز شاہی ص ۱۶؛ نیز ملاحظہ ہو سیرت فیروز شاہی ورق ۷۶-۷۷۔

"نامرادانہ زیست" کی اس سے بڑی اور کیا مثال ہوگی کہ جب تخت پر بیٹھا تو "پدرکش" کہلایا، جب تک جیا "ظالم" اور "بے دین" ہونے کے طعنے سُنے، مرا تو قبر پر معافی نامے رکھ کر اس کی تشہیر کی گئی! تاریخِ ہند میں اس کی جگہ متعین کرتے وقت نظر اس ناکامی پر نہیں بلکہ اس جذبہ پر ہونی چاہیے جو اس ناکامی کا سبب بنا تھا!

باب یازدہم

سلطان فیروز شاہ تغلق

ہندی قرونِ وسطیٰ کے جس سلطان نے اپنی مذہبیت کا سب سے زیادہ گہرا نقش معاصرین کے ذہن پر چھوڑا وہ فیروز شاہ تھا۔ علماء و مشائخ، عوام و خواص سب ہی اس کے مذہبی جذبات اور دینداری کے قائل تھے۔ شیخ قطب الدین منورؒ تو یہ کہا کرتے تھے کہ:

"سلطان فیروز شیخے است از مشائخ طریقت کہ تاجِ بادشاہی بر سر دارد"[1]
سلطان فیروز تو مشائخ طریقت میں سے ایسا شیخ ہے جو سر پر تاج بادشاہی رکھتا ہے۔

عفیف نے اس کو نہ صرف "اولیائے حضرت الٰہ"[2] میں شمار کیا ہے بلکہ اس کو "خصال انبیا"[3] کا حامل بتایا ہے اور اس کے ہر کام کو "بالہام الٰہ"[4] قرار دیا ہے۔ مطہر نے اس کو "نائبِ رسول"، "مہدی عصر"، "عیسی مختار" وغیرہ القاب سے یاد کیا ہے[5]۔ برنی نے سلاطین دہلی میں اس کو سب سے اونچا مرتبہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ دہلی کی فتح کے بعد نہ فیروز شاہ سے زیادہ پاکیزہ اعتقاد کا کوئی بادشاہ ہندوستان کے تخت پر بیٹھا[6]۔ نہ کسی نے "ایثار احکام شرع" کے لیے اس کے برابر جد و جہد کی[6]۔ حد یہ ہے کہ برنی اس کے ایک امیر کی تعریف کرتے ہوئے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۲۲-۲۳، لیکن جب اس تنقید کی طرف توجہ کرتے ہیں جو شیخ نے سلطان کی شکار اور شراب میں دلچسپی کے سلسلہ میں کی تھی تو خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ الفاظ غلط طور پر شیخ سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ عفیف ص ۷۹۔ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۹۵۔ [3] ایضاً ص ۲۷۷

[4] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۷ وغیرہ

[5]
وآں نائب رسول کہ در ہر فضیلتے — ادرا خدائے نادرۂ روزگار کرد
مہدی عہد توی عیسی مختار توی — حاتم جود توئی حیدر کرار توی

دیوان مطہر (اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۵ء ص ۱۳۰)

[6] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۴۸-۵۵۲-۵۶۱۔

کہنے لگتا ہے ؎

ادہم بر کار جبرئیل است ‌ ‌ ‌ ‌ در پیش خدایگاں کیہاں[1]

اس بلند آہنگی سے تعریف کرنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ فیروز کی شخصیت کے گرد افسانوں کا ایک جال بن دیا گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کے متعلق "ظہور کرامات" اور "خرق عادات" کی داستانیں تاریخوں تک میں راہ پا گئیں[2]۔ فیروز کی مذہب میں دلچسپی اپنی جگہ پر مسلم ہے، لیکن معاصرین و متاخرین نے جس والہانہ انداز میں اس کے مذہبی افکار کی مدح و ستایش کی ہے، اس سے نہ فیروز شاہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے نہ اس کے عہد کو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مبالغہ آمیز بیانات ہمارے تاریخی زاویۂ نگاہ میں ایک دھندلا پن سا پیدا کر دیتے ہیں اور ہمارا ذہن تجزیہ کے قابل نہیں رہتا۔ مذہبی افکار کی تاریخ میں فیروز شاہ کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ان تمام بیانات سے قطع نظر کرنا ضروری ہے تاکہ ماحول کی روشنی میں اس کی اعتقادی زندگی کے بنیادی پہلوؤں اور نظامِ حکومت پر اُن کے اثرات کا صحیح جائزہ لیا جا سکے۔ اس سلسلہ میں چند حقائق ذہن میں رکھنے چاہئیں۔

(۱) برنی نے اپنی کتاب فتاوائے جہانداری، فیروز شاہ کے عہد میں مرتب کی۔ فکری اعتبار سے اس کتاب کا ماحصل یہ ہے کہ نظام حکومت شریعت کے مطابق نہیں چلایا جا سکتا اور بادشاہوں کو مجبوراً بعض ایسے ضوابط بنانے پڑتے ہیں جو شریعت کی رو سے جائز قرار نہیں دیے جا سکتے، لیکن جہانداری اُن کے بغیر ممکن نہیں ـــــ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کے عہد میں (جس کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نظام حکومت شریعت کے مطابق تھا) کیوں برنی کی فکر ان وادیوں میں گشت کر رہی تھی؟ اگر واقعی شرعی نظام حکومت موجود تھا تو پھر برنی کے ذہن میں کس چیز نے یہ ہیجان پیدا کیا تھا کہ تمام اُس تعریف کے باوجود جو برنی نے تاریخ فیروز شاہی

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۷۸ ۔ [2] سیرت فیروز شاہی ورق ۱۴۰، ۱۴۱ ۔ فرشتے فیروز شاہ کی مدد کرتے ہیں، دریائے کوسی اس کو راہ دے دیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

میں فیروز کی کی ہے۔ وہ اس بات کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر رہا تھا کہ فیروز شاہ کا نظام حکومت بھی شریعت کے مطابق نہیں ہے!!

(۲) عہد فیروزی کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس وقت سماج کا ہر طبقہ آسودہ اور خوش حال تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس دور کا لٹریچر افسردگی اور قنوطیت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ جس طبقہ کو لیجیے، خواہ وہ علماء کا ہو یا مشایخ کا، ادیبوں کا ہو یا شاعروں کا، حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے نا اُمید ملیگا۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے ملفوظات کے صفحے کے صفحے اُلٹ جائیے۔ دل برداشتگی، نا اُمیدی اور گہرے غم کی عجیب کیفیت نظر آئیگی۔ عہد علائی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں کس قدر ارزانی تھی، کتنے لنگر شہر میں چلتے رہتے تھے[۱] لیکن عہد فیروزی میں ـــ

ایں زماں نہ آں لنگرداراں ونہ آں	اس زمانہ میں نہ وہ لنگردار ہیں نہ وہ لوگ باقی
بندگاں ماندہ اند، ہمہ خراب شدند[۱]	رہے ہیں۔ سب خراب ہوگئے۔

ایک شخص شیخ نصیر الدین چراغ سے تنگی روزگار کی شکایت کرتا ہے اور شیخ نظام الدین اولیاء کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ اُن کی مدد سے ایک شخص کو ملازمت مل گئی تھی۔ شیخ جواب میں فرماتے ہیں:

مولانا! دراں وقت معتقداں بسیار بودند	مولانا! اس وقت معتقدین بہت تھے۔
ایں زماں بہ کہ تواں گفت، صبر می باید کرد[۲]	اس زمانہ میں کس سے بات کہی جائے بس صبر کیجیے۔

پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ کے ایک حاکم کی رعایا کی بہبودی کے لیے جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ـــ

"پادشاہاں پیشیں را ہر کوشش کہ بود	پہلے بادشاہوں کی جو کوشش تھی وہ رعایا کی
در پروردن رعیت بود"[۳]	پرورش کے لیے تھی۔

عہد فیروزی کا ایک شاعر عابد کہتا ہے ـــ

---

[۱] خیر المجالس ص ۱۸۵ [۲] ایضاً ص ۲۴۰ [۳] ایضاً ص ۱۳۹

دوستاں گویند عابد باچنیں طبعِ لطیف | چیست کاشعار و غزل از تو فراواں برنخاست
ما کر اشعر و غزل گوئیم چوں در عہدِ ما | شاہدِ موزوں و ممدوحے زر افشاں نماند

عہدِ فیروزی میں یہ مایوسی آخر کن حالات نے پیدا کردی تھی؟

(۳) پچھلے صفحات میں ہم بتا آئے ہیں کہ محمد بن تغلق کے عہد میں خانقہی نظام ڈھیلا پڑ گیا تھا نظام کی اس کمزوری کا ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ تصوف کے وہ افکار جو خواص تک محدود رہتے تھے عوام تک پہنچ گئے۔ نخشبی نے کہا تھا:

"رموزِ عشق را بیان کردن حرام است"[۱]

لیکن جب وہ نظام ہی ابتر ہو گیا تو پھر ان "رموزِ عشق" کو دل میں چھپا کر کون بیٹھ سکتا تھا! اس زمانہ میں ایک طرف تو شیخ اکبر محیی الدین ابن عربیؒ کی تصانیف ہندوستان کے مشائخ اور صوفیہ کے مطالعہ کا مرکز بن گئیں اور مطہر کی طرح ہر شخص کا حال یہ ہو گیا کہ

کتابے ز ہر فن بنزدیک من | نہادہ چو گنجینۂ گوہری
ز عرفاں عوارف ز وجداں فصوص | ز وعظ و نصائح کتاب سری[۲]

دوسری طرف شیخ علی ہمدانیؒ[۳]، ابو المحاسن شرف الدین دہلویؒ[۴]، سید محمد گیسو درازؒ وغیرہ نے فصوص الحکم کی شرحیں لکھ کر اس کے خیالات کو عام کر دیا۔ تیسری طرف اس عہد کے بعض اہل قلم نے جن میں مسعود بکؒ[۵] اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ[۶] خاص طور پر قابل ذکر ہیں، وحدت الوجود کے

---

[۱] سلک السلوک ص ۴۶۔ [۲] دیوان مطہر (اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۳۵ء ص ۱۹۹) ہندوستان میں شیخ اکبر کے اثرات پر ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "شیخ اکبر اور ہندوستان" مطبوعہ برہان جنوری ۱۹۵۰ء

[۳] کشمیر کے مشہور و معروف بزرگوں میں تھے۔ ایران سے کشمیر آ گئے تھے اور وہیں ۱۳۸۴ء میں وصال فرمایا۔ کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ شرح فصوص الحکم کے علاوہ اُن کی ایک اہم تصنیف ذخیرۃ الملوک ہے جس میں اخلاق و سیاست کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔ باب پنجم اور ششم میں سلطنت اور خلافت سے متعلق دلچسپ گفتگو ہے۔ اخوند درویزہ نے اپنی کتاب مخزن الاسلام میں اس سے کافی مدد لی ہے۔

[۴] ۱۳۹۲ء میں انتقال ہوا۔ ان کی عین الفصوص شرح الفصوص کا نسخہ آصفیہ کتب خانہ حیدر آباد میں ہے (جلد نمبر ۲، ۳)

[۵] شیخ رکن الدین بن شہاب الدین امام کے مرید اور فیروز شاہ کے رشتہ دار تھے۔ ایک دیوان اور ایک کتاب مرآۃ العارفین یادگار چھوڑی ہے۔ گفتگو کا عنوان وحدت الوجود ہے۔ شیخ عبد الحق لکھتے ہیں: "در سلسلۂ چشتیہ ہیچ کس (باقی بر صفحہ ۳۸۹)

خیالات کو اپنے اشعار اور تصانیف میں عوام تک پہنچانا شروع کر دیا۔ ان حالات میں ناممکن تھا کہ انا الحق کی صدائیں بلند نہ ہو جاتیں۔ فیروز شاہ کے افکار میں ان عصری میلانات کا عمل اور ردعمل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!

(۴) فیروز شاہ کے عہد میں فقہی علوم سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا گیا تھا۔ محلات شاہی سے لے کر مدرسوں تک فقہ کی گرم بازاری تھی۔ متقدمین کی تصانیف پر حاشیے لکھے جا رہے تھے اور فتاویٰ کی نئی کتابوں کی تدوین کا کام زور شور سے جاری تھا۔[۱] درباری زندگی سے متعلق علماء نے "فتاوئے جہانداری" کی طرف توجہ کی تھی تو صوفیہ نے "فتاوائے صوفیہ"[۲] کی طرف۔ فقہ اور تصوف کے درمیان جس کشمکش کا پہلا اظہار غیاث الدین تغلق کے عہد میں ہوا تھا وہ فقہ کی کامیابی کی صورت میں اب ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ گو فیروز شاہ نے تصوف اور فقہ دونوں کا اثر قبول کیا تھا لیکن وحدت الوجودی تحریکوں کو روکنے کے لیے اس کو فقہاء کی طرف زیادہ جھکنا پڑا۔ فیروز کی مذہبی فکر میں تصوف اور فقہ کے اثرات کو علیحدہ علیحدہ دیکھنا ضروری ہے!

(۵) فیروز کے بہت سے افکار و اعمال صرف محمد بن تغلق کی پالیسی کے ردعمل کے پس منظر میں مطالعہ کیے جا سکتے ہیں۔ اپنے پورے دور حکومت میں اس کی یہ کوشش رہی کہ تمام ان طبقوں کی جنہیں محمد بن تغلق نے ناراض کر دیا تھا، ہمدردیاں حاصل کی جائیں اور انہیں حکومت کی پالیسی میں مکمل تبدیلی کا یقین دلایا جائے۔ ممکن ہے کہ محمد بن تغلق کی قبر میں معافی نامے رکھنے کا جذبہ بالکل مذہبی ہو، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس

(بقیہ صفحہ ۳۸۸) ایں چنیں اسرار حقیقت فاش نگفتہ و مستی نکردہ کہ او کردہ" (اخبار الاخیار ص ۱۶۹)

[۶] شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں وحدت الوجود کے مسائل نہایت عالمانہ اور پرتاثیر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اپنے بعض مکتوبات کا عام ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ اخبار الاخیار ص ۱۱۷۔

(نوٹ صفحہ ہذا) [۱] ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "علوم فقہ آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں" مطبوعہ رسالہ "دار العلوم" اگست ۱۹۵۳ء

[۲] شیخ فضل اللہ بن محمد بن ایوب المعروف بہ ماجو کی تصنیف ہے۔ وہ سہروردی سلسلہ کے بزرگ تھے۔ اس کتاب میں فقہاء کے عام مسلک سے ہٹ کر اظہار رائے کیا گیا تھا، اسی بنا پر ابن کمال

طرح اس نے لوگوں پر یہ بات واضح کردی کہ نئی حکومت محمد بن تغلق کی سزاؤں کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ ان معافی ناموں کو حاصل کرنا محمد بن تغلق کی پالیسی کی شدید ترین مذمت کے مترادف تھا۔ علاوہ ازیں لاکھوں روپیہ جو سوندھار (تقاوی) کے طور پر محمد بن تغلق نے تقسیم کیا تھا، ڈرامائی انداز سے معاف کردیا گیا۔ گذشتہ عہد میں غیر ملکی اور ملکی امراء اور علماء میں کافی کشیدگی رہی تھی۔ محمد بن تغلق غیر ملکی علماء اور امراء کی بہت عزت کرتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے ملک میں بدنام اور غیر ممالک میں مشہور ہوگیا تھا۔ فیروز نے اس پالیسی کو تبدیل کیا اور سندھ کے قیام کے دوران میں ہی یہ بات پورے طور پر واضح کردی۔ سیوستان میں ہرو، سیستان، مصر، عدن وغیرہ مقامات سے لوگ آئے ہوئے تھے اور ملک میں داخل ہونے کی اجازت کے منتظر تھے، فیروز شاہ نے اُن کو روپیے دے کر "بجانب اوطان قدیم باز گردانید"[1] کاشتکار ہوں یا تاجر، امراء ہوں یا اجارہ دار، صوفیہ ہوں یا علماء، اس نے سماج کے ہر طبقہ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ محمد بن تغلق کی پالیسی غلط تھی اور نیا سلطان اس میں مکمل تبدیلی کا ارادہ رکھتا ہے!

(۶) چودھویں صدی میں مسلمانوں کے معاشرہ پر ایک انحطاطی رنگ چھا گیا تھا۔ اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑگئی تھی۔ مذہب میں توہمات نے راہ پالی تھی۔ قبر پرستی اور پیر پرستی نے تصوف کی بنیادوں کو منہدم کردیا تھا۔ اباحتی فرقے اپنے افکار و نظریات کے پھیلانے میں سرگرم تھے۔ بدعات و احداث کا ہر طرف ہنگامہ تھا۔ یہی حال ہندو سوسائٹی کا بھی تھا اس عہد کے بعض مناد ر بقول ڈاکٹر ایشور ٹوپا، شیطانیت کے مرکز تھے، اور مذہب سے اُن کا کوئی تعلق نہ رہا تھا ـــــ ان عام سماجی اور مذہبی حالات نے فیروز شاہ کی مذہبی فکر کو بیحد متاثر کیا۔ مسلمانوں کے بعض فرقوں کے ساتھ اس کا برتاؤ اور ہندوؤں کے چند منادر کا انہدام اسی ماحول کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۵۳۸۔

[2] Politics in Pre Mughal Times p. 246 247

ابتدائی زندگی

فیروز کے بچپن ہی میں اُس کے باپ رجب کا انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ غازی ملک نے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ ملتان اور دیبالپور قیام کے زمانہ میں غازی ملک اکثر صوفیہ اور مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، فیروز کو بھی اپنے ساتھ لے جایا کرتا[1] جب غیاث الدین تغلق (غازی ملک) کا انتقال ہوا تو اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ محمد بن تغلق نے نائب امیر حاجب مقرر کر دیا۔ اس حیثیت میں اُسے اُن علماء و مشائخ سے ملاقات کا اکثر موقع ملا جو دربار میں خود آتے یا طلب کیے جاتے تھے[2]

تخت نشینی

جس وقت محمد بن تغلق کا ٹھٹھ میں انتقال ہوا، ملک کے عام حالات بے حد نازک تھے۔ شاہی لشکر دار السلطنت سے دور تھا اور ملک کے مختلف حصوں میں بدامنی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ ایسی صورت میں تخت کو زیادہ عرصہ تک خالی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے، جو اس وقت ٹھٹھ میں موجود تھے، فیروز کو ایک پیغام بھیجا کہ

"با ایں خلق عدل و انصاف خواہی کرد یا برائے ایں مشتے مسکیناں والیِ دیگر از اللہ تبارک و تعالیٰ التماس کردہ آید"[3]

اس خلق کے ساتھ تم عدل و انصاف کا برتاؤ کرو گے یا اس "مشتے مسکیناں" کے واسطے کسی دوسرے والی کی اللہ تبارک تعالیٰ سے گزارش کروں

فیروز نے اچھے سلوک کا وعدہ کیا تو شیخ نے اُسے دعائے خیر دی[4]۔ عفیف نے ایک روایت یہ بھی بیان کی ہے کہ فیروز تخت نشین ہونے کے لیے آمادہ نہ تھا اور کعبہ جانے کا ارادہ کر رہا تھا[5]۔ مخدوم زادہ عباسی، شیخ الشیوخ مصری، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی وغیرہ نے نہ صرف یہ ذمہ داری قبول کرنے پر اصرار کیا بلکہ زبردستی تخت پر بٹھا دیا[6]

تخت پر قدم رکھنے سے پہلے فیروز نے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی اور سجدہ میں سر

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۲۷-۲۸ [2] سیر الاولیاء ص ۲۵۴۔
[3] [4] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۲۹۔ لکھا ہے کہ شیخ نے اُسے اُنتالیس کھجوریں بھیجی تھیں جس سے اس کی مدت حکومت کا اظہار مقصود تھا۔ [5] تاریخ فیروز شاہی ص ۴۷۔
[6] تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۵۳۵-۵۳۶۔

ڈال کر بارگاہ ایزدی میں دعا مانگی۔[1] مطہر نے لکھا ہے ؎

اوّل کہ پائے بر سرِ تختِ گیاں نہاد　　شکر و سپاس حضرت پروردگار کرد[2]

سندھ سے دہلی کا سفر | تخت نشینی کے بعد فیروز شاہ لشکر شاہی کے ساتھ دہلی روانہ ہوا۔

اس سفر سے اس نے پورا فائدہ اُٹھایا اور اُن تمام خانوادوں اور خانقاہوں سے روابط قائم کر لیے جن کے گزشتہ دور میں حکومت سے تعلقات بگڑ گئے تھے۔ سیوستان میں چند دن قیام کیا۔ وہاں کے مشایخ کے مزارات پر گیا اور "فقراء و مسافران و غرباء و مساکین" کو صدقات دیے۔[3] پھر بھکر آیا۔ اور یہاں بھی فقراء و مساکین کو ادرارات اور انعامات پیش کیے اور مزارات مشایخ پر حاضری دی۔[4] یہاں سے اُچھ پہنچا۔ وہاں شیخ جمال الدینؒ کی خانقاہ کو "کہ حکم اندراس گرفتہ بود" از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کی اور اُن کے بیٹوں کو گاؤں اور باغات پیش کیے۔[5] اسی زمانہ میں خواجہ جہاں کے متعلق اطلاع ملی کہ اس نے ایک لڑکے کو محمد بن تغلق کا بیٹا مشہور کر کے دہلی کے تخت پر بٹھا دیا ہے۔ سلطان فیروز نے ایک محضر ترتیب دیا جس میں شیخ نصیر الدین محمود اودھیؒ، مولانا کمال الدین اودہی، مولانا کمال الدین سامانہ، مولانا شمس الدین باخرزی اور دیگر علماء و اکابر نے شرکت کی۔ سلطان نے اُن سے دریافت کیا کہ اس صورت میں "از روئے شرع مرا چہ باید کرد" شریعت کی رو سے مجھے کیا کرنا چاہیے۔

مولانا کمال الدین نے جواب دیا:

"ہر کہ در اول شروع سلطنت کردہ اولیٰ تر است"[6]

یہ متفقہ فتویٰ حاصل کر لینے کے بعد فیروز آگے بڑھا اور دیپالپور میں چند دن قیام کیا۔ پھر اجودھن کا رُخ کیا۔ یہاں بابا فرید گنج شکرؒ کے مزار پر حاضر ہوا۔ اور بقول برنی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی عفیف۔ ص ۴۷　　[2] اورینٹل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۳۵ء ص ۱۳۰۔

[3] تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۵۳۸　　[4][5] تاریخ فیروز شاہی۔ برنی ص ۵۳۸-۵۳۹

[6] طبقات اکبری جلد اول ص ۲۲۷۔ نیز تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۱۲۱-۱۲۲

"آں خانوادۂ بزرگوار کہ بکلی پریشان شدہ بود از سرِ نو ملتئم و منتظم گردانید"[1]

اُن بزرگوار کا خانوادہ جو بالکل منتشر ہو گیا تھا ہو سرے سے جوڑا اور منظم کیا۔

شیخ علاء الدین رح کے پوتوں کو خلعتیں، جاگیریں، زمینیں وغیرہ دیں اور باشندگانِ اجودھن کو کثرت سے صدقات تقسیم کیے[2]۔ اس کے بعد لشکر شاہی سرستی پہنچا۔ یہاں "بقالان و صرافان" نے لاکھوں روپیے سلطان کو نذر کیے اور اس رقم سے فوج کی تنخواہیں ادا کر دی گئیں[3]۔

سرستی ہی میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح نے سلطان سے کہا:

"از تھتہ تا ایں مقام دعاگوئے درگاہ از حضرت الٰہ التماس کردہ۔ بکرم حق پادشاہ با جمیع بنگاہ و لشکر ہواخواہ سلامت رسیدہ ازیں جا بیشتر حد ولایت خدمت شیخ الاسلام قطب الانام شیخ قطب الدین منور است۔ ۔ ۔ بخدمت ایشاں نبشتہ می باید فرستاد"[4]

تھتہ سے یہاں تک اس دعاگوئے درگاہ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بادشاہ معہ خزانہ، لشکر اور متعلقین خیریت سے پہنچ گئے۔ یہاں سے شیخ الاسلام شیخ قطب الدین منور کی ولایت کی حد ہے اُن کی خدمت میں لکھ کر بھیجنا چاہیے۔

فیروز نے یہ ساری کیفیت ہانسی لکھ بھیجی۔ شیخ قطب الدین منور رح نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے اُمید ہے کہ دہلی

"بر شما خواہد آمد"[5] تمہارے پاس آئیگی

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب فیروز دہلی کے قریب پہنچا تو "خواص و عوام، علماء و مشایخ و صوفیان و قلندران و حیدریان و بازرگان و سوداگران و حمتران و ساہان و صرافان و برہمنان شہر"[6] جوق در جوق اس کے استقبال کے لیے آئے اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ ساری دہلی ہی

۱؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۵۴۳ ۲؎ ایضاً ص ۵۴۳ ۳؎ تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۶۱

۴؎ ۵؎ تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۶۱-۶۲ ۶؎ تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۵۴۶

اس کے خیر مقدم کے لیے نکل آئی ہے۔

دہلی جاتے ہوئے فیروز چند دن ہانسی میں بھی ٹھہرا تھا۔ اور لشکر کے ساتھ شہر کی چہار دیواری کے باہر قیام کیا تھا۔ محمد بن تغلق کی طرح اس نے شیخ قطب الدین منورؒ کو دربار میں طلب نہیں کیا، بلکہ خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جمعہ کا دن تھا۔ شیخ نماز کی نیت سے خانقاہ سے باہر نکل رہے تھے۔ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا جبہ پہنے ہوئے تھے اور دروازہ تک پہنچ گئے تھے کہ فیروز شاہ کی سواری پہنچی۔ شیخ نے مصافحہ کے بعد کہا کہ نماز جمعہ کی نیت سے باہر آیا ہوں۔ اب کس نیت سے واپس اندر جاؤں! مقصد یہ تھا کہ نماز جمعہ سے قبل ملاقات کے لیے نہ آنا چاہیے تھا۔ پھر دروازہ پر کھڑے کھڑے بادشاہ کو چند نصیحتیں کیں۔ فرمایا:

"بابا دعاگو شنیدہ است کہ شمارا میل	بابا! دعاگو نے سنا ہے کہ تمہیں شراب پینے
برائے خوردن شراب بسیار است اگر	کی طرف بہت رغبت ہے۔ اگر بادشاہ اور
سلاطین و امامان دین در خوردن شراب	امامان دین شراب پینے میں مشغول ہو جائیں
مشغول شوند حاجات حاجتمندان	تو ضرورتمندوں کی حاجت روائی بند
مستمند بستہ بماند" [1]	ہو جائے!

فیروز نے وعدہ کیا کہ آئندہ شراب نہیں پیے گا۔ پھر شیخ نے فرمایا:

"بابا دعاگو شنیدہ است کہ شمارا برائے	بابا! دعاگو نے سنا ہے کہ تمہیں شکار مارنے کی
تاختن شکار ہوس بسیار و کوشش	بیحد ہوس ہے اور اس کام میں بے حد کوشش
بے شمار است [2]۔ دنبال شکارے جہانے	کرتے ہو۔ اس شکار کے پیچھے ایک عالم کو پریشانی

[1] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۷۹

[2] فیروز شاہ کو شکار سے بیحد دلچسپی تھی۔ سیرت فیروز شاہی (ورق ۵۰-۵۲-۱۷۸) اور عفیف کی تاریخ فیروز شاہی (ص ۳۱۵-۳۲۹) میں تفصیل سے اس کا ذکر ہے۔ وہ "شیر و ماہی پرند و چرند و درند" ہر جاندار کا شکار کرتا تھا۔ جانوروں کی پہچان میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ شکار کے کچھ ہتھیار بھی ایجاد کیے تھے (سیرت ورق ۱۷۸) اور ایک کتاب شکار نامہ فیروز شاہی "بارشاد و امداد" مرتب کرائی تھی (سیرت ورق ۵۰)، سلطان محمد بن تغلق اس کی شکار میں حد سے (باقی برصفحہ ۳۹۵)

راسر گردانی و عالمے را حیرانی است ۔ اور سرگردانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات
این نوع نیکو نیست ۔ جانے را بے فائدہ ٹھیک نہیں۔ کسی جاندار کی بے فائدہ جان
بے جان کردن مستحسن نیست "[1] لینا اچھا نہیں ہے۔

فیروز شاہ نے جواب دیا کہ شیخ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے باز رکھے۔ یہ سُن کر شیخ کا مزاج برہم ہوگیا۔ بلند آواز سے فرمایا:

"سبحان اللہ! منکر دعائے ما"

پھر اسی جملہ کو دہراتے ہوئے فرمایا۔

"منکر دعائے ما ہمچنین است ۔ نمی گوید ہماری دعا کا منکر ایسا ہے، یہ نہیں کہتا کہ میں
کہ توبہ کردم" نے توبہ کی۔

اور مسجد کی طرف چلدیے۔ سلطان نے ایک "لبادہ شوستری" بھیجا۔ شیخ نے اپنے بیٹے شیخ نورالدین سے پوچھا "از جنس محرمات است یا از قسم مشروعات" جب یہ معلوم ہوا کہ محرمات میں سے ہے تو پہننے سے انکار کردیا۔ شیخ نورالدین کو ڈر ہوا کہ کہیں یہ بات سلطان کو گراں نہ گزرے۔ اس وقت سلطان بیٹھا ہوا بھی ایسی جگہ تھا، جہاں سے وہ شیخ کو دیکھ سکتا تھا۔ شیخ نورالدین نے دو آدمیوں کو متعین کیا کہ لباچہ کی دونوں آستین پکڑ کر شیخ کے پیچھے اس طرح چلیں گویا شیخ اس کو پہنے ہوئے ہیں۔ تاکہ سلطان کی اگر نظر پڑے تو یہ خیال نہ ہو کہ شیخ نے اس کا لباچہ استعمال نہیں کیا۔ فیروز شاہ نے اس کو محسوس کرلیا۔ شیخ نورالدین کے پاس آدمی بھیجا اور کہلوایا کہ شیخ منور رح کو اس کی زحمت نہ دیں۔ وہ "پادشاہ دین" ہیں، نامشروع کپڑا کس طرح استعمال کرسکتے ہیں۔[2]

(بقیہ صفحہ ۳۹۴) زیادہ دلچسپی پر اعتراض کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا کہ یہ شخص تو "دنبال کنجشک ملک بباد دہد" (عفیف ص ۳۱۶)۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ایک رسالہ طب فیروز شاہی (نمبر ۱۶۰۷) موجود ہے جس میں باز کی بیماریوں اور اُن کے علاج کا ذکر ہے۔

(نوٹ صفحہ ہذا) [1] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۸۰ [2] ایضاً ص ۸۰ - ۸۱ ۔

عبادت میں انہماک | فیروز شاہ کی عبادت میں دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے عفیف لکھتا ہے:

سبحان اللہ زہے مشغولی کہ فیروز شاہ	سبحان اللہ! فیروز شاہ عبادت میں کیسی
داشت چند سورہ از کلام اللہ ہر روز	مشغولیت رکھتا تھا۔ ہر روز قرآن کی چند
خواندے و در روز جمعہ سورۂ کہف و	سورتیں پڑھتا تھا۔ جمعہ کے دن سورۂ کہف اور
در شب جمعہ سورۂ طٰہٰ بے ناغہ خواندے و	جمعہ کی رات میں سورۂ طٰہٰ بلا ناغہ پڑھتا تھا۔ اور
در ہر روز پنجگانہ با جمعیت و جماعت	ہر روز پانچوں وقت کی نماز با جماعت ادا کرتا
گزاردے۔"[۱]	تھا۔

تلاوت کرتے میں جہاں اسم اعظم اللہ آجاتا، فوراً ہاتھ چوم کر آنکھوں سے ملتا تھا۔[۲]

فقہ میں دلچسپی | فیروز شاہ کی مذہبی تعلیم کے متعلق معاصر تاریخوں میں کوئی تفصیل نہیں ملتی لیکن سیرت فیروز شاہی کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُسے علوم دینی بالخصوص فقہ میں بہت دلچسپی تھی۔ فقہی مسائل پر کامل عبور اور مذاہب اربعہ پر "استحضار تام" تھا۔[۳] اور

"اکثر کتب فقہ از بدایت تا نہایت	فقہ کی اکثر کتابیں شروع سے آخر تک انھوں
باستماع ہمایوں .... رسیدہ"[۴]	نے سُنی ہیں۔

اس نے کتب فقہ کی تدوین میں بھی گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ فتاوائے فیروز شاہی[۵] اُسی کے اشارہ پر ترتیب دی گئی تھی۔ یہ کتاب اصل میں مولانا صدر الدین یعقوب مظفر کرمانی رح نے تالیف کی تھی لیکن وہ اس کو مکمل کرنے سے قبل ہی وفات پا گئے اور ایک دوسرے عالم نے (جنہوں نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا) اس کو نظر ثانی اور اضافہ کے بعد مکمل کیا۔ اس میں فتاوائے صغیری، فتاوائے خانیہ، فتاوائے سراجیہ، ہدایہ، واقعات حسامیہ، واقعات ظہیریہ، ایضاح، ذخیرہ، واقعات حامیہ وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف

[۱،۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۷۸ [۳،۴] سیرت فیروز شاہی۔ ورق ۱۵۱۔

[۵] فتاوائے فیروز شاہی کا ایک قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی کے ذخیرۂ مخطوطات میں موجود ہے۔ نیز ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ انڈیا آفس نمبر ۲۵۶۴۔ فہرست کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ص ۴۹۹۔

نے اس کی تالیف میں کافی زحمت اُٹھائی تھی لیکن بایں ہمہ۔ یہ کتاب اپنے زمانہ کا فقہی کارنامہ نہ بن سکی۔ اور فتاویٰ تاتارخانیہ[1] کے سامنے اس کی کوئی حیثیت ہی نہ رہی۔ محمد غوثی شطاری نے لکھا ہے کہ فیروزشاہ کی خواہش تھی کہ مولانا عالم بن علاء[2] اس کتاب کو اس کے نام معنون کردیں لیکن اُنھوں نے تاتارخاں[3] کے احسانات کے پیش نظر ایسا کرنے سے انکار کردیا[4]۔ کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے ان کتابوں کی فہرست دی ہے جن سے اس کی تیاری میں استفادہ کیا گیا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کا خیال ہے کہ "فقہ حنفی کے حاویات، مبسوطات، مجامع، محیئون اور فتاویٰ کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس کا تتارخانیہ کے دیباچہ میں یہ کہتے ہوئے ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ تدوین کتاب میں فلاں فلاں کتابیں زیر نظر تھیں[5]" حد یہ ہے کہ آٹھویں صدی کے ہم عصر مصنفین کی کتابوں کے حوالے بھی اس میں درج ہیں۔

عقائد پر ایک کتاب مولانا شرف محمد العطائی نے فوائد فیروزشاہی[6] کے نام سے مرتب کرکے فیروزشاہ کے نام معنون کی تھی۔ یہ کتاب ۱۱۵ ابواب پر مشتمل ہے جن میں مذہب، اخلاق اور معاشرت کا تقریباً ہر پہلو زیر بحث آگیا ہے[7]۔ گو کتاب کی ترتیب متداول کتب فقہ سے

---

[1] قلمی نسخے دار الکتب مصریہ، کتب خانہ پشاور، کتب خانۂ رام پور، کتب خانہ بانکی پور وغیرہ میں موجود ہیں۔ کشف الظنون میں لکھا ہے کہ ایک ترکی عالم شیخ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم (المتوفی ۹۵۶ھ) نے اس کتاب کا انتخاب تیار کیا تھا۔ [2] ملاحظہ ہو گلزار ابرار (قلمی)، کشف الظنون جلد اول ص ۲۱۱۔ نزہت الخواطر ص ۷۰۔ محمد غوثی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ۷۷۷ھ میں مکمل ہوئی تھی۔

[3] مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ فیروزشاہی عفیف ص ۳۸۸۔ ۳۹۴، عفیف نے لکھا ہے کہ تاتارخاں نے ایک تفسیر تاتارخانی بھی مرتب کرائی تھی (ص ۳۹۲)

[4] گلزار ابرار (قلمی)۔ [5] مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت حصہ اول ص ۳۸۔

[6] اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے، لیکن کسی قدر ناقص ہے۔ دوسرے نسخ کے لیے ملاحظہ ہو: فہرست کتب خانہ بانکی پور جلد ۱۴۔ ص ۷۷۔ ۸۴، فہرست کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ص ۵۱۷۔ [7] چند ابواب کی سُرخیاں ملاحظہ ہوں: ۲۹ در درود رسول ونسب وحلیہ ومیلاد ووفات، ۶۹ بازی وشطرنج، ۸۶ درکلمات کفر ودرارتداد وحکم رنج کافر در دنیا ونیت تعظیم او، ۹۳-۱۳۴ درسحر وتصدیق کاہن۔ وغیرہ

مختلف ہیں لیکن خیالات میں کوئی خاص فرق نہیں ہے مصنف نے فقہ کی کتابوں کے علاوہ صوفیہ کی تصانیف مثلاً کشف المحجوب، رسالہ مولانا شمس الدین یحییٰ[1]، رسالہ حجۃ الاسلام زبدۃ الصالحین، اوراد شیخ بہاء الدین زکریا وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

علم نجوم میں دلچسپی فیروز شاہ کو علم نجوم میں گہری دلچسپی تھی۔ "منجمان دانا" اور "کاہنان باریک بیناں" سے وہ اکثر ستاروں کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا تھا[2]۔ اس علم پر اس کا وسیع مطالعہ تھا۔ اور کئی کتابیں بھی اس فن پر اس نے تصنیف کرائی تھیں۔ لکھا ہے:

"چندیں مصنفات ومولفات وقواعد آں بتالیف وتصنیف خاص مخصوص گشتہ وبا ملا وارشاد حضرت مسطور ومذکور است[3]"

صاحب سیرت فیروز شاہی نے علم نجوم میں اس کی دلچسپی کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے جس سے اس سلسلہ میں بھی اس کی مذہبی عظمت کا پہلو نکل آیا ہے۔ لکھتا ہے:-

"وانچہ از علم نجوم عامہ اہل اسلام را	اور عام مسلمانوں کو علم نجوم کے (جس حصہ کے)
از دانستن آں چارہ نیست و امرے	جانے بغیر چارہ نہیں اور جو بہت ضروری اور
ضروری وکلیست یکے معرفت سایہ	بنیادی کام ہے وہ سایہ کا علم ہے جو نماز
اصلی است کہ صحت دخول وقت	کے صحیح وقتوں کے تعین سے تعلق رکھتا ہے
صلوٰۃ بداں تعلق دارد آنرا بوفور حکمت	اس کا حساب حضرت سلطنت پناہ نے (اس
وکمال مہارت حضرت سلطنت پناہ	علم میں) اپنی پوری حکمت اور کمال کے ساتھ
خلد اللہ ملکہ .... حساب کردہ"[4]	کیا ہے۔

اس نے ایک اسطرلاب[5] ایجاد کیا تھا جو "اسطرلاب فیروز شاہی" کہلاتا تھا[6]۔ اس کو منارہ فیروز آباد

---

[1] مولانا شمس الدین یحییٰ کے رسالہ سے ذمیوں کے لباس کے متعلق ایک روایت نقل کی گئی ہے (ورق ۱۱۶)
[2] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۳۲۱۔ [3] سیرت فیروز شاہی ورق ۱۵۳۔ [4] ایضاً ورق ۱۵۹۔
[5] اسطرلاب کی نوعیت، مسلمانوں کی اس میں دلچسپی اور ہندوستان میں اس کے ماہرین کی تفصیلات کے لیے دیکھیے اسلامک کلچر جنوری ۱۹۳۵ء ص ۴۹-۵۳، اکتوبر ۱۹۳۵ء ص ۲۲۱-۲۳۱، جولائی ۱۹۳۶ء ص ۳۶۲-۳۸۱۔ [6] سیرت فیروز شاہی ورق ۱۵۳۔

پر نصب کیا گیا تھا۔

جوالا مکھی کے مندر میں فیروز شاہ کو نجوم پر ایک سنسکرت[1] کی کتاب ملی تھی جس کو اس نے عزالدین خالد خانی سے نظم میں ترجمہ کرایا۔ اس کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا گیا تھا۔ نظام الدین بخشی نے اس کا مطالعہ کیا تھا، اس کی رائے ہے۔

الحق کتابیست متضمن اقسام حکمت علمی و عملی"[2]

حدیہ ہے کہ بدایونی نے بھی اس کتاب کی تعریف کی ہے[3]۔ سجان رائے نے لکھا ہے کہ سلطان کو یہ کتاب بہت پسند آئی تھی اور اُس نے

"درصلۂ آں بسیارے نقود از طلا و نقرہ و جامہ و جاگیر مرحمت کرد"[4] | اس کے صلہ میں بہت سی نقدی سونے اور چاندی کی صورت میں اور جامہ و جاگیر عطا فرمائی

علم نجوم پر باراہمیر کی مشہور کتاب باراہی سنگھتا[5] کا بھی فیروز شاہ نے ترجمہ کرایا تھا۔ یہ کتاب نجوم کی اعلیٰ ترین کتابوں میں شمار کی جاتی تھی اور البیرونی جب ہندوستان آیا تھا تو اس نے بھی اس کا ترجمہ کیا تھا[6]۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اس کا نسخہ ترجمہ باراہی[7] کے نام سے اور مسلم یونیورسٹی کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں کتاب النجوم[8] کے نام سے موجود ہے۔ باراہمیر کی کتاب ۱۰۴ ابواب پر مشتمل تھی لیکن اس کے آٹھ باب (۴۱، ۴۲، ۴۶، ۴۷، ۵۴، ۵۶، ۵۷، ۵۸) ترجمہ میں اس بناء پر شامل نہیں کیے گئے تھے کہ اُن میں کفر آمیز خیالات کا اظہار کیا گیا تھا کتاب النجوم کے شروع میں لکھا ہے:-

ایں کتاب ترجمہ کردہ از ہندوی بفارسی امام ائمہ عبدالعزیز شمس تھانیسری مولف

---

[1] سیرت میں لکھا ہے "از ہندوی بزبان فارسی ترجمہ فرمودہ است" (ورق ۱۵۳) غالباً "ہندوی" سے یہاں سنسکرت ہی مراد ہے۔ [2] طبقات اکبری جلد اول ص ۲۳۴، [3] منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۴۹۔ [4] خلاصۃ التواریخ ص ۲۴۸۔ [5] اس کتاب کو Kern نے کلکتہ سے ۱۸۶۴ء میں شائع کیا تھا۔ اور ۱۸۷۰ء میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالہ میں چھپا تھا۔

[6] کتاب الہند، البیرونی ص ۲۰ [7] فہرست ص ۱۱۱۱-۱۱۱۲ نمبر ۱۹۹۷- [8] کتاب النجوم (نمبر ۵۲۶) ص ۱

تاریخ فیروز شاہی اصلح اللہ شانہ بر حکم و فرمان بادشاہ دین دار.... ابو المظفر فیروز شاہ.... ایں کتاب باراہی از نوادر کتب اہل ہند است"[۱]

فیروز شاہ کو فال میں بھی بہت اعتقاد تھا[۲]۔ ہر کام کے لیے قرآن میں فال دیکھتا تھا۔ حد یہ ہے کہ گورنروں کا تقرر تک فال دیکھ کر کیا جاتا تھا[۳]۔ علاوہ ازیں سلطان تعویذ گنڈوں میں بھی یقین رکھتا تھا۔ غالباً اسی دلچسپی کے پیش نظر عبد القوی المعروف بہ ضیار نے اپنی کتاب راحت الانسان اس کے نام معنون کی تھی۔ اس کتاب میں تین باب اور چوہتر فصلیں ہیں۔ بیشتر حصہ تعویذ گنڈوں، عملیات وغیرہ پر مشتمل ہے[۴]۔

گانے اور شراب کا شوق ہر چند کہ فیروز شاہ اتباع شریعت کا اتنا مظاہرہ کرتا تھا لیکن وہ شراب نوشی ترک کرنے پر قادر نہ ہو سکا۔ شیخ قطب الدین منورؒ نے اس سلسلہ میں اس پر تنبیہ کی تھی اور اس نے ترک کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا[۵]۔ لیکن یہ وعدہ شاید کبھی پورا نہیں ہوا۔ لکھنوتی کی دوسری مہم پر جب وہ روانہ ہوا تو تاتار خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایک دن "بعد از فراغ نماز و اوراد بامداد" اپنے خیمہ میں شراب پینا ہی چاہتا تھا کہ تاتار خاں آ گیا۔ سلطان نے جام و سبو کو پلنگ پر رکھ کر کپڑا ڈال دیا۔ تاتار خاں نے محسوس کر لیا اور باتوں ہی باتوں میں کہا کہ یہ توبہ و انابت کا وقت ہے۔ ان چیزوں کا نہیں ہے۔ سلطان نے جواب دیا کہ جب بواسیر کی تکلیف اُسے پریشان کرتی ہے تو وہ شراب پی لیتا ہے۔ تاتار خاں نے پھر کہا:

"ایں محل استغفار است، دریں چیزہا مشغول شدن نشاید" — یہ توبہ و استغفار کا موقع ہے۔ ان چیزوں میں مشغول ہونا نہیں چاہیے۔

اس پر سلطان نے قسم کھائی کہ جب تک تاتار خاں لشکر میں ہے وہ شراب نہیں پیے گا۔ چند ہی دن کے بعد تاتار خاں کو ایک بہانہ سے حصار فیروزہ بھیج دیا گیا[۶]۔

---

[۱] کتاب النجوم (نمبر ۵۲۶) ص ۱، [۲] [۳] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۳۲۵،
[۴] فہرست کتب ایشیاٹک سوسائٹی ص ۱۶، [۵] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۷۹
[۶] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۱۴۷-۱۴۷، عفیف نے اس کی شراب نوشی کا ذکر کرتے ہوئے (باقی برصفحہ ۴۰۱)

سلطان کو گانے کا بھی بہت شوق تھا۔ نماز جمعہ کے بعد اس کا وقت "طائفۂ مطرباں" میں گزرتا تھا
عفیف نے لکھا ہے کہ موسیقی میں اس کی دلچسپی کے باعث

"کاروبار مطربان دہلی بجائے رسید کہ فرزندان خردسال برابر خود کردہ از شہر دہلی تا شہر فیروزآباد می آمدند"[1]	دہلی کے گویوں کے کاروبار میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ وہ چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کر شہر دہلی سے فیروزآباد آنے لگے۔

اس کے عہد میں موسیقی پر دو کتابیں لکھی گئی تھیں۔ ایک غنیۃ المنیۃ جس میں ہندوستانی گانوں کا ذکر ہے۔ اور دوسری کتاب فرید الزماں فی معرفت الالحان کا فارسی ترجمہ۔ اول الذکر کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے[2]۔

شخصی زندگی میں مذہب کا احترام

شراب نوشی اور موسیقی میں دلچسپی سے قطع نظر، فیروز کی زندگی میں شریعت کا کافی احترام معلوم ہوتا ہے۔ محمد بن تغلق کے عہد میں چاندی سونے کے برتن بڑی کثرت سے استعمال ہوتے تھے[3] اور تلوار کی پیٹیاں، خول اور ترکش سونے کے بنائے جاتے تھے اور اُن پر جواہرات جڑے جاتے تھے۔ خود لکھتا ہے:

"آں را منع کردہ حلیہ سلاح خود از استخوانہائے شکاری ساختیم و استعمال آوانے کہ در شرع مباح است اعتیاد کردیم"[4]	میں نے ان چیزوں کو منع کر دیا اور اپنے ہتھیاروں کے نیام شکار کے جانوروں کی ہڈیوں سے بنوائے اور ان برتنوں کا استعمال شروع کیا جو شرعاً جائز ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۴۰۰) لکھا ہے: "زہے شرابے کہ فیروز شاہ خردے بانواع رنگ و بانواع مزہ بعضے برنگ زعفران و بعضے برنگ گل و بعضے برنگ سپید و مزۂ او مانند شیر شیریں" جس کے معنی یہ ہیں کہ شراب کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ عفیف کے بیان سے ایسا خیال ہوتا ہے کہ غالباً شراب نوشی کی عادت صرف "آغاز جلوس" تک رہی تھی۔

(نوٹ صفحہ ہذا) [1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۸

[2] فہرست کتب خانہ انڈیا آفس ص ۱۱۱۷-۱۱۱۷، نمبر ۲۰۰۸، کتاب گجرات کے گورنر ابراہیم حسن ابو رجا کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔

[3] عجائب الاسفار، ص ۹۳-۹۷، ۹۸، ۱۰۱، ۱۰۲ وغیرہ

[4] فتوحات فیروز شاہی ص ۱۱۔

ایام سابقہ میں شاہی خلعتوں[1]، گھوڑوں کی لگاموں، عود کی انگیٹھیوں، پیالوں، خیموں کے دروازوں، پردوں وغیرہ پر تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ فیروز شاہ نے حکم دیا کہ

"جملہ صورت و تمثال از جمیع ایں چیزہا دور کنند" — ان تمام تصویروں اور صورتوں کو مٹا دیا جائے۔

محلات شاہی کی دیواروں پر جو تصویریں بنی ہوئی تھیں وہ بھی صاف کر دی گئیں[2]۔

اس زمانہ میں ریشمیں اور زربفت کے کپڑے عام طور پر دربار میں استعمال ہوتے تھے۔ خود فیروز نے ابتدائے عہد میں جو خلعت شیخ قطب الدین منورؒ کو بھیجا تھا وہ ریشمیں تھا۔ فیروز شاہ نے ان سب کو ممنوع قرار دیا اور

"ملبوسات ہمچناں شد کہ در شرع محمدؐ مصطفیٰ مباح است" — لباس ایسے رائج کیے جو شرع محمدی کی رو سے جائز ہیں۔

علمہائے زردوزی اور کلاہ زربفت کے متعلق اس نے حکم دیا کہ ان کی چوڑائی چار انگل سے زیادہ نہ ہو[3]۔

خانقہی نظام کو زندہ کرنے کی کوشش محمد بن تغلق کی پالیسی کے زیر اثر شمالی ہندوستان میں خانقہی نظام کی بربادی صرف لنگروں کی تباہی یا مشائخ کے منتشر ہو جانے تک محدود نہ رہی تھی بلکہ اس ہنگامۂ دار و گیر میں وہ روایات فنا ہو گئی تھیں جن پر اس نظام کی بقا کا انحصار تھا۔ فیروز شاہ نے خانقہی زندگی کو بحال کرنے کے لیے جو کوششیں کیں وہ سوکھی ہوئی کھیتی کو پانی دینے کے مترادف تھیں اس کی فیاضی سے زمین تو تر ہو گئی لیکن پودوں پر شگفتگی اور ترو تازگی واپس نہ آسکی۔ برنی نے

---

[1] علاء الدین خلجی نے علاء الملک کو جو خلعت دیا اس کے متعلق برنی نے لکھا ہے: "جامہ زردوزی صورت شیر و نگر بافت زرنیم منی" (ص ۲۷۱)، محمد بن تغلق کے عہد میں بھی یہی صورت تھی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے: ریشم کا زریں خلعت جس کو شیر صورت کہتے ہیں اس کو پہنائی گئی، اس خلعت کی پشت اور سینہ پر شیر کی تصویر ہوتی ہے" (ص ۲۰۹) [2] فتوحات فیروز شاہی ص ۱۱، سلطان محمود غزنوی کے بیٹے مسعود کے محل کی دیواروں پر جنسی جذبات متحرک کرنے والی تصویریں تھیں، سلطان محمود نے ان کو مٹوا دیا تھا۔ تاریخ آل سبکتگین ص ۱۳۵۔

[3] فتوحات فیروز شاہی ص ۱۱۔

لکھا ہے کہ سلطان نے شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ، شیخ بہاء الدین زکریاؒ، شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ، شیخ نظام الدین اولیاؒ، شیخ جمال الدینؒ وغیرہ کے خاندانوں اور خانوادوں کو کثرت سے گاؤں، وظائف اور باغات تقسیم کیے اور اُن خانقاہوں میں جہاں خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا، قرآن خوانی، فاتحہ اور تسبیح و تہلیل کے ہنگامے پھر گرم ہو گئے۔ اور

"خانقاہات شہر و حوالی کہ از سالہا باز حکم خراب پذیرفتہ بود و پرندہ پر نمی زد و تشنہ آب نمی یافت از مراحم سلطانی فیروز شاہی از آستانہ داران و صوفیان و متعبدان و قلندران و حیدریان و مسافران و مسکینان پر و پیمان شدہ است"[۱]

شہروں اور قرب و جوار کی خانقاہیں جو برسوں سے خراب حالت میں پڑی تھیں اور جہاں پرندہ تک پر مارنا پسند نہیں کرتا تھا اور جہاں پیاسے کو پانی بھی نہیں ملتا تھا، سلطان فیروز شاہ کی فیاضی سے آستانہ داروں، صوفیوں، زاہدوں، قلندروں، حیدریوں، مسافروں اور مسکینوں سے

بیچارے برنی کی نگاہوں نے جس ظاہری کر و فر اور چہل پہل سے دھوکا کھایا تھا[۲] وہ حقیقی تصوف سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی تھی۔ حکومت کی مدد چند "آستانہ داروں" کی خورد و نوش کا سامان تو ضرور مہیا کر سکتی تھی لیکن تصوف کے گزرے ہوئے دور کو واپس نہیں لا سکتی تھی۔ چنانچہ عہد فیروزی کی خانقاہیں مسافروں کے ٹھہرنے اور حکومت کی طرف سے خیرات تقسیم کرنے کے لیے تو اچھی جگہیں تھیں[۳] لیکن روحانی اصلاح و تربیت کے صبر آزما کام سے اُنہیں کوئی

---

۱ تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۵۶۰۔

۲ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ برنی شیخ نظام الدین اولیاؒ کا مرید ہوتے ہوئے بھی تصوف کی روح سے ناآشنا تھا۔ نسلی امتیازات پر اس کا اصرار، شریف و رذیل کا فرق، ہندوؤں پر سختی وغیرہ وغیرہ ـــ یہ وہ نظریات ہیں جو اس نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ بیان کیے ہیں اور جو شیخ کی تعلیم کے بالکل برعکس ہیں۔ علاوہ ازیں شیخ کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۱-۳۴۶) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ظاہری ہنگامہ کو تو دیکھ سکتا تھا، لیکن شیخ کے فکر کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا!

۳ ان خانقاہوں کا مقصد سیرت فیروز شاہی کے مصنف نے یہ بیان کیا ہے: "تا مداوم و مستدام بغرباء و فقراء کہ آئند و روند ہمہ را الوان نعمت و ما یحتاج الیہ بمراد برسانند" (ورق ۳)، اور یہی بات عفیف نے لکھی۔ ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی ص ۳۳۰-۳۳۱۔

سروکار نہ تھا۔ معاصر مورخوں اور شاعروں کی نظریں خانقاہوں کے بام و در کی بلندی کو دیکھتی تھیں اور اعلان کرتی تھیں ؎

صحن و کنف آں پر حسن و جمالست　　　　سقف و طرف آں پر رنگ و نگارست [1]

لیکن "کاروانِ رفتہ" کے بچھڑے ہوئے جو دو ایک مشائخ طریقت رہ گئے تھے وہ چشم پرنم کے ساتھ یہ اعلان کر رہے تھے۔

امروز ایں کار (شیخی) بازی بچگاں شد [2]

مزارات پر حاضری فیروز شاہ اپنے رشتہ داروں بالخصوص اپنی والدہ [3]، مشائخ اور سلاطین کی قبروں پر جایا کرتا تھا۔ کسی مہم پر روانہ ہونے سے قبل وہ دہلی کے سلاطین اور مشائخ کی قبروں پر فاتحہ کے لیے حاضر ہوتا تھا [4]۔ تاریخوں اور تذکروں میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، شیخ بہاء الدین زکریاؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ اور دیگر بزرگوں کے مزارات پر اس کی حاضری کا متعدد جگہ ذکر ملتا ہے۔ جب ٹھٹہ کی مہم پر روانہ ہوا تو اثنائے راہ میں چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے مقبروں پر خصوصیت سے گیا۔ شیخ الاسلام صدر الدین نبیسۂ شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس کے ہمراہ تھے۔ اُنھوں نے سلطان سے شکایت کی کہ

"مشائخ شہر ملتان را پہلو مال گذاشتہ　　　　شہر ملتان کے مشائخ کو نظر انداز کر دیا اور شیخ

زیارت بندگی شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین　　　　الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی زیارت

---

[1] سیرت فیروز شاہی ورق ۱۰۶، مصنف نے یہ شعر خانقاہ فتح خاں کے متعلق لکھا ہے۔ حوضوں کے کنارے جو خانقاہیں بنائی گئی تھیں ان کا حال سیرت (ورق ۱۰۶) میں پڑھا جا سکتا ہے۔

[2] اخبار الاخیار، ص ۸۲۔　　　　[3] سیرت فیروز شاہی، ورق ۷۵۔

[4] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۱۹۴۔ "ہر بار کہ خواستے از شہر دہلی جائے سواری کند اگر چہ یک ماہ یا دو ماہ سواری بودے عاقبت جمیع مشائخ دیندار و سلاطین نامدار را زیارت کردے و از ہر یکے استمداد خواستے خود را در پناہ ایشاں انداختے" (عفیف) شیخ نور الحق نے لکھا ہے کہ سلطان فیروز صرف غیاث الدین تغلق کی قبر پر نہیں جاتا تھا۔ بلکہ جب کبھی اس کا ذکر آجاتا تھا تو "غلام خواجہ کش" کے نام سے اُسے یاد کرتا تھا۔ زبدۃ التواریخ (روٹوگراف) ورق ۱۶۔

ذکر یار ناکردہ"[۱]　　　　کے لیے نہیں گئے۔

واپسی پر فیروز نے سہرورد یہ سلسلہ کے مشایخ کے مزارات پر بھی حاضری دی[۲]۔ ۷۷۶ھ میں بہرائچ گیا اور سید سالار مسعود غازیؒ کے مزار پر حاضر ہوا۔ اور کچھ دنوں وہاں قیام کیا۔ ایک دن سید سالارؒ کو خواب میں دیکھا۔ انھوں نے فیروز کو دیکھ کر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا جس کی اس نے یہ تعبیر کی کہ ——

"ایام پیری غلبہ آوردہ، استعداد آخرت می باید کرد"[۳]　　　ایام پیری کا غلبہ ہو گیا ہے، آخرت کا سامان کرنا چاہیے۔

دوسرے دن صبح ہی فیروز محلوق ہوا۔

تعمیر مزارات و مقابر　فیروز شاہ نے اپنے عہد حکومت میں متعدد مزارات تعمیر کرائے اور بے شمار مزارات کی مرمت کرائی تھی[۴] اس سلسلہ کی کچھ تعمیرات کا ذکر اس نے اپنی فتوحات میں بھی کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ سلطان معز الدین سامؒ[۵] کے مقبرے کی مغربی دیوار اور دروازے کے تختے پرانے اور فرسودہ ہو گئے تھے، اُن کی تجدید کرائی گئی اور بجائے لکڑی کے صندل استعمال کیا گیا[۶]۔ سلطان التتمش کے مقبرہ کے جو ستون گر گئے تھے، ان کی جگہ بہتر ستون بنوائے گئے، مقبرہ کا صحن پختہ کرایا گیا اور گنبد کے نیچے ایک سنگ تراشیدہ زینے کا اضافہ کیا گیا[۷]۔ ملک پور میں سلطان معز الدین پسر سلطان شمس الدین کا مقبرہ بالکل منہدم ہو چکا تھا، اس کی از سر نو تعمیر کرائی گئی۔

[۱-۲] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۲۳۰۔　[۳] ایضاً ص ۲،۳۔

[۴] "ہمچنیں مزار و مقابر مشائخ و اولیاء ... عمارت فرمودہ" سیرت فیروز شاہی ورق ۹)

[۵] سلطان معز الدین سام کے مقبرے کے متعلق یہ بیان پریشانی سے خالی نہیں۔ سلطان کی شہادت دمیک میں ہوئی تھی اور اس کو غزنین میں دفن کیا گیا تھا۔ سلطان کے مرقد و مقتل کے متعلق تفصیلی معلومات درکار ہوں تو معارف (جون ۱۹۴۳ء) میں مولانا ریاست علی ندوی کا مضمون (۴۲۶-۴۶۷) اور معارف (ستمبر ۱۹۴۳ء) میں ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی کا مضمون (۲۱۹-۲۲۷) اور برہان (جنوری ۱۹۵۶ء) میں کرنل خواجہ عبد الرشید کا مضمون (۱۷-۳۰) مطالعہ کرنا چاہیے۔

[۶] فتوحات فیروز شاہی ص ۱۲۔　[۷] ایضاً ص ۱۳۔ نیز ملاحظہ ہو آثار الصنادید ص ۶۵-۶۶۔

اور گنبد، چبوترہ اور احاطہ بنوایا گیا[1]۔ اسی طرح ملک پور میں سلطان رکن الدین کے مقبرہ کا احاطہ اور گنبد بنوایا گیا اور ایک خانقاہ وہاں تعمیر کی گئی[2]۔ جلال الدین خلجی کے مقبرہ پر ایک نیا دروازہ لگایا گیا[3]۔ علاء الدین خلجی کے مقبرہ میں صندل کے دروازے لگوائے گئے اور آبدار خانہ اور مسجد کی دیواریں درست کرائی گئیں[4]۔ نیز خلجی شہزادوں خضر خاں، شادی خاں، فرید خاں، سکندر خاں، سلطان قطب الدین اور شہاب الدین وغیرہ کے مقبرے بھی ٹھیک کرائے گئے[5]۔ ملک کافور کا مقبرہ جو زمین میں دھنس گیا تھا از سر نو تعمیر کیا گیا[6]۔ دار الامان میں جہاں تغلق سلاطین کی قبریں تھیں، صندل کے دروازے بنوائے گئے اور خانہ کعبہ کے دروازوں کے پردے سائبان کے طور پر لگائے گئے[7]۔ ان مقبروں سے متعلق اوقاف کو بھی جاری کیا گیا[8]۔

سہسوان میں مخدوم لعل شہباز قلندرؒ کی خانقاہ کے عقب میں مندرجہ ذیل دو کتبے نصب ہیں[9]:-

(۱)

جہاں مردم کش است ای دل مباش از جان وفادارش ۔۔۔ کی جز کین و جفا نامد زبیدادی و گر کارش

تو از حال محمد شاہ برگیر اعتبار از وے ۔۔۔ کی چوں اورنگ شاہی در ربود این درغدارش

شہنشا ہیست ایں اے خواجہ کش بینی بخاک اندر ۔۔۔ کی ہمچوں بندگاں بودند شاہان جہاندارش

اگرچہ پیش ازیں صد بار در بارش چناں دیدی ۔۔۔ کنوں چشم خرد بکشا دریں جا بنگر ایں بارش

جہاں بکشاد از مردے و بخشید از جوانمردی ۔۔۔ بدہر از کوشش فراواں بود کردارش

(شد از) ماہ محرم (بیست و یک) کاندر شب شنبہ ۔۔۔ گذشتہ ہفصد و پنجاہ و دو شد عزم آں دارش

(۲)

بعہد دولت فیروز شاہ خسرو گیتی ۔۔۔ کہ یزداں بر سریر سلطنت بادا نگہدارش

بر آں سلطاں دیں پرور بر آمد ایں چنیں گنبد ۔۔۔ کی آمد پیش پائے گنبد گردون دوارش

---

۱ تا ۲ فتوحات فیروز شاہی ص ۱۲ ۳ تا ۵ ایضاً ص ۱۳-۱۴ ۶ ایضاً ص ۱۴
۷ ایضاً ص ۱۴-۱۵ ۸ ایضاً ص ۱۵
۹ اورنٹیل کالج میگزین - فروری ۱۹۳۵ء ص ۱۴۸-۱۵۱

بسال ہفصد و پنجاہ و چہار از ہجرت احمد   قبول بندۂ درگاہ او سر مست معمارش

غالباً یہ مقام وہ ہوگا جہاں محمد بن تغلق کی نعش کو کچھ عرصہ کے لیے اماناتاً دفن کر دیا گیا تھا اسی بنا پر ۷۵۴ھ میں فیروز شاہ نے یہاں ایک گنبد تعمیر کرا دیا۔

سلاطین کے مقابر کے علاوہ سلطان فیروز نے مشائخ کے مزارات بھی بڑی تعداد میں تعمیر کرائے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مقبرہ کے دروازے اور جالیاں صندل کی بنوائی گئیں اور سونے کی قندیلیں سونے کی زنجیروں سے باندھ کر چاروں کونوں پر لٹکا دی گئیں اور ایک جماعت خانہ[۱] نیا تعمیر کیا گیا[۲]

شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا مزار بھی فیروز شاہ نے تعمیر کرایا تھا مزار کے دروازے پر کتبہ ہے:

"بسم اللہ تیمناً بذکرہ۔ عمارۃ ایں گنبد در عہد ہمایوں الواثق باللہ ابو المظفر فیروز شاہ سلطان خلد اللہ ملکہ سال ہفصد ہفتاد و پنج از تاریخ ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بود"[۳]

سہسوان کے کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد فیروزی میں شیخ عثمان مرندیؒ کے مزار پر روضہ

---

[۱] شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار کے قریب جماعت خانہ کی عمارت کے متعلق سیر العارفین میں لکھا ہے "و ایں عمارت عالی کہ مقبرۂ حضرت شیخ کہ در صحن وے واقع است ساختۂ خضر خاں است" (ص ۴۷) لیکن یہ بیان اس لیے قابل قبول نہیں کہ سیر الاولیاء میں لکھا ہے کہ "آنجا کہ روضۂ متبرکہ سلطان المشائخ است صحرا بود، بعد نقل سلطان المشائخ سلطان محمد بن تغلق بر روضۂ متبرکہ سلطان المشائخ گنبد عمارت کنانید" (ص ۱۵۴) سرسید نے آثار الصنادید (ص ۳۸) میں اس عمارت کو خضر خاں سے منسوب کرنے کے سلسلہ میں جو عبارت لکھی ہے اس کا ماخذ یقیناً سیر العارفین ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ مسجد (جو شروع میں جماعت خانہ تھا) محمد بن تغلق نے بنوائی تھی، فیروز نے اسی بنیاد پر "جماعت خانہ جدید ... کہ آنچناں پیش ازیں آنجا نبود" (فتوحات ص ۱۴) تعمیر کرایا۔ فیروز شاہ کے عہد میں اس جگہ کی خوبصورتی، حجروں کی کثرت کا ذکر مطہر نے اپنے دیوان میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اورنٹیل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۳۵ء۔ ص ۱۳۵-۱۳۶۔

[۲] فتوحات فیروز شاہی۔ ص ۱۴۔

[۳] آثار الصنادید ص ۱۹، واقعات دار الحکومت دہلی جلد سوم ص ۹۳۔

بنوایا گیا تھا جس میں سات طاق اور چھ گنبد تھے[1]۔ علاوہ ازیں ولی اللہ علاء الحق علی بغدادیؒ کی قبر پر اسی زمانہ میں ایک گنبد تعمیر کیا گیا تھا[2]۔

فقراء و مشائخ سے عقیدت | فیروز فقراء و مشائخ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ خود فتوحات میں لکھتا ہے:

"بہ عنایاتِ حق تواضع فقراء و مساکین واستمالتِ قلوبِ ایشاں دردل ما تمکن یافت تا ہر جا کہ فقیرے وگوشہ نشینے یافتیم برائے ملاقات او قدم زدیم وبہ دعاء استمداد نمودیم تا فضیلت نعم الامیر لباب الفقیر (علی باب الفقیر) اکتساب کردہ شود"[3]	خدا کی مہربانی سے میرے دل میں فقراء و مساکین کی خاطرداری اور اُن کی تالیف قلوب کا جذبہ پیدا ہوا۔ حتی کہ جہاں کہیں مجھے کوئی فقیر یا گوشہ نشین ملتا ہے میں اس کی ملاقات کے واسطے جاتا ہوں اور دعاء کے ذریعہ اس کی مدد حاصل کرتا ہوں تاکہ "وہی امیر سب سے بہتر ہے جو فقیر کے دروازہ پر جاتا ہے" کی فضیلت حاصل کروں۔

سیرتِ فیروز شاہی[4] اور تاریخ فیروز شاہی[5] میں تفصیل کے ساتھ اس کی فقراء و مشائخ سے عقیدت

---

[1] شیخ عثمان مرندیؒ کا تفصیلی حال کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزرا۔ ابن بطوطہ اُن کے مزار پر پہنچا تھا۔ (عجائب الاسفار۔ ص ۹) کتبہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بعہد دولت فیروز شہ سلطاں دیں پرور ... کہ خاک درگہش سازند شاہان جہاں افسر
عمارت شد مقام شیخ عثماں مرندی کو ... ولی اللہ بازا سفید میر بحر بود و بر
اگرچہ اولیاء اندر زماں شیخ بس بودند ... ولیکن در کرامت بود او از ہمگناں برتر
بنائیش کرد والی اختیار الدین ملک ارشد ... امیر عادل و باذل تہمتن ثانی اسکندر

(اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۳۵ء ص ۱۴۹)

[2] شد بنائے گنبد عالی بعہد شہریار ... شاہ فیروز آنکہ بگرفتہ است گبراں زو فرار

(اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۳۵ء ص ۱۵۱)

[3] فتوحات فیروز شاہی ص ۱۷، مطہر اس کے متعلق لکھتا ہے ؎

ہر جا کہ اہل دانش واصحاب نہد بود ... نان داد و دیر داد و درہا نثار کرد

[4] سیرت فیروز شاہی ورق ۸۵ تا ۹۰، لکھتا ہے: "بہر شہرے و قریہ کہ درویشے متقی و زاہد استماع فرمود بوجود عظمت سلطنت وجلالت جہانداری مسکن آن فقیر را بقدم میمون ہمایوں منور گردانید"

[5] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۳۷۱

کا ذکر کیا گیا ہے عفیف کا بیان ہے کہ فیروز شیخ علاء الدین اجودھنیؒ سے بیعت تھا[۱]۔ سیرت کے مصنف نے مجذوبوں سے اس کے تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے[۲]۔ لکھنوتی جاتے ہوئے سلطان بہت سے مساکین فقرا، اور مشائخ کے آستانوں پر حاضر ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک تارک الدنیا بزرگ شیخ ہمبر سے ملا تھا۔ وہ گھاس پھوس پر گزارہ کرتے تھے اور ترک و تجرید کی زندگی بسر کرتے تھے۔ سلطان نے اُن سے راہ سلوک اختیار کرنے کا سبب پوچھا تو اُنھوں نے بتایا کہ ایک زمانہ میں شراب پیے ہوئے دریا کے کنارے مست گھوم رہا تھا، دریا میں جا پڑا۔ اسی حالت میں شیخ الاسلام فریدالدینؒ کی صورت دکھائی دی کہ فسق و فجور سے توبہ کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ دریا سے باہر نکل کر سارا مال و منال لٹا دیا اور گوشہ نشین ہو کر عبادت میں مشغول ہو گیا۔ فیروز نے فیروز آباد کی جامع مسجد کے قریب ایک حجرہ اُن کے لیے تعمیر کرا دیا اور وہ وہاں رہنے لگے[۳]۔ ایک اور بزرگ بہادر سے ملاقات کا حال بھی سیرت میں ملتا ہے[۴]۔

شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ اور سلطان تذکروں میں شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ اور سلطان فیروز کے درمیان گہرے تعلقات کا ذکر ملتا ہے لیکن تحقیق کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ سب افسانے ہیں جو بعد کو تراش لیے گئے ہیں۔ فیروز سے شیخ نصیرالدین چراغؒ کے جو کچھ بھی مراسم یا تعلقات تھے اُن کی ابتدا ٹھٹہ کے قیام کے دوران میں ہوئی تھی اور دہلی پہنچنے سے قبل ہی وہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا[۵]۔ صورت حال یہ تھی کہ جس وقت ٹھٹہ میں محمد بن تغلق کا انتقال ہوا تو فوج پر اور اُن لوگوں پر جو دہلی سے ہزاروں میل دور، باغی آبادی کے درمیان ٹھہرے ہوئے تھے، مایوسی اور ہراس کی کیفیت طاری ہو گئی۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر شیخ نے دیگر اور علماء و مشائخ کے ساتھ مل کر فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔ دہلی پہنچ کر اُنھوں نے فیروز سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھا۔ نہ

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۳۷۱۔ [۲، ۳، ۴] سیرت فیروز شاہی ورق ۸۷ تا ۹۰

[۵] شیخ نے نہایت با اخلاق طریقہ سے سلطان فیروز سے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا۔ تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۶۱

کبھی دربار میں گئے نہ کوئی جاگیر قبول کی۔ برنی نے ان علماء و مشائخ کا ذکر کیا ہے جن پر سلطان نے جاگیریں، باغات، وظائف و ادرارات کی بارش کی تھی۔ شیخ نصیرالدینؒ کا نام اس فہرست میں نہیں ملتا[۱]۔ وجہ ظاہر ہے۔ خیرالمجالس میں فیروز کا کوئی ذکر ہی نہیں بلکہ اس زمانہ کے حالات پر شدید ترین تنقید ہے۔ پروفیسر محمد حبیب کا خیال بالکل درست ہے کہ جو شخص اس بیباکی کے ساتھ حالات پر تنقید کر رہا تھا اس کا سلطان یا عمال حکومت سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا![۲]

جوامع الکلم میں ایک واقعہ درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے خود سلطان سے تعلقات رکھنے پسند نہیں کیے۔ ایک دن فیروز شیخ کی خانقاہ میں آیا۔ شیخ قیلولہ کر رہے تھے اور اُن کے خادم خاص مولانا زین الدین کہیں باہر گئے تھے۔ سلطان خانقاہ کے صحن میں کھڑا تھا کہ بارش ہونے لگی۔ فوراً ہی مولانا زین الدین آ گئے۔ اُنھوں نے شیخ کو اطلاع دی وہ سلطان کے استقبال کے لیے باہر آنے کے بجائے وضو کر کے نماز میں مشغول ہو گئے۔ سلطان کو یہ انتظار گراں گزرا۔ تاتار خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا:

ما بادشاہ نہ ایم، بادشاہ ایشاں اند ہم بادشاہ نہیں ہیں۔ بادشاہ تو یہ ہیں

جب شیخ حجرہ سے باہر آئے تو صحن ہی میں سلطان کے لیے ایک شطرنجی بچھوا کر وہیں باتیں کرنے لگے۔ فیروز تھوڑی دیر بیٹھا، پھر "رنجیدہ و ناخوش" واپس ہو گیا[۳]۔ یہ واقعہ اس پورے ماحول اور طرز فکر سے ہم آہنگ ہے جو شیخ کے ملفوظات میں کار فرما نظر آتا ہے۔ فیروز شاہ جس نظامِ حکومت کو چلا رہا تھا، اس سے شیخ کو شدید شکایتیں تھیں۔ وہ حالات گرد و پیش کو امراء یا علماء کے زاویۂ نگاہ سے نہیں بلکہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے ـــــ عہد علائی میں کوئی فقیر بغیر لحاف نہ ہوتا تھا، بعض کے پاس کئی کئی ہوتے تھے، پہلے کتنی ارزانی تھی۔ بڑی بڑی دعوتیں ایک تنکہ میں مرتب ہو جاتی تھیں[۴]، وغیرہ وغیرہ ـــــ ان جملوں میں ماحول سے جو دل

[۱] تاریخ فیروز شاہی۔ برنی۔ ص ۵۵۸۔ ۵۶۰ [۲] اسلامک کلچر، اپریل ۱۹۴۶ء ص ۱۴۴

[۳] جوامع الکلم ص ۲۱۹۔ [۴] ملاحظہ ہو خیرالمجالس ص ۱۸۵، ۲۴۰، ۸۸، ۱۳۹ وغیرہ

برداشتگی اور مایوسی ٹپکتی ہے اُس کا کچھ تعلق فیروز سے بھی تھا!

شیخ شرف الدین پانی پتیؒ اور سلطان

سیرت فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ شیخ شرف الدین پانی پتیؒ فیروز شاہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ اکثر "عالمِ وحدت" اور "مقامِ وحشت" میں رہتے تھے۔ کھانا کم کھاتے تھے۔ کبھی خواہش ہوتی تو "شیر با نبات" چکھ لیتے تھے۔ اپنا بچا ہوا کھانا کسی کو نہ دیتے تھے۔ لیکن اکثر اوقات فیروز کو ان الفاظ کے ساتھ بھجوا دیتے تھے۔

"برائے فرزند من فیروز ببرند" [1] میرے بیٹے فیروز کے لیے اس کو لے جائیں۔

شیخ قطب الدین منورؒ اور فیروز

شیخ قطب الدین منورؒ چشتیہ سلسلہ کے اُن بزرگوں میں تھے جن کو خانقہی زندگی میں کسی طرح کی مداخلت پسند نہیں تھی۔ اس لیے فیروز شاہ کی عقیدت اور نیاز مندی بھی اُن کو حکومت سے قریب لانے میں کامیاب نہ ہوئی۔ علاوہ ازیں اُنہوں نے جس جرأت اور بیباکی کے ساتھ فیروز پر تنقید کی تھی اس کے پیش نظر یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی کہ سلطان اُن سے روابط قائم کرنے کے لیے کوئی غیر معمولی کوشش کریگا۔ اُن کے بیٹے شیخ نورالدینؒ نے بھی اپنے خانوادہ کی روایات پر عمل کیا۔ حصار فیروزہ کو آباد کرنے کے بعد [2] فیروز اُن سے ملنے کے لیے ہانسی گیا۔ جب خانقاہ میں پہنچا تو شیخ نورالدینؒ نے سجادہ سے اُٹھ کر استقبال کے لیے آگے بڑھنا چاہا لیکن سلطان نے قسم دلا کر روک دیا۔ پھر فیروز نے اُن سے حصار فیروزہ میں قیام کی درخواست کی اور کہا کہ اگر آپ وہاں قیام کرنا پسند کریں تو ایک خانقاہ تعمیر کرادی جائے اور اس کے مصارف کا انتظام کر دیا جائے۔ شیخ نورالدینؒ

---

[1] سیرت فیروز شاہی ورق ۸۶۔ [2] حصار فیروزہ میں سلطان نے ایک نہر بھی کھدوائی تھی، اور اس کی وجہ سے ہانسی میں بھی شادابی ہوگئی تھی۔ سیرت میں لکھا ہے کہ شیخ قطب الدین منورؒ نے ایک بار سلطان سے کہا تھا: "از والد مرحوم شیخ جمال الدین (؟ برہان الدین) سماع دارم کہ بسعی ایں صاحب زماں خلد اللہ ملکہ، در زیر ہانسی لب آب رواں خواہد شد" اور یہ کہہ کر اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تھے۔ اور کہنے لگے تھے: افسوس! اس وقت میں موجود نہ ہونگا (ورق ۸۶) فیروز شاہ جس وقت شیخ نورالدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا یہ الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔

نے پوچھا: حصار فیروزہ میں قیام کا مجھے حکم دیا جا رہا ہے یا اس معاملہ میں مجھے اختیار ہے؟ فیروز نے جواب دیا: میں آپ کو حکم کیسے دے سکتا ہوں، یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے؟ شیخ نے فرمایا: مجھے یہاں ہانسی ہی میں رہنا ہے۔ یہ میرے باپ دادا کا وطن ہے اور شیخ فریدالدینؒ اور شیخ نظام الدینؒ نے اُن کے سپرد کیا ہے[1]

وحدت الوجودی فکر کے تین امام اور سلطان سے اُن کے تعلقات

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، مسعود بکؒ، اور میر سید امیر ماہؒ اس دور کی تین ممتاز شخصیتیں تھیں جن پر وحدت الوجود کا رنگ غالب تھا، اور جن کی زبان اور قلم نے چودھویں صدی میں ان خیالات کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا تھا۔

شیخ شرف الدین یحییٰؒ کے مکتوبات ملک میں دور دور پہنچے تھے اور جذبات کی گہرائی، خیالات کی بلندی، اور انداز بیان کی گیرائی کے باعث مقبولیت عامہ حاصل کر لی تھی۔ عام طور پر تذکروں میں اُن کے اور فیروز شاہ کے درمیان گہرے روابط دکھائے گئے ہیں، لیکن صورتِ حال اس کے بالکل برعکس معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ جس مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے اس کے کسی فرد کا سلطان سے اچھے تعلقات رکھنا ممکن نہ تھا۔ محمد بن تغلق نے شیخ کو جو جاگیر دی تھی وہ انہوں نے فیروز شاہ کے عہد میں واپس کر دی[2]۔ اُن کو سلطان کی مذہبی پالیسی سے اختلاف تھا اور احمد بہاری کے قتل پر (جس کی تفصیل آگے آئیگی) انہوں نے نہ صرف اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا بلکہ دہلی کی تباہی اور بربادی کی پیشین گوئی کی تھی یہ خبر سلطان کے کانوں تک بھی پہنچ گئی اور اس نے شیخ کو دہلی طلب کیا۔ اسی اثنا میں سید جلال الدین بخاری المعروف بہ مخدوم جہانیاںؒ دہلی تشریف لے آئے۔ تین دن تک سلطان کی اُن سے ملاقات نہ ہو سکی تو خادم سے مصروفیت کی نوعیت دریافت کی۔ پتہ چلا کہ مکتوبات منیری

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۳۲۲، ۳۲۳۔

[2] مکتوبات بست وہشت ص ۳۴۳، انڈیا آفس میں شیخ کے مکتوبات کا جو نسخہ ہے اس میں ایک خط فیروز شاہ کے نام بھی ہے۔

کے مطالعہ میں ایسے مستغرق ہیں کہ دنیا و مافیہا کی خبر ہی نہیں رہی ہے سلطان کو شیخ منیری کی عظمت و بزرگی کا احساس ہوا اور جن لوگوں کو انہیں لانے کے لیے بھیجا تھا، واپس بلا لیا[1] تذکرہ نویسوں نے اپنے مخصوص انداز میں یہ واقعہ اس طرح بیان کر دیا ہے۔ غالباً صورت یہ پیش آئی ہوگی کہ مخدوم جہانیاںؒ کی سفارش پر سلطان نے اُن کے خلاف کارروائی کا ارادہ ترک کر دیا ہوگا!

مسعود بک[2] فیروز شاہ کے عزیز تھے۔ انھوں نے جاہ و ثروت کو ٹھکرا کر فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر لی تھی عشقِ حقیقی کی آگ ہر وقت اُن کے سینے میں سلگتی رہتی تھی اور اس کے شرارے کبھی کبھی شعر کی صورت میں نمودار ہوتے تھے۔ ان کے دیوان نور العین[3] کا ایک ایک شعر اور ان کی مراۃ العارفین[4] کی ایک ایک سطر اُن کے جذبے اور کیفیت کی غماز ہے۔ کتابوں میں فیروز شاہ سے اُن کے تعلقات کی تفصیل نہیں ملتی لیکن محمد بولاق کا بیان ہے:

"علمائے روزگار را با وے نقارے تمام بود	اُن کے ہم عصر علماء کو ان سے بڑی عداوت تھی
چنانچہ بفتوئ ایشاں مثل حسین منصور	چنانچہ ان کے فتوے پر حسین منصور کی طرح اُن
بقتل آمد"[5]	کو قتل کر دیا گیا۔

---

[1] مرآۃ الاسرار (قلمی) ص ۶۹۷، مکتوبات بست وہشت (اقتباس از مناقب الاصفیاء) ص ۳۴۶،

[2] بک بخارا میں ایک مقام ہے جس کی نسبت سے وہ مسعود بک مشہور ہو گئے تھے۔ اصل نام شیر خاں تھا۔ شیخ رکن الدینؒ بن شہاب الدین امامؒ سے بیعت تھے۔ چراغ دہلویؒ سے بھی عقیدت تھی۔ ایک شعر میں ان کے متعلق کہتے ہیں ۔ شاہنشاہے جہاں لطافت نصیر دیں :: کو داد حسن از رخ خود ایں دیار را
انھوں نے عین القضات ہمدانی کی تمہیدات پر حاشیہ لکھا تھا۔ مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۱۶۴-۱۶۷، گلزار ابرار (قلمی)، معارج الولایت (قلمی)

[3] قلمی نسخے برٹش میوزیم (فہرست ص ۶۳۲) اور دیگر کتب خانوں میں موجود ہیں۔ عرصہ ہوا یہ دیوان چھپا بھی تھا لیکن اب نایاب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسعود بک کا دیوان اسی زمانہ میں خانقاہوں میں رائج ہو گیا تھا۔ (لطائف قدوسی ص ۹)

[4] چودہ کشف پر مشتمل ہے۔ پہلے کشف ہی کا عنوان ہے: "فی بیان حقیقت الوجود"

[5] روضۃ اقطاب ص ۸۸، بعض تذکروں میں ان کا سنہ وصال ۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء دیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ان کی شہادت کی ذمہ داری فیروز پر نہیں ہے

میر سید امیر ماہ[۱] بہرائچ کے مشہور و معروف مشایخِ طریقت میں تھے۔ سید علاء الدین المعروف بہ علی جاوریؒ سے بیعت تھے۔ وحدت الوجود کے مختلف مسائل پر رسالہ مطلوب فی عشق المجبوب[۲] لکھا تھا۔ فیروز شاہ جب بہرائچ گیا تھا تو اُن کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور

"بسیار صحبت نیک و گرم بر آمد"[۳]

فیروز شاہ کے ذہن میں مزار سے متعلق کچھ شبہات بھی تھے جن کو میر سید امیر ماہؒ نے رفع کیا۔ عبدالرحمٰن چشتی کا بیان ہے کہ اس ملاقات کے بعد فیروز شاہ کا دل دنیا کی طرف سے سرد پڑ گیا تھا اور اس نے "باقی عمر یادِ الٰہی میں کاٹ دی"[۴] یہ بیان مبالغہ آمیز ضرور ہے لیکن غلط نہیں۔ بہرائچ کے سفر کے بعد فیروز پر مذہبیت کا غلبہ ہو گیا تھا۔[۵]

سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاںؒ اور سلطان فیروز

مخدوم جہانیاںؒ جب سفرِ حجاز سے واپس آئے تو محمد بن تغلق کا انتقال ہو چکا تھا۔ فیروز سے اُن کے بہت جلد تعلقات قائم ہو گئے۔ عفیف نے لکھا ہے:

"میانِ ہر دو بزرگوار محبت و مودت از بطانہ چوں دوستان یگانہ بود"[۶]

(ان دونوں بزرگوں کے درمیان دوستانِ یگانہ کی سی محبت اور مودت تھی۔)

عہدِ فیروزی میں وہ متعدد بار دہلی تشریف لائے۔ ۷۸۷ھ/۱۳۸۵ء میں انہوں نے آخری بار دہلی کا سفر کیا تھا۔ اس کے اگلے سال ان کا وصال ہو گیا۔ فیروز ہر مرتبہ اُن کا بہت گرم جوشی سے استقبال کرتا تھا، آخری بار تو اُس نے عقیدت اور نیاز مندی کا کوئی مظاہرہ باقی

---

۱ مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو: مرأۃ الاسرار (قلمی)، ص ۶۹۲،

۲ اس رسالہ کا ایک قدیم نسخہ خاکسار کے پاس ہے۔ شروع اور آخر میں سلیمان جاہ کے کتب خانہ کی مہریں ہیں۔ ص ۲۲ پر انہوں نے سید علاء الدین سے اپنی ارادت کا ذکر کیا ہے۔

۳ مرأۃ الاسرار (قلمی) ص ۶۹۲، عبدالرحمٰن چشتی نے اس ملاقات کا حال اپنی ایک اور تصنیف مرأۃِ مسعودی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ میرے پیش نظر مرأۃ مسعودی کا اُردو ترجمہ ہے جو ۱۲۷۰ھ میں مطبع علوی میں چھپا تھا۔

۴ مرأۃ مسعودی (اردو ترجمہ) ص ۹۹۔

۵ تاریخ فیروز شاہی، عفیف ص ۳۷۳۔

۶ تاریخ فیروز شاہی ص ۵۱۴

نہ چھوڑا تھا۔ دہلی میں وہ شاہی مہمان کی حیثیت سے کوشک فیروز آباد میں یا فتح خاں کے محل میں ٹھہرتے تھے[۱] سلطان اُن سے ملاقات کے لیے خود اُن کی قیام گاہ پر جاتا تھا۔ اگر خود کبھی دربار میں تشریف لے آتے تھے تو سلطان کھڑے ہو کر اُن کا استقبال کرتا تھا اور بڑی عزت سے اپنے قریب بٹھاتا تھا۔ مخدومؒ کی قیام گاہ پر حاجتمندوں کا ایک ہجوم لگا رہتا تھا خادم اُن کی حاجتوں کو لکھتے رہتے تھے۔ جب سلطان ملاقات کے لیے آتا تو یہ فہرست اُس کے حوالہ کر دی جاتی تھی[۲]۔ اور وہ ان لوگوں کی حاجت روائی کو اپنے لیے سعادت دارین سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے اوچھ سے دہلی کا سفر محض اس لیے کیا تھا کہ اُن کے ایک اُستاد کے لڑکے کو اپنی بہنوں کی شادی کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی[۳]۔ انھوں نے فیروز شاہ سے "وظیفۂ خانقاہ" اور "انعامات" جو قبول کیے تھے اُن کا مقصد بقول اُن کے بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچانا تھا " نہ از جہت دفن و نگاہ داشتن"[۴]

سندھ میں مخدوم جہانیاںؒ کا بہت اثر تھا۔ سلطان نے اُن کی روحانی عظمت اور رسوخ سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ اس زمانہ میں جام جونا اور بن بہنیا مغلوں سے ساز باز کر کے گجرات اور پنجاب کی سرحدوں پر شورشیں پیدا کر رہے تھے۔ مخدومؒ نے اس معاملہ میں پڑ کر سلطان سے دونوں کو معافی دلائی۔ لیکن یہ دونوں اپنے وعدہ پر قائم نہ رہے اور پھر ہنگامہ آرائی شروع کر دی تو عین الملک ماہرو نے ایک پروانہ میں انہیں تنبیہ کی:

"شیخ الاسلام قدوۃ الانام صدر الحق والشرع والدین . . . و سید جلال الدین بخاری . . . درمیان آوردہ بودند و چناں عرضداشت محمول کردند کہ ولایتے کہ در تصرف داریم ہمہ وقت در وجہ حشم ہا و خدمت ہا دریں دیار مصرف می رسد . . . چوں شیخ الاسلام و سید جلال الدین مخصوص اند، بر مبنا حسن ظن کلمات مموہ

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۵۱۴ [۲] ایضاً ص ۵۱۵
[۳] ملفوظات قطب عالم (قلمی) ورق ۱۲۹۔ [۴] ایضاً ورق ۹۵

ایشاں را راست پنداشتند . . . بہ عز اجابت مقرون گردانید و بامن و امان اختصاص داد[1]"

جب فیروز دوسری بار تتہ گیا تو جام جونا اور بن بھینا کو خطرہ پیدا ہوا۔ ایک قاصد بھیج کر مخدوم کو بلوایا اور اُن سے سفارش کی درخواست کی، سلطان نے پھر اُن کو معاف کر دیا۔ مخدوم کا عوام اور زمینداروں پر اس قدر اثر تھا کہ عین الملک جیسے گورنر کو بھی خراج کی وصولی میں ان کی مدد لینی پڑتی تھی[2]

مخدوم جہانیاں سلطان سے اتنا گہرا تعلق رکھنے کے باوجود نہایت جرأت کے ساتھ اس کے اعمال پر تنقید بھی کر دیا کرتے تھے اور سلطنت کو ملک عضوض کا درجہ دیتے تھے[3]

ایک مرتبہ ایک شخص نے سوال کیا کہ۔

طعام و شراب ملوکِ ایں زمانہ خوردن شاید یا نے ؟	اس زمانہ کے بادشاہوں کا کھانا کھانا چاہیے یا نہیں ؟

تو جواب میں فرمایا :

"در فتاوائے خانی مذکور است کہ مکروہ است طعام ملوک و سلاطین خوردن ، بسبب آنکہ اغلب وجوہات ایشاں را امروز از مال ظلم و تعدی است۔ چنانکہ مال دلالت بازارہا، و مال جزاری، و مال امیر مطربی، و مال جکری غلہ، و مال حاصل کیالان، و مال حبہ ستدن[4]، و مال خماران	فتاوائے خانی میں لکھا ہے کہ ملوک و سلاطین کا کھانا کھانا مکروہ ہے۔ سبب یہ ہے کہ اُن کے بیشتر محاصل اس زمانہ میں ظلم و تعدی سے حاصل کیے ہوئے مال پر مشتمل ہیں جیسے مال دلالت بازارہا، اور مال جزاری، مال امیر مطربی، مال جکری غلہ، مال حاصل کیالان، مال حبہ ستدن، و مال خماران،

[1] منشات ماہرو ص ۱۶۰-۱۶۱ [2] ایضاً ص ۷۰ [3] ملفوظات قطب عالم (قلمی) ورق ۱۶
[4] حاشیہ پر اس طرح تشریح کی گئی ہے: "حبہ بر پیشانی زدن و نزد آب آمدن"

ومال نگینی گراں ستدن، مال ماہی فروشاں
ومال سبزہ و ترہ فروشاں، ومال لمبرہ
یعنی اخراجات، نسبت وقسمت ومال
صابون گراں ستدن، ومال مصادرہ
فروشاں، ومال گل فروشاں ومال جزائی و
مال مردہ ستدن ومال غلیہ از دیگراں
ستدن[1] باتفاق علما، دین اسلام ایں
اموال حرام است بغیر اختلاف و بر ملوک
زمانہ اکثر ایں وجوہات است ازاں سبب
طعام وشراب ایشاں خوردن حرام است[2]

ومال نگینی گراں، مال ماہی فروشاں، مال سبزہ
وترہ فروشاں، مال لمبرہ یعنی اخراجات،
نسبت وقسمت، مال صابون گراں، مال
مصادرہ فروشاں، مال گل فروشاں،
مال جزائی، مال مردہ، مال حوالہ ——
علماء دین اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ
مال حرام ہیں۔ اور چونکہ آج کل کے بادشاہوں
کے محاصل بیشتر انہی پر مشتمل ہیں اس لیے
ان کا کھانا کھانا حرام ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان پر ان خیالات کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اس نے جو ٹیکس معاف کیے تھے اُن میں بیشتر وہی تھے جن کی طرف مخدوم جہانیاںؒ نے اشارہ کیا ہے

علماء سے تعلقات اور نظامِ حکومت پر اُن کا اثر

فیروز شاہ نے مذہبی طبقہ بالخصوص علماء پر انعام واکرام کی بارش کی۔ اس طرح محمد بن تغلق کے لگائے ہوئے زخموں پر اُس نے نہ صرف مرہم رکھ دیا بلکہ ایک ایسے طبقہ کی ہمدردیاں اور معاونت بھی حاصل کرلی جس کی شورشوں سے گزشتہ عہد میں پورے ملک کی فضا خراب ہوگئی تھی۔ فیروز نے علماء، مدرسوں، مفتیوں، مذکروں، حافظوں، ارباب مساجد اور آستانہ داروں کو لاکھوں کی تعداد میں ادرار اور وظائف تقسیم کیے[3]۔ وہ لوگ جو کبھی نانِ شبینہ کو محتاج تھے آرام وآسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔ وظائف کی رقموں میں کئی کئی گنا اضافہ کردیا گیا۔ اور بقول برنی

[1] حاشیہ پر لکھا ہے: "حوالہ وکفالہ"
[2] ملفوظات قطب عالم (قلمی)، ورق ۳۳۔
[3] تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۵۵۹۔

"و بیشترے از طوائف مذکور کہ کفش درست نداشتند از مراحم سلطان فیروز شاہی جامہائے لطیف می پوشند و بر اسپان چیدہ سوار می شوند و بیشتر در علوم دین و تعلم احکام شرع مشغول می باشند"[1]	اس طبقہ کے بہت سے ایسے لوگ جن کے پاس ٹھیک جوتیاں بھی نہ تھیں، سلطان فیروز شاہ کی بخششوں سے (ایسے متمول ہو گئے کہ) نہایت اعلیٰ کپڑے پہننے لگے، عمدہ گھوڑوں پر چڑھنے لگے اور اُن میں سے اکثر آج کل علوم دین اور احکام شرع کی تعلیم میں مصروف رہتے ہیں۔

عفیف کا اندازہ ہے کہ اس طرح چھتیس لاکھ تنکے کے وظائف اور صد لک تنکہ قیمت کی زمین اکھل فقرا اور مساکین کو دی گئی تھی[2]۔ وظائف کی تعداد اور رقمیں بڑھ جانے کے ساتھ دیوانِ رسالت کی (جو ان وظائف کو تقسیم کرتا تھا) اہمیت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں دیوان قضا، کی اہمیت اور اختیارات بھی وسیع ہو گئے۔ یہی دو محکمے ایسے تھے جن میں بیشتر علما ہی ملازم تھے۔ دیوان قضا، دیوان شرع کے نام سے مشہور ہو گیا[3]۔ اور سلطان نے سید جلال الدین کرمانی کو جو صدر جہاں تھے پورے اختیارات تفویض کر دیے۔ برنی نے لکھا ہے:

"اورا در امور احکام شرع محمدی کلاً وجملۃً مطلق العنان گرادنید و تعین ادرارات و انعامات جماہیر علما دار الملک و تمامی بلاد ممالک بصدر صدور جہاں مفوض گشتہ"[4]	ان کو احکام شرع محمدی کے جملہ معاملات میں کلیتاً مطلق العنان بنا دیا۔ دہلی اور تمام ملک کے علماء کے ادرارات اور انعامات کا کام صدر صدور جہاں کے سپرد کر دیا گیا۔

شیخ صدر الدین نبیرہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو شیخ الاسلام بنایا گیا اور اُن کے ساتھ بڑی عزت اور احترام کا برتاؤ کیا گیا۔ ایک دن اُنھوں نے ایک سلسلہ میں سلطان کے احسانات کا ذکر

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۵۵۹۔ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۷۹۔
[3] سیرت فیروز شاہی، ورق ۶۰۔ [4] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۸۰

کیا تو فیروز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہنے لگا:

"شیخ الاسلام چنانچہ دیدی ازاں سلاطین	شیخ الاسلام تم نے دیکھا کہ اُن سلاطین ماضیہ
ماضیہ انار اللہ برہانہم کس نماند جز چند	میں سے کوئی چند روز سے زیادہ باقی نہ رہا
روز۔ ما نیز ازیں جہاں رخت بربندیم	ہم بھی اس جہان سے سفر آخرت کریں گے۔
چوں بزم ما بہ بینی خالی ز ما بگوئی	چوں بزم ما بہ بینی خالی ز ما بگوئی
رندے دریں محلت غوغا زدے حبابی[۱]	رندے دریں محلت غوغا زدے حبابی

فیروز شاہ کے عہد میں علماء و مشائخ کے عروج اور اقتدار کو دیکھتے ہوئے بعض مصنفین نے اس کی حکومت کو مذہبی حکومت قرار دیا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے کہ جہاں تک نظام حکومت کی باگ ڈور کا تعلق تھا وہ قطعی طور پر اُن لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو طبقہ علماء سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس عہد کے عمال و حکام کی فہرستوں[۲] پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ خواجہ حسام الدین جنیدی[۳] اور سید الحجاب خواجہ معروف[۴] کے علاوہ علماء کے طبقہ سے متعلق کوئی شخص نظام حکومت سے وابستہ نہیں تھا۔ لیکن علماء و مشائخ عوام پر اپنے اثر اور سلطان کے مذہبی رجحانات سے فائدہ اُٹھا کر سیاست میں دخیل ہو گئے تھے۔ عین الملک کو مختلف انتظامی معاملات میں علماء و مشائخ کی مدد لینی پڑتی تھی۔[۵] خود فیروز شاہ نے سندھ کے حالات کو قابو میں لانے کے لیے مخدوم جہانیاںؒ کے اثر اور رسوخ سے فائدہ اُٹھایا تھا۔ بعض اوقات عمال حکومت علماء و مشائخ کی

۱۔ تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۹۸۔
۲۔ مثلاً ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی، برنی ص ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ عفیف کی کتاب میں بھی اس عہد کے عمال و حکام کے حالات منتشر طور پر ملتے ہیں۔
۳۔ خواجہ حسام الدین جنیدی، شیخ رکن الدین ملتانیؒ کا مرید تھا۔ عفیف نے اس کو "مردے صالح و متقی و متدین و امین و راستکار و خوش گفتار و نیک رفتار و احسن کردار" لکھا ہے۔ تفصیل کے لیے تاریخ فیروز شاہی ص ۴۰۰-۱-۴۱۴ ملاحظہ ہو۔
۴۔ خواجہ معروف، شیخ نظام الدین اولیاؒ کا مرید تھا۔ حالات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از عفیف ص ۴۴۵-۴۵۱۔
۵۔ منشآت ماہرو۔ مکتوب ۲۰-۲۱-۲۲-۲۵-۳۱ وغیرہ

سفارشوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے، لیکن اس میں اُن کو کامیابی نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک نوسندہ کے بیٹے کو خاں جہاں نے قید کر دیا۔ مخدوم جہانیاںؒ نے خان جہاں سے سفارش کی، لیکن اس نے رہا کرنے سے انکار کیا۔ مخدوم اُنیس بار اس سلسلہ میں خان جہاں کے پاس گئے۔ بالآخر مجبور ہو کر اُس نے رہائی کا حکم دے دیا۔[1]

فیروز شاہ نے جو غیر شرعی ٹیکس معاف کیے تھے اس میں یقیناً مخدوم جہانیاںؒ کا بھی دخل تھا۔ عفیف نے لکھا ہے کہ "علماء و مشائخ بلاد" نے فیروز کو ان ٹیکسوں کے معاف کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔[2] سلطان نے اپنی فتوحات میں جن لوگوں کے قتل کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ اس معاملہ میں اس نے علماء کی رائے پر عمل کیا تھا۔

مالی نظام اور شریعت | فیروز شاہ نے مالی نظام کو شریعت کے مطابق ترتیب دینے کی کوشش کی اور حکم دیا کہ

"مالے کہ در بیت المال جمع آید ہماں	جو روپیہ بیت المال میں جمع کیا جائے انہی محاصل
وجوہات باشد کہ در شرع مصطفیٰ صلی	سے آیا ہو جو شریعت محمدی میں جائز قرار دیے
اللہ علیہ وآلہ وسلم آمدہ است وکتب	گئے ہیں اور دینی کتابیں جن کی تصدیق کرتی
دینیہ براں ناطق است ۔۔۔ و وجہے	ہیں ۔۔۔ جن ٹیکسوں کا وصول کرنا قرآن کے
کہ جمع کردن آں بہ حکم کتاب درست	مطابق نہ ہو ان کو کسی صورت میں بھی بیت المال
نباشد، بہ ہیچ وجہ در بیت المال جمع	میں جمع نہ کیا جائے۔
نہ کنند"[3]	

اس حکم کے ماتحت مندرجہ ذیل ٹیکس[4] معاف کر دیے گئے:

---

[1] سیر العارفین ص ۱۵۷۔ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۷۴-۳۷۵-۳۷۷۔

[3] فتوحات فیروز شاہی ص ۶۔

[4] یہ فہرست فتوحات فیروز شاہی، (ص ۵) سیرت فیروز شاہی (ورق ۶۱) اور تاریخ فیروز شاہی، عفیف (ص ۳۷۵-۳۷۶) کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے۔

(۱) منڈوی برگ[۱] : منڈی کا ٹیکس
(۲) دلالت بازارہا : دلالوں پر ٹیکس
(۳) جزاری[۲] : قصائیوں پر ٹیکس
(۴) امیری طرب : تماشوں، ناچ رنگ پر ٹیکس
(۵) گل فروشی : پھولوں کی فروخت پر ٹیکس
(۶) ضربیہ تنبول[۳] : پان پر ٹیکس
(۷) چنگی غلہ[۴] : غلہ پر چنگی۔
(۸) کیالی[۵] : تولنے والوں پر ٹیکس
(۹) نیل گری[۶] : رنگ بنانے پر ٹیکس
(۱۰) ماہی فروشی[۷] : مچھلی بیچنے پر ٹیکس
(۱۱) ندّافی : دھنے پر ٹیکس
(۱۲) صابون گری : صابون بنانے پر ٹیکس
(۱۳) ریسماں فروشی[۸] : رسّی اور ڈوریوں کے بنانے پر ٹیکس۔
(۱۴) روغن گری : تیل نکالنے پر ٹیکس
(۱۵) نخود بریاں[۹] : بھنے ہوئے چنوں پر ٹیکس

۱؎ سیرت میں "منڈہ ترک" دیا ہے (ورق ۶۱)۔ شیخ عبدالرشید نے اس کو ترکاری پر، اور رائے نے پانوں پر ٹیکس بتایا ہے۔ قریشی نے حکومت کی منڈی میں فروخت ہونے والے غلہ پر قرار دیا ہے۔ مہدی حسین اور ایشوری پرشاد نے منڈی کا ٹیکس قرار دیا ہے۔ سیرت میں چونکہ خضراوات (سبزی) پر ایک ٹیکس کا ذکر آیا ہے اس لیے یہ ٹیکس سبزی پر نہیں ہو سکتا۔

۲؎ عفیف نے اس طرح تشریح کی ہے: "چوں قصابے مادہ گاوے ذبح کند در ہر سرے دوازدہ جیتل بدہد" ص ۳۷۵

۳؎ سیرت میں اور برٹش میوزیم کے نسخہ فتوحات میں 'ضربیہ تنبول' دیا ہوا ہے۔ شیخ عبدالرشید اور چغتائی نے 'جزیہ تنبول' دیا ہے۔

۴؎ سیرت میں "چنگری غلہ" اور ملفوظات مخدوم جہانیاں میں "مال جکری غلہ" دیا ہے۔

۵؎ قریشی، شیخ عبدالرشید، مہدی حسین اور ایشوری پرشاد نے اسے "کتابی" پڑھا ہے اور عرائض نویسوں اور کتابوں پر ٹیکس قرار دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ لفظ کیالی ہے۔ (کیال بمعنی ناپنے تولنے والا)۔ سیرت میں بھی یہ لفظ کیالی دیا ہوا ہے۔ غلطی سے "کتابی" یا "کبابی" پڑھ لیا گیا ہے۔ ہمارے خیال کی تائید ملفوظات مخدوم جہانیاں سے بھی ہوتی ہے

۶؎ رائے نے "بیل گری" پڑھا ہے۔ چغتائی نے اس سے مراد وہ مسالہ لیا ہے جو عمارتوں کی تعمیر میں استعمال ہوتا ہے۔

۷؎ سرور الصدور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس پیشہ میں کوئی یافت نہ رہی تھی۔ "ازیں کار رہایش نیست" (قلمی نسخہ ص ۳۶)

۸؎ ایشوری پرشاد نے "ریشماں فروشی" پڑھا ہے اور اس کے معنی سلک بیچنے پر ٹیکس بتلائے ہیں جو صحیح نہیں۔

۹؎ سیرت میں "نخود بریاں گری" دیا ہوا ہے۔

(۱۶) تہ بازاری: خوانچہ والوں پر ٹیکس
(۱۷) چھتہ[1]: چھتہ پر ٹیکس

(۱۸) قمارخانہ: جوئے خانوں پر ٹیکس
(۱۹) دادبیگی: کورٹ فیس

(۲۰) کوتوالی: پولیس سے متعلق فیس
(۲۱) احتسابی: محکمہ احتساب سے متعلق فیس

(۲۲) قصابی[2]: قصابوں پر ٹیکس
(۲۳) کوزہ وخشت پزی: اینٹیں اور مٹی کے برتن بنانے پر ٹیکس

(۲۴) کرہی[3]: دیہات کے مکانوں پر ٹیکس

(۲۵) چرائی[4]: چرانے پر ٹیکس
(۲۶) مصادرات[5]: جرمانے

(۲۷) خضراوات: ترکاری پر ٹیکس
(۲۸) دانگانہ[6]

(۲۹) مستغل: دہلی کے مکانوں اور دکانوں پر ٹیکس۔

اورنگ زیب کے عہد کے ایک ہندو مورخ نے ان ٹیکسوں کے علاوہ بھی کئی اور ٹیکسوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پوری عبارت قابل غور ہے۔ لکھتا ہے:

"واز اخذ محصول مثل گل فروشی ونیل گری وماہی فروشی وندافی وریسماں فروشی ونخود بریاں گری ودکانانہ وقمارخانہ ودادبیگی، وکوتوالی وقصابانہ وطومانہ، و

[1] قریشی اور ایشوری پرشاد نے اسے "چھپہ" پڑھا ہے۔ قریشی نے اس سے مراد چھپا ہوا کپڑا لیا ہے۔ سیرت میں یہ لفظ "جھبہ" دیا ہوا ہے۔ کیا اسے ملفوظات مخدوم جہانیاں کا "حبہ" پڑھا جا سکتا ہے؟

[2] قصابی اور جزاری میں غالباً یہ فرق تھا کہ 'جزاری' صرف گائے پر لیا جاتا تھا اور 'قصابی' عام ٹیکس تھا جو جانوروں کے کاٹنے پر لیا جاتا تھا۔

[3] کرہی کو گڑھی بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ قریشی نے چرائی اور کرہی کو ایک ہی چیز قرار دیا ہے۔ مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۲۸۷-۲۸۸۔ تاریخ مبارک شاہی ص ۱۰۲۔

[4] علاء الدین خلجی کا حکم تھا: "از گاؤ میش یا گوسفند ہرچہ شیر آور بود چرائی بستانند" برنی ص ۲۸۷۔

[5] سیرت میں کوزہ وخشت پزی اور مصادرات کا ذکر نہیں ہے۔ ان کی جگہ 'خضراوات' اور 'دانگانہ' کا ذکر ہے۔ دانگانہ کا ذکر عفیف نے بھی کیا ہے۔

[6] عفیف لکھتا ہے: "آں مقدار قماش کہ در سرائے عدل زکوٰۃ شود از قسم نصاب وغیر نصاب بعد از فارغ شدن وستدن مال زکوٰۃ آں تمام اقماش در خزینہ می آوردند واز سر وزن می کردند ودر تنکہ یک دانگ می ستدند" ص ۳۷۵۔

[7] اس ٹیکس کا ذکر صرف عفیف نے کیا ہے۔

نکاحانہ، و دہر یچہ و تول لسپر و جوار و نشکر و روغن گراں و پزاوہ خشت، وشیر و جغرات وکاہ چرائی و تراز و کشتی و فروعی و شکرانہ و جرمانہ و سازندہا کہ روز شادی بخانہ مردم میروند و خرید و فروخت زمین و ظروف سفالی و کولہ استخوان ہندوان کہ بگنگ می برند وغیر ذلک کہ باعث آزار عامہ برایا ست اجتناب داشت "[1]

ان محاصل کے معاف ہو جانے سے حکومت کو کافی مالی نقصان ہوا[2]۔ علاوہ ازیں جو محاصل باقی رہے اُن کی شرعی نوعیت کو متعین کیا گیا۔ مال غنیمت کے سلسلہ میں یہ "رسم و عادت" تھی کہ چار حصّے دیوان میں چلے جاتے تھے، ایک حصّہ "غانمان" میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ فیروز نے شرعی تناسب قائم کر دیا[3]۔

فیروز شاہ کے زمانہ میں جو محاصل وصول کیے جاتے تھے وہ یہ تھے :۔

خراج اراضی، عشور، زکوٰۃ، جزیۂ ہنود، ترکات، خمس غنائم و معادن[4]۔ فیروز شاہ نے نہروں کے بنوانے میں کافی روپیہ صرف کیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سارے ملک کے مشہور علماء اور مشائخ کو جمع کیا اور اُن سے فتویٰ طلب کیا کہ شرعاً وہ اس سلسلہ میں کوئی ٹیکس عائد کر سکتا ہے علماء نے فیصلہ کیا کہ اُسے حق شرب وصول کرنے کا اختیار ہے[5]۔ چنانچہ یہ ٹیکس وصول کیا جانے لگا۔

شیعوں کے ساتھ برتاؤ مخدوم جہانیاںؒ نے اپنے ملفوظات میں مسلمانوں کے ان چھ گروہوں کو باطل قرار دیا ہے : روافضیہ، خارجیہ، جبریہ، قدریہ، جہمیہ، اور مرجیہ[6] اور پھر اُن کے عقائد سے تفصیلی بحث کی ہے۔ روافضیہ کے بارہ فرقے بتائے ہیں، جن میں سے ایک فرقہ متربصیہ

---

[1] خلاصۃ التواریخ ص ۲۴۹، نیز ملاحظہ ہو زبدۃ التواریخ ورق ۴۶۔

[2] عفیف کا خیال ہے کہ اس طرح حکومت کو تقریباً انتیس لاکھ تنکے کا نقصان ہوا تھا۔

[3] فتوحات فیروز شاہی ص ۵، نیز سیرت فیروز شاہی ورق ۶۲۔ [4] فتوحات فیروز شاہی ص ۶۔

[5] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۱۲۹۔۱۳۰ [6] ملفوظات قطب عالم (قلمی) ورق ۱۶۳، سیرت فیروز شاہی (ورق ۶۳۔۶۶) میں بھی مختلف مذہبی فرقوں سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ بادشاہ اور امام کے خلاف جنگ کرنا جائز سمجھتے ہیں[۱]۔ خارجیہ کے ایک فرقہ خازمیہ کے متعلق لکھا ہے کہ ـــ

"یکے عورت را نکاح کند، ہر کرا شہوت آید با او مجامعت کند، منع نیست"[۲]

غالباً اسی قسم کے عقائد کے خطرناک دینی، سماجی اور سیاسی نتائج کا احساس کرتے ہوئے فیروز شاہ نے اپنے عہد کے بعض شیعہ فرقوں کو سزائیں دی تھیں۔ ورنہ جہاں تک اہلِ بیت سے عقیدت کا تعلق تھا اس کا حال بقول برنی یہ تھا کہ

"در اخلاص اہل بیت رسول رب العالمین	اہل بیت سے اخلاص اور خاندان نبوی سے
و در محبت خاندان خاتم النبیین گوئے سبقت	محبت میں وہ ربع مسکوں کے بادشاہوں
از بادشاہان ربع مسکوں ربودہ"[۳]	سے بازی لے گیا تھا۔

فتوحات میں لکھتا ہے:۔

"شیعی مذہباں[۴] کہ ایشاں را روافض	شیعہ مذہب کے لوگ جنہیں رافضی کہتے ہیں،
می گویند، بہ مذہب رفض و شیعہ مردم	لوگوں کو رفض اور شیعہ مذہب اختیار کرنے کی
را دعوت می کردند و رسالہ ہا و کتابہا	دعوت دیتے تھے۔ اور اس مذہب سے متعلق
دریں مذہب پرداختہ و تعلیم و تدریس	کتابیں اور رسالے لکھ کر اس کی ترویج و تبلیغ
پیشہ ساختہ بودند۔ و جناب خلفائے	کرتے تھے اور خلفائے راشدین اور ام المومنین
راشدین و ام المومنین حضرت عائشہ	حضرت عائشہ صدیقہ رض اور تمام صوفیائے
صدیقہ و جمیع صوفیہ کبار رضی اللہ عنہم را	کرام کو علانیہ برا بھلا کہتے تھے۔ لواطت کا

[۱] ملفوظات قطب عالم (قلمی) ورق ۱۶۳۔۱۶۴۔ [۲] ایضاً ورق ۱۶۵

[۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۸۰ [۴] سیرت فیروز شاہی (ورق ۶۳) میں لکھا ہے کہ یہ لوگ حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض کے پتلے بنا کر ان کی بے حرمتی کرتے تھے۔ سیرت کے مصنف نے لکھا ہے کہ ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ "تعصب دینی بر جبین ہمایوں ظاہر شد" اور فیروز شاہ نے حکم دیا کہ: "در مملکت ہند جز اہل سنت و جماعت ہیچ دیگر مذاہب مختلفہ نیست۔ و آنکہ مشرکان ہنداند . . . با خذ جزیہ ایشاں را رہا می کنیم"۔

سبِ صریح و شتم قبیح می گفتند ولواطت	ارتکاب کرتے تھے اور قرآن مجید کو "ملحقات عثمانی"
می کردند و قرآن مجید را "ملحقات عثمانی"	کہتے تھے۔ ہم نے ان سب کو گرفتار کرالیا اور
می خواندند۔ ہمہ را گرفتیم و بر ایشاں	جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ خود بھی گمراہی میں
ضلال و اضلال ثابت شد۔ غالیاں	مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں تو
را سیاست فرمودیم و دیگراں بہ تعزیرو	ہم نے ان لوگوں کو جو کٹر تھے قتل کرادیا اور
تہدید و تشہیر زجر کردیم و کتب ایشاں	باقی لوگوں کو سزا، تاکید و تشہیر کے ذریعہ تنبیہ
را در ملاء عام بسوختیم تا شرآں طائفہ	کی اور ان کی کتابوں کو شارع عام پر جلادیا
بہ عنایت ربانی بہ کلی مندفع شد[1]	یہاں تک کہ خدا کے فضل سے اس فرقہ کا
	فتنہ بالکل دفع ہو گیا۔

انا الحق کی صدائیں اور فیروز شاہ کا ردعمل

فیروز شاہ کے عہد میں دہلی اور گجرات سے انا الحق کی دو صدائیں اُٹھیں جو حقیقت میں وحدت الوجود کے پیدا کیے ہوئے ذہنی موسم کی پیداوار تھیں۔ فیروز شاہ کا بیان ہے کہ بہار کا احمد نامی ایک باشندہ دہلی میں آکر بس گیا تھا۔ معتقدین کا ایک گروہ اس کے گرد جمع ہو گیا اور اس کو "خدا" کہنے لگا۔ اس کا ایک مرید کہا کرتا تھا کہ "دہلی میں خدا طلوع ہوا ہے"۔ علاوہ ازیں احمد بہاری پر سبِ نبی کا بھی الزام تھا۔ فیروز نے ان لوگوں کو پابہ زنجیر بلوایا۔ احمد بہاری اور اس کے مرید خاص کو قتل کرادیا اور باقی لوگوں کو اِدھر اُدھر منتشر کر دیا[2]۔

فیروز نے جس طرح اس واقعہ کو پیش کیا ہے اس سے پوری نوعیت واضح نہیں ہوتی۔ مناقب الاصفیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ وحدت الوجودی فکر کو روکنے کے سلسلہ میں پیش آیا تھا۔ اور بعض حلقوں میں اس پر ناراضگی کا اظہار بھی کیا گیا تھا۔

احمد بہاری، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ سے گہرا تعلق خاطر رکھتے تھے۔ گو دیوانہ شکل تھے

---

[1] فتوحات فیروز شاہی ص ۶ ، [2] ایضاً ص ۷۔

لیکن توحید کے اسرار و رموز پر بڑی نظر تھی۔ شیخ منیریؒ سے اکثر ان کی اس موضوع پر گفتگو رہتی تھی بعض اوقات عالمِ دیوانگی میں ایسی باتیں زبان پر آتے تھے جو عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہوتی تھیں۔ اُن کے ایک دوست شیخ عز کاکو کے رہنے والے تھے۔ اُن کی گو شیخ منیریؒ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن خط و کتابت کا رشتہ رکھتے تھے۔ شیخ نے اُن کو جو خطوط لکھے تھے وہ اُجوبہ کاکوی کے نام سے مشہور ہیں۔ احمد بہاری اور شیخ کاکوی دونوں فیروز شاہ کے عہد میں دہلی آئے اور یہاں

"در توحید سخنہائے فراخ و شطح گفتند"

دہلی کے علماء نے سلطان سے شکایت کی۔ اس نے محضر ترتیب دیا اور اکابر شہر کو جمع کیا سب علماء نے اُن کے قتل کا فتویٰ دیا۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کو جب اُن کے قتل کی اطلاع ملی تو فرمایا:

"در شہرے کہ خون ایں چنیں بزرگاں	جس شہر میں ایسے بزرگوں کا خون بہایا
ریختہ شود عجب بود اگر آں شہر آباداں بماند"	جائے تعجب ہی ہے اگر وہ آباد رہے۔

صاحبِ مناقب الاصفیاء کا کہنا ہے کہ یہی وجہ تھی کہ فیروز شاہ کے زمانہ میں ہی خرابی کے آثار پیدا ہو گئے اور اس کے بعد تو تیمور کے ہاتھوں دہلی کی خوب بربادی ہوئی[1]

اسی زمانہ میں عین الملک ماہرو کے ایک غلام نے گجرات میں سجادۂ مشیخت بچھا دیا تھا اور مریدین کا ایک حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ وہ خود "انا الحق" کہتا تھا اور اس کے مریدین "توئی، توئی" کہہ کر اس کی تصدیق کرتے تھے۔ اس نے اپنے افکار کی تشریح میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ فیروز نے اس کو قتل کرایا اور اس کے رسالہ کو جلا دینے کا حکم دیا[2]

نواہون کا قتل | احمد بہاری کا قتل اگر وحدت الوجود کے خیالات کو روکنے کی کوشش تھی تو نواہون کا قتل بھگتی تحریک کے خلاف صدائے احتجاج تھی جس زمانہ میں مخدوم جہانیاںؒ

---

[1] مکتوبات بست وہشت ص ۳۴۶-۳۴۷۔ [2] فتوحات فیروز شاہی ص ۸۔

مرض الموت میں مبتلا تھے، اوچھ کا ہندو داروغہ نواہوں ان کی عیادت کو آیا اور کہنے لگا:

"خدائے تعالیٰ حضرت مخدوم را صحت	خدا تعالیٰ حضرت مخدوم کو صحت عطا فرمائے
دہد ذات پاک مخدوم ختم اولیا ست	مخدوم کی ذات ختم اولیاء ہے جس طرح حضرت
چنانکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ختم انبیاء بود"[1]	محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ختم انبیاء تھی۔

مخدوم جہانیاںؒ اور اُن کے بھائی شیخ صدر الدین راجو قتالؒ نے اس بیان کی بنیاد پر نواہون سے مطالبہ کیا کہ وہ اسلام قبول کر لینے کا صاف طور پر اعلان کرے۔ نواہوں نے انکار کیا تو اس پر مرتد ہو جانے کا الزام لگایا۔ نواہوں بھاگ کر دہلی پہنچ گیا۔ اسی اثناء میں مخدوم جہانیاںؒ کا انتقال ہو گیا۔ سیوم کے بعد راجو قتالؒ گواہوں کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے اور گو بعض علماء نے اُن کے نقطۂ خیال کی تائید نہیں کی لیکن اُنھوں نے فیروز کو مجبور کر کے نواہون کو ارتداد کی سزا میں قتل کرا دیا[2]۔

رکن الدین کا قتل | دہلی کے ایک باشندہ رکن الدین نے اعلان کیا کہ ـــ

"مہدی آخر الزماں منم و مرا علم لدنی	مہدی آخر الزماں میں ہوں اور مجھ کو علم سینہ
حاصل شدہ است و من از پیش کسے	حاصل ہو گیا ہے۔ میں نے کسی سے تعلیم و فیض
تعلیم و استفادہ نہ کردہ ام، و اسمائے جمیع	حاصل نہیں کیا۔ اور مجھ کو تمام مخلوقات کے
مخلوقات کہ از آں جز آدم ہی علیہ السلام	ناموں کا علم ہے جس کو سوائے آدم علیہ السلام
ہیچ پیغمبرے را علم نبودہ است مرا معلوم	کے کوئی پیغمبر نہیں جانتا تھا، اور علم حروف کے
شدہ است، و اسرار علم حروف کہ بر	وہ راز جو کسی کو معلوم نہیں مجھ پر ظاہر کر دیے
ہیچ کس مکشوف نبود بر من کشف گردید"[3]	گئے ہیں۔

اس نے ان خیالات کی توضیح میں کتابیں بھی لکھی تھیں، اور لوگوں کو دعوت دی تھی کہ اُسے پیغمبر تسلیم کر لیں۔ علماء نے فیروز کی توجہ اس فتنہ کے خطرناک اثرات کی طرف دلائی۔ چنانچہ

---

[1] سیر العارفین ص ۱۵۹۔ [2] ایضاً ص ۱۶۰ [3] فتوحات فیروز شاہی ص ۷-۸

اُس نے رکن الدین کو معہ اس کے ساتھیوں اور معتقدین کے اس طرح ختم کیا کہ۔

"خاص و عام خلق در آمدہ و گوشت و پوست — سب خاص و عام جمع ہو گئے اور اس کے

واعضائے اورا پارہ پارہ کردند"[1] — گوشت، کھال اور جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اباحتی فرقہ کو سزا | فیروز شاہ کے عہد میں اباحتیوں کا ایک گروہ دہلی میں جمع ہو گیا تھا اور لوگوں کو اباحتی طرز زندگی کی طرف ترغیب دیتا تھا۔ ان لوگوں کا دستور تھا کہ رات کو کسی مقام پر جمع ہو کر شراب پیتے تھے اور ایک "صورت" کے سامنے لوگوں سے سجدہ کراتے تھے اور پھر زنا کے مرتکب ہوتے تھے۔ فیروز نے اُن کو سخت سزائیں دیں۔ کچھ کے سر کٹوا دیے، کچھ کو قید میں ڈال دیا، کچھ کو جلا وطن کر دیا۔ اس طرح اباحتی زندگی کا دہلی میں خاتمہ ہو گیا[2]

عورتوں کے مزارات پر جانے کی ممانعت | چودہویں صدی کے نصف آخر میں تصوف نے ہندوستان میں نہایت ہی بدنما شکل اختیار کر لی تھی اور صدہا مخرب اخلاق رسمیں اور گمراہ کن بدعات عام ہو گئی تھیں[3] ایک بڑی گمراہی یہ تھی کہ عورتیں کثیر تعداد میں مزارات پر جاتی تھیں اور شہر کے "لوندان و مردان اوباش" اُن کے پیچھے ہو لیتے تھے اور مزارات پر طرح طرح کی حیا سوز حرکتیں ظہور میں آتی تھیں۔ فیروز شاہ نے حکم نافذ کیا کہ کوئی عورت مزار پر نہ جائے خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دی گئیں اور اس طرح یہ فتنہ ختم ہوا[4] سجان رائے اور شیخ نور الحق کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ نے اسی طرح ہندو عورتوں کو بھی مندروں میں جانے سے روکا تھا[5]

قیام مدارس | سیرت میں فیروز کے متعلق لکھا ہے:

---

[1] فتوحات فیروز شاہی ص ۷-۸۔ [2] ایضاً ص ۷، نیز سیرت فیروز شاہی

[3] ملاحظہ ہو ملفوظات قطب عالم (ورق ۵۵) جہاں قبروں سے متعلق بدعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

[4] فتوحات فیروز شاہی ص ۸-۹۔ [5] خلاصۃ التواریخ ص ۳۵، زبدۃ التواریخ ورق ۴۷

سجان رائے نے لکھا ہے: "عورات مسلمہ و ہنود بر مزارات و بت خانہ منع کرد" لیکن خود فیروز کا کہنا ہے کہ "مستورات مسلمانان بیروں آیند"

"از شمائل حمیدہ اشاعت علم است و قامت مدارس علوم"[1]

نظام الدین بخشی اور فرشتہ نے اس کے قائم کیے ہوئے مدارس کی تعداد تیس بتائی ہے[2]۔ ان مدرسوں میں مدرسہ فیروز شاہی، مدرسہ سری، اور مدرسہ شاہزادہ بزرگ فتح خاں[3] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مدرسہ فیروز شاہی اس دور کا سب سے زیادہ اہم تعلیمی مرکز تھا[4]۔ حوض خاص کے کنارے ایک خوشنما باغ کے صحن میں مدرسہ کی دو منزلہ عمارت تھی۔ شیراز اور دمشق کے قالین ہر طرف بچھے ہوئے تھے۔ مدرسہ کے پرنسپل مولانا جلال الدین رومی اپنے زمانہ کے مشہور عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کے علمی تبحر کا یہ حال تھا کہ ــــ

راوی ہفت قرأت سند چار دہ علم + شارح پنج سنن مفتی مذہب ہر چار

اساتذہ مصری دستار اور شامی جبہ استعمال کرتے تھے[5]۔ طلباء کو اخراجات کے لیے خزانہ سے مالی مدد ملتی تھی۔ اقامتی زندگی پر خاص زور تھا اور اساتذہ اور تلامذہ کے درمیان گہرا ربط و ضبط تھا۔ مدرسہ میں عبادت کے لیے حجرے بھی بنے ہوئے تھے۔ کھانے کا انتظام سلطان کی طرف سے تھا۔ مطہر نے طلباء کے سامنے جو کھانے دیکھے تھے، اُن کی تفصیل اسی کی زبانی سنیے:

همه دراج و کبوتر بچه کبک و کلنگ   ماهی و مرغ مسمن بره کوه وقار
قرص بریان زلیبا و دگر آرایش   خشت و لوزینه تر و خشک بهر سو انبار[6]

فیروز کے قائم کیے ہوئے مدارس میں جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی، وہ یہ تھے ــــ

(۱) علم فقہ (۲) قرأت (۳) اصول کلام (۴) اصول فقہ (۵) تفسیر
(۶) احادیث (۷) معانی و بیان (۸) نحو و صرف (۹) علم نظر (۱۰) علم ریاضی
(۱۱) طبیعی (۱۲) الٰہی (۱۳) علم طب (۱۴) تحریر و خط[7]

---

[1] سیرت فیروز شاہی ورق ۳، ۷۔ [2] طبقات اکبری جلد اول ص ۲۴۱۔
[3] سیرت فیروز شاہی ورق ۱۰۶ [4] اس مدرسہ کے متعلق تفصیلی معلومات درکار ہوں تو خاکسار کی کتاب Studies in Medieval Indian History ملاحظہ فرمائیے۔
[5-6] ملاحظہ ہو دیوان مطہر اورنٹیل کالج میگزین مئی ۱۹۳۵ء [7] سیرت فیروز شاہی ص ۳، ۷۔

خلافت سے تعلقات | فیروز اذنِ خلافت کو "صحت سلطنت" کے لیے ضروری سمجھتا تھا خود لکھتا ہے:

درست نباشد تا خود را بخادمی حضرت — جب تک اپنے آپ کو خلیفہ کا خادم نہ بنا لے اور
مشرف نہ گرداند و اذن از آں درگاہ — اس کی مقدس درگاہ سے اجازت نہ حاصل
مقدسہ نیابد" ؎۱ — کرے (حکومت) جائز نہیں۔

حکومت کے تیسرے سال میں جب اس کو درگاہ خلافت سے منشور عطا ہوا تو اُس نے "جشنِ عام" منا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا؎۲۔ عفیف نے لکھا ہے کہ محمد بن تغلق کے لیے جامۂ خلافت اس کی درخواست پر آیا تھا۔ لیکن فیروز کے لیے "بے التماس" آیا؎۳۔ سب سے پہلے ۷۵۴ھ (۱۳۵۳ء) میں المعتضد باللہ ابوبکر بن الحاکم نے شیخ شہاب الدین احمد صامت کے ہاتھ منشور روانہ کیا اور فیروز شاہ کو سیف الخلافت، قسیم امیر المومنین خطابات عطا فرمائے۔ ۷۶۴ھ (۱۳۶۲ء) میں محمد ابوبکر المتوکل علی اللہ نے قاضی بہاء الدین اور خواجہ کافور کے ہاتھ اس مضمون کا منشور بھیجا کہ

"تفویض کردیم ما سید السلاطین فیروز شاہ را مملکت اقلیم ہند و آنچہ منسوب است بداں از جزیرہ سراندیپ و جاوات و معبر و سیلان و کولم و سولیاں، ہنو و باکنور و بنگالہ و لکھنوتی و تلنگ و دیوگیر و سواحل بحر مالوہ و گجرات و دہلی و کوہہا قراجل و سندھ حدود افغانیہ ولوہہا آں تا کشمیر و زاولستان تا حدود ترک و ماوراء النہر والی گردانید . . ." ؎۴

اسی منشور میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو سید السلاطین کی تابعداری کریگا اُس نے گویا خدا اور رسول کی تابعداری کی اور

"ہر کہ بے فرمانی کنند و لبے فرمانی کردہ باشد — جس کسی نے اس کی (فیروز شاہ کی) نافرمانی کی اس
ما را رسول را وعاصی باشد خدا را . . ." ؎۵ — نے ہماری نافرمانی کی اور رسول کی نافرمانی کی اور اللہ کی نافرمانی کی

؎۱ فتوحات فیروز شاہی ص ۱۸۔ ؎۲ تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۲۷۵
؎۳ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۷۴ ؎۴-۵ سیرت فیروز شاہی، ورق ۱۴۰

۷۶۰ھ/۱۳۵۸ء میں بہمنی سلطان علاء الدین حسن کے انتقال پر اس کا بیٹا سلطان محمد تخت پر بیٹھا۔ اس نے کسی طرح دربار خلافت سے خلعت اور بہمنیہ کے خطبہ وسکہ کی منظوری کا فرمان حاصل کر لیا اور خلعت کو سر پر رکھ کر قیام گاہ تک لایا اور شادیانے بجوائے[1]۔ یہ گویا دکن کی خود مختاری کا دربار خلافت کی جانب سے اعلان تھا۔ اس صورت حال نے فیروز شاہ کے اقتدار شاہی کو زبردست صدمہ پہنچایا، اور "شر طغاۃ" ملک میں برپا ہو گیا۔ فیروز شاہ نے غالباً مرکز کو اس صورت حال کی اطلاع کی، چنانچہ ۷۶۶ھ/۱۳۶۴ء میں متوکل علی اللہ کی طرف سے ناصر الدین دواتدار خلیفہ اور اشرف الدین رفاعی کے ذریعہ دوسرا منشور آیا، جس میں لکھا تھا:

سید السلاطین فیروز شاہ را معلوم باد	سید السلاطین فیروز شاہ کو معلوم ہو کہ میرے دادا،
کہ جد من و والد من و من ہر ہیچ کسے از	میرے باپ اور میں نے ہندوستان کے بادشاہوں
بادشاہان ہند جز صاحب تخت دہلی	میں سے سوائے صاحب تخت دہلی کے کسی کو منشور
منشور ننبشتہ ایم و اذن سلطنت	نہیں لکھا ہے اور سلطنت کی اجازت نہیں دی
ندادہ ترا السلطنت و امارت ممالک ہند	ہے تجھے ممالک ہند کی سلطنت اور امارت تفویض
مفوض گردانیدہ ایم پس ہر کہ اطاعت	کی گئی ہے پس جو کوئی تیری اطاعت کریگا ایسا ہے
کند ترا اطاعت کردہ باشد مارا ....."[2]	جیسے اس نے ہماری اطاعت کی۔

معلوم نہیں کہ سلطان محمد بہمنی نے جعل بنایا تھا، یا خلیفہ نے غلط بیانی سے کام لیا۔ بہر حال اس منشور کے آجانے سے فیروز شاہ کی سلطنت میں سکون اور قرار پیدا ہو گیا۔ برنی نے لکھا ہے کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف تو دلہائے عوام و خواص "اطاعت و انقیاد" کی طرف راغب ہو گئے، دوسری طرف بلاہائے آسمانی کے دروازے بند ہو گئے اور کثرت زراعت اور رفارغ البالی کے آثار نمودار ہونے لگے[3]۔

---

[1] خلافت اور ہندوستان - سید سلیمان ندوی ص ۲۵ [2] سیرت فیروز شاہی ورق ۱۴۱

[3] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۹۸ - ۵۹۹ -

فیروز نے محمود شمس کے ہاتھ دربار خلافت کو ہندوستان کے اوقاف، مساجد و رباطات و مدارس و خوارنق وغیرہ کے متعلق پوری تفصیل روانہ کی ۷۷۱ھ ۱۳۶۹ء میں محمود شمس کے ساتھ قاضی نجم الدین قریشی اور خواجہ کافور بھی آئے اور خلیفہ کی جانب سے ایک "وقف نامہ" ساتھ لائے جس میں غالباً فیروز کو ہندوستان کی سلطنت وامارت پر بلا شرکت غیرے پورا حق دیا گیا تھا۔ فیروز نے اس وقف نامہ کے نسخے "اطراف واقصار بلاد" میں تقسیم کرائے۔ صاحب سیرت نے لکھا ہے کہ اس طرح کا وقف نامہ اس سے پہلے کسی بادشاہ کو دربار خلافت سے حاصل نہیں ہوا تھا۔[۱]

خطبوں میں سلاطین کے القاب

سلاطین ماضیہ کے نام عیدین اور جمعہ کے خطبوں میں نہیں پڑھے جاتے تھے۔ فیروز شاہ نے حکم دیا کہ جن بادشاہوں کی جدوجہد اور کوشش مسلسل سے ہندوستان فتح ہوا تھا، اُن کے القاب کو خطبوں میں ضرور پڑھا جائے اور اُن کے لیے دعائے مغفرت کی جائے۔[۲] عفیف نے ان ناموں کی فہرست دی ہے جو خطبہ میں پڑھے جاتے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ اس میں قطب الدین ایبک، علاءالدین مسعود، معز الدین بہرام، رضیہ اور کیقباد کے نام شامل نہیں ہیں۔

رفاہ عام کے کام

فیروز شاہ نے رفاہ عام کے کاموں میں گہری دلچسپی لی اور ان میں کافی وقت اور روپیہ صرف کیا۔ اس نے متعدد نئے شہر[۳] اور بہت سے چھوٹے چھوٹے قصبے آباد کیے۔ نظام الدین احمد نے اس کے بنوائے ہوئے بندوں، نہروں، تالابوں، مسجدوں، مدرسوں، پلوں وغیرہ کی تعداد بتائی ہے[۴]۔ اس کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفصیل فتوحات فیروز شاہی سے

---

[۱] سیرت فیروز شاہی ورق ۱۴۱۔ [۲] فتوحات فیروز شاہی ص ۴-۵، سیرت فیروز شاہی ورق ۶۳-۶۴۔ تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۱۰۵-۱۰۷۔ [۳] مثلاً فیروز آباد، حصار فیروزہ، جون پور، فتح آباد وغیرہ۔ فیروز آباد کے متعلق سٹہر کا ترکیب بند پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے (اورنٹیل کالج میگزین مئی ۱۹۳۵ء ص ۱۲۵-۱۲۹)

[۴] طبقات اکبری جلد اول ص ۲۴۱، نیز ملاحظہ ہوں مندرجہ ذیل مضامین

ہوسٹن کا مضمون مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی جنرل ۱۹۱۱ء ص ۹۹-۱۰۸، شارپ کا مضمون مطبوعہ ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن رپورٹ ۱۹۲۲ء ص ۳۴-۴۱۔

اخذ کی گئی ہے۔ لیکن موجودہ نسخے میں یہ تفصیلات درج نہیں ہیں۔ بہر حال رفاہ عام کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل کام خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں:

(۱) شفاخانوں کا قیام۔ ان شفاخانوں میں دوا اور غذا فراہم کی جاتی تھی۔ "اُو مقیم و مسافر، وضیع و شریف، احرار و عبید" سب وہاں جا کر علاج کراتے تھے۔[1]

(۲) قید خانوں کی حالت کو بہتر بنایا گیا۔ ہر چاند کی پہلی تاریخ کو قیدیوں کے متعلق مفصل رپورٹ سلطان کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔ اور وہ قید خانوں کی اصلاح میں ذاتی دلچسپی لیتا تھا۔[2]

(۳) کوتوال کو حکم تھا کہ بے روزگار لوگوں کی فہرست تیار کرے۔ ایسے لوگوں کو سلطان کسی کام میں لگا دیتا تھا۔ کام متعین کرنے میں اُن کے خاندانی حالات، تعلیم، اور صلاحیتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔[3]

(۴) غریب لڑکیوں کی شادی کا انتظام کرنے کے لیے ایک دیوان خیرات قائم کیا گیا تھا۔ عفیف کا بیان ہے کہ

"مسلمانانِ فقیر و عورات بیوۂ حقیر از اشخاص صغیر و کبیر از چہار سوئے مملکت در شہر باز آمدند و آسامی دختراں در دیوان نویسانیدند"[4]

(۵) ایک دیوان استحقاق قائم کیا گیا تھا جو مستحقین کی مدد کرتا تھا چھتیس[36] لاکھ تنکہ سالانہ اس پر خرچ ہوتا تھا اور چار ہزار دو سو "دل ریش" غریبوں کو اس سے مشاہرہ دیا جاتا تھا۔[5]

تبرکات حجاز عہد فیروزی میں تین تبرکات حجاز سے آئے تھے۔ کلید کعبہ، موئے رسولؐ اور قدم

---

[1] فتوحات فیروز شاہی ص ۱۵-۱۶، فیروز کو طب میں خاص دلچسپی تھی۔ سیرت میں لکھا ہے: "طب فیروز شاہی باملا و ارشاد ہمایوں مؤلف شدہ است" ورق ۱۷۸۔

[2] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۵۰۹-۵۱۱ [3] ایضاً ص ۳۳۴-۳۳۵

[4] ایضاً ص ۳۵۱، سیرت فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ غریب لڑکوں کی بھی شادی کے سلسلہ میں مدد کی جاتی تھی۔ [5] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۳۵۹-۳۶۰

رسولؐ۔ فیروز شاہ نے ان تبرکات سے بے حد عقیدت کا اظہار کیا۔ کلید کعبہ اور موئے رسول کا ذکر تو سیرت فیروز شاہی میں بھی ملتا ہے[1] لیکن قدمِ رسولؐ کے متعلق کوئی معاصر شہادت نہیں ملتی۔ کہا جاتا ہے کہ جب فیروز کے چہیتے بیٹے فتح خاں کا انتقال ہوا تو اُس نے قدمِ رسولؐ قبر پر لگوا دیا تھا[2]۔ مولوی نذیر حسین دہلوی نے ایک فاضلانہ رسالہ دلیل محکم فی نفی اثر القدم[3] میں اس کی تردید کی ہے اور محدثانہ کلام کیا ہے۔ واقعات مشتاقی سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد سکندری میں "قدم گاہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم" میں پنجشنبہ کو مجلس ہوتی تھی[4]۔

تعمیر مساجد فیروز شاہ نے اپنے عہد حکومت میں کافی تعداد میں نئی مسجدیں تعمیر کرائیں اور بے شمار پرانی مسجدوں کی مرمت کرائی۔ مسجدوں کی تعمیر میں اس کی دلچسپی سے متاثر ہو کر اس کے امراء نے بھی اس طرف توجہ کی اور ملک کے مختلف حصوں میں مسجدیں بنوائیں۔ عہد فیروزی کی مسجدوں میں کلاں مسجد، مسجد فیروز آباد، مہرولی ذیل کی مسجد، بیگم پوری مسجد، کھڑکی مسجد وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سلطان کا یہ دستور تھا کہ جو بھی نیا شہر آباد کرتا تھا وہاں کئی مسجدیں تعمیر کراتا تھا۔ مسجدوں کی تعمیر کے سلسلہ میں اُسے قبلہ کے صحیح رُخ کے تعین کی ضرورت محسوس ہوئی تو بڑی تحقیق کے بعد ایک "قبلہ نما" تیار کیا۔ رمضان کے مہینے میں مسجدوں میں گھڑیالی کا انتظام کیا جس سے لوگوں کو سحر و افطار کے اوقات کی اطلاع ہو جاتی تھی[5]۔

دہلی میں فیروز شاہ کی بنوائی ہوئی جامع مسجد بام و در کی بلندی اور صحن کی وسعت میں اپنی نذیر نہ رکھتی تھی[6]۔ سیرت کا مصنف لکھتا ہے:۔

مسجد است ایں کہ بریں قاعدہ پرداختہ اند
یا بہشتیست کہ بر روئے زمیں ساختہ اند

---

[1] سیرت فیروز شاہی ورق ۱۴۹۔۱۵۰ [2] آثار الصنادید ص ۹۲۔۹۳، نیز Carr Stephen p. 147-148 [3] فخر المطابع دہلی ۱۲۶۷ھ
[4] واقعات مشتاقی (قلمی) ص ۶۱ [5] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۲۵۹
[6] ملاحظہ ہو دیوان مطہر (ص ۱۳۹۔۱۴۰)، تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۵۶۲

ہندوؤں کے ساتھ تعلقات ہندوؤں کے ساتھ فیروز شاہ کے تعلقات کے سلسلہ میں کئی غلط فہمیاں عام ہوگئی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ پر غور کرلیا جائے۔

(۱) جہاں تک ہندوؤں کے عام سماجی اور معاشی حالات کا تعلق ہے برنی کی فتاوائے جہانداری اور تاریخ فیروز شاہی سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کو معاشی سہولتیں حاصل تھیں اور وہ سماجی اقتدار سے بھی محروم نہ تھے۔ دارالسلطنت دہلی میں وہ "رائے" "ٹھاکر" "ساہو" "مہنت" "پنڈت" کے معزز القاب سے مخاطب کیے جاتے تھے[۱] خوط و مقدم کے یہاں دولت کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ بقول برنی

در خانہائے خوطان و مقدمان از	خوطوں اور مقدموں کے گھروں میں گھوڑوں، مویشی
اسپان و مواشی و غلات و اسباب جائے	غلہ اور مال و اسباب کی کثرت کے باعث جگہ نہ رہی
نماندہ و نام احتیاج در رعایا نماندہ"[۲]	تھی اور احتیاج کا نام بھی رعایا میں باقی نہ رہا تھا۔

(۲) فیروز شاہ کو ہندوؤں کے علوم میں گہری دلچسپی تھی۔ جوالا مکھی کے مندر سے وہ تیرہ سو کتابیں لایا تھا اور اُن میں سے کچھ کتابوں کے فارسی میں ترجمے بھی کرائے تھے[۳]۔ اشوک کی لاٹھ کو جس طرح اُس نے میرٹھ سے دہلی لاکر نصب کیا[۴] اس سے ہندوؤں کے تاریخی آثار کو قائم رکھنے کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔

(۳) "رایان و رانگان" سے فیروز کے اچھے تعلقات کا ثبوت عفیف اور برنی دونوں کی کتابوں میں ملتا ہے[۵]۔ لیکن محمد بن تغلق کی طرح اس کے عہد میں ہندو اعلیٰ عہدوں پر متعین نہیں کیے گئے۔ ویسے ایک آدھ ٹکسال میں ہندو افسر یا کسی علاقہ میں ہندو داروغہ کی موجودگی کی

---

[۱] فتاویٰ جہانداری ورق ۱۲۰، [۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۵۴

[۳] منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۴۹، طبقات اکبری جلد اول ص ۲۳۳، تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۴۸، زبدۃ التواریخ ورق ۲۰۵۔

[۴] اس سلسلہ میں فیروز شاہ نے جس دلچسپی کا اظہار کیا اُس کی تفصیل کے لیے سیرت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

[۵] عفیف ص ۶۰، ۱۰۳، ۲۸۱، برنی ص ۵۸۷-۵۹۵۔

شہادتیں ضرور ملتی ہیں۔ لیکن کسی اہم عہدے پر کوئی ہندو نظر نہیں آتا۔ غالباً جہاں فیروز نے اور شعبوں میں محمد بن تغلق کی پالیسی کو بدلا تھا، وہاں ہندوؤں کے تقرر کے سلسلہ میں بھی اس کی پالیسی کو بدل دیا۔

(۴) فیروز شاہ غالباً دہلی کا پہلا سلطان تھا جس نے ہندوؤں کو تبدیلی مذہب کی ترغیب دی۔ خود فتوحات میں لکھتا ہے:

"بہ ترغیب اہل ذمہ بہ سوئے دین ہدیٰ	اہل ذمہ کو سچے مذہب کی طرف ترغیب دینے کی
توفیق یافتم و بہ اعلام گفتیم "ہر کہ از کفار	توفیق ہم نے پائی اور اعلان کر دیا کہ کافروں
کلمۂ توحید گوید و دین اسلام پذیرد چنانکہ	میں سے جو کوئی بھی کلمۂ توحید پڑھے اور دین
در دین محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و	اسلام قبول کرلے اس کو شرع محمدی کے
آلہ وسلم آمدہ است جزیہ از و دور کنند	مطابق جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ جب یہ اعلان
صیت آں بہ گوش عام رسید فوج فوج	لوگوں کے کانوں تک پہنچا تو جوق در جوق
و جماعت جماعت ہنود آمدند و بہ شرف	ہندوؤں کی جماعتیں آنے لگیں اور اسلام
اسلام مشرف شدند" [1]	قبول کرنے لگیں۔

ساتھ ہی ساتھ اس نے ہندوؤں کی ان تحریکوں کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی جن سے اُسے یہ خطرہ تھا کہ شاید بعض مسلمان طبقے ہندو مذہب کی طرف راغب ہو جائیں۔ اس ڈر میں اُس

---

[1] فتوحات فیروز شاہی ص ۱۶-۱۷، محمد بن تغلق نے اسلامی تمدن کو پھیلانے کی ضرور کوشش کی تھی لیکن اس طرح تبدیلئ مذہب کی ترغیب کسی کو نہیں دی۔ مبارک شاہ خلجی کے متعلق ابن بطوطہ نے لکھا ہے: "اس وقت میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی ہندو مسلمان ہونا چاہتا تھا تو . . . بادشاہ کی طرف سے اس کو خلعت اور سونے کے کنگن انعام میں ملتے تھے" (عجائب الاسفار۔ ص ۵۷) اس کی تائید کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوتی۔ اگر یہ بات صحیح بھی ہو تو اس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی اس لیے کہ مبارک خلجی کی مذہبی دلچسپیوں کا ہمیں علم ہے۔

[2] فتوحات فیروز شاہی ص ۹-۱۰۔ عفیف نے لکھا ہے کہ ایک برہمن نے ایک مسلمان عورت کو مرتد کرلیا تھا (ص ۳۸۰-۸۱) فیروز نے علماء سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا: "رخصت شرع بدین است تا ایں زنار دار . . مسلمان شود" اس نے مسلمان ہونے سے انکار کیا تو اُسے آگ میں ڈال دیا گیا۔

نے ان تحریکوں کو بھی روکا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو نزدیک تر لانے میں ممد و معاون ہو سکتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اور ہندوؤں کے درمیان فکری اعتبار سے ایک خلیج پیدا ہو گئی۔ نواہون کا قتل غلط مذہبیت اور تنگ نظری کی بدترین مثال ہے۔

(۵) فیروز نے اپنے زمانہ میں کچھ مندروں کو ضرور منہدم کرا دیا تھا لیکن جن حالات میں یہ مندر منہدم کیے گئے تھے ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بعض مندر جاج نگر اور نگر کوٹ کی مہم کے دوران میں گرائے گئے تھے۔ اور دورانِ جنگ میں عبادت گاہوں کی بربادی اس زمانہ میں عام بات تھی لیکن جس وقت بھی صلح کی صورت پیدا ہوئی ان عبادت گاہوں کی تخریب سے ہاتھ اٹھا لیا گیا۔ مثلاً جوالا مکھی کے مندر کو بالکل اصلی حالت میں اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ وہاں کے راجہ نے اطاعت قبول کر لی تھی۔

ذمیوں کی عبادت گاہوں کے سلسلہ میں شریعت کے دو اصول بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ کسی قدیم عبادت گاہ کو مسمار کرنا یا نقصان پہنچانا قطعاً ناجائز ہے۔ اور دوسرے یہ کہ کوئی نئی عبادت گاہ بغیر حکومت کی اجازت کے تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ فیروز شاہ نے بعض مندروں کو اس لیے منہدم کیا تھا کہ وہ بغیر اجازت تعمیر کیے گئے تھے۔ بعض مندروں کی اخلاقی فضا نہایت خراب تھی اور سلطان نے یہ اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ اُن کو مسمار کر دے۔ فتوحات میں اس نے ان منادر کا ذکر کیا ہے۔ موضع ملوہ میں ایک کنڈ تھا جس کے کنارے ایک مندر بنا لیا گیا تھا۔ وہاں عورتیں اور بچے، مسلمان اور ہندو میلے میں جاتے تھے۔ سلطان نے اس مندر کو منہدم کرا دیا اور وہاں ایک مسجد تعمیر کرا کے دو قصبے تغلق پور اور سالار پور کے نام سے آباد کر دیے۔ صالح پور اور گوہانہ کے مندر بھی مسمار کر دیے گئے لیکن وہاں کوئی مسجد نہیں بنائی گئی۔

(۶) فیروز شاہ سے پہلے برہمنوں سے کسی سلطان نے جزیہ وصول نہیں کیا تھا۔ فیروز شاہ نے علماء و مشائخ سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد حکم دے دیا کہ برہمنوں سے بھی جزیہ وصول کیا جائے۔ اس اعلان سے عام بے چینی پھیل گئی۔ ہر طرف سے برہمن جمع ہو کر سلطان کے پاس

پہنچے اور کہا کہ یہ سیاہ روئی ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ چند دن تک برہمنوں نے کوشک شکار میں فاقہ کیا اور "خود را در معرض ہلاکت آوردند" بالآخر شہر کے ہندوؤں نے جزیہ کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی[1]۔

فیروز شاہ کے بعد

فیروز شاہ کے عہد حکومت کے آخری سال تھے۔ فجر کے وقت ایک درویش جمنا کے کنارے وضو کر رہا تھا۔ یکایک محل شاہی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا:

"میدانی دروں این کوشک کیست	تو جانتا ہے کہ اس کوشک کے اندر کون ہے۔
... بلاہائے جملہ عالم زیر پائے اوست	... دنیا کی تمام بلاؤں کو اس نے پاؤں
آں روز کہ او ازیں جہاں برود معلوم	کے نیچے دبا رکھا ہے۔ جس دن وہ اس جہاں
جہانیاں شود"[2]	سے چلا جائیگا دنیا والوں کو معلوم ہو جائیگا۔

۱۸ رمضان ۷۹۰ھ مطابق ۲۱ ستمبر ۱۳۸۸ء کو فیروز شاہ نے انتقال کیا اور حوض خاص کے کنارے سپرد خاک کیا گیا[3]۔

۱۳۸۸ء سے ۱۴۵۱ء تک جو چونسٹھ پینسٹھ سال کا عرصہ گزرا وہ شمالی ہندوستان میں بڑی ابتری اور انتشار کا دور تھا۔ ۱۳۹۸ء میں تیمور کا حملہ ہوا، جس سے شمالی ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی زندگی کی بنیادیں ہل گئیں اور دہلی کی عظمت خاک میں مل گئی۔ فیروز شاہ کے کمزور اور نااہل جانشین حالات پر قابو نہ پا سکے۔ ۱۴۱۳ء میں تغلق خاندان کا خاتمہ ہوا اور سیدوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ یحییٰ سرہندی نے تاریخ مبارک شاہی میں ان سلاطین کا حال لکھا ہے لیکن ان کے مذہبی رجحانات کے متعلق کوئی معلومات بہم نہیں پہنچائی۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۳۸۲-۳۸۳   [2] ایضاً ص ۲۲

[3] آثار الصنادید۔ ص ۸۴-۸۵ — Carr Stephen p. 157-158.

لودی سلاطین

باب دوازدهم

سُلطان بہلول لودی

بہلول لودی پہلا افغان فرمانروا تھا جو دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ شیخ رزق اللہ مشتاقی نے اس کی دین داری، شجاعت اور سخاوت کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ

"بامراء و سپاہی معیشت برادرانہ داشت"[1] امراء اور سپاہیوں کے ساتھ برادرانہ رہتا تھا

زمانہ کے حالات، افغانوں کی قبائلی روایات اور خود اس کی افتاد طبیعت نے اس میں احساس برتری نہیں پیدا ہونے دیا۔ وہ عیادت اور تعزیت کے لیے لوگوں کے گھروں پر جاتا تھا۔ دسترخوان پر ہر کس و ناکس کو بٹھا لیتا تھا۔ دروازہ پر کوئی 'پردہ دار' نہیں رکھتا تھا۔ دربار میں قالیچہ پر بیٹھتا تھا اور کسی کو کھڑا نہیں رہنے دیتا تھا۔[2] عبداللہ کا بیان ہے:

"حلم و کرم جبلی در سرداشت، بظاہر آراستہ بشریعت و بہ متابعت آن کمال تقید داشت، در کل احوال سلوک بر مسالکِ شریعت نمودے و خلاف شریعت ہرگز بکار دست نزدے"[3]	حلم و کرم اس کی سرشت میں تھا۔ ظاہر میں شریعت سے آراستہ تھا۔ اور اس کی متابعت میں بڑی کوشش کرتا تھا۔ احوال سلوک میں شریعت کے راستہ پر چلتا تھا اور شریعت کے خلاف کسی کام پر ہاتھ نہ ڈالتا تھا۔

ابتدائی زندگی: بہلول کا بچپن ہی تھا کہ اُس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی پرورش اور نگرانی اس کے چچا سلطان شاہ لودی نے کی۔ سلطان شاہ یتیم بھتیجے سے بہت محبت کرتا تھا۔ ایک

---

[1] واقعات مشتاقی ص ۹۔ [2] ایضاً ص ۶ [3] تاریخ داؤدی ص ۱۰

دن نماز پڑھ رہا تھا۔ بہلول[1] کی گیند اس کے مصلے پر جا پڑی۔ گھر کے اور لوگوں نے اس کو تنبیہ کی، لیکن سلطان شاہ نے کہا اس کو سرزنش نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے اس کی پیشانی پر بلندی کے آثار نظر آتے ہیں[2]۔ بہلول جب سن بلوغ کو پہنچا تو گھوڑوں کی تجارت شروع کردی[3]۔ ایک مرتبہ وہ تجارتی قافلہ کے ساتھ آرہا تھا، سامانہ میں ایک مجذوب سید ابن[4] سے ملاقات ہوئی۔ مجذوب نے پوچھا کیا تم میں سے کوئی شخص دو ہزار تنکے میں ہندوستان کی حکومت خریدنے پر آمادہ ہے۔ بہلول کے ساتھی قطب اور فیروز تو خاموش رہے لیکن خود بہلول نے سولہ[1] سو تنکے نکال کر مجذوب کے سامنے رکھ دیے۔ مجذوب نے وہ رقم قبول کرتے ہوئے کہا:

"بادشاہی دہلی مبارک باشد واین دو — دہلی کی بادشاہت مبارک ہو۔ یہ دو آدمی جو تیرے
کس کہ ہمراہ داری نوکری تو خواہند کرد — ساتھ ہیں تیری ملازمت کرینگے۔

بہلول کے ساتھیوں نے اس حرکت پر اس کا مذاق اڑایا تو اُس نے جواب دیا کہ سولہ سو تنکے میں میری زندگی تو بسر ہو نہیں سکتی تھی، اگر مجذوب کی پیشین گوئی پوری نہیں ہوتی تو مجھے ایک سید کی مدد کا ثواب ملیگا، اگر پوری ہوگئی تو یہ سودا کیا بُرا رہا۔ اور پھر یہ شعر پڑھا ؎

نعمت من ہیچ دانی از کجاست؟ — از در دلہا گدائی کردہ ام[6]

---

[1] ان دنوں وہ بلّو کہلاتا تھا۔ [2] تاریخ شاہی احمد یادگار (ص ۲-۳)، واقعات مشتاقی (قلمی) ص ۳، تاریخ داؤدی ص ۳، [3] تاریخ داؤدی ص ۳۔ نظام الدین بخشی (طبقات اکبری جلد اول ص ۲۹۵۔ باقی نہاوندی (مآثر رحیمی جلد اول ص ۴۳۵) وغیرہ نے گھوڑوں کی تجارت کے افسانہ کو غلط قرار دیا ہے۔

[4] احمد یادگار نے فنا نام لکھا ہے (ص ۳) فرشتہ نے سید انام لکھا ہے (ص ۱۷۴)، داؤدی (ص ۳) میں ابن سید دیا ہوا ہے۔ [5] تاریخ داؤدی ص ۴، لکھا ہے کہ مجذوب نے یہ شعر بھی اس موقع پر پڑھا تھا۔

سالکانِ رہ ہمت چو ارادت بینند — ملک کاؤس و فریدوں بگدائے بدہند

[6] تاریخ داؤدی ص ۴، واقعات مشتاقی (قلمی) ص ۴، اس قسم کے قصوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاسکتی اس لیے کہ تمام ایسے سلاطین کے متعلق جنھوں نے خود اپنی کوشش سے تخت حاصل کیا — مثلاً التتمش (طبقات ناصری ص ۱۶۷) بلبن (ابن بطوطہ ص ۲۳) غیاث الدین تغلق (عفیف ص ۲۷) وغیرہ — اس قسم کے قصے مشہور ہوگئے تھے۔ احمد یادگار نے لکھا ہے کہ مجذوب نے تین پشتوں تک بادشاہی کی پیشین گوئی کی تھی (ص ۴)

مذہبی جذبات | بہلول کے مذہبی جذبات کا ذکر کرتے ہوئے مشتاقی نے لکھا ہے:-

"پنج نماز با جماعت ادا می کرد، و در وقت جنگ رسم بود چوں بر فوج مخالف نظر می افتاد، زود از اسپ فرود می آمد واستخارہ وخیریت اسلام ومسلمانی و اقرار عجز می کرد"[1]	پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ جنگ کے وقت جب دشمن کی فوج پر نظر پڑتی تو فوراً گھوڑے سے اترتا تھا اور استخارہ کرتا تھا اور خیریت اسلام اور مسلمانی کے لیے (دعا) اور اقرار عجز کرتا تھا

جب سلطان حسین شرقی نے ایک بڑی فوج لے کر دہلی پر چڑھائی کی تو بہلول نے تمام رات خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر ننگے سر کھڑے ہو کر دعائیں مانگیں کہتے ہیں کہ صبح کے وقت ایک مرد غیب نمودار ہوا اور ایک لکڑی اس کے ہاتھ میں دے کر کامیابی کی بشارت دی[2]۔

دہلی میں ایک رسم تھی کہ جب کوئی شخص مرجاتا تو سویم کے دن شربت، پان، مصری، وغیرہ تقسیم کی جاتی تھی۔ بہلول نے اس رسم کو بند کر دیا۔ کیونکہ اس میں بالکل بیکار روپیہ صرف ہوتا تھا[3]

علماء سے تعلقات | فرشتہ کا بیان ہے:

"در حضر و سفر با علماء و مشایخ صحبت داشتے و اکثر اوقات با ایشاں بسر بردے"[4]	سفر وحضر میں علماء و مشایخ سے صحبت رکھتا تھا اور اکثر اوقات ان کے ساتھ رہتا تھا۔

واقعات مشتاقی میں علماء کے احترام کے سلسلہ میں تین دلچسپ واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

تخت نشینی کے بعد جب پہلے دن جامع مسجد میں آیا تو میاں قادن نے خطبہ کے بعد افغانوں کا اس طرح مذاق اڑانا شروع کر دیا:

سبحان اللہ عجب قومے پیدا شدند، نمی دانم پیشرو دجّال در ایشاں باشد یا نہ	سبحان اللہ، یہ عجب قوم پیدا ہوگئی ہے معلوم نہیں شاید دجال کا پیشرو اسی قوم میں سے ہو

---

[1] واقعات مشتاقی (قلمی) ص ۱۰۔ [2] ایضاً ص ۱۰۔۱۱،

[3] واقعات مشتاقی ص ۹، تاریخ داؤدی ص ۱۱ [4] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۷۹

ایشاں انیست کہ مادر را موز می گویند و	ان کی زبان یہ ہے کہ ماں کو موز بھائی کو اروز
برادر را اروز می گویند و دیہ را شوز می	گاؤں کو شوز اور فوج کو توز کہتے ہیں۔
گویند و سپاہ را توز می گویند"[۱]	

بہلول نے یہ سن کر منہ پر رومال رکھ لیا اور تبسم کرتے ہوئے کہا:

ملا قادن! بس کن کہ ما ہمہ بندگان	ملا قادن! بس کر، ہم سبھی خدا کے
خدا ایم"[۲]	بندے ہیں۔

پھر ایک مرتبہ سلطان کی ملاقات ایک ایسے ملا سے ہوئی جو پستہ قد تھا اور جس کے سر پر سرخ بال تھے۔ سلطان نے مذاق میں اس سے کوئی ایسی بات کہہ دی جو اسے ناگوار ہوئی۔ سلطان کو جب اس کا احساس ہوا تو اس سے اظہار معذرت کیا۔ پھر ایک ملا اس کے خلوت کدے میں گھس گیا اور ایسی حالت میں جب کہ سلطان غسل کے لیے جا رہا تھا اُسے روک لیا اور مجبور کیا کہ پہلے اس کے مطالبہ کو پورا کرے پھر غسل خانہ میں قدم رکھے۔ سلطان نے بلا اظہار ناراضگی اس کی خواہش کو پورا کر دیا۔[۳]

سہروردی مشایخ کو مدد تیمور کے حملے کے بعد جب پنجاب میں ابتری اور بدنظمی کا دور دورہ ہوا تو سہروردیہ سلسلہ کے ان مشایخ نے جو سیاست میں پہلے سے کافی دخیل تھے، بے پناہ سیاسی طاقت حاصل کر لی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ کے سجادہ نشین شیخ یوسف کو ملتان کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ نظام الدین بخشی نے لکھا ہے:

"چوں بزرگی طبقہ علیہ شیخ الطریقۃ شیخ بہاء الدین زکریاؒ ملتانی قدس اللہ تعالیٰ در قلوب سکنۂ ملتان و جمہور زمینداران آں صوب بنوعی قرار گرفتہ بود کہ مزیدبراں متصور

۱؎ ۲؎ واقعات مشتاقی ص ۹، تاریخ داؤدی ص ۱۲، غالباً میاں قادن نے افغانوں پر یہ اعتراض اُن کی لسانی عصبیت کی بنا پر کیا ہوگا۔ اخوند درویزہ کا بیان ہے۔ "بحکم آنکہ جہل و سختی بر افغانان غالب است ہر کہ در زبان فارسی نطق و تکلم می کند او را دشمن گیرند" ملاحظہ پنجاب میں اُردو۔ ص ۲۰۶۔

۳؎ واقعات مشتاقی ص ۱۰۔

نبا شد، جمیع اہالی واشراف وعموم سکنۂ جمہور متوطنان آنجد و درشیخ یوسف قریشی را
کہ تولیت خانقاہ وحراست ومجاورت روضہ رضیہ شیخ بہاءالدین زکریاؒ با و متعلق
بود، بسلطنت و بادشاہی برداشتہ برمنابر ملتان و اوچہ وبعضے قصبات خطبہ
بنام او خواندند"[۱]

لیکن یہ اقتدار زیادہ عرصتک قائم نہ رہ سکا اور لنگاہ قوم نے نہایت چالاکی کے ساتھ اُن کی سیاسی طاقت کا خاتمہ کردیا[۲]۔ شیخ یوسف مع چند ساتھیوں کے دہلی آگئے۔ بہلول نے اس برگشتہ قسمت قافلے کی خاطر مدارات کی اور نہ صرف اپنے یہاں پناہ دی بلکہ اپنی ایک لڑکی کی شادی بھی شیخ یوسف کے بیٹے شیخ عبداللہ کے ساتھ کردی[۳]۔

شیخ یوسف نے بہلول سے اصرار کیا کہ وہ لنگوں کے خلاف لشکر آرائی کرے لیکن بہلول مصلحتاً ٹالتا رہا[۴]۔ جب لنگوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو بہلول کو بھی موقع ملا اور اس نے ملتان پر حملہ کردیا۔ لیکن اس حملہ کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ سہروردیوں کو پناہ دینے اور اُن کی حمایت کرنے کی بنا پر بہلول مذہبی حلقوں میں خاص عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ سہروردی تذکروں میں اسی وجہ سے اس کا ذکر احتراماً کیا گیا ہے۔

شیخ سماءالدین سہروردیؒ اور سلطان شیخ سماءالدین سہروردیؒ[۵] اس دور کے مشہور ترین مشائخ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ملتان میں جب لنگاہ قوم کا اقتدار قائم ہوگیا تو وہ رنتھنبور، بیانہ وغیرہ ہوتے ہوئے دہلی آگئے اور پھر یہیں کے ہوگئے۔ وہ عموماً سلاطین کی صحبت سے گریز کرتے تھے[۶] لیکن بہلول کے سہروردیہ سلسلہ پر اتنے احسانات تھے کہ وہ اُس سے دامن کشاں نہ رہ سکے۔

---

[۱] طبقات اکبری جلد ۳ ص ۵۲۲ - [۲] ایضاً ص ۵۲۳، ۵۲۴

[۳] ایضاً ص ۵۲۵، اخبار الاخیار ص ۲۰۹ [۴] ایضاً ص ۵۲۵-۵۲۷۔

[۵] حالات کے لیے ملاحظہ ہو سیر العارفین ص ۱۷۱-۱۸۴۔ اخبار الاخیار۔ ص ۲۰۵-۲۰۷

[۶] جمالی کا بیان ہے: "سلاطین روزگار بہ پیش آں عالی وقار ہرگز وزنے و مقدارے نبود"

سیر العارفین۔ ص ۱۷۶

ایک دن بہلول اُن سے ملنے کے لیے آیا اور غایت عقیدت میں ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا اور عرض کیا کہ میں آپ کے کرم کا محتاج ہوں۔ شیخ نے جواب دیا:

"تین آدمی اللہ کے انعام واکرام سے محروم رہینگے۔ اول وہ بوڑھا کہ گناہوں سے باز نہ آوے، دوسرے وہ جوان کہ ایام پیری میں اصلاح کی اُمید پر بے خوف معصیت میں سرگرم رہے، اور تیسرے وہ سلطان کہ باوجود حصول مقاصد و مرادات دینی و دنیاوی اپنی سلطنت کے چراغ کو جھوٹ کی آندھی سے گل کرے"[1]

اور اس سلسلہ میں بادشاہ کو بہت سی اور نصیحتیں بھی کیں۔ سلطان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے اور عرض کرنے لگا:

"حضرت مخدوم باوجود چندیں تقصیرات	حضرت مخدوم باوجود اتنی تقصیرات کے اپنے
محبت درویشاں در خود زماں زماں	دل میں لمحہ بہ لمحہ درویشوں کی محبت زیادہ
مزیدمی یابم، امید کہ حق تعالی بر برکت	پاتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ حق تعالی محبتِ
محبت ایں قوم مرا نجات ارزانی	فقرا، کی برکت سے مجھے نجات عطا فرمائیگا۔
فرمائد"[2]	

سلطان کے اس اظہار عقیدت سے متاثر ہو کر شیخ نے اُسے ایک مصلائے خاص عنایت فرمایا جس کو احتراماً سر پر رکھ کر وہ خانقاہ سے واپس ہوا۔[3]

شیخ سماء الدینؒ نے بہلول کو اس کی طاقت کے استحکام میں بھی مدد دی جس زمانہ میں سلطان حسین شرقی سے جنگ ہو رہی تھی، شیخ بیانہ میں مقیم تھے۔ سلطان احمد جلوانی نے اُن سے درخواست کی کہ سلطان شرقی کی کامیابی کے لیے دعا کریں۔ شیخ نے اس کو نہایت سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ ایک شخص کے مقابلہ میں جو

"دل و دیدہ ہموارہ بخدامی آرد و شقائق وار سر تعبد از زمین تعبد عبادت برنمی دارد"

---

[1]-[3] سیر العارفین ص ۱۷۸-۱۷۹۔

ایک ظالم کے لیے دعا کریں۔[1]

جب بہلول کا انتقال ہو گیا تو ایک دن شیخ سماء الدینؒ اس کے مزار پر تشریف لے گئے اور کچھ دیر مراقب رہنے کے بعد فرمانے لگے:

"سبحان اللہ! ایں مرد اگرچہ دریں جہاں در کامرانی و سلطانی گزرانید، از برکت فرط محبتے و اعتقادے کہ با دوستان خدا داشت در آں جہاں نیز مرتبہ عالی یافت"[2]	سبحان اللہ! اس آدمی نے اگرچہ اس دنیا میں اپنی عمر کامرانی اور سلطانی میں گزاری لیکن اس محبت اور اعتقاد کی وجہ سے جو اس کو دوستان خدا سے تھا، اس نے اس جہان میں بھی اعلیٰ مرتبہ پایا۔

[1] سیر العارفین ص ۱۷۷ [2] ایضاً ص ۱۷۹۔

باب سیزدہم

سلطان سکندر لودی

تیمور اور بابر کے حملوں کے درمیان جن سلاطین نے ہندوستان پر حکومت کی تھی اُن میں سکندر لودی کو اپنی انتظامی صلاحیت، سیاسی بصیرت علمی دلچسپیوں اور مذہبی شغف کے باعث ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کا اٹھائیس سالہ دورِ حکومت ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ شیخ عبدالحق محدثؒ کا خیال تھا کہ

"بالحقیقت محامد زماں سلطنت آں	حقیقت میں اس سلطان سعادت نشان
سلطان سعادت نشان از حد تحریر	کے عہد کی خوبیاں حد تحریر و تقریر سے باہر
و تقریر خارج است ... "	ہیں "
اگر ایں جملہ را سعدی املا کند	اگر ایں جملہ را سعدی املا کند
مگر دفترے دیگر انشا کند"[1]	مگر دفترے دیگر انشا کند

سکندر لودی کے مذہبی افکار و رحجانات کو سمجھنے کے لیے اس عہد کی ذہنی فضا کا ایک سرسری جائزہ ضروری ہے۔

(۱) امام اکبر شیخ محیی الدین ابن عربیؒ کے نظریات کی اشاعت کو روکنے کے لیے فقہا نے جو بند باندھے تھے، وہ اس دور میں ٹوٹنے شروع ہو گئے تھے۔ اور امام اکبرؒ کی کتابیں صرف اعلیٰ مذہبی حلقوں تک محدود نہ رہی تھیں، بلکہ ہر خاص و عام کے ہاتھ میں پہنچ گئی تھیں[2]۔

---

[1] اخبار الاخیار۔ ص ۲۲۰

[2] گلزار ابرار میں دولت خاں لودی کے لڑکے کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ شیخ اکبرؒ کی ایک عبارت کا مفہوم سمجھنے کے لیے سید احمد افغان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

شیخ علی مہائمی[1] اور شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ[2] وغیرہ نے فصوص الحکم کی شرحیں لکھ کر وحدت الوجود کے تصورات کو عام کر دیا تھا۔ شیخ علی مہائمی تو صرف ابن عربیؒ کے افکار کو سمجھانے کے لیے یمن تک گئے تھے[3]۔

(۲) صوفیہ نے صحو کی جگہ سُکر کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اس عہد کے سب سے زیادہ معروف چشتی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ حالت وجد میں گھر کا چھپر تک اٹھا پھینکا تھا[4]۔ اس زمانہ میں مجذوبین کی کثرت[5] سُکر کی زندگی کے مہلک اثرات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ روحانی اصلاح و تربیت کے لیے جس ضبطِ نفس، تحمل اور بردباری کی ضرورت تھی وہ قطعاً مفقود ہو چکی تھی۔ 'عشق حقیقی' کی جگہ 'عشق مجازی' نے لے لی تھی۔ اور بعض خاص مشہور شخصیتیں اس گمراہی کا شکار نظر آتی تھیں[6]۔

(۳) بھگتی کی تحریک[7] جس کا پہلا اظہار نواہون کے جلے میں غالباً غیر شعوری طور پر ہوا تھا، اس دور میں بالکل واضح شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور فضاؤں میں مساوات انسانی اور وحدت ادیان کی صدائیں گونج اٹھتی ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ اس دور کے لٹریچر میں ان بھگتوں کا کہیں ذکر نہیں، لیکن چند ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں جن کو ان کی تعلیم کی صدائے بازگشت قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً لودھن برہمن کا یہ اعلان کہ "اسلام حق ست و دین من نیز درست است[8]"

---

[1] حالات کے لیے ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۱۷۴-۱۷۵۔ حکیم سید عبدالحیی نے ان کو "ابن عربی ثانی" کہا ہے۔ (یاد ایام ص ۵۲)

[2] ملاحظہ گلزار ابرار (قلمی)، اخبار الاخیار ص ۲۱۵-۲۱۷۔ سیر الاقطاب ص ۲۲۷-۲۲۸

[3] گلزار ابرار (قلمی)

[4] لطائف قدوسی ص ۳۲

[5] اس عہد کے لٹریچر پر نظر ڈالیے تو تاجن دیوانہ، ابراہیم مجذوب، یونس دیوانہ، الہدو دیوانہ جیسے سیکڑوں مجاذیب کے نام سامنے آئینگے۔ نیز ملاحظہ ہو لطائف قدوسی۔ ص ۸-۹۔

[6] شیخ حسن کو سکندر لودی سے جو عشق ہو گیا تھا اس کی تفصیل آگے آئیگی۔ اس دور کے ایک اور بزرگ سید سلطان بہرایچی کے متعلق شیخ عبدالحق کا بیان ہے: "دے را باہندو زنے محبت واقع شدہ" اخبار الاخیار۔ ص ۲۲۵۔

[7] اس تحریک کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: Tara Chand: Influence of Islam on Indian Culture p. 143-192; اور Yusuf Husain: Glimpses of Medieval India Culture p. 1-31.

[8] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۲۲-۳۲۳۔

یا ایک عورت کے متعلق یہ جھگڑا کہ وہ مسلمان مری تھی یا ہندو۔[1] اگر ایک طرف کبیر اور نانک ہندو مذہب اور اسلام کو قریب لانے کے لیے وحدت ادیان پر زور دے رہے تھے تو دوسری طرف وحدت الوجود کا دھارا اس طرح اس فکر کو تقویت پہنچا رہا تھا کہ

"ایں چہ شور و ایں چہ غوغا کشادہ، کسے مومن کسے کافر، کسے مطیع، کسے عاصی کسے درراہ، کسے بے راہ، کسے مسلم کسی پارسا، کسے ملحد، کسے ترسا، ہمہ دریک سلک است۔"[2]

یہ کیسا شور اور غوغا پھیلا دیا گیا ہے کہ کوئی مومن ہے، کوئی کافر، کوئی مطیع ہے کوئی گناہگار، کوئی صحیح راہ پر اور کوئی بے راہ، کوئی مسلم، کوئی پارسا، کوئی ملحد، کوئی ترسا، (سچ تو یہ ہے کہ) سب ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں

(۴) ساتھ ہی ساتھ ہندوؤں کی بعض ایسی تبلیغی جماعتیں بھی سرگرم عمل ہو گئی تھیں جن کا مقصد فکری اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے بجائے مسلمانوں کو مرتد بنانا تھا۔ یہ تحریکیں جاہل عوام تک محدود نہ رہی تھیں بلکہ امراء تک کو متاثر کر رہی تھیں۔ کالپی کے ضابط نصیر خاں نے

"رو از جادۂ مستقیم شریعت تافتہ راہ الحاد و زندقہ پیش گرفتہ، و ترک نماز و روزہ دادہ، و زنان مسلمہ را بنائکاں ہندو سپردہ تا رقاصی تعلیم نمایند۔"[3]

شریعت کے سیدھے راستہ سے منہ موڑ لیا اور الحاد و زندقہ کی راہ اختیار کر لی۔ نماز روزہ ترک کر دیا اور مسلمان عورتوں کو ہندو نائکوں کے سپرد کر دیا تاکہ انہیں رقاصی کی تعلیم دیں۔

ایک اور افغان امیر کے متعلق لکھا ہے ــــ

"خبر رسید کہ احمد خاں پسر مبارک خاں لودی کہ حاکم لکھنوتی بود، بمصاحبت کفار طریقہ ارتداد پیش گرفتہ، از دین اسلام برگشتہ است۔"[4]

اطلاع ملی کہ احمد خاں پسر مبارک خاں لودی نے جو لکھنوتی کا حاکم تھا، کفار کی صحبت میں ارتداد کا طریقہ اختیار کر لیا ہے اور دین اسلام سے منحرف

۱؎ تاریخ شاہی ص ۱۰۶-۱۰۷۔ ۲؎ مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ص ۲۰۵۔
۳؎ طبقات اکبری جلد ۳ ص ۳۲۶ ۴؎ ایضاً جلد اول ص ۳۳۱۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض علاقوں میں ان تحریکوں نے کچھ جارحانہ صورت بھی اختیار کر لی تھی مثلاً شیخ رکن الدین گنگوہیؒ کا بیان ہے :

"وطرف ہندوستان غلبۂ کافراں بود	اس طرف ہندوستان میں کافروں کا غلبہ تھا۔
در پرگنہ ردولی عمل کافراں شد شعارِ	پرگنہ ردولی میں کافروں کا عمل دخل ہو گیا تھا
اسلام مندرس شدند، در بازار گوشت	اسلام کے شعار مٹ گئے تھے۔ بازار میں سور
خوک فروختہ می شد، حضرت قطبی دل گیر	کا گوشت بکتا تھا، حضرت قطبی (شیخ عبد القدوسؒ)
شدہ بیروں آمدند" ۱؎	دل برداشتہ ہو کر باہر آگئے۔

یا افسانہ شاہان کی یہ اطلاع کہ بہار کے علاقہ میں سکندر لودی کو ایک شخص نے جس کے پورے قبیلہ کو ایک ہندو راجہ نے قتل کرا دیا تھا، بتایا کہ

"اولاً مسلمان بودیم، عثمانی، الحال	پہلے ہم مسلمان تھے اور عثمانی (نسل سے تھے)
زنار دار شدہ ام" ۲؎	اب میں زنار دار ہو گیا ہوں۔

ناممکن تھا کہ یہ واقعات سکندر لودی کے مذہبی افکار پر اثر انداز نہ ہوتے۔

(۵) اس زمانہ میں چشتیہ اور سہروردیہ دونوں سلسلے بے اثر ہو چکے تھے۔ شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ اور شیخ سماء الدینؒ کے سوا ان سلسلوں میں غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والا کوئی بزرگ موجود نہ تھا۔ پھر ان دونوں سلسلوں میں باہمی یگانگت اور محبت کے جو مراسم دور اول میں قائم تھے وہ ختم ہو چکے تھے ۳؎ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ سہروردی بزرگ ان علاقوں میں اپنا حلقۂ اثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں پہلے سے قائم

۱؎ لطائف قدوسی ص ۳۱ ۲؎ افسانۂ شاہاں ورق ۲۹۔

۳؎ شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ ایک جولاہے ابراہیم کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنے کے بعد شیخ سماء الدینؒ کے جنازے میں شرکت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: "مرتبہ این میت ہیچو مرتبہ ابراہیم نمی بینم" لطائف قدوسی ص ۵۷-۵۸۔ اس کے برخلاف شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور شیخ فرید گنج شکرؒ، شیخ رکن الدین ملتانیؒ، اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے درمیان انتہائی محبت و مودت کے تعلقات قائم رہے۔

تھیں۔ بہر حال اس صورت حال نے فضا کو مکدر کر دیا۔

اسی زمانہ میں شطاریہ سلسلہ ہندوستان میں جاری ہوا۔ اس کے بانی شاہ عبد اللہ شطاریؒ[1] تو سکندر لودی کی تخت نشینی سے چار سال قبل رحلت فرما گئے تھے، لیکن اُن کے متوسلین میں بعض نہایت با اثر شخصیتیں تھیں جنھوں نے اس سلسلہ کو خوب ترقی دی[2]۔ شطاری مشائخ نے ہندوؤں کے ساتھ نہ صرف نہایت اچھے مراسم قائم کیے بلکہ اُن کے مذہبی افکار و نظریات کو بھی ہمدردانہ سمجھنے کی کوشش۔ اس کی ایک اہم مثال سید محمد غوث گوالیاریؒ کی بحر الحیات ہے جس میں ہندو مذہبی فکر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۶) اسی دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں ایک دوسرے کے علوم کو سمجھنے کا شوق بڑھ رہا تھا۔ اگر ایک طرف رزق اللہ مشتاقیؒ[3] اور میاں طہٰ[4] وغیرہ ہندوؤں کے علوم کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے تو دوسری طرف ایک ہندو برہمن[5] کے علوم اسلامی پر عبور کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کو درس دیتا تھا۔ شیخ رکن الدین گنگوہیؒ ایک جوگی بال ناتھ سے "اسرار توحید" معلوم کرتے تھے[6]۔

(۷) مسلمانوں کی عام سماجی اور اخلاقی حالت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی تھی۔ افسانۂ شاہان[7] اور تاریخ داؤدی[8] میں جن قصوں کو عجائب روزگار بنا کر پیش کیا گیا ہے وہ اخلاقی پستی اور اعتقاد کی زبوں حالی کے آئینہ دار ہیں۔ فقیروں کی عیاشانہ زندگی، طالب علموں کی بے راہ روی، تعویذ گنڈوں میں بے جا اعتقاد، جنوں اور دیووں کے قصے، چراغ سلیمان کی داستانیں کسی مضبوط معاشرہ یا محکم اخلاقی نظام میں اس طرح عام نہیں ہو سکتی تھیں حقیقت میں مہدوی تحریک اسی ذہنی انحطاط اور مذہبی جمود کو دور کرنے کی ایک کوشش تھی۔

---

[1] مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۱۷۱، گلزار ابرار (قلمی)   [2] تفصیل کے لیے گلزار ابرار کا مطالعہ کرنا چاہیے۔   [3] صبح گلشن ص ۴۱۳   [4] واقعات مشتاقی ص ۱۳۳۔
[5] منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۳   [6] لطائف قدوسی ص ۴،   [7] افسانہ شاہان ورق ۳۵
[8] تاریخ داؤدی ص ۷۱-۷۳ - نیز تاریخ شاہی ص ۵۲-۱۰۴، ۱۰۵-

ابتدائی زندگی | سکندر کی ماں ہیما ایک ہندو سُنار کی بیٹی تھی[1] سکندر کی پیدائش سے قبل اس نے خواب میں دیکھا کہ چاند ٹوٹ کر اُس کی گود میں آگیا ہے[2] نجومیوں نے یہ تعبیر بتائی کہ اس کے بیٹا پیدا ہوگا اور وہ سلطنت کو چار چاند لگائیگا[3] بہلول نے سکندر کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی تھی لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کی مذہبی تعلیم کس قدر ہوئی تھی[4] بہرحال ابتدائی زندگی ہی میں اس کے اندر شدید مذہبی تعصب پیدا ہوگیا تھا۔ ایک دن اُس نے محضر طلب کیا اور علماء سے کرکشیتر کے کنڈ کو تباہ کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔ علماء نے ملک العلماء میاں عبداللہ اجودھنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی موجودگی میں کون اظہار رائے کی جرأت کرسکتا ہے۔ شہزادہ میاں عبداللہ کی طرف متوجہ ہوا۔ انھوں نے دریافت کیا کہ کرکشیتر میں کیا چیز ہے؟ جواب ملا: ایک حوض ہے جہاں کفار ہر شہر سے جمع ہوکر آتے ہیں اور غسل کرتے ہیں۔ پوچھا کب سے یہ رسم جاری ہوئی ہے۔ جواب دیا۔ قدیم رسم ہے۔ میاں عبداللہ نے تفصیلات معلوم کرنے کے بعد فتویٰ دیا کہ

"بت خانہ قدیم را ویران ساختن جائز نیست"[5]

کسی قدیم بت خانہ کو تباہ کرنا جائز نہیں ہے۔

سکندر کو اس پر غصہ آگیا اور خنجر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا:

"طرف کفار می کنی اول ترا می زنم بعد آں بر کرکشیتر خواہم تاخت"

کفار کی طرفداری کرتا ہے۔ میں پہلے تجھے مارونگا پھر کرکشیتر کو تباہ کرونگا۔

میاں عبداللہ نے نہایت جرأت سے جواب دیا:

مرگ حق است بغیر حکم حق کسے نمیرد،

موت حق ہے۔ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نہیں مرتا

---

[1] ہیما بے حد حسین و جمیل عورت تھی۔ بہلول اُس پر عاشق ہوگیا (ملاحظہ ہو تاریخ شاہی ص ۱۷-۱۹) کچھ لوگ اس بناء پر سکندر کو "کم اصل" ہونے کا طعنہ دیتے تھے (افسانۂ شاہان ورق ۴۱)

[2] یہ روایت کئی اور بادشاہوں کے متعلق بھی کتابوں میں ملتی ہے۔ [3] تاریخ شاہی ص ۱۷۔

[4] افسانۂ شاہان (ورق ۲۲) میں اس کے صرف ایک استاد قتلو خاں کا نام ملتا ہے۔

[5] واقعات مشتاقی ص ۱۵ [6] تاریخ داؤدی ص ۲۹-۳۰۔ نیز تاریخ شاہی احمد یادگار ص ۳۰-۳۱۔

"چوں کسے پیش ظالمے می آید اول مردن خود را اختیار کردہ می آید، ہرچہ بادا باد، چوں مرا پرسیدید مسئلہ شرع بیان نمودم اگر پروائے شرع ندارید حاجت پرسیدن نیست"

جب کوئی ظالم کے پاس آتا ہے پہلے اپنی موت کے لیے تیار ہو کر آتا ہے۔ جو کچھ بھی ہونا ہے وہ ہو جائے جب آپ نے مجھ سے دریافت کیا تو میں نے شریعت کا مسئلہ بیان کر دیا۔ اگر شریعت کی پروا نہیں ہے تو پھر پوچھنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟

سکندر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور کہنے لگا:

"اگر اجازت می دادید چندیں ہزار ہا مسلماناں آسودہ می شدند" [۱]

اگر تم اجازت دیدیتے تو کتنے ہزار مسلمان آسودہ ہو جاتے!

مشتاقی نے لکھا ہے کہ جب مجلس برخاست ہو گئی تو سکندر میاں عبداللہ کی طرف خاص طور پر مخاطب ہوا اور کہنے لگا:

"میاں عبداللہ! شما گاہ گاہ با ما ملاقات فرمائید" [۲]

میاں عبداللہ! آپ گاہے گاہے ہم سے ملا کیجیے۔

سکندر بے حد حسین وجمیل شہزادہ تھا۔ راپڑی کے ایک مجذوب شیخ حسنؒ اس پر عاشق ہو گئے تھے۔ ایک دن شہزادہ کے پاس خلوت کدہ میں پہنچ گئے اُس نے اُن کا سر دہکتی ہوئی انگیٹھی میں رکھ دیا لیکن اُن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بعد کو شہزادہ نے انہیں قید کر دیا لیکن وہ جیل سے باہر ناچتے ہوئے پائے گئے۔ سکندر نے بلوا کر کہا: "مجھ پر عاشق ہونے کا دعویٰ کرتے ہو، پھر بھی میری قید سے بھاگتے ہو" جواب دیا: میں خود نہیں گیا تھا، میرے دادا شیخ ابولالا نے یہاں سے نکال دیا تھا۔[۳]

تخت نشینی

تخت پر بیٹھنے سے قبل سکندر شیخ سماء الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

---

۱ اس جملہ سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً گرشبتہ بھی ان تحریکوں کا مرکز بن گیا تھا جن کی طرف ہم اشارہ کر آئے ہیں۔
۲ واقعات مشتاقی ص ۱۶ ۳ اخبار الاخیار ص ۲۸۱ ۴ واقعات مشتاقی ص ۲۳-۲۴

"یا شیخ! می خواہم کہ در علم صرف کتاب میزان پیش شما بخوانم" | یا شیخ! میں چاہتا ہوں کہ علم صرف کی کتاب میزان آپ سے پڑھوں۔

شیخ نے فرمایا:

"بداں اسعدک اللہ فی الدارین خیرا" [۱]

سکندر نے یہ کلمہ تین بار اُن کی زبان سے کہلوایا اور پھر اس سے فال نیک لے کر اور اُن کے ہاتھ چوم کر کھڑا ہو گیا۔

سادہ زندگی

سلطان سکندر بہت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ افسانۂ شاہان میں لکھا ہے:

"عادت سلطان چناں بود تا آنکہ جامہ پارہ نشدے جامۂ نو نپوشیدے، تا آنکہ خواب غلبہ نکردے نخسپیدے و نیز تا آنکہ اشتہا غالب نشدے طعام نخوردے" [۲]

سلطان کی عادت یہ تھی کہ جب تک کپڑا پھٹ نہ جاتا تھا، نئے کپڑے نہیں پہنتا تھا جب تک نیند کا غلبہ نہ ہو جاتا تھا، سوتا نہیں تھا اور جب تک بھوک غالب نہیں ہو جاتی تھی کھانا نہیں کھاتا تھا۔

احمد یادگار نے لکھا ہے کہ وہ اپنا "جامۂ خواب و پلنگ" ہر روز بدلتا تھا۔ اور یہ جامہ اور پلنگ یتیم بچیوں کے جہیز میں دے دیا جاتا تھا [۳]

عبادت میں انہماک

سکندر لودی مذہبی فرائض نہایت پابندی سے ادا کرتا تھا۔ محمد کبیر نے لکھا ہے:

"نماز با جماعت ہر پنج وقت می گذاردے و نوافل بسیار می کردے و نماز تہجد و اشراق گاہے فوت نہ کردے" [۴]

پانچوں وقت کی نماز با جماعت ادا کرتا تھا۔ نوافل بہت پڑھتا تھا۔ اور تہجد اور اشراق کی نماز کبھی اس سے فوت نہ ہوتی تھی۔

---

[۱] واقعات مشتاقی ص ۲۴، تاریخ داؤدی ص ۴۳، تاریخ شاہی ص ۴۳، تاریخ فرشتہ ج ا ص ۱۸۶۔
[۲] افسانۂ شاہاں ورق ۳۹ [۳] احمد یادگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ شادی کا خرچ سرکار سے دیا جاتا تھا۔ (ص ۴۹) ملک الامرا فخر الدین کوتوال دہلی کا بھی یہی دستور تھا کہ اپنے کپڑے یتیم لڑکیوں کے جہیز میں دیدیا کرتا تھا۔ تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۱۱۷۔ [۴] افسانۂ شاہاں ورق ۳۸۔ (باقی بر صفحہ ۴۵۵)

احمد یادگار نے لکھا ہے کہ صبح ہونے سے تین گھنٹے قبل وہ بیدار ہو جاتا تھا[۱]۔ اور غسل کرنے کے بعد نماز تہجد ادا کرتا تھا اور پھر۔

سہ سپارہ کلام ربانی دست بستہ ایستادہ خواندے[۲]

قرآن کے تین سپارے ہاتھ باندھ کر اور کھڑے ہو کر پڑھتا تھا۔

عبادت میں اس انہماک کے باعث اس کی کراماتوں کے افسانے بھی لوگوں میں پھیل گئے تھے[۳]

غرباء کی مدد

سال میں دو بار سکندر محتاجوں اور مسکینوں کی فہرستیں تیار کراتا تھا اور ان کو مدد دیتا تھا۔ جاڑوں کے زمانے میں جڑاول اور دوشالے تقسیم کیے جاتے تھے۔ شہر میں متعدد مقامات پر جنس اور پکا ہوا کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ غریب لڑکیوں کی شادی کے سلسلہ میں سلطان کی طرف سے مدد کی جاتی تھی۔ نظام الدین نے لکھا ہے:

یومیہ و جمعگی، و دو مرتبہ انعام در سالے در کل ممالک مخصوص فقراء بود[۴]

امراء میں جو بھی غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرتا تھا وہ سلطان کی نظر میں معتبر اور معزز ہو جاتا تھا[۵]۔ ایک مرتبہ غلہ کی کمی ہوئی تو اُس نے غلہ پر زکوٰۃ معاف کر دی[۶]۔ اس کے بعد اگرچہ حالات بدل گئے اور غلہ ارزاں[۷] ہو گیا لیکن اس نے دوبارہ "زکوٰۃ غلہ" وصول نہیں کی۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۵۴) نظام الدین نے لکھا ہے: "وگاہ از صبح تا شام و خفتن بہ معاملات مشغولی می بود، و نماز پنج وقت را در یک مجلس ادا می کرد" طبقات اکبری ج ا ص ۳۳۵۔ [۱] تاریخ شاہی ص ۴۹، تاریخ داؤدی میں اس کا نظام اوقات مختلف دیا ہے۔ لکھا ہے: "بعد از نماز پیشین تا صلوٰۃ عشاء صحبت بعلماء داشتہ تلاوت کتاب مجید کردے" (ص ۳۵) اور پھر تھوڑے سے آرام کے بعد تمام شب جاگتا تھا۔ [۲] تاریخ شاہی ص ۴۹

[۳] افسانۂ شاہان (ورق ۲۴) میں اُسے "صاحب خارق" لکھا ہے۔ اور شیخ عبد الحق محدثؒ کا بیان ہے کہ "در باب فراست بلکہ کرامت حکایات نقل می کنند" (اخبار الاخیار ص ۲۲۰) نظام الدین اور عبد اللہ نے اسے "جن آشنا" کہا ہے (طبقات اکبری جلد اول ص ۳۳۷، تاریخ داؤدی ص ۶۴۔۶۵)، عبد اللہ نے اس کے چند "خوارق" بھی بیان کیے ہیں۔ [۴-۵] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۳۶)، تاریخ فرشتہ ج ص ۱۸۶، واقعات مشتاقی ص ۱۴، [۶] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۲۰، تاریخ داؤدی ص ۵۴

[۷] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۳۵، مشتاقی نے لکھا ہے کہ اس کے عہد میں "خلق آسودہ شد و زراعت کامل میشد۔۔۔ و سوداگران و محترفہ و مزارعان ہمہ بحال خود آسودہ شدند" (ص ۱۳) نیز تاریخ داؤدی ص ۳۶۔

مذہبی جذبات | تاریخوں میں سکندر لودی کے مذہبی جذبات کے سلسلہ میں متعدد واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ لکھا ہی کہ اس نے اپنی پوری سلطنت کی مسجدوں میں مقری، خطیب، جاروب کش مقرر کیے تھے اور اُن کے لیے وظائف و ادرار کا انتظام کیا تھا[1]۔ ایام متبرکہ، مثلاً رمضان، عاشورا وغیرہ کے موقع پر فقرا اور درویشوں میں خیرات تقسیم کرتا تھا[2]۔ اور قیدیوں کو رہا کرتا تھا[3]۔ کسی مہم پر جاتا یا کسی شہر کی بنیاد رکھتا تو پہلے فاتحہ پڑھتا تھا۔ جس زمانہ میں باربک شاہ سے جنگ ہو رہی تھی، ایک قلندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، فتح تیری ہے۔ سکندر نے کراہت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا:

"ہرگاہ کہ درمیان طائفہ اسلامیہ جنگ باشد حکم بر یک طرف نباید کرد۔ بلکہ باید گفت در آنچہ خیریت اسلام است آں شود۔ و در فتح ہر کہ صلاح خلق باشد از حق باید خواست"[4]

بہار کا سفر اور علماء و مشائخ سے ملاقات | بہار میں قیام کے زمانہ میں سکندر لودی بہت سے علماء اور مشائخ سے اُن کے مکانوں پر جا کر ملا تھا۔ بہار کے ایک مشہور بزرگ شیخ فخر الدین زاہدیؒ تھے[5]، بنگال کے بادشاہ اُن کے مرید تھے اور بہار میں اُن کا بڑا اثر اور اقتدار تھا۔ جو بھی ان کے پاس ملنے کے لیے آتا اُسے شربت پلاتے تھے۔ جس وقت سکندر اُن کے پاس پہنچا تو مصری اور چینی موجود نہ تھی۔ ایک خادم نے اشارہ سے یہ بات شیخ سے کہی، انھوں نے انگلی سے اشارہ کیا کہ

از شیرینی چینی خراشیدہ شربت ساختہ بیارید[6] مٹھائی پر سے چینی کھرچ کر شربت بنا لاؤ۔

سلطان اور اس کے ساتھیوں نے یہ شربت پیا۔ جب سلطان رخصت ہوا تو شیخ زاہدی نے ایک ایک خادم کو ساتھ روانہ کر دیا تاکہ وہ یہ دیکھے کہ سلطان اُن کے متعلق کیسی رائے ظاہر کرتا ہے۔

---

[1] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۳۶، تاریخ داؤدی ص ۳۶ [2] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۳۶، زبدۃ التواریخ ورق ۳۔ [3] تاریخ داؤدی ص ۳۸ [4] طبقات اکبری ج ا ص ۳۳۵، واقعات مشتاقی ص ۲۰۔ [5] حالات کے لیے ملاحظہ ہو گلزار ابرار (قلمی)

[6] افسانۂ شاہان ورق ۲۸-۲۹۔

سکندر نے باہر نکل کر مولانا جمالی سے کہا کہ ان جیسا شیخ اس وقت کہیں نہیں ہے۔ لیکن ایک عیب ہے۔ یہ ہیں جاہل۔ گفتگو کے دوران میں کہنے لگے "من شمارا غبتاً یاد میکردم"۔ جہالت کے باعث "غبتا" اور "غیبتاً" میں فرق نہ کرسکے[1]

سکندر جب تک بہار میں رہا پابندی کے ساتھ نماز جمعہ کے لیے حاضر ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اُسے آنے میں دیر ہوگئی۔ میاں بدی حقانی نے سلطان کا انتظار کیے بغیر جماعت کھڑی کرادی۔ جب نماز ختم ہوچکی تو بادشاہ پہنچا۔ جمالی نے سمجھ لیا کہ نماز ہوچکی ہے لیکن درباری ذہنیت سے مجبور ہو کر نمازیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

"اے مردمان! بس ایں مقدار تاخیر نباید کرد کہ بادشاہ بیاید" اے لوگو! بادشاہ کے انتظار میں اتنی تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

میاں بدی حقانی جمالی کی یہ تقریر سُن کر فوراً بولے:

من نماز خدائے را گذرانیدم وگذاردیم ہم کو اللہ کی نماز ادا کرنی تھی وہ ادا کرلی۔

سکندر نے مولانا جمالی کو خاموش کردیا اور میاں بدی سے کہا کہ آپ نے اچھا کیا کہ نماز ادا کرادی کوتاہی تو میری ہی ہے[2]

بہار کے قیام کے زمانہ میں سلطان شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مزار پر بھی حاضر ہوا تھا اور وہاں کے فقراء و مساکین کو خیرات دی تھی[3]

سکندر لودی نے بہار سے روانگی کے وقت وہاں کے علماء و مشائخ بالخصوص شیخ بدی حقانیؒ، شیخ بدن منیریؒ، شیخ بدہ طیبؒ، شیخ فخرالدینؒ وغیرہ کو نذریں پیش کیں[4]

علمی دلچسپیاں اور علماء سے تعلقات سکندر لودی بہت اچھا علمی مذاق رکھتا تھا۔ اُسے ادب سے بھی

---

[1] افسانۂ شاہان ورق ۲۸-۲۹ [2] ایضاً ورق ۲۸-۲۹

[3] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۲۰، زبدۃ التواریخ ورق ۷۲، تاریخ داؤدی ص ۵۳-۵۴

[4] افسانۂ شاہان۔ ورق ۲۹۔

دلچسپی تھی اور علمی اور دینی مسائل سے بھی[1] - خود فارسی میں شعر کہتا تھا اور گلرخی[2] تخلص کرتا تھا علم دوستی کا یہ حال تھا کہ بقول شیخ محدث رح:

"از اکناف عالم از عرب و عجم بعضے بہ	دنیا کے مختلف گوشوں سے اور عرب و عجم
سابقہ استدعا و طلب و بعضے بے	سے بعض لوگ بغیر بلائے اور بعض دعوت پر
آں، در عہد دولت او تشریف آوردہ	اس کے دور حکومت میں تشریف لائے اور
توطن ایں دیار اختیار کردند" [3]	اس ملک میں سکونت اختیار کرلی۔

اکثر عالم رات کو اس کے پلنگ کے نیچے بیٹھ جاتے تھے اور وہ اُن سے مسائل دریافت کرتا رہتا تھا۔ خود اس کا کھانا ایک کرسی پر چن دیا جاتا تھا اور علماء کا کھانا اُن کے سامنے فرش پر لیکن کسی عالم کو وہاں کھانے کی اجازت نہ تھی۔ جب مجلس برخاست ہو جاتی تو وہ کھانا گھر لے جا کر کھاتے تھے[4]۔

اس عہد کے علماء میں شیخ سعد اللہ[5]، شیخ رزق مشتاقی، مولانا الہداد[6]، شیخ عبدالوہاب بخاری، شاہ جلال تبریزی، شیخ عبداللہ تلنبی، میاں طہٰ اور میاں خواجگی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شیخ سعد اللہ، شیخ عبدالحق محدث رح کے دادا اور شیخ رزق اللہ ان کے چچا تھے موخر الذکر عربی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ ہندوؤں کے علوم پر مہارت کامل حاصل تھی[7]۔ ہندی میں راجن اور فارسی میں مشتاقی تخلص کرتے تھے۔ مولانا الہداد جونپور کے مشہور علماء

---

[1] شیخ نور الحق کا بیان ہے: "استماع مذاکرہ علمی و تحقیق مسائل فقہی رغبتے تمام بود" (ورق ۷۲)، نیز ملاحظہ ہو تاریخ شاہی ص ۴۶
[2] اس کے حسن و جمال کے پیش نظر یہ تخلص بہت موزوں تھا۔ ملاحظہ ہو زبدۃ التواریخ ص ۷۴، اس کے چند اشعار بدایونی نے (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۲۳) اور ایک شعر نور الحق نے (ورق ۷۴) نقل کیا ہے۔
[3] اخبار الاخیار ص ۲۲۰، نیز تاریخ داؤدی ص ۳۶
[4] واقعات مشتاقی ص ۴۹، احمد یادگار نے صرف امراء کا ذکر کیا ہے (ص ۴۱-۴۲) سلطان کی علمی یا مذہبی دلچسپیاں اپنی جگہ پر لیکن علماء کے ساتھ یہ برتاؤ تو نہایت حقارت آمیز تھا۔
[5] دیکھیے اخبار الاخیار، ص ۱۶۹۔ [6] ایضاً ص ۱۹۱۔
[7] صبح گلشن ص ۴۱۳۔

میں تھے۔ فقہ پر متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ سلطان سکندر خود اُن کے مکان پر ملاقات کے لیے گیا تھا[1]۔ شاہ جلال شیرازی مکّہ معظّمہ سے ہندوستان آگئے تھے۔ مثنوی مولانا روم کے ماہرین میں اُن کا شمار ہوتا تھا[2]۔ شیخ عبداللہ تلنبی ملتان سے آئے تھے اور دہلی میں قیام کرلیا تھا۔ سکندر اُن کے درس میں اس طرح شریک ہوتا تھا کہ

"درگوشۂ مجلس آہستہ می نشست وبعد از فراغ درس سلام علیکم گفتہ بایک دیگر صحبت می داشتند"[3]

مجلس کے گوشہ میں آہستہ بیٹھ جاتا اور درس سے فراغت کے بعد سلام علیکم کرکے باہم گفتگو کرتے تھے۔

شیخ عبداللہ اور اُن کے بھائی شیخ عزیز اللہ نے دہلی میں علم معقول کو بہت رواج دیا تھا۔ ان سے پہلے منطق وکلام میں صرف شرح شمسیہ اور شرح صحائف ہندوستانی مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھیں[4]۔ شیخ الہدیا اور شیخ عبداللہ تلنبی میں سلطان اکثر بحث ومباحثہ کراتا تھا[5]

میاں طٰہٰ اس عہد کے متبحر عالموں میں تھے۔ کوئی ہنر اور کوئی علم ایسا نہ تھا جس میں اُن کو کامل دستگاہ حاصل نہ ہو۔ خطاطی، نقاشی، علم مقراض، علم موسیقی ہر فن میں کمال رکھتے تھے موسیقی کے کاملانِ فن اُن کو اُستاد مانتے تھے۔ علم طب میں اُن کو چوبیس ہزار اشلوک یاد تھے۔ ہندو بھی اُن کے پاس تحصیل علم کے لیے آتے تھے۔ سکندر اُن کی بڑی قدر کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ۔ "ہزار آدمی بہ یک ذات میاں طٰہٰ است"[6]

---

[1] افسانۂ شاہان ورق ۲۹-۳۱، شیخ الہداد کے بعض منافق دوستوں نے اس موقع پر اُن کے ساتھ بُرا سلوک کیا تھا۔ تفصیل کے لیے افسانۂ شاہان دیکھیے۔ [2] اخبار الاخیار ص ۲۱۴۔

[3] منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۴، شیخ عبداللہ کی ایک کتاب بدیع المیزان شرح میزان المنطق کے نسخے رام پور، حیدرآباد اور بانکی پور کے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ حالات کے لیے ملاحظہ ہو مآثر الکرام ص ۱۹۱۔

[4] منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۳۔ نیز ملاحظہ ہو مولانا سید عبدالحیی کا مضمون "ہندوستان کا نصاب درس" الندوہ فروری ۱۹۰۹ء ص ۸-۹۔ [5] منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۴۔

[6] واقعات مشتاقی ص ۱۳۳۔ مولانا رزق اللہ مشتاقی نے بھی اُن کے درس میں شرکت کی تھی۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے ایک موتی اپنے ہاتھ سے بنا کر سلطان کو دیا تھا اور جوہری تک اس کی شناخت سے قاصر رہے تھے

(باقی بر صفحہ ۴۶۰)

اسی دور کے ایک اور عالم سید رفیع الدین صفوی تھے معقولات میں مولانا جلال الدین دوانی کے اور حدیث میں شیخ شمس الدین سخاوی الحافظ المصری کے شاگرد تھے۔ حرمین الشریفین سے سکونت چھوڑ کر دہلی آ گئے تھے اور

"سلطان سکندر درحق او اعتقادِ عظیم پیدا شد" ؎۱	سلطان سکندر کو ان میں بے حد اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔

بعد کو وہ سلطان کی اجازت سے آگرہ چلے گئے تھے۔

شیخ حسام الدین المشتہر بہ شیخ اوجھر اس عہد کے متبحر علماء میں تھے۔ سکندر لودی نے چند علماء فحول اور "چند شتر" کتابیں اُن کے سپرد کر کے محکمۂ احتساب کا نگراں بنا دیا تھا۔ وہ ملک کے مختلف حصوں میں گئے اور مشایخ، مفتیوں، قاضیوں اور اشراف سے اس مضمون کے محلکے لکھوائے کہ

"من بعد ازیں ہیچ متنفسے بامور نا مشروعہ وممنوعہ مرتکب نگردد"	اس کے بعد کوئی متنفس کسی غیر شرعی کام کا مرتکب نہ ہوگا۔

سکندر لودی اُن کے احتسابی کام سے بہت خوش ہوا تھا۔ اسی سلسلہ میں وہ گنگوہ پہنچے اور شیخ عبد القدوس گنگوہی رح کے پاس جا کر سرود و سماع پر احتساب کیا لیکن اُن کی صحبت سے کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ اپنا مال و اسباب لٹا کر اُن کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو گئے۔ لکھا ہے کہ جب سکندر لودی کو شیخ اوجھر کی زندگی میں اس انقلاب کا علم ہوا تو وہ بھی شیخ گنگوہی رح کا بہت معتقد ہو گیا۔ ؎۲

میاں بھوہ اور سکندر لودی	عہد سکندری کے علماء میں میاں بھوہ کو امتیازی شان حاصل ہے۔ اُن ؎۳

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۵۹) علم کیمیا اور سیمیا میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے لیے کاغذ سے ایک "کلاہِ عاج" تیار کیا تھا۔ ایک عجیب و غریب کرن پھول بنایا تھا جو سر کی حرکت کے ساتھ کبھی پھول بن جاتا تھا کبھی غنچہ۔ (ملاحظہ ہو تاریخ داؤدی ص ۵۶) مشتاقی نے لکھا ہے کہ اُن پر سعدی کا یہ شعر صادق آتا تھا ؎ آں چیست در جہاں کہ نداری تو از ہنر: تا سعدی از خدائے بخواہد برائے تو۔ (ص ۱۳۳) ؎

(نوٹ صفحہ ہذا) ؎۱ اخبار الاخیار ص ۲۴۴۔ ؎۲ تکملہ لطائف قدوسی ص ۱۰۷-۱۰۹۔

؎۳ (بر صفحہ ۴۶۱)

کی علمی دلچسپیوں کا یہ حال تھا کہ۔

"علماء ہم نشین ساخت فضلائے عصر پیش او گرد آمدند و خطاطان و حکماء جمع کرد و کتابہا از ہر علم مکرر می نویسانید و از خراسان می آورد و علماء و فضلاء مید اد و ہمیشہ کتابان اندریں کار مشغول می بودند حکماء ہند و خراسان را جمع کردہ و کتابہا حکمت گرد آورد و انتخاب کنانید" [۱]

ان کی طب سکندری کو تاریخ طب میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔کتاب کے دیباچہ میں مؤلف نے یہ بتایا ہے کہ سلطان کی علم دوستی نے اس میں علمی مذاق پیدا کیا تھا۔خاتمہ پر چند اشعار ہیں جن میں سلطان کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے۔

شہا طبائع بندہ زکردن ایں طب	نہ مال بود و منال و نہ جاہ بود و کمال
یکے دو چیز تمنائے نوکرت بودہ	کہ باد حاصل آں دو بہ فضل رب جلال
یکیکہ نفع رسد زاں ہمہ وضیع و شریف	دوئم ثواب بود شاہ را ازاں اعمال
کہ تا بروز قیامت جہانیاں باشند	دعائے جاہ و جوانی شہ بصدق مقال
مؤیدا ملکا خالقا خداوندا	بدہ تو دولت کونین شاہ را ہمہ حال [۲]

سجان رائے نے لکھا ہے کہ ایک دن جامع مسجد میں سکندر لودی کی نظر سوبٹھ کے ایک دانہ پر جا پڑی، اُسے اُٹھالیا اور میاں بھوہ کے ہاتھ پر رکھ دیا میاں بھوہ نے

آں را در باغچہ نشیمن خود کاشتہ مراسم حزم و احتیاط در پرورش آں بکار برد، از و چند خوشہ بر آمد، چوں پختہ شد زیادہ از دو صد دانہ بہم رسید، ہمچنیں چند سال علی التواتر کاشتہ و حاصلات آں سال بسال بہم رسانیدہ مبلغے فراواں پیدا

(نوٹ صفحہ ۴۶۰) [۵] جمالی نے لکھا ہے: وزیرے بے نظیر، صاحب فراست و اہل کمال و کیاست مربی علماء و فقراء۔ کہ مدار سلطنت از وے باستحکام بود" سیر العارفین ص ۱۳۸۔

نوٹ صفحہ ہذا: [۱] واقعات مشتاقی ص ۶۳،

[۲] معدن الشفاء یعنی طب سکندری ص ۳۔۹۰۔

کردواز آں سلطنہا در شہر دہلی مسجدے بعمارت متین احداث نمودہ"[1]

سکندر کو جب اس کا علم ہوا تو میاں بھوہ کی عقل و دانش کی بہت داد دی۔ میاں بھوہ کی ذہانت اور فرزانگی کے بہت سے قصّے واقعات مشتاقی اور افسانۂ شاہان میں درج ہیں۔

شیخ حسن طاہر اور سلطان | شیخ حسن طاہر[2] راجی حامد شہ کے مرید تھے۔ بہار میں شیخ بدہ حقانی سے تحصیل علم کیا تھا۔ فلسفہ وحدت الوجود کے خاص ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے سلطان سکندر کا ایک بھائی اُن کا مرید تھا۔ ایک دن اُن سے عرض کیا۔

"حضرت شیخ فاتحہ بخوانید کہ تام اسلطنت دہلی نصیب گردد"	حضرت شیخ فاتحہ پڑھیے کہ مجھے دہلی کی سلطنت حاصل ہو جائے

شیخ حسن نے اس خیال سے باز رکھا اور کہا کہ

"حق تعالیٰ بحکمت خویش ترقی یکے خواستہ است تو در آنجا معارضہ مکن تو مطیع او باش"[3]	اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے ایک کی ترقی چاہی ہے تو اس بات میں معارضہ مت کرو اس کا فرمانبردار ہو جا۔

سلطان سکندر کو جب اس کا علم ہوا تو اُنہیں اصرار کر کے آگرہ بلوایا۔ وہ کچھ عرصہ وہاں رہ کر دہلی چلے گئے۔ وہیں ان کا مزار ہے۔

سکندر لودی اور جمالی | شیخ سماءالدین دہلویؒ کے مرید مولانا جمالی[4] سکندر لودی کے مصاحبین خاص میں تھے۔ افسانۂ شاہان میں لکھا ہے:

"می گویند درمیان مولانا جمالی و سلطان سکندر چناں اتحادے بود کہ دیگرے درمیان نبود"[5]

---

[1] خلاصۃ التواریخ ص ۲۷۸، یہ مسجد اب تک موجود ہے اور موٹھ کی مسجد کہلاتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ Carr Stephen p. 166,

[2] [3] اخبار الاخیار۔ ص ۱۹۰۔

[4] حالات کے لیے ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۲۲۱، منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۲۶۔ نیز Storey: Persian Litrature p. 968-970.

[5] افسانۂ شاہان۔ ورق ۳۶

ایک دن سکندر نے کسی معاملہ میں میاں حافظ کی جانبداری کردی تو جمالی دلگیر ہو گئے اور قلندروں کی طرح "چرمے در زیر بستہ و خاک بر وجود خود مالیدہ" خراسان کی طرف نکل گئے[1] عراق و عرب، عجم و روم و شام و مصر و ماوراء النہر میں عرصہ تک گشت کرنے کے بعد دہلی پہنچے۔ سکندر ان دنوں بدایوں میں تھا۔ وہاں سے جمالی کے نام اپنے ہاتھ سے مندرجہ ذیل منظوم خط لکھ کر بھیجا اور شیخ سماء الدین کو بھی لکھا کہ جمالی کو جلد از جلد بدایوں بھیج دیں:

اے مخزنِ گنجِ لایزالی — اے سالکِ راہِ دیں جمالی
در گردِ جہاں بسے زدہ سیر — در منزلِ خود رسید بالخیر
بودے تو مسافرِ زمانہ — الحمد کہ آمدی بخانہ
اے شیخ بما برس بزودی — بسیار مسافرت نمودی
بکشائے بسوئے درگہم گام — تا دریابی زگلرخی کام
چشم بجمالِ تو طپان است — دل مرغ مثال در فغان است
من اسکندر تو خضر مائی — آں بہ کہ بسوئے ما بیائی
باید کہ کتاب مہر و ماہم — ارسال دہد چنانکہ خواہم
از مہر کشد دو دیدہ را نور — آں مہ نشود ز دیدہ ام دور[2]

احمد یادگار کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سماء الدین نے اصرار کر کے جمالی کو بھیجا تھا اور

---

[1] افسانۂ شاہان میں لکھا ہے کہ سکندر نے جمالی کو واپس لانے کے لیے آدمی بھیجے تھے۔ تو جمالی نے لکھا۔ "اے بادشاہ از ما و شما دوستی از دل بود، برائے مال و جاہ نبود، چونکہ رقیبے درمیان شد خاطرم پارہ پارہ گشت، پیوندنمی پذیرد" ؎

گرچہ دوریم از بساطِ قرب ہمت دور نیست — بندۂ شاہی شمائیم و ثنا خوانِ شما (ورق ۳۸)

[2] بعض تذکروں میں ان دو شعروں کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے ؎

در مکہ و مدینہ گشتی — گوہر بودی خزینہ گشتی
در شیخ زدوستاں نشد سیر — تشریف نمودنش کشد دیر

افسانۂ شاہان (ص ۳۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شعر سکندر نے ہندوستان سے باہر جمالی کے پاس بھیجا تھا۔

انہیں سمجھایا تھا کہ۔

فقرار را از صحبت پادشاہان بسی فائدہ دنیاست کہ مہم چندیں مسکیناں بوسیلۂ آں فیصل یابد"[1]	فقرار کو بادشاہوں کی صحبت سے بہت سی دنیاوی فائدے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سی مسکینوں کی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔

بہر حال ٹوٹے ہوئے رشتے پھر جڑ گئے اور جمالی دربار میں واپس آگئے۔ جب سکندر لودی کا انتقال ہوا تو جمالی کو بے حد صدمہ ہوا۔ ان کے لکھے ہوئے مرثیہ کے یہ چند شعر گہرے غم والم کا پتہ دیتے ہیں ؎

خلق حیران و پریشانست شہنشاہ چہ شد　　ہمہ بر سینہ زناں دست کہ اللہ چہ شد

مہر در آتش غم سوخت شفق خوں بارید　　انجم از چرخ فرو ریخت کہ آں ماہ چہ شد

ظلمت آباد شد آفاق ز شام غم او　　یارب آں طلعتِ خورشید سحرگاہ چہ شد

خوں گرہ شد بگلو زاہ دمم شد مسدود　　در غم آنکہ مرا ہمدم و ہمراہ چہ شد

دیک آں فرحت و آں بہجت و آں حال چہ شد　　آوخ آں دولت و آں مسند و آں گاہ چہ شد

نیک خواہان وے ایں لحظہ اجل خواہ شدند　　کاں خداداں و خدابین و خداخواہ چہ شد

ہاتفم گفت مپندار کہ او در خاک است　　قدمش ہمچو ہمیر بسر افلاک است

لودھن کا قتل تخت نشینی کے بعد سکندر سنبھل میں مقیم تھا۔ وہاں لکھنوتی کے حاکم اعظم ہمایوں نے ایک برہمن لودھن کو اس کے پاس بھیجا۔ اس برہمن کا قصور یہ تھا کہ اُس نے کہا تھا کہ

اسلام حق است و دین من نیز درست ست　　اسلام حق ہے اور میرا دین بھی صحیح ہے۔

قاضی پیارہ اور قاضی بدہ کی رائے میں اختلاف تھا۔ سکندر نے ملک کے مختلف حصوں سے علمار کو طلب کیا۔ دہلی سے میاں قادن بن شیخ خوجو، میاں عبداللہ بن الہداد تلنبی، سید محمد بن سعید خاں بلائے گئے، سرہند سے ملا قطب الدین، ملا الہداد، ملا صالح، قنوج سے سیدامان

[1] تاریخ شاہی ص ۴۸۔

اور میراں سید آخن بلائے گئے۔ ان کے علاوہ وہ علماء بھی شریک محضر تھے جو ہمیشہ سلطان کے ساتھ رہتے تھے مثلاً سید صدر الدین قنوجی، میاں عبدالرحمٰن سیکروی، میاں عزیز اللہ سنبھلی۔ ان سب علماء نے مسئلہ پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ لودھن کو قید میں رکھا جائے اور اس سے اسلام میں اعتقاد کا اعلان کرایا جائے، اگر انکار کرے تو قتل کر دیا جائے۔ لودھن نے انکار کیا۔ چنانچہ اس کو قتل کر دیا گیا۔[1]

لودھن کا قتل ہندوستان کی مذہبی تاریخ کا ایک نہایت ہی افسوسناک واقعہ ہے لیکن اس کو ایک فرد کا معاملہ سمجھنا غلط ہوگا۔ لودھن کا یہ جملہ یقیناً بھگتی کی تحریک کا ترجمان تھا۔ اگر ایسی صورت نہ ہوتی تو ملک کے دور دراز حصوں سے علماء کو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ہرگز طلب نہ کیا جاتا۔

شراب وسرود میں دلچسپی

مذہب سے اس گہرے لگاؤ کے باوجود جس کا مظاہرہ سلطان اکثر کرتا رہتا تھا، وہ شراب اور گانے کا شوقین تھا۔[2] عبداللہ لکھتا ہے:

"بعضے از اہل خبر بریں رفتہ اند کہ شاید درآں وقت سلطان بقصد صحت مزاج و بطریق مداوا و علاج درخفیہ بر نہجیکہ ہیچ کس برآں مطلع نشدے بطریق ادویہ جیا چیزے از اسباب عیش و عشرت نیز بکار بردے"۔[3]

عبداللہ نے فن موسیقی میں اس کی دلچسپی اور سازندوں کے ساتھ اس کے برتاؤ کی تفصیل بھی

---

[1] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۲۲-۳۲۳، تاریخ داؤدی ص ۵۹-۶۰، تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۸۳، فرشتہ نے اس کا نام بودھن لکھا ہے۔ ولسن کا خیال ہے کہ لودھن غالباً کبیر کے چیلوں میں کوئی شخص تھا۔ (Asiatic Researches Vol XVI p. 55) ہودی والا کا خیال ہے کہ ممکن ہے وہ بھاوانند ہو جو رامانند کے بارہ چیلوں میں سے ایک تھا (Studies in Indo-Muslim History p. 471)

[2] غالباً انہی کمزوریوں کے پیش نظر نظام الدین نے اپنے محتاط انداز میں اس کے متعلق لکھا ہے: بیشتر بر ہوائے نفس نرفتے (ج ۱ ص ۳۳۵)

[3] تاریخ داؤدی ص ۳۶، مشتاقی نے لکھا ہے: "بعضے اوقات شراب می خورد اما ہیچ آفریدہ ندیدہ داست" (ص ۵۲)

دی ہے[1]

سماجی اصلاحات سکندر نے بعض سماجی خرابیوں کو دور کرنے کی بھی کوشش کی۔ مذہبی رسوم کے پردے میں جو گمراہیاں عام ہو گئی تھیں اُن کے خلاف اس نے تعزیری کارروائیاں کیں۔ سید سالار مسعود کے نیزے جو ہر سال نکلتے تھے اس نے تمام ملک میں بند کرا دیے[2]۔ فیروز شاہ نے عورتوں کو قبروں پر جانے سے روکا تھا، لیکن اس کے بعد یہ رسم پھر جاری ہو گئی تھی۔ سکندر نے اس پر بھی پابندی لگائی[3]۔ علاوہ ازیں بہت سی جعلی قبریں اس زمانہ میں وجود میں آ گئی تھیں۔ مشتاقی نے لکھا ہے۔

"وقبور بلا میت را نهر ساخته"[4]

چیچک کی دیوی سیتلا کی پرستش کو سختی سے روکا[5]

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا خط سکندر لودی کے نام شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے سلطان کو ایک طویل خط لکھا تھا جس میں علماء و صلحاء و ائمہ کے ساتھ تیمارداری اور "غم خواری" کا برتاؤ کرنے کی درخواست کی تھی۔ خط میں یہ القاب استعمال کیے گئے تھے:

"بجناب عالی مآب لایزال عالیا حضرت ظل اللہ فی الارض آسمان جاہ فلک سپاہ جهاندار شہریار سلیمان جهانبان سکندر زماں خلد اللہ ملکہ وابد فی العالمین رافتہ واعلیٰ فی الدارین شانہ وصانہ عما شانہ"

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے زمانہ سے اب تک تصوف اور صوفیہ کے افکار و کردار میں جو فرق پیدا ہو گیا تھا وہ اس خط کے ایک ایک حرف سے ظاہر ہے۔ اس میں سلطان کو "روشن ضمیر" "منیر حق پذیر" وغیرہ القاب سے مخاطب کیا گیا ہے، اور بقائے جہاں کا انحصار سلطان پر بتانے کے بعد مشائخ و علماء کے ساتھ اچھے سلوک کی ترغیب دی گئی ہے:۔

---

[1] تاریخ داؤدی ص ۳۸-۳۹۔ [2] واقعات مشتاقی ص ۱۵۔ تاریخ داؤدی ص ۳۸

[3] تاریخ داؤدی ص ۳۸ [4] واقعات مشتاقی ص ۱۵۔

"پس ہمت بلند باید درم و دینار جاہ و جلال نثار فقرا و صلحا ، شاید کہ در خدمت و صحبت ایشاں ایں سعادت و مساعدت نماید . . . ہمہ عالم امید وار الطاف و اشفاق خداوند عالم است"[1]

ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ

ہندوؤں سے برتاؤ کے سلسلہ میں سکندر لودی بجا طور پر بدنام ہے ، خود مسلمان مورخوں نے اعتراف کیا ہے کہ

"تعصب اسلام بمرتبہ داشتے کہ دریں باب بسر حد افراط رسانیدہ بود"[2]	اسلام میں تعصب اس حد تک رکھتا تھا کہ سرحد افراط تک پہنچ گیا تھا ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے یہ تعصب اس لیے اختیار کیا تھا تاکہ عام مسلمان یا اس کے ہم قبیلہ افغان اس کو ہندو ماں کے پیٹ سے ہونے کا طعنہ نہ دے سکیں[3] ۔ ممکن ہے کہ اس کے تحت الشعور میں یہ احساس بھی کام کر رہا ہو ، لیکن اس کی پوری مذہبی پالیسی کو صرف اس نقطہ کے گرد نہیں گھمایا جا سکتا ـــــ اس کی مذہبی فکر بھگتی کی تحریک کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے ۔ ایسی صدا جو اس کی زندگی تک تو محلات شاہی میں گونجتی رہی لیکن اس کے مرنے کے بعد صدا بہ صحرا ثابت ہوئی ۔ اکبر کے عہد تک بھگتی کی تحریکیں پوری قوت کے ساتھ کام کرتی رہیں اور ہندوستان کے بعض بہترین دماغ اس سے متاثر ہوئے ۔

سکندر لودی کے مذہبی تعصب سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن عبداللہ[4] اور دیگر مورخین نے جس انداز میں انہدام منادر کی تصویر کھینچی ہے وہ حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی ۔ نگر کوٹ[5] اور متھرا[6] میں سکندر نے ضرور تعصب سے کام لے کر سختی کا برتاؤ کیا تھا لیکن سلطنت کے اور حصوں میں تخریب منادر کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی ۔ اس کے برخلاف یہ حقیقت ہے

---

[1] مکتوبات قدوسی ص ۴۶ [2] طبقات اکبری جلد اول ص ۳۳۵

[3] A. B. Pandey : The First Afghan Empire in India p. 251.

[4] تاریخ داؤدی ص ۳۷ وغیرہ [5] تاریخ شاہی ص ۴۷

[6] واقعات مشتاقی ص ۱۳، تاریخ داؤدی ص ۳۷ ۔

کہ سکندر لودی نے ہندوؤں کے علوم میں دلچسپی کا اظہار کیا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوؤں کو فارسی کی تعلیم کی طرف ترغیب دی لکھا ہے:۔

"وکافراں بخواندن ونوشتن خط فارسی	اور کافروں کو فارسی پڑھنے اور لکھنے کی طرف
کہ تا آں زماں درمیان ایشاں معمول	لگایا اس وقت تک ان میں اس کا رواج
نبود پرداختند"[1]	نہیں ہوا تھا۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ ہندوؤں کا دفاتر میں عمل دخل پہلے سے زیادہ بڑھ گیا اور شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے بابر سے درخواست کی کہ اُن کے تقررات محکمہ دیوانی میں نہ کیے جائیں[2]۔

انتقال رزق اللہ مشتاقی نے لکھا ہے:

"در تمام اعمال وافعال او جائے انگشت	اس کے تمام اعمال وافعال میں کسی جگہ بھی انگلی
نہ الا کہ ریش می تراشید"[3]	رکھنے کی گنجائش نہ تھی مگر یہ کہ وہ داڑھی منڈاتا تھا۔

دہلی کے ایک مشہور بزرگ حاجی عبدالوہاب بخاریؒ[4] نے ایک دن سکندر کو داڑھی رکھنے کی تلقین کی اور کہا کہ ——

"شما پادشاہ مسلمانان باشید و ریش نگاہ	تم مسلمان بادشاہ ہو اور داڑھی نہیں رکھتے۔
ندارید۔ از آداب سلمانی دور می نماید"	یہ آداب مسلمانی سے دور نظر آتا ہے۔

سکندر نے جواب دیا کہ میری داڑھی بھری ہوئی نہیں ہے۔ اگر رکھونگا تو بری معلوم ہوگی، اور لوگ ہنسینگے۔ حاجی عبدالوہاب نے کہا: میں ہاتھ پھیرے دیتا ہوں، اچھی داڑھی نکلیگی۔ سکندر یہ سُن کر خاموش ہو گیا۔ حاجی نے اصرار کیا اور جواب مانگا۔ سکندر نے جواب دیا کہ جب میرا پیر

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۸۷ [2] مکتوبات قدوسی ص ۳۳۷ [3] واقعات مشتاقی ص ۵۲

[4] حالات کے لیے ملاحظہ ہو اخبار الاخیار۔ ص ۲۰۹۔۲۱۴، گلزار ابرار (قلمی)، مشتاقی نے ان کا ذکر احتراماً اس طرح کیا ہے: "قطب عالم سید السادات حضرت شیخ حاجی عبدالوہاب"۔ سکندر کے "خوارق عادات" میں مورخین نے بیان کیا ہے کہ جب حج سے واپسی پر انھوں نے ساحل ہند پر قدم رکھا تھا تو سلطان نے بغیر اطلاع اس بات کا اعلان کر دیا۔

مجھے حکم دیگا جب رکھونگا۔ حاجی عبدالوہاب نے پوچھا: تمہارا پیر کون ہے۔ جواب دیا: وہ جالیسر کے ایک موضع بھوا کے جنگل میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھ سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔ حاجی عبدالوہاب نے پوچھا: خود اُن کے بھی داڑھی ہے۔ جواب دیا: نہیں۔ حاجی عبدالوہاب نے کہا: تم تو داڑھی رکھ لو، جب اُن سے ملاقات ہو گی اُن سے بھی امر معروف کرونگا۔ سلطان یہ سُن کر خاموش ہو گیا۔ اور حاجی عبدالوہاب اپنی قیام گاہ پر واپس آگئے۔ اُن کے اُٹھ جانے کے بعد سلطان نے کہا:

"شیخ می داند کہ مردم بخدمت ایشاں می آیند و پائے بوسی می کنند از عظمت ایشان است اگر من غلامے را بر چوڈول نشانم ہمہ امرا ر چوڈول او بکشند"	شیخ یہ سمجھتا ہے کہ لوگ جو اس کے پاس آتے ہیں اور اس کے پیر چومتے ہیں وہ اس کی اپنی عظمت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اگر میں اپنے کسی غلام کو چوڈول پر بٹھادوں تو سب امرا اس کا چوڈول کھینچیں۔

شیخ عبدالجلیل وہاں موجود تھے، انھوں نے یہ گفتگو شیخ عبدالوہاب تک پہنچادی۔ شیخ عبدالوہاب نے غصہ میں کہا:

"چوں او اہانت فرزند رسول کردہ بغلام نسبت نمودہ، ان شاء اللہ تعالیٰ حلق او خواہند گرفت" [1]	چونکہ اس نے فرزند رسول کی بے عزتی کی ہے اور غلام سے اس کو نسبت دی ہے، اللہ نے چاہا تو اس کا حلق بند ہو جائیگا۔

اور اپنے وطن کو چلے گئے۔ ایک ماہ کے بعد سلطان کے گلے میں شدید تکلیف پیدا ہوئی۔ اور روز بروز بڑھنے لگی۔ ایک دن اپنے امام شیخ لاڈن کو حکم دیا کہ "نماز و روزہ و ریش تراشیدن و می خوردن و گوش و بینی بریدن [2]" کے کفارہ کی رقم کا تعین کرکے تبلائے۔ پھر حکم دیا کہ

[1] واقعات مشتاقی ص ۵۲-۵۳، تاریخ شاہی ص ۶۲-۶۵۔ تاریخ داؤدی ص ۷۹-۸۱۔ زبدۃ التواریخ ورق ۲، ۷-۳۔

[2] واقعات مشتاقی ص ۵۲، یادگار نے "می خوردن" نہیں لکھا۔ (ص ۶۳)

"خزانہ از بیت المال علیحدہ است — اس خزانہ سے جو بیت المال سے مختلف اور علیحدہ
ازاں بعلما و صلحا در ساند" [1] — ہے (یہ رقم) علمار اور صالحین کو پہنچا دیں۔
اس بیماری میں ۷۔ ذی الحجہ ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔[2]

---

[1] واقعات مشتاقی ص ۵۲۔
[2] مقبرہ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: Carr Stephen: p. 170-171,

باب چہاردہم

سلطان ابراہیم لودی

لودی خاندان کے آخری فرمانروا ابراہیم لودی نے تقریباً چھ سال حکومت کی تھی۔ مورخوں نے اس کے مذہبی افکار و رجحانات کے متعلق کوئی تفصیل بہم نہیں پہنچائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ پانی پت نے تاریخ کا ایک ورق اس طرح اُلٹ دیا کہ پھر کسی کو ابراہیم کے افکار و کردار میں کوئی دلچسپی ہی نہ رہی خود افغانوں کے ساتھ اس کا برتاؤ اس قدر مغرورانہ تھا کہ انہوں نے اس کے متعلق روایات جمع کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ دور مغلیہ کے مورخوں نے اس کے "اخلاق حمیدہ" اور "حسن کیاست و فراست" کی تعریف کی ہے[1]۔ اس نے فقراء و مساکین کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ اُن کے وظائف، مدد معاش اور ادرار میں اضافے کیے۔ گوشہ نشینوں کو فتوحات اور نذریں بھیجیں[2]۔

ابراہیم لودی نجوم میں بہت اعتقاد رکھتا تھا۔ جنگ پانی پت سے پہلے اس نے نجومیوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے جواب دیا: "ستاروں کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے تمام گھوڑے اور ہاتھی مغل کے لشکر میں چلے گئے"۔ سلطان نے اس کو فتح کی بشارت پر محمول کیا۔

ابراہیم نے بہت سے ایسے لوگوں کو جو گزشتہ دور میں بڑی عزت اور اقتدار کے مالک تھے، بری طرح ذلیل کیا۔ میاں بھوہ، اعظم ہمایوں، جمالی تینوں سے اس کے تعلقات خراب ہو گئے تھے اعظم ہمایوں کے معاملہ میں شیخ راجو بخاری نے مصالحت کرانی چاہی تھی، لیکن سلطان رضامند نہیں ہوا۔ سلطان کا بھائی جلال خاں شکست کھا کر شیخ عبدالوہاب بخاریؒ کی خانقاہ میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ وہ قلندروں کا لباس پہنتا تھا، اور شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ابراہیم کو اس کی

---

[1] تاریخ شاہی ص ۶۹، طبقات اکبری ج ۱ ص ۳۴۱، زبدۃ التواریخ ورق ۴۵ ۔ [2] طبقات اکبری ج ۱ ص ۳۴۳
تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۸۹

اطلاع ہوگئی۔ وہاں سے بلوا کر ہانسی بھیجنے کا بہانہ کیا اور راستہ میں مروا دیا۔ شیخ عبدالوہاب کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔ اور ابراہیم کی طرف سے اُن کا دل مکدر ہوگیا جب پانی پت کا ہنگامہ گرم ہوا تو شیخ بستر علالت پر تھے لیکن بار بار ابراہیم کے متعلق پوچھتے تھے اور کہتے تھے:

"حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سر اورا بریدہ بدست من دادہ اند"[1] — حضرت رسول اکرمؐ نے اس کا سر کاٹ کر میرے ہاتھ میں دے دیا ہے۔

جمالی نے سکندر لودی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا، اس کا ایک شعر تھا:

اے سلیمانِ زماں آہ کجائی آخر — تا کنم پیش تو از فتنۂ دیواں فریاد[2]

لوگوں نے ابراہیم کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ جمالی نے اس کو "دیو" کہا ہے۔ چنانچہ جمالی کی طرف سے اس کو رنجش پیدا ہوگئی۔ جمالی نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی بہت کوشش کی۔ وہ "کدورت" تو شاید دور ہوگئی[3] لیکن جمالی کو عہدِ سکندری کی سی عظمت اور اقتدار حاصل نہ ہوسکا۔ چنانچہ اس نے اس کا بدلہ اس وقت نکالا جب ابراہیم کی نعش خاک و خون میں آلودہ پانی پت کے میدان میں نیرنگیِ عالم کا مرثیہ پڑھ رہی تھی۔ جمالی نے بابر کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا ؎

زافغاں فغاں برآمد آں دم کہ شد حسامت — اشباح را مخرب ارواح را محصل

از صدمۂ سمندت ہر فیل کوہ پیکر — در خاک و خوں فروشد ہمچوں حمار در گل

در حلقۂ سپاہت کا مد عدو پر از خوں — چوں نقطۂ ز سرخی در چشم گشتہ داخل

حالانکہ خود بابر کا عالم اس کی نعش کو دیکھ کر یہ ہوا تھا کہ

"دراں حال عبرت بخش بر خود لرزید سر او از خاک بر گرفت"[4] — اس عبرتناک منظر کو دیکھ کر لرز گیا اور اس کے سر کو خاک میں سے اُٹھا لیا۔

---

[1] زبدۃ التواریخ ورق ۷۸۔ [2][3] سیر العارفین ص ۱۳۸۔ [4] تاریخ شاہی ص ۹۸۔ بابر نے نہایت احترام کے ساتھ اس کو دفن کیا۔ اور "قند حلوا" تیار کرکے تقسیم کیا۔

مآخذ

عربی و فارسی

احکام السلطانیہ: ابوالحسن ماوردی

(۱) قاہرہ ۱۲۹۸ھ

(۲) اُردو ترجمہ حیدرآباد ۱۹۳۱ء

احیاء العلوم الدین: امام غزالیؒ

(۱) قاہرہ ۱۳۷۶ھ

(۲) اُردو ترجمہ: مذاق العارفین (نول کشور) ۱۸۷۵ء

اخبار الجمال: راجہ محمد بن راجی یار محمد

(قلمی)

اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ

اخلاق جلالی: جلال الدین دوانی

لکھنؤ ۱۲۸۳ھ

اخلاق محسنی: ملا حسین واعظ الکاشفی

ہرٹفورڈ ۱۸۵۰ء

اخلاق ناصری: محمد بن حسن المعروف بہ ناصر طوسی

لکھنؤ ۱۳۰۹ھ

آداب الحرب والشجاعت: فخر مدبر

(روٹوگراف قلمی نسخہ برٹش میوزیم)

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: شاہ ولی اللہ دہلویؒ

مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ

اساس التقدیس: امام فخرالدین رازیؒ

قاہرہ ۱۳۲۸ھ

اسرار الاولیاء: ملفوظات بابا فرید گنج شکر

(قلمی نسخہ، ذاتی)

اسرار المخدومین: ملفوظا خواجہ کرکؒ

فتح پور ۱۸۹۳ء

اصول السماع: مولانا فخرالدین زرادیؒ

مسلم پریس جھجر ۱۳۱۱ھ

اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین: امام فخرالدین رازیؒ

قاہرہ ۱۳۵۶ھ

اعجاز خسروی: امیر خسرو

مطبع نول کشور ۱۸۶۵ء

افسانۂ شاہان: محمد کبیر بن شیخ اسمٰعیل

(روٹوگراف قلمی نسخہ برٹش میوزیم)

افضل الفوائد: ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاءؒ

(۱) قلمی نسخہ، ذاتی (۲) مطبع رضوی دہلی ۱۳۰۵ھ

البدایۃ والنہایۃ: عماد الدین ابی الفدا اسمٰعیل معروف
بہ ابن کثیر

التبصیر فی الدین وتمییز الفرقۃ الناجیۃ عن الفرق
الہالکین : علاء الدین ابوالمظفر شاہفور اسفراینی
(قاہرہ ۱۳۵۹ھ)

الدر المنظوم فی ترجمہ ملفوظ المخدوم : ترجمہ جامع
العلوم، ملفوظات مخدوم جہانیاںؒ
شائع کردہ سید نور الحسن مجددی
مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۹ھ

الدرر الکامنہ : ابن حجر عسقلانی
دائرۃ المعارف ۱۳۴۸ھ

الفخری : ابن طقطقی
(۱) مطبوعہ مصر ۱۹۲۱ء
(۲) انگریزی ترجمہ وہٹنگ

الفرق بین الفرق وبیان الفرقۃ الناجیہ منہم :
عبد القاہر بغدادی

آئین اکبری : ابو الفضل
مرتبہ سید احمد خاں (دہلی)

آئینۂ سکندری : امیر خسرو
بہ تصحیح مولانا سعید احمد فاروقی
مطبع انسٹیٹیوٹ علیگڈھ ۱۹۱۷ء

بابرنامہ : ظہیر الدین بابر
(۱) فارسی : مطبوعہ بمبئی ۱۸۹۰ء
(۲) انگریزی ترجمہ مسز بیوریج، لندن ۱۹۲۱ء

تاج المآثر : صدر الدین حسن نظامی
(قلمی نسخہ مملوکہ پروفیسر محمد حبیب)

تاریخ الکامل : ابن اثیر
(۱) مصر ۱۲۹۰ھ
(۲) ترجمہ حیدرآباد ۱۹۲۷ء

تاریخ آل سبکتگین : ابو الفضل بیہقی
(۱) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۶۲ء
(۲) طہران ۱۳۲۶ھ

تاریخ حقی : شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ
(قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری)

تاریخ داؤدی : عبد اللہ
بہ تصحیح پروفیسر شیخ عبد الرشید (علی گڈھ)

تاریخ دولت شیر شاہی : حسن علی خاں
(مڈیول انڈیا کوارٹرلی)

تاریخ شاہی : احمد یادگار
ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۹ء

تاریخ فخر الدین مبارک شاہ : فخر مدبر
بہ تصحیح سر ڈینی سن راس (لندن ۱۹۲۷ء)

تاریخ فرشتہ : محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ

نول کشور سنہ ۱۲۸۱ھ

تاریخ فیروز شاہی : ضیاء الدین برنی

ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۸۶۰

تاریخ فیروز شاہی : شمس سراج عفیف

ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۸۹۱ء

تاریخ مبارک شاہی : یحییٰ بن احمد سرہندی

ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۳۱ء

تاریخ محمدی : محمد بہامد خانی

(روٹو گراف قلمی نسخہ برٹش میوزیم)

تاریخ نامہ ہرات : سیف بن محمد بن یعقوب ہروی

ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۴۴ء

تاریخ یمینی : ابو النصر محمد بن محمد الجبار العتبی

(فارسی ترجمہ : طہران سنہ ۱۲۷۱ھ)

تبصرة العوام فی معرفة مقالات الانام :

سید صفی الدین ابو تراب مرتضیٰ

طہران سنہ ۱۳۱۳ھ

تغلق نامہ : امیر خسرو

بہ تصحیح سید ہاشمی فرید آبادی

(مطبع اردو اورنگ آباد سنہ ۱۹۳۳ء)

جوامع الکلم : ملفوظات سید محمد گیسو دراز۔

مرتبہ سید محمد حسینیؒ ۔ بہ تصحیح محمد حامد صدیقی

(مطبع انتظامی کانپور سنہ ۱۳۵۶ھ)

جواہر فریدی : علی اصغر چشتی

(قلمی نسخہ ذاتی)

چچ نامہ : محمد علی بن حامد بن ابوبکر

حیدر آباد دکن سنہ ۱۹۳۹ء

حجة اللہ البالغہ : شاہ ولی اللہ دہلویؒ

حمایت الاسلام پریس لاہور سنہ ۱۳۲۲ھ

خزائن الفتوح : امیر خسرو۔

(۱) مرتبہ سید معین الحق (علیگڈھ پرنٹنگ ورکس سنہ ۱۹۲۷ء)

(۲) انگریزی ترجمہ پروفیسر حبیب (مدراس سنہ ۱۹۳۱ء)

خزینة الاصفیاء : مولانا غلام سرور

مطبع ثمر ہند لکھنؤ سنہ ۱۸۷۳ء

خطط المقریزیہ : تقی الدین احمد مقریزی

مصر سنہ ۱۳۲۶ھ

خلاصة التواریخ : سجان رائے

بہ تصحیح ظفر حسن (مطبع جی اینڈ سنس دہلی سنہ ۱۹۱۸ء)

خیر المجالس : ملفوظات شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ

مرتبہ حمید قلندر

بہ تصحیح خلیق احمد نظامی (علی گڈھ)

دلیل المحکم فی نفی اثر القدم : مولوی سید نذیر حسین
فخر المطابع دہلی ۱۲۶۶ھ

دول رانی خضر خاں : امیر خسرو
بہ تصحیح مولانا رشید احمد سالم
مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۱۷ء

دیباچہ غرۃ الکمال : امیر خسرو
شائع کردہ سید یسین علی دہلوی (مطبع قیصریہ دہلی)

دیوان حسن : امیر حسن علاء سجزی
مرتبہ مسعود علی محوی
ابراہیمیہ مشین پریس حیدر آباد ۱۳۵۲ھ

دیوان شیخ جمال الدین ہانسوی :
شائع کردہ پیرجی رفیع الدین (دہلی ۱۸۸۹ء)

دیوان مطہر :
اورنٹیل کالج میگزین (مئی و اگست ۱۹۳۵ء)

ذخیرۃ الملوک : سید علی ہمدانی
(قلمی نسخہ ذاتی)

رحلۃ ابن بطوطہ :
عربی - مصر ۱۳۴۶ھ
اردو ترجمہ : عجائب الاسفار مولوی محمد حسین لاہور ۱۸۹۸ء

رسالہ احوال خانوادہ چشت : تاج الدین نبیرہ شہاب الدین امامؒ
(قلمی نسخہ ذاتی)

رسالہ مطلوب فی عشق المحبوب : محمد امیر ماہؒ
(قلمی نسخہ ذاتی)

روضۃ اقطاب : محمد بلاق
(مطبع محب ہند دہلی ۱۸۸۷ء)

زبدۃ التواریخ : شیخ نور الحق محدث دہلویؒ
(روٹوگراف قلمی نسخہ برٹش میوزیم)

سبع سنابل : میر عبد الواحد بلگرامی
مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۹ھ

سرور الصدور : ملفوظات شیخ حمید الدین ناگوری
(قلمی نسخہ، ذاتی)

سیاست نامہ : نظام الملک طوسی
(طہران)

سیر العارفین : مولانا جمالی
فارسی : مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۱ھ
نیز قلمی نسخہ، ذاتی
اردو ترجمہ : مولوی غلام احمد سنبھلی
شمس المطابع مراد آباد ۱۳۱۹ھ

سیر الاقطاب : الہدیہ چشتی
مطبع نول کشور ۱۸۸۱ء

سیر الاولیاء : سید محمد مبارک کرمانی المدعو بہ امیر خورد
(مطبع محب ہند دہلی ۱۳۰۲ھ

سیرت فیروز شاہی :
(مائکرو فلم نسخہ بانکی پور)

شذرات الذہب فی اخبار من الذہب:

ابوالفرج عبدالحیٰ بن عماد حنبلی

صبح الاعشیٰ : شہاب الدین ابوالعباس قلقشندی

انگریزی ترجمہ ڈاکٹر اسپیس (علی گڈھ)

صحیفۂ نعت محمدی یا ثنائے محمدی : ضیاءالدین برنی

قلمی نسخہ رام پور)

ضبط الاعلام : احمد تیمور پاشا

قاہرہ سنہ ۱۳۶۶ھ

طب سکندری (معدن الشفا) : میاں بھوہ

(نول کشور، لکھنؤ)

طبقات اکبری : نظام الدین احمد بخشی

ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۱۱ء

طبقات الشافعیۃ الکبریٰ : تاج الدین سبکی

قاہرہ سنہ ۱۳۲۴ھ

طبقات ناصری : ابوعمر منہاج الدین عثمان جوزجانی

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سنہ ۱۸۶۲ء

ظفر الوالہ : عبداللہ محمد بن عمر حاجی الدبیر

مرتبہ سر ڈینی سن راس (لندن سنہ ۲۸-۱۹۲۱ء)

علم الحساب : حاجی عبدالحمید محرر غزنوی

(۱) قلمی نسخہ رام پور

(۲) انگریزی ترجمہ ڈیول انڈیا کوارٹرلی

فتاوائے جہانداری : ضیاءالدین برنی

روٹوگراف قلمی نسخہ انڈیا آفس

فتاوائے فیروزشاہی :

قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری

فتوح السلاطین : عصامی

آگرہ ایڈیشن : ڈاکٹر مہدی حسین آگرہ سنہ ۱۹۳۸ء

مدراس ایڈیشن : محمد یوشع، مدراس سنہ ۱۹۴۸ء

فتوحات فیروزشاہی : فیروزشاہ تغلق

(۱) رضوی پریس دہلی سنہ ۱۳۰۲ھ

(۲) شیخ عبدالرشید ایم اے مخدومی (معہ

انگریزی ترجمہ) علی گڈھ

(۳) ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لاہور

(۴) پروفیسر شیخ عبدالرشید (علی گڈھ سنہ ۱۹۵۴ء)

فوائد السالکین : ملفوظات شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ

قلمی نسخہ، ذاتی

فوائد الفواد : ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاءؒ

مرتبہ امیر حسن علاء سجزیؒ (نول کشور سنہ ۱۳۰۲ھ)

قابوس نامہ : امیر عنصر المعانی کیکاؤس

باہتمام سعید نفیسی (سنہ ۱۳۲۰ شمسی)

قانون ہمایونی : خوندامیر

ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۴۰ء

قرآن السعدین : امیر خسرو

(۱) بہ تنقید مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی

(مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سنہ ۱۹۱۸ء)

(۲) بہ تصحیح مولوی قدرت اللہ (مطبع حسنی سنہ ۱۲۶۱ھ)

قصائد بدر چاچ : بدر چاچ

نول کشور سنہ ۱۲۷۹ء

کتاب الایمان : امام ابن تیمیہ

قاہرہ سنہ ۱۳۲۵ھ

کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل : ابو محمد علی

معروف بابن حزم (قاہرہ سنہ ۱۳۲۰ھ)

کتاب النجوم : عبدالعزیز شمس تھانیسری

(قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری)

کتاب الملل والنحل : ابوالفتح محمد بن عبدالکریم شہرستانی

(۱) لندن سنہ ۱۸۴۶ء

(۲) طہران سنہ ۱۲۸۸ھ

کتاب الہند : البیرونی

(۱) انگریزی ترجمہ، زخاؤ : لندن سنہ ۱۹۱۴ء

(۲) سید اصغر علی : انجمن ترقی اردو ہند سنہ ۱۹۴۱ء

کلمات طیبات : مکتوبات مرزا مظہر جان جاناںؒ وغیرہ

مطبع مطلع العلوم، مراد آباد

سنہ ۱۳۰۳ھ

کیمیائے سعادت : امام غزالی

(۱) مطبع ہاشمی میرٹھ سنہ ۱۲۷۷ھ

(۲) مطبع نول کشور لکھنؤ سنہ ۱۳۲۴ھ

گلزار ابرار : محمد غوثی منڈوی

(۱) قلمی نسخہ، ذاتی

(۲) اردو ترجمہ: مولوی فضل احمد (آگرہ سنہ ۱۳۲۶ھ)

گنج الاسرار : خواجہ معین الدین چشتیؒ

قلمی نسخہ، ذاتی

لباب الالباب : محمد عوفی

مرتبہ براؤن و مرزا محمد (لندن سنہ ۱۹۰۶ء)

لسان المیزان : ابن حجر عسقلانی

دائرۃ المعارف، حیدر آباد

لطائف قدوسی : ملفوظات شیخ عبدالقدوس

گنگوہیؒ مرتبہ شیخ رکن الدین

مطبع مجتبائی، دہلی سنہ ۱۳۱۱ھ

لیلیٰ مجنوں : امیر خسروؒ

بہ تصحیح مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی

(مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سنہ ۱۳۳۵ھ)

مآثر الکرام : مولانا غلام علی آزاد بلگرامی

مطبع مفید عام، آگرہ

سنہ ۱۹۱۰ء

مآثر رحیمی : عبدالباقی نہاوندی
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ
مراۃ العارفین : مسعود بک
قلمی نسخہ، ذاتی
مراۃ الاسرار : مولوی عبدالرحمن چشتی
قلمی نسخہ، ذاتی
مراۃ مسعودی : مولوی عبدالرحمن چشتی
قلمی نسخہ، ذاتی
مسالک الابصار : شہاب الدین العمری
(انگریزی ترجمہ ڈاکٹر اسپیس علی گڈھ)
مطلع الانوار : امیر خسرو
بہ تصحیح مقتدیٰ خاں شیروانی
مطبع مسلم یونیورسٹی ۱۹۳۶ء
مطلوب الطالبین : محمد بلاق چشتی
قلمی نسخہ، ذاتی
معارج الولایت : غلام معین الدین عبداللہ
قلمی نسخہ، ذاتی
معدن المعانی : ملفوظات شیخ شرف الدین
یحییٰ منیریؒ ۔ مرتبہ زین بدر عربی
مطبع شرف الاخبار، بہار ۱۳۰۱ھ
مفتاح الطالبین : ملفوظات شیخ قطب الدین
بختیار کاکیؒ قلمی نسخہ، ذاتی
مفتاح الفتوح : امیر خسرو
بہ تصحیح شیخ عبدالرشید (علی گڈھ)
مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین :
امام ابوالحسن اشعری ۔ استنبول ۱۹۲۹ء
مقدمہ ابن خلدون : اردو ترجمہ مولوی عبدالرحمن
مطبع حمیدیہ لاہور ۱۹۰۴ء
مکتوبات امام ربانی : مکتوبات شیخ احمد سرہندی
المعروف بہ مجدد الف ثانیؒ
مطبع نول کشور ۱۸۷۷ء
مکتوبات سید محمد اشرف جہانگیر سمنانیؒ
(۱) قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری
(۲) قلمی نسخہ : خانقاہ لائبریری کچھوچھہ
مکتوبات شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ
(۱) مطبع نول کشور ۱۸۹۸ء
(۲) مطبع علوی ۱۲۸۷ھ
مکتوبات قدوسی : شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ
مطبع احمدی دہلی
ملفوظات قطب عالم : یعنی سراج الہدایہ ملفوظات
مخدوم جہانیاںؒ
قلمی نسخہ اٹاوہ اسلامیہ کالج لائبریری

منتخب التواریخ : ملا عبدالقادر بدایونی
ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سنہ ۱۸۶۹ء

منشآت ماہرو : عین الدین عبداللہ ماہرو
مرتبہ پروفیسر شیخ عبدالرشید (علی گڑھ)

مونس الارواح : جہاں آرا بیگم
قلمی نسخہ، ذاتی

نزہتہ الخواطر : حکیم سید عبدالحیی
دائرۃ المعارف حیدر آباد

نصیحت الملوک : امام غزالی
مرتبہ آغا جلال ہمائی سنہ ۱۳۱۷ مجلس طہران

نہایۃ الاقدام فی علم الکلام : ابوبکر محمد بن
ابوالقاسم عبدالکریم شہرستانی
(لندن سنہ ۱۹۳۴ء)

نہ سپہر : امیر خسرو
بہ تصحیح ڈاکٹر وحید مرزا
(کلکتہ سنہ ۱۹۴۸ء)

واقعات مشتاقی : رزق اللہ مشتاقی
(روٹوگراف قلمی نسخہ برٹش میوزیم)

ہفت گلشن محمد شاہی : ہادی کامور خاں
(روٹوگراف قلمی نسخہ برٹش میوزیم)

اردو

آثار الصنادید : سرسید احمد خاں
نول کشور پریس لکھنو سنہ ۱۹۰۰ء

المامون : مولانا شبلی
قومی پریس لکھنو

تاریخ امروہہ : محمود احمد عباسی
تجلی پرنٹنگ ورکس دہلی سنہ ۱۹۳۰ء

تذکرہ : مولانا ابوالکلام آزاد
کتابی دنیا - لاہور

تذکرۃ الواصلین : رضی الدین بسمل
منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز پریس لاہور
سنہ ۱۳۱۸

ترجمان القرآن : مولانا ابوالکلام آزاد
(دہلی سنہ ۱۹۳۱ء)

جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد :
مولانا ابوالکلام آزاد
مطبع معارف اعظم گڈھ

حیات خسرو : منشی سعید احمد مارہروی
نول کشور اسٹیم پریس لاہور سنہ ۱۹۰۹

خلافت اور ہندوستان: مولانا سید سلیمان ندوی
مطبع اعظم گڈھ سنہ ۱۳۴۰ھ

رسائل شبلی: مولانا شبلی
اسٹیم پریس امرتسر سنہ ۱۹۱۱ء

سیرت النبیؐ: مولانا شبلی و مولانا سلیمان ندوی
(مطبع معارف اعظم گڈھ)

عرب و ہند کے تعلقات: سید سلیمان ندوی
(ہندوستانی اکاڈیمی، الہ آباد)

کنز التواریخ: رضی الدین بسمل
(نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۰۷ء)

مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت:
مولانا مناظر احسن گیلانی
ندوۃ المصنفین سنہ ۱۹۴۴ء

مسئلہ خلافت اور جزیرۂ عرب:
مولانا ابوالکلام آزاد
البلاغ پریس کلکتہ سنہ ۱۹۲۰ء

واقعات دار الحکومت دہلی، مولوی بشیر الدین
آگرہ سنہ ۱۹۱۹ء

یادِ ایام: حکیم سید عبدالحیی
(شبلی بک ڈپو لکھنؤ)

ENGLISH :-

Aghnides Nicholas P: Mohammadan Theories of Finance (New York 1916)

Ames, E. Scribner : The Psychology of Religious Experience

Amir Ali, The Spirit of Islam (London 1935)

Amir Ali, A Short History of the Saracens (London 1927)

Arnold, T. W: The Caliphate (Oxford 1924)

Bellew, H. W: Races of Afghanistān

Brown, Percy: Indian Architecture (Bombay 1943)

Cambridge History of India Vol III edited by Sir W. Hag (1928).

Carlyle, T: On Heroes & Hero-Worship (London)

Grunebaum: Islam (London 1955)

Habib, Mohd: Hazrat Amir Khusrau of Delhi Bombay 1927)

Habibullah, A B. M: The Foundation of Muslim Rule in India (London 1945)

Hitti, P. K: History of the Arabs (London 1951)

Hodivala, S. H: Studies in Indo-Muslim History Bombay 1939)

Husain, A. M: Rise & Fall of Mohd. bin Tughluq London 1938

Iqbal, Sir Mohd. : Reconstruction of Religious Thought in Islam (London 1944)

Leeuw G. Van Der : Religion in Essence and Manifestation (London 1938)

Lokkegaard, Frede : Islamic Taxation in the Classic Period

Topa, Dr. Ishwar : Politics in Pre-Mughal Times

Moore, George Foote : History of Religious (New York 1937)

Moreland, W. H : The Agrarian System of Moslem India (Cambridge 1929)

Nizami, K. A : Studies in Medieval Indian History (Aligarh 1956)

Pandey, A.B : The First Afghan Empire in India (Calcutta 1956)

Prasad, Ishwari : A History of the Qarauna Turks in India (Allahabad 1936)

Pratt, James : The Religious Consciousness: A psychological study (New York 1920)

Qureshi, I. H : The Administration of the Sultanate of Delhi (London 1942)

Schneider, Herbert : Religion in Various Cultures (New York 1932)

Sewell, Robert : A Forgotteu Empire (London 1900)

Smith, V.A : Early History of India

Stephen, Carr : The Archaeology & Monumental Remains of Delhi (1876)

Storey, C.A : persian Literature (London)

Tara chand : Influence of Islam on Indian culture (Allahabad)

Thomas, Edward : Chronicles of the Pathan Kings of Delhi (London 1871)

Todd, James : Annals & Antiquities of Rajasthan (London 1920)

Tolstoy, Leo : What is Religion? (London 1902)

Toynbee : An Historian's approach to Religion

Tripathi R.P : Some Aspects of Muslim Administration (Allahabad 1936)

Vaidya, C.V : Historyof Medieval Hindu India (Poona 1926)

Wach, Joachim : Sociology of Religion (Chicogo 1949)

Wright, Nelson : The Coinage & Metrology of the Sultans of Delhi (Delhi 1936)

Yusuf Husain : Glimpses of Medieval India Culture (Bombay 1957)

Zubaid Ahmad, The Contribution of India to Arabic literature (Allahabad 1945)

REPORTS, JOURNALS etc

Asiatic Researches

Encyclopaedia of Islam

Epigraphia Indo-Moslemica

Islamic Culture, Hyderabad-Deccan

Journal of Indian History

Journal of the Asiatic Society of Bengal

Journal of the U.P. Historical Society

Oriental College Magazine Lahore

Proceedings of the Indian History Congress

Reports of the Archaeological Survey of India

Reports of the Indian Historical Records Commission

تاریخ اسلام کامکمل کورس

تاریخِ اسلام کا یہ سلسلہ جو تاریخِ ملّت کے نام سے مشہور ہے اور مقبولِ عوام وخواص ہوچکا ہے۔ مختلف خصوصیتوں کے لحاظ سے نہایت ممتاز ہے۔ زبان کی سلاست، ترتیب کی دل نشینی اور جامعیت اس کی ایسی خصوصیتیں ہیں جو آپ کو اس سلسلہ کی دُوسری کتابوں میں نہیں ملیں گی۔ خلفاء اور سلاطین کی شخصی زندگی کے سبق آموز واقعات کو اس میں اہتمام کے ساتھ اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد تاریخِ اسلام کے تمام ضروری اور مستند حالات سامنے آجاتے ہیں۔

اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل ہونے کے لائق کتاب

جلد اوّل	نبی عربی	ایک روپیہ آٹھ آنے	جلد ششم	خلافتِ عباسیہ (حصّہ دوم)	چار روپے بارہ آنے
جلد دوم	خلافتِ راشدہ	تین روپے آٹھ آنے	جلد ہفتم	تاریخِ مصر	تین روپے چار آنے
جلد سوم	خلافتِ بنی اُمیہ	تین روپے آٹھ آنے	جلد ہشتم	خلافتِ عثمانیہ	تین روپے چار آنے
جلد چہارم	خلافتِ ہسپانیہ	دو روپے	جلد نہم	تاریخِ صقلیہ	ایک روپیہ بارہ آنے
جلد پنجم	خلافتِ عباسیہ (حصّہ اوّل)	تین روپے بارہ آنے	جلد دہم	سلاطینِ ہند	تین روپے آٹھ آنے
جلد یازدہم	سلاطینِ ہند دوم	تین روپے آٹھ آنے			

قیمت مکمل سیٹ غیر مجلّد اکتیس روپے آٹھ آنے مجلّد چونتیس روپے

مکتبہ برہان جامع مسجد دہلی۔۶

Titl Printed at The Fine Press DELHI